--275 | Javeed Name - جاوید نامہ
Dr. Iqbal 1971 - 192 pages.
Union Printing Press Delhi -

82-276 | Gubar-i-Khatir غبار خاطر
by Abul Kalam Azad
Nomani Press Delhi (Azad Academi)
352 pages - 1946

51-277 | Sharh-i-Bang-i Dara
Prof. Yusuf Saleem Chisti
Sultanice Book depot Delhi
536 pages

...82-275	Javeed Name - جاویدنامہ Dr. Iqbal 1971 - 192 pages Union Printing Press Delhi -
...82-276	Ghubar-i-Khatir غبار خاطر by Abul Kalam Azad Nomani Press Delhi (Azad Academi) 352 pages - 1946
...82-277	Sharh-i-Bang-i Dara Prof. Yusuf Saleem Chishti Sultanie Book dept Delhi 536 pages

شرحِ بانگِ درا

مؤلف

پروفیسر یوسف سلیم چشتی

مکتبہ ترقیٔ ادب ۔ امروھہ (یو۔پی)

باھتمام سلطانیہ بک ڈپو

قاسم جان اسٹریٹ دہلی ۶

قیمت : نو ۹ روپئے

بار اوّل ۱۰۰۰

(یونین پرنٹنگ پریس دہلی)

فہرست

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

مقدمہ

بانگِ درا، علامہ اقبال مرحوم کی سب سے زیادہ مشہور کتاب بلکہ ان کی شہرت کا سنگِ بنیاد ہے، حقیقت یہ ہے کہ عوام میں اسی کی بدولت انھیں لازوال شہرت حاصل ہوئی جس میں دوسری کتابوں کی وجہ سے اضافہ ہوتا رہا۔ اقبال کی غزلوں اور نظموں کا یہ دلکش مجموعہ ۱۹۲۴ء میں پہلی مرتبہ شایع ہوا تھا اس وقت سے لیکر اس وقت تک یہ کتاب تیرہ مرتبہ طبع ہو چکی ہے اور اس کے اٹھتر ہزار نسخے شایع ہو چکے ہیں۔

اسرارِ خودی اور رموزِ بیخودی ۱۹۱۴ء اور ۱۹۱۵ء میں اور پیام مشرق ۱۹۲۳ء میں شایع ہوئی لیکن یہ تینوں کتابیں فارسی میں ہیں اور بہت مشکل ہیں اس لیے جب ۱۹۲۴ء میں 'بانگِ درا' شایع ہوئی تو لوگوں نے اس کو ہاتھوں ہاتھ لیا اور اس کی بدولت اقبال کا نام ہندوستان کے طول و عرض میں مشہور ہو گیا۔

اس کتاب کی مقبولیت یا ہردلعزیزی کے وجوہ حسب ذیل ہیں:

(۱) یہ کتاب اردو زبان میں ہے اور دوسری کتابوں کے مقابلہ میں آسان ہے (اگرچہ بجائے خود کافی مشکل ہے)

(۲) اس میں وہ غزلیں اور نظمیں شامل ہیں جو برسوں پہلے ملک میں مشہور ہو چکی تھیں اور غزلیں تو لاہور سے حیدرآباد دکن تک لوگوں کی زبان پر چڑھ چکی تھیں۔ مثلاً:

ع، کبھی اے حقیقت منتظر نظر آ لباس مجاز میں

(۳) اس میں وہ غزلیں اور نظمیں بھی ہیں جن سے وطن دوستی (نیشنلزم) کا رنگ

ٹپکتا ہے مثلاً:

ع سارے جہاں سے اچھا ہندوستاں ہمارا

اس لیئے مسلمانوں کے علاوہ ہندو بھی ان کو بڑے شوق سے پڑھتے ہیں۔

(۴) اس میں وہ نظمیں بھی شامل ہیں جو علامہ نے انجمن حمایت الاسلام لاہور کے سالانہ جلسوں میں پڑھی تھیں اور ان کو بے پناہ مقبولیت حاصل ہو چکی تھی۔

(۵) اس میں وہ غزلیں بھی شامل ہیں جو داغ اور میر کے رنگ میں لکھی گئی ہیں اور اس صدی کے آغاز میں بہ رنگ قبول عام کی سند حاصل کر چکا تھا۔

(۶) اس میں وہ نظمیں بھی شامل ہیں جن میں مرحوم نے غیر مذاہب کے بزرگوں مثلاً گورو نانک، شری رامچندر، اور سوامی رام تیرتھ کی مدح کی ہے۔

(۷) اس میں وہ غزلیں اور نظمیں بھی شامل ہیں جو 'بانگ درا' کی اشاعت سے برسوں پہلے ہندوستان کے مختلف رسائل میں شایع ہو کر عوام اور خواص دونوں میں مقبول ہو چکی تھیں۔ مثلاً، اس کتاب کی پہلی نظم "ہمالہ" ۱۹۰۱ء میں مخزن میں شایع ہوئی تھی۔

بانگِ درا میں اقبال نے اپنی بعض غزلیں اور نظمیں شامل نہیں کی ہیں اور بعض غزلیں اور نظمیں ایسی ہیں جن میں سے بعض اشعار خارج کر دیئے گئے ہیں۔ مثلاً نظم موسومہ نالۂ یتیم جو انھوں نے ۱۸۹۹ء میں انجمن حمایت اسلام کے جلسے میں پڑھی تھی اور اَبرِ گہر بار جو فریادِ اُمت کے نام سے الگ شایع ہوئی تھی اس مجموعہ میں شامل نہیں ہیں۔ یا مثلاً یہ غزلیں بھی بانگِ درا میں نہیں ہیں۔

طور پر تو نے جو اے دیدۂ موسیٰ دیکھا
میری ہستی ہی جو تھی، میری نظر کا پردہ
عین ہستی ہوا ہستی کا فنا ہو جانا
خلق معقول ہے محسوس ہے خالق اے دل

وہی کچھ قیس نے دیکھا پسِ محمل ہو کر
اٹھ گیا بزم سے میں پردۂ محفل ہو کر
حق دکھایا مجھے اس نقطے نے باطل ہو کر
دیکھ ناداں ذرا آپ سے غافل ہو کر

نظم نیا شوالہ اور عقل و دل میں سے بعض اشعار حذف کر دیئے گئے ہیں۔ بعض اشعار غزلوں میں سے اس لیے حذف کر دیئے گئے کہ ان میں اقبال کو زبان کی خامیاں نظر آئیں۔

بانگ درا تین حصوں میں منقسم ہے پہلے حصہ میں وہ نظمیں اور غزلیں شامل ہیں جو انھوں نے ابتدائے شاعری سے ۱۹۰۵ء تک لکھیں، اس دور کی خصوصیات حسب ذیل ہیں:

(۱) سب سے نمایاں خصوصیت یہ ہے کہ اس زمانہ میں ان پر وطن پروری (نیشنلزم) کا جذبہ غالب تھا چنانچہ "ہمالہ" "صدائے درد"، "تصویر درد"، "آفتاب"، "ترانۂ ہندی" اور "نیا شوالہ" اس کی بہترین مثالیں ہیں۔ وطن پروری پر تصویرِ درد سے بہتر کوئی دوسری نظم اردو میں نہیں لکھی گئی۔

(۲) اس دور کی غزلوں میں داغ اور امیر کا رنگ بہت نمایاں ہے۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ ان کی شاعری کی ابتدا غزلوں ہی سے ہوئی تھی اور اس سلسلہ میں انھوں نے داغ سے اصلاح بھی لی تھی، چنانچہ خود کہتے ہیں: ؎

نسیم و تشنہ ہی اقبال کچھ اس پر نہیں نازاں
مجھے بھی فخر ہے شاگردیٔ داغ سخنداں کا

(۳) بعض نظموں میں انھوں نے مشہور مغربی شعرا، مثلاً ایمرسن، کاؤپر، لانگ فیلو اور ٹینی سن کے خیالات کو اردو نظم کا جامہ پہنایا ہے۔ مثلاً "رخصت اے بزم جہاں" ایمرسن سے "ہمدردی" کاؤپر سے "پیام صبح" لانگ فیلو سے اور "عشق اور موت" ٹینی سن سے ماخوذ ہے۔

(۴) بعض نظموں میں تصویر کشی اور منظر نگاری کے بہت عمدہ نمونے پائے جاتے ہیں مثلاً ہمالہ، گل رنگیں، ابر کہسار، آفتاب صبح، چاند اور صبح کا ستارہ وغیرہ۔

(۵) بعض نظموں میں بہت عمیق اور سنجیدہ خیالات پائے جاتے ہیں، مثلاً شمع اور

انسان اور بزمِ قدرت۔

(٦) بعض نظمیں بچوں کے لئے لکھی ہیں، مثلاً "ایک مکڑا اور مکھی"، "ایک پہاڑ اور گلہری"، "ایک گائے اور بکری"، "بچے کی دعا"، "ماں کا خواب"، "پرندے کی فریاد"، "ہندوستانی بچوں کا قومی گیت"، اور "ہمدردی" وغیرہ۔ ان نظموں کی زبان بہت آسان ہے۔ فارسی تراکیب یا مشکل الفاظ کہیں استعمال نہیں کیے۔ لیکن یہ سب نظمیں بہت سبق آموز ہیں جن سے بڑی عمر کے لوگ بھی مستفید ہو سکتے ہیں۔

(٧) ابتدائی کلام کا مطالعہ کرنے سے یہ بات بھی واضح ہو سکتی ہے کہ اس زمانہ میں اقبال پر مناظرِ فطرت کے مطالعہ کا شوق بہت غالب تھا یہی وجہ ہے کہ انھوں نے ابرِ رنگیں"، "ابرِ کوہسار"، "آفتاب"، "ماہِ نو"، "چاند"، "ابر"، "صبح"، "اخترِ صبح"، "پیامِ صبح"، "جگنو اور شمع" پر نظمیں لکھیں، اس قسم کی کوئی نظم ضربِ کلیم میں نظر نہیں آتی۔

(٨) ابتدائی دور کی نظموں میں "تلاش" تحقیق اور تجسس کا رنگ بہت نمایاں ہے چنانچہ گلِ رنگیں میں لکھتے ہیں۔ ؎

مطمئن ہے تو، پریشاں مثلِ بو رہتا ہوں میں
زخمیِ شمشیرِ ذوقِ جستجو رہتا ہوں میں

آفتابِ صبح میں، آفتاب سے یوں خطاب کیا ہے۔ ؎

دردِ استفہام سے واقف ترا پہلو نہیں
جستجوئے رازِ قدرت کا شناسا تو نہیں

ان نظموں کے مطالعہ سے معلوم ہوتا ہے کہ اس زمانہ میں اقبال حقیقت کی جستجو میں منہمک تھے۔

(٩) اس زمانہ میں اقبال اس اختلاف سے بہت آزردہ خاطر تھے جو ہندو مسلمانوں میں بتدریج ترقی پذیر تھا چنانچہ اس آزردگی کا اظہار انھوں نے صدائے درد میں کیا ہے جس کے دو شعر ذیل میں درج کرتا ہوں۔

جل رہا ہوں کل نہیں پڑتی کسی پہلو مجھے　　　ہاں ڈبو دے اے محیطِ آبِ گنگا تو مجھے

سرزمیں اپنی قیامت کی نفاق انگیز ہے　　　وصل کیسا یاں تو اک قربِ فراق آمیز ہے

(۱۰) جو نظمیں انھوں نے وطن پروری کے جذبہ سے متاثر ہو کر لکھی ہیں ان میں فارسی کے بجائے ہندی الفاظ استعمال کیے ہیں۔ مثلاً نیا شوالہ کا یہ شعر:

شکتی بھی شانتی بھی بھگتوں کے گیت میں ہے　　　دھرتی کے باسیوں کی مکتی پریت میں ہے

بالکل ہندی زبان میں ہے۔

(۱۱) اس دور کی بعض نظمیں ایسی بھی ہیں جن میں فلسفیانہ خیالات پائے جاتے ہیں یعنی ان میں انھوں نے کائنات کے اہم مسائل، مثلاً 'حیات'، 'مآخذِ حیات'، 'مقصدِ حیات'، 'انجامِ حیات'، 'حیات بعد الموت'، 'شعورِ ذات'، 'خودی عشق اور حسن کی ماہیت سے بحث کی ہے۔ ان نظموں میں ہمیں ان کی آئندہ فلسفیانہ شاعری کے ابتدائی نقوش صاف نظر آ سکتے ہیں۔ یہ رنگ خاص طور سے گل رنگیں، خفتگانِ خاک سے استفسار، شمع، ماہِ نو، انسان اور بزمِ قدرت، بچہ اور شمع، جگنو اور دل میں نظر آتا ہے۔

(۱۲) یورپ جاتے وقت حضرت محبوبِ الٰہیؒ کے مزار مبارک پر حاضر ہو کر جن خیالات اور جذبات کا انھوں نے اظہار کیا ہے ان کے مطالعہ سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ ان کو شروع ہی سے بزرگانِ دین کے ساتھ دلی عقیدت تھی اور میری رائے میں یہ لازمی نتیجہ ہے۔ جذبۂ عشقِ رسول کا جو اقبال کی رگ و پے میں سمایا ہوا تھا۔

(۱۳) ابتدائی دور میں انھوں نے اکبر الہ آبادی مرحوم کے رنگ میں بھی نظمیں لکھی تھیں جو بانگ درا کے آخر میں ظریفانہ کے عنوان سے شامل ہیں۔ لیکن جس طرح غالب نے کچھ عرصہ کے بعد طرزِ بیدل میں ریختہ لکھنے کے خیال کو ترک کر دیا۔

اسی طرح اقبالؔ نے بھی کچھ سوچ سمجھ کر آئندہ اس رنگ میں لکھنا چھوڑ دیا۔ سچ کہا ہے کسی نے۔

ع ہر کسے را بہر کارے ساختند

بانگِ درا کے دوسرے حصہ میں وہ نظمیں اور غزلیں شامل ہیں جو انھوں نے قیامِ یورپ (۱۹۰۵ء تا ۱۹۰۸ء) کے دوران میں لکھی۔ ان کی تعداد نسبتاً کم ہے اور اس کی وجہ یہ ہے کہ یورپ جا کر ان کے خیالات میں ایسا انقلاب آیا کہ وہ شاعری ہی سے دل برداشتہ ہو گئے تھے لیکن بعض دوستوں اور بزرگوں کے سمجھانے سے انھوں نے اپنی رائے میں تبدیلی پیدا کر لی اور دوبارہ شعر گوئی شروع کر دی۔

زمانۂ قیامِ یورپ میں ان کی شاعری میں ایک خوش آئند مگر عظیم الشان انقلاب پیدا ہو گیا، جس کی تفصیل یہ ہے کہ وہاں انھوں نے مغربی تہذیب و سیاست کو بہت نزدیک سے دیکھا جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ ان دونوں چیزوں کے مفاسد ان پر بخوبی آشکار ہو گئے، بالفاظِ دیگر ان پر یہ حقیقت منکشف ہو گئی کہ نظریۂ قومیت و وطنیت بنی آدم کے حق میں کبھی مفید نہیں ہو سکتا کیونکہ اس کی بنیاد تعصب اور تنگ نظری پر ہے۔ دوسری بات یہ کہ مغربی تہذیب کا نتیجہ انسانوں کے حق میں تباہی کے سوا اور کچھ نہیں ہے کیونکہ اسکی بنیاد مادیت اور انکارِ خدا پر ہے۔

علاوہ بریں اس عرصہ میں انھوں نے اسلامی اصول اور اسلامی تاریخ کا بہت غور کے ساتھ مطالعہ کیا۔ اس لئے وہ اس نتیجہ پر پہنچے کہ دُنیا کی نجات، اسلامی اصول زندگی کی تبلیغ و اشاعت ہی میں مضمر ہے اسی زمانے میں ان کو اس حقیقت کا علم ہوا کہ وہ فارسی زبان میں بھی بڑی آسانی کے ساتھ شعر کہہ سکتے ہیں۔ اس لئے انھوں نے فیصلہ کیا کہ آئندہ اپنے خیالات اسی زبان میں پیش کریں جو ہندوستان سے باہر دوسرے ملکوں مثلاً افغانستان، ترکستان، ایرانؔ، اور عراقؔ میں بھی سمجھی جاتی ہے۔

جب انھوں نے یہ فیصلہ کر لیا کہ آئندہ اپنی شاعری کو اسلامی اصولوں کی تبلیغ کے لئے وقف کر دیں گے تو قدرتی طور پر ان کی شاعری میں "پیغام" کا رنگ پیدا ہو گیا جو ۱۹۰۸ء سے لے کر ۱۹۳۸ء تک ہر تصنیف اور ہر نظم میں نظر آتا ہے۔ چنانچہ اس شعر میں اسی انقلاب کی طرف اشارہ ہے ؎

یہ ہند کے فرقہ ساز اقبال آزری کر رہے ہیں گویا
بچا کے دامن بتوں سے اپنا غبارِ راہِ حجاز ہو جا

اب ہم اس دور کی بعض خصوصیات درج کرتے ہیں :

(۱) سب سے بڑی خصوصیت یہ ہے کہ اضطراب، جستجو، اور تذبذب کا رنگ زائل ہو گیا اور اس کے بجائے ان کی شاعری میں یقین اور پیغام کا رنگ پیدا ہو گیا، چنانچہ ۱۹۰۷ء میں انھوں نے یورپ سے جو نظم علی گڑھ کالج کے طلبہ کے نام لکھ کر بھیجی تھی وہ دراصل ان کا پہلا پیغام ہے جو انھوں نے اپنی قوم کی وساطت سے دنیا کو دیا اور غور سے دیکھا جائے تو انھوں نے اپنی زندگی کے باقی ماندہ تیس سال اسی پیغام کی وضاحت میں صرف کر دیئے۔

(۲) اس دور کی شاعری میں وطن پروری کا رنگ کہیں نظر نہیں آتا جس کی وجہ میں اوپر لکھ چکا ہوں، اس کے بجائے انھوں نے اسلامی اصولوں کی تبلیغ واشاعت کے لئے اپنی شاعری بلکہ زندگی وقف کر دینے کا اعلان کر دیا۔ چنانچہ ۱۹۰۷ء میں انھوں نے ایک نظم لکھی تھی جس میں وہ کہتے ہیں۔ ؎

میں ظلمتِ شب میں لے کے نکلوں گا اپنے درماندہ کارواں کو
شرر فشاں ہوگی آہ میری، نفس مرا شعلہ بار ہوگا

دنیا جانتی ہے کہ اقبال نے اس شعر میں جو کہا تھا وہ کر دکھایا۔

(۳) اس دور کے مطالعہ سے یہ حقیقت واضح ہو سکتی ہے کہ اب اقبال دنیا کی

نجات اسلامی اصولوں کی اشاعت میں مضمر سمجھنے لگے تھے۔ اسی لئے انھوں نے اپنی قوم کے اندر جوش اور ولولہ پیدا کرنے والی نظمیں لکھیں، اور مسلمانوں کو ان کے شاندار ماضی سے آگاہ کیا۔ نظم صقلیہ اسی مقصد کے لیے لکھی گئی تھی اس نظم کا یہ شعر جس میں وہ اس جزیرے سے خطاب کرتے ہیں، اقبال کے جذباتِ قلبی کا مرقع ہے ؎

درد اپنا مجھ سے کہہ، میں بھی سراپا درد ہوں
جس کی تو منزل تھا میں اس کارواں کی گرد ہوں

جب غیر مسلموں نے اقبال کی شاعری میں یہ انقلاب دیکھا تو انہیں قدرتی طور پر بہت شکایت پیدا ہوئی۔ کیونکہ وہ کب پسند کرتے تھے کہ کوئی شخص نخچیروں کو صیاد کے ارادے سے آگاہ کر دے۔ اس غصہ کا اندازہ ان کے ایک ہموطن (کشمیری پنڈت) کی نظم سے ہو سکتا ہے جس کے دو شعر ذیل میں درج کرتا ہوں ؎

ہندی ہونے پہ ناز جسے کل تک تھا، حجازی بن بیٹھا
اپنی محفل کا رند پرانا، آج نمازی بن بیٹھا

محمل میں چھپا ہے قیس حزیں، دیوانہ کوئی صحرا میں نہیں
پیغامِ جنوں، جو لایا تھا، اقبال وہ اب دنیا میں نہیں

ان شعروں کے مطالعہ سے ثابت ہے کہ غیر مسلموں کی نظر میں اس سے بڑا کوئی جرم نہیں کہ مسلمان حجازی یا نمازی بن جائے۔

(۴) قیامِ یورپ کی بدولت اقبال کو اس حقیقت سے آگاہی ہو گئی تھی کہ مغربی تہذیب چونکہ انکارِ خدا پر مبنی ہے اس لئے اس کی بربادی یقینی ہے، چنانچہ انھوں نے اسی زمانے میں یہ پیشین گوئی کر دی تھی ؎

تمہاری تہذیب اپنے خنجر سے آپ ہی خودکشی کرے گی
جو شاخِ نازک پہ آشیانہ بنے گا ناپائیدار ہوگا

(۵) اس زمانہ کی غزلوں میں کہیں کہیں نعتِ رسول کا رنگ بھی نظر آتا ہے۔ ایک طویل غزل کے دو شعر ذیل میں درج کرتا ہوں ؎

سراپا حسن بن جاتا ہے جس کے حسن کا عاشق
بھلا اے دل حسیں ایسا بھی ہے کوئی حسینوں میں
پھڑک اٹھا کوئی تیری ادائے مَاعرفنا پر
ترا رتبہ رہا بڑھ چڑھ کے سب ناز آفرینوں میں

(۶) اس دور کی نظموں میں بعض اشعار ایسے پائے جاتے ہیں جن سے یہ معلوم ہو سکتا ہے کہ اقبال نے عشق و محبت کو اپنا مسلکِ زندگی قرار دیدیا تھا، دو شعر لکھتا ہوں ؎

عشق نے کر دیا تجھے ذوقِ تپش سے آشنا　　بزم کو مثلِ شمعِ بزم، حاصلِ سوز و ساز دے
تارے میں وہ قمر میں وہ، جلوہ گہِ سحر میں وہ　　چشمِ نظارہ میں نہ تو سرمۂ امتیاز دے

(۷) ابتدائی دور میں جیسا کہ میں واضح کر چکا ہوں، اقبال شہیدِ جستجو نظر آتے ہیں، لیکن یورپ جا کر انہیں گوہرِ مقصود ہاتھ آ گیا۔ چنانچہ لکھتے ہیں ؎

جستجو جس گل کی تڑپاتی تھی اے بلبل مجھے
خوبیٔ قسمت سے آخر مل گیا وہ گل مجھے

اقبال کے آیندہ کلام کے مطالعہ سے واضح ہو سکتا ہے کہ وہ "گل" قرآن حکیم کا پیغام ہے جس کی اشاعت وہ آخر وقت تک کرتے رہے۔

(۸) اس دور میں یہ حقیقت ان پر منکشف ہو گئی تھی کہ زندگی سراسر حرکت، عمل اور جدوجہد ... کا نام ہے۔ چنانچہ چاند ستاروں سے کہتا ہے ؎

جنبش سے ہے زندگی جہاں کی
یہ رسم قدیم ہے یہاں کی

ابتدائی دور میں وہ "رازِ حیات" کے جویا　　نظر آتے ہیں لیکن اس دوسرے دور

میں وہ اس کی حقیقت کو ان لفظوں میں بیان کرتے ہیں ؎

راز حیات پوچھ لے خضرِ خجستہ گام سے
زندہ ہر ایک چیز ہے کوششِ ناتمام سے

(۹) اس دور میں اقبال نے ہندی وطنیت کو خیر باد کہہ کر اس کے بجائے اسلامی تعلیم کی تبلیغ شروع کر دی یعنی مسلمانوں کی قومیت کی بنیاد وطن نہیں بلکہ مذہب ہے۔

نرالا سارے جہاں سے اس کو عرب کے معمار نے بنایا
بنا ہمارے حصار ملّت کی اتحادِ وطن نہیں ہے

(۱۰) یورپ میں قیام کی بدولت جو عظیم الشان انقلاب اقبال کی زندگی میں آیا اس کا نقشہ انھوں نے اس نظم میں کھینچا ہے جو اپنے دوست عبد القادر مرحوم کے نام لکھی ہے یہ نظم اس لحاظ سے بہت قیمتی ہے کہ اس سے ہمیں یہ معلوم ہو سکتا ہے کہ اب اقبال نے اپنے لئے ایک نصب العین متعین کر لیا تھا یعنی خدمت اسلام۔

اگر کوئی شخص اس نظم کو غور سے پڑھے تو اسے اقبال کی آئندہ شاعری کے تمام نقوش بلکہ بنیادی تصورات اس میں نظر آ سکتے ہیں۔ مثلاً۔

رخت جاں بتکدۂ چیں سے اٹھالیں اپنا — سب کو محو رخ سعدی و سلیمی کر دیں
دیکھ یثرب میں ہوا ناقۂ لیلےٰ بے کار — قیس کو آرزوئے نو سے شناسا کر دیں

شمع کی طرح جییں بزم گہہ عالم میں
خود جلیں دیدۂ اغیار کو بینا کر دیں

بانگِ درا کے تیسرے حصے میں وہ نظمیں اور غزلیں شامل ہیں جو انھوں نے ولایت سے واپسی کے بعد ۱۹۰۸ء سے ۱۹۲۳ء تک لکھیں۔ اس دور کی خصوصیات حسب ذیل ہیں:

(۱) زبان زیادہ صاحب اور سلیس ہو گئی ہے۔ زاویہ نگاہ آفاقی ہو گیا ہے اور کلام میں سوز و گداز اور محاسنِ شعری کے ساتھ ساتھ فلسفیانہ غور و فکر کا رنگ

پیدا ہو گیا ہے۔

(۲) اُردو پر فارسی کا اثر غالب ہو گیا ہے جس کی وجہ یہ ہے کہ ۱۹۱۴ء اور ۱۹۱۵ء میں انھوں نے اپنی غیر فانی مثنویاں اسرارِ خودی اور رموزِ بے خودی۔ اور ۱۹۲۳ء میں پیامِ مشرق، یہ تینوں کتابیں فارسی ہی میں لکھی ہیں۔ فارسی زبان سے جو وابستگی ان کو ہو گئی تھی اس کا اندازہ اس بات سے ہو سکتا ہے کہ انھوں نے طلوعِ اسلام کا آخری بند بالکل فارسی میں لکھا ہے۔ اور شمع و شاعر کا پہلا بند بھی اسی شیریں زبان میں قلمبند کیا ہے۔

(۳) زبان کے ساتھ ساتھ خیالات میں بھی انقلاب عظیم رونما ہو گیا۔ چنانچہ تیسرے دور میں نہ تو کوئی نظم انگریزی شعرا کے کلام سے ماخوذ ہے نہ کوئی نظم مکڑی یا گائے پر ہے۔ نہ کسی نظم میں بادل، چاند، دریا، یا ستارہ سے خطاب کیا ہے، بلکہ اب ان کا موضوع حیات، خودی، خدا، فلسفۂ خودی، فلسفۂ بے خودی اور عشق ہے جو شخص کسی زمانہ میں دامنِ کوہ میں ایک چھوٹا سا جھونپڑا بنانا چاہتا تھا اب اپنے یقین کی پوری قوت کے ساتھ دنیا کو یہ پیغام دیتا ہے ؎

تو رازِ کن فکاں ہے اپنی آنکھوں پر عیاں ہو جا!
خودی کا رازداں ہو جا، خدا کا ترجماں ہو جا!

خودی میں ڈوب جا غافل یہ سرِّ زندگانی ہے
نکل کر حلقۂ شام و سحر سے جاوداں ہو جا

اقبالؔ کے جاننے والوں سے یہ حقیقت مخفی نہیں ہے کہ خودی میں ڈوب جانے کی جو تعلیم انھوں نے ۱۹۲۲ء میں دی تھی یہی تعلیم انھوں نے ۱۹۳۶ء میں اس غیر فانی شعر میں دی ہے ؎

اپنے من میں ڈوب کر پا جا سراغِ زندگی تو اگر میرا نہیں بنتا نہ بن اپنا تو بن

(۴) سرکار دوعالم صلے اللہ علیہ وسلم سے۔ ان کی عقیدت بہت زیادہ ہوگئی اور اس میں آخر دم تک اضافہ ہی ہوتا رہا۔ حتیٰ کہ مرنے سے پہلے وہ میری رائے میں عشقِ رسول ؐ میں فنا ہو چکے تھے۔

(نوٹ) میں نے یہ رائے اس لیے قائم کی ہے کہ اگر وہ فنافی الرسول کے مقام پر نہیں پہنچے تو مرنے کے بعد زندہ کیسے ہوگئے؟

حضور انور صلے اللہ علیہ وسلم کی ذات گرامی تو بڑی چیز ہے ان کو تو سرزمین حجاز سے بھی محبت ہوگئی تھی۔ دو شعر ملاحظہ ہوں:

میں نے کہا کہ موت کے پردے میں ہے حیات ... پوشیدہ جس طرح ہو حقیقت مجاز میں
اوروں کو دیں حضور یہ پیغامِ زندگی! ... میں موت ڈھونڈھتا ہوں زمینِ حجاز میں

اقبال نے اس دور میں "میں اور تو" کے عنوان سے ایک "قیامت در بغل" نظم لکھی تھی جس کا آخری شعر، عاشقانِ رسول ؐ کی نگاہ میں "گنج شائیگاں" سے بھی زیادہ قیمتی ہے۔

کرم اے شہِ عرب و عجم! کہ کھڑے ہیں منتظرِ کرم
وہ گدا کہ تو نے عطا کیا ہے جنہیں دماغِ سکندری

ناممکن ہے کہ کوئی مسلمان اس شعر کو پڑھے اور اس پر مستی کا عالم طاری نہ ہو جائے۔

(۵) اس دور کی اکثر نظموں میں انھوں نے مسلمانانِ عالم کے قلبی جذبات کی ترجمانی کی ہے۔ اس کی تفصیل یہ ہے کہ علامہ مرحوم جب ۱۹۰۸ء میں یورپ سے واپس آئے تو اسی زمانہ سے دنیائے اسلام پر حوادث ارضی و سماوی کا نزول شروع ہوگیا۔ ۱۹۰۸ء میں ایران میں زبردست سیاسی انقلاب برپا ہوا یعنی روس اور برطانیہ نے اس بدقسمت ملک کے اندرونی اور داخلی معاملات میں مداخلت شروع کر دی۔

۱۹۰۹ء میں ترکوں نے سلطان عبدالحمید کو معزول کر دیا۔ ۱۹۱۱ء میں اطالیہ نے بلاوجہ طرابلس پر حملہ کر کے اس ملک کو اپنے مظالم کا تختۂ مشق بنا لیا۔ برطانیہ نے بھی بالواسطہ "اس کارِ خیر میں" اطالیہ کی مدد کی تھی۔ ۱۹۱۲ء میں بلقانی ریاستوں نے برطانیہ کے ایما پر سے ترکوں کے خلاف اعلان جنگ کر دیا۔ ۱۹۱۳ء میں انگریزوں نے کانپور میں مچھلی بازار کی مشہور مسجد کے ایک حصہ کو محض اسلئے شہید کر دیا کہ مجوزہ شارعِ عام میں کجی پیدا نہ ہو۔ انگریزوں کے اس انسانیت سوز اور ملت کش طرزِ عمل کے خلاف سارے ہندوستان میں آگ لگ گئی تھی اور اقبال پر یہ حقیقت منکشف ہو گئی کہ انگریزوں کی ذہنیت یہ ہے کہ چاہے اسلامیانِ ہند کے قلوب پاش پاش ہو جائیں لیکن سڑک میں کوئی عیب پیدا نہ ہو۔

۱۹۱۵ء میں ترکی شریک جنگ ہوا اور انگریزوں نے کمال عیاری سے کام لیکر عربوں کو ترکوں کے خلاف صف آرا کر کے مسلمانوں کے خون کو پانی سے بھی ارزاں کر دیا۔ ۱۹۱۹ء میں انگریزوں نے ترکی سلطنت کو ختم کرنیکی سازش مکمل کر لی چنانچہ ۱۹۲۱ء میں یونان کو خفیہ جنگی امداد دیکر ترکوں کے خلاف جنگ پر آمادہ کر دیا۔

تیسرے دور کی شاعری میں اقبال نے انگریزوں کی اسلام دشمنی کے ان تمام شواہد کو صراحتاً یا کنایتاً اپنی نظموں میں بیان کر کے مسلمانوں کے جذبات کی ترجمانی کی ہے، کل اشعار تو کہاں تک لکھوں گا صرف ایک شعر پر اکتفا کرتا ہوں ؎

اگر عثمانیوں پر کوہِ غم ٹوٹا تو کیا غم ہے
کہ خونِ صد ہزار انجم سے ہوتی ہے سحر پیدا

(۶) اس دور کی نظموں کے مطالعہ سے یہ حقیقت واضح ہو سکتی ہے کہ ۱۹۰۸ء کے بعد سے اقبال کے خیالات میں بہت وسعت، تخیلات میں بلندی، جذبات میں شدت

اور احساسات میں ذکاوت پیدا ہو گئی تھی اور وہ شاعر کے مرتبہ سے بلند ہو کر پیغامبر بن گئے تھے۔ چنانچہ خضر راہ میں ان کی پیغامی شاعری کا رنگ صاف نمایاں ہے۔

(۷) اب انھوں نے عشق کو اپنا مسلک بنا لیا اور ان کی شاعری اسی مسلک کی تبلیغ و اشاعت کے لیے وقف ہو گئی۔

یقیں محکم، عمل پیہم، محبت فاتح عالم
جہادِ زندگانی میں ہیں یہ مردوں کی شمشیریں

(۸) ان کا زاویۂ نگاہ آفاقی ہو گیا، چنانچہ اب وہ یہ کہتے ہیں ؎

چین و عرب ہمارا ہندوستاں ہمارا
مسلم ہیں ہم وطن ہے سارا جہاں ہمارا

(۹) اب انھوں نے اپنی شاعرانہ قوتوں کو مسلمانوں کے دل میں ولولہ پیدا کرنے کے لیے وقف کر دیا۔ چنانچہ خطاب بہ جوانانِ اسلام، مسلم، شعاعِ آفتاب، نویدِ صبح ان سب نظموں میں انھوں نے قوم کو امید اور یقین کا پیغام دیا ہے اور اطاعتِ اسلام کے جذبہ کو ابھارا ہے اور اس کے ساتھ ساتھ انھوں نے مسلمانوں کو تہذیبِ مغرب کے خطرات سے بھی آگاہ کیا ہے۔ چنانچہ مسلمان اور تعلیم جدید اور مذہب میں انھوں نے اس فرض کو بڑی خوبی اور خوش اسلوبی کے ساتھ انجام دیا ہے۔

(۱۰) اس دور میں انھوں نے بعض ایسی نظمیں لکھیں جن کی بدولت اگر ایک طرف اردو ادب کا دامن جواہرات سے مالا مال ہو گیا تو دوسری طرف خود انہیں غیر فانی شہرت حاصل ہو گئی مثلاً شکوہ، جواب شکوہ، شمع اور شاعر، والدہ مرحومہ کی یاد میں، خضرِ راہ، اور طلوعِ اسلام، اردو ادب میں ان نظموں میں سے کسی کا جواب نہیں مل سکتا۔

(۱۱) کیونکہ اسلام انسان کو تمام مذاہب کے بزرگوں کی عزت کرنا سکھاتا ہے،

اس لئے اسلامی تعلیمات کے شارح ہونے کے باوجود اقبالؔ کی وسعت نظر اور کشادگی قلب کا وہی عالم رہا جو ۱۹۰۵ء سے پہلے تھا۔ یہی وجہ ہے کہ اس دور میں بھی انھوں نے اگر ایک نظم حضرت صدیق رضؓ اکبر کی شان میں لکھی ہے تو دوسری نظم میں شری رامچندر کی سیرت کے بعض پہلوؤں کو سراہا ہے۔

(۱۲) اس حصے میں بعض نظمیں ایسی ہیں کہ جن میں انھوں نے بعض فارسی شعراء کے اشعار پر تضمین کی ہے جن سے ان کے مطالعہ کی وسعت کا پتہ چلتا ہے۔

(۱۳) چونکہ اس زمانے میں انھوں نے اپنے فلسفۂ خودی کو مدّون کر کے اسرار خودی کی صورت میں دنیا کے سامنے پیش کر دیا تھا۔ اس لیے ان کی بعض اُردو نظموں میں بھی اس کے اشارات ملتے ہیں۔ مثلاً انسان اور بزم قدرت، عقل و دل، ایک پرندہ اور جگنو کنار راوی۔ اور طلوع اسلام میں فلسفۂ خودی کے اکثر مسائل نہایت دلکش انداز میں نظم کیے ہیں۔

(۱۴) اس دور کی شاعری میں ان کی نظموں اور غزلوں کی زبان بہت منجھ گئی ہے اور فارسی ادبیات کے گہرے مطالعہ کی بدولت ان کو اپنے خیالات کے اظہار پر بے پناہ قدرت حاصل ہو گئی ہے۔ جس کا ثبوت شیکسپیر، اسیری، ارتقاء اور دوسری نظموں سے بآسانی مل سکتا ہے۔

(۱۵) اس دور کی غزلوں میں جوش اور سرمستی کا رنگ بہت نمایاں ہے۔

بانگِ درا پر ایک طائرانہ نظر

یہ مسلّم ہے کہ اقبالؔ نے اُردو شاعری میں اپنے کلام کی بدولت ایک نئے دور کا آغاز کر دیا۔ اور آج کوئی شاعر ایسا نہیں جو کسی نہ کسی رنگ میں ان کے اندازِ بیان سے متاثر نہ ہو۔ یہ دوسری بات ہے کہ جس طرح میرؔ کا انداز بہت کم شعراء کو

نصیب ہو سکا۔ اسی طرح اقبالؔ کے رنگ کی کامیاب پیروی بھی بہت کم شعراء کے حصہ میں آ سکی۔

یہ سچ ہے کہ بالِ جبریل میں ان کی اُردو شاعری اپنے مرتبۂ کمال کو پہنچ گئی ہے اور اس لحاظ سے ہم بانگِ درا کا مقابلہ یا موازنہ اس کے ساتھ نہیں کر سکتے لیکن اس سے قطع نظر کر کے اپنی جگہ بانگِ درا بھی لائقِ صد تحسین و آفریں ہے اور اس میں بھی شاعری کی تمام خوبیاں موجود ہیں۔ وہ خوبیاں جن کی بدولت کسی شاعر کو دنیا کے صف اول کے شعراء میں نمایاں جگہ حاصل ہو سکتی ہے چونکہ یہ مقدمہ تفصیل کا متحمل نہیں ہو سکتا اس لیے ہم اختصار کیساتھ ذیل میں بانگِ درا کی چند شاعرانہ خصوصیات درج کرتے ہیں۔

واضح ہو کہ بانگِ درا میں غزلیں بھی ہیں اور نظمیں بھی ہیں۔ ابتدائی غزلوں میں داغؔ کا رنگ پایا جاتا ہے لیکن جوں جوں ان کے خیالات میں وسعت اور فکر میں بلندی پیدا ہوتی گئی، تیوں تیوں ان کی غزلوں میں غالبؔ کا رنگ پیدا ہوتا گیا ہم اس بات کو مثالوں سے واضح کر سکتے ہیں۔

تامل تو تھا ان کو آنے میں قاصد ۔۔۔ مگر یہ بتا طرزِ انکار کیا تھی

اس شعر میں داغؔ کا رنگ جھلکتا ہے۔

سکون دل سے سامانِ کشود کار پیدا کر ۔۔۔ کہ عقدہ خاطرِ گرداب کا آبِ رواں تک ہے

اس شعر میں غالبؔ کا انداز بیان پایا جاتا ہے۔

داغؔ اور غالبؔ کے علاوہ اقبالؔ کی بعض غزلوں میں میرؔ کا رنگ بھی پایا جاتا ہے مثلاً

زمانہ بھر میں رسوا ہوں مگر اے وائے ناکامی ۔۔۔ سمجھتا ہوں کہ میرا عشق میرے رازداں تک ہے

محبت کے لیے دل ڈھونڈ کوئی ٹوٹنے والا ۔۔۔ یہ وہ مے ہے جسے رکھتے ہیں نازک آبگینوں میں

کوئی دم کا مہماں ہوں اے اہلِ محفل چراغِ سحر ہوں بجھا چاہتا ہوں!

بانگِ درا میں اقبال نے مختلف النوع نظموں پر طبع آزمائی کی ہے۔ مثلاً:

(۱) فطری یا نیچرل نظمیں جن میں اقبال نے مناظرِ فطرت کی تصویر کھینچی ہے مثلاً ہمالہ، گلِ رنگیں، ابرِ کوہسار، آفتابِ صبح، چاند، جگنو، شمع، اور بزمِ انجم، وغیرہ۔

(۲) وطنی اور قومی نظمیں، جن میں انھوں نے وطن دوستی کے جذبات کو ابھارا ہے یا قوم کو عمل کی دعوت دی ہے مثلاً ہندوستانی بچوں کا قومی گیت، ترانۂ ملی نیا شوالہ، وطنیت، خطاب بہ جوانانِ اسلام، اور ہلالِ عید وغیرہ۔

(۳) اخلاقی نظمیں، جن میں انھوں نے قوم کو اپنے اندر اخلاقِ حسنہ پیدا کرنے کی تلقین کی ہے یا کسی واقعہ سے کوئی سبق اخذ کیا ہے۔ مثلاً گلِ پژمردہ، زہد اور رندی، طفلِ شیرخوار، گورستانِ شاہی، شبنم اور ستارے وغیرہ۔

(۴) تاریخی نظمیں، جنمیں تاریخی واقعات نظم کیے ہیں، یا بعض مشاہیر کا تذکرہ کیا ہے، مثلاً بلالؓ، صقلیہ، غلام قادر رہیلہ، حضور رسالت مآبؐ میں، فاطمہ بنت عبداللہ، محاصرۂ ادرنہ، صدیق اکبرؓ، بلادِ اسلامیہ وغیرہ۔

(۵) فلسفیانہ نظمیں، جن میں فلسفہ، اور حکمت کے نکتے بیان کیے گئے ہیں مثلاً شمع، موجِ دریا، سرگزشتِ آدم، جگنو، بچہ اور شمع، محبت نوائے غم، فلسفۂ غم، بزمِ انجم، انسان، مکالمہ، ارتقاء وغیرہ۔

(۶) دعائیہ نظمیں، جن میں انھوں نے دعائیں کی ہیں، مثلاً التجائے مسافر ایک آرزو۔ دعا۔

(۷) بعض نظموں میں انھوں نے فارسی شعراء کے اشعار پر تضمین کی ہے مثلاً تضمین بر شعر انیسی شاملو، ملا عرشی، ابو طالب کلیم، فیضی، رضی، دانش، ملک قمی

مرزا صائب، اور مرزا بیدل وغیرہ۔

(۸) بعض نظموں میں انھوں نے مشہور شعرا، کی خدمت میں خراج تحسین پیش کیا ہے مثلاً داغ، حالی، شبلی، غالب، عرفی اور شیکسپیئر۔

(۹) بعض نظموں میں انھوں نے ہندوستان کے مشہور مذہبی رہنماؤں کی عظمت کا اعتراف کیا ہے، مثلاً گوتم، رامچندر، نانک، اور رام تیرتھ۔

(۱۰) ظریفانہ نظمیں، جن میں انھوں نے بعض اہم معاشرتی اور سیاسی مسائل پر ظرافت اور طنز کے پیرایہ میں اپنے خیالات کا اظہار کیا ہے۔

دوسری خصوصیت یہ ہے کہ اقبال نے اپنی نظموں میں فارسی تراکیب بکثرت استعمال کی ہیں، بعض شعر ایسے ہیں کہ اگر اردو کے بجائے فارسی کا ایک لفظ رکھ دیا جائے تو پورا شعر فارسی زبان کا ہو جائے گا۔ مثلاً

غمزدائے دل افسردۂ دہقاں ہونا
رونقِ بزمِ جوانانِ گلستاں ہونا

اس شعر میں ہونا کے بجائے بودن رکھ دیجئے تو یہ شعر فارسی کا ہو جائے گا اسی خصوصیت کو دیکھ کر ناقدین نے یہ رائے قائم کی ہے کہ اقبال نے غالب کے انداز بیان کا تتبع کیا ہے۔ مثال کے طور پر غالب کے اس شعر میں۔

شمار سبحہ مرغوب بتِ مشکل پسند آیا
تماشائے بیک کف بردنِ صد دل پسند آیا

اگر آیا کی جگہ آمد رکھ دیا جائے تو یہ شعر فارسی کا ہو جائے گا۔

ذیل میں چند اشعار یا مصرعے درج کرتا ہوں۔

ع تو شناسائے خراشِ عقدۂ مشکل نہیں

ع یہ نظر غیر از نگاہِ چشمِ صورت بیں نہیں

یہ تلاش متصل شمع جہاں افروز ہے   توسنِ ادراکِ انسان کو خرام آموز ہے

ع، آہنگِ طبعِ ناظمِ کون و مکاں ہوں میں

ع، عالم ظہورِ جلوۂ ذوقِ شعور ہے!

تیسری خصوصیت یہ ہے کہ اقبال نے اپنے مفہوم کو واضح کرنے کے لیے بہت سی جدید تراکیب وضع کی ہیں جن کی بدولت اُردو زبان میں وسعت پیدا ہو گئی ہے۔ اور یہ بات عرفی کی طرح ان کے قادر الکلام اور طباع ہونے کی دلیل ہے۔ چونکہ اختصار مدنظر ہے اس لئے چند مثالوں پر اکتفا کرتا ہوں۔

توسنِ ادراک انسان، ناقۂ شاہد رحمت، قتیل ذوق استفہام، قرب فراق آمیز، یزدانِ ساکنانِ نشیب و فراز، تپش آموز جانِ عشق۔ طوق گلوئے حسن تماشا پسند۔ شورش میخانۂ انساں۔ دختر خوش خرام ابر۔ جوئے سرود آفریں۔ شانۂ موج صرصر۔ داغِ مداد شب۔ سیارۂ ثابت نما، کلیم ذروۂ سینائے علم، مایۂ دارا شکیبِ عنابی، شکست رشتۂ تسبیح شیخ۔

چوتھی خصوصیت یہ ہے کہ بانگِ درا کے بہت سے اشعار اپنی برجستگی دل کشی، معنویت، اور موزونیت کی وجہ سے زبان زد خلائق ہو گئے ہیں۔

چند مثالیں لکھتا ہوں:

گیسوئے اُردو ابھی منت پذیر شانہ ہے   شمع یہ سودائی سوزِ دلِ پروانہ ہے

جو میں سر بسجدہ ہوا کبھی تو زمیں سے آنے لگی صدا

ترا دل تو ہے صنم آشنا تجھے کیا ملے گا نماز میں

کوئی اندازہ کر سکتا ہے اس کے زورِ بازو کا

نگاہِ مرد مومن سے بدل جاتی ہیں تقدیریں

خریدیں نہ ہم جس کو اپنے لہو سے   مسلماں کو ہے ننگ وہ بادشاہی

پروانہ کو چراغ ہے بلبل کو پھول بس　　صدیقؓ کیلئے ہے خدا کا رسولؐ بس

فرد قائم ربطِ ملت سے ہے تنہا کچھ نہیں
موج ہے دریا میں اور بیرونِ دریا کچھ نہیں

اچھا ہے دل کے پاس رہے پاسبانِ عقل　　لیکن کبھی کبھی اسے تنہا بھی چھوڑ دے

عمل سے زندگی بنتی ہے جنّت بھی جہنم بھی!
یہ خاکی اپنی فطرت میں نہ نوری ہے نہ ناری ہے

تری خاک میں ہے اگر شرر تو خیالِ فقر و غنا نہ کر
کہ جہاں میں نانِ شعیر پر ہے مدار قوتِ حیدری

غلامی میں نہ کام آتی ہیں شمشیریں نہ تدبیریں
جو ہو ذوقِ یقیں پیدا تو کٹ جاتی ہیں زنجیریں

ان اشعار کے علاوہ شکوہ، جواب شکوہ، شمع اور شاعر، خضر راہ اور طلوع اسلام کے اکثر اور بیشتر بند لوگوں کو حفظ یاد ہیں جن کو قومی جلسوں اور مذہبی تقریروں میں بڑے ذوق شوق کے ساتھ پڑھا جاتا ہے۔

پانچویں خصوصیت یہ ہے کہ ان کی اکثر نظموں میں سوز و گداز کی وہ کیفیت پائی جاتی ہے جسے مبصرین کلام اقبالؔ نے "کیفِ غم" سے تعبیر کیا ہے چونکہ یہ کیفیت سراسر ذوقی چیز ہے اس لئے میں نہ اس کی منطقی تعریف کرسکتا ہوں اور نہ چند سطروں میں وضاحت کرسکتا ہوں، ہاں اتنا کہہ سکتا ہوں کہ اقبالؔ کا دل چونکہ سوز و گداز سے لبریز تھا اس لئے یہ رنگ ہر جگہ نمایاں ہے بلکہ ان کی طبیعت ثانیہ بن گیا ہے اور یہی وجہ ہے کہ وہ پیر مغاں سے خانہ ساز کی فرمائش کرتے ہیں ؎

پیر مغاں! فرنگ کی مے کا نشاط ہے اثر
اس میں وہ کیفِ غم نہیں مجھکو تو خانہ ساز دے

اگر ناظرین اس کیفیت سے آگاہ ہونا چاہتے ہیں تو بانگ درا کا اوّل سے آخر تک بڑے غور کے ساتھ مطالعہ کریں۔ اقبال کی مشہور نظم "ایک آرزو" اسی جذبہ کی شدت کا نتیجہ ہے۔

چھٹی خصوصیت یہ ہے کہ اس کی بعض نظموں سے "وحدۃ الوجود" کا رنگ ٹپکتا ہے۔ مثلاً شمع، اس نظم کو پڑھ کر ہر شخص اس نتیجہ پر پہنچے گا کہ تصوف کا مذاق ابتدا ہی سے اقبال کے دل میں جاگزیں تھا۔ اور بال جبریل میں یہی شراب عالم بے خودی میں ان کے پیمانۂ دل سے چھلک پڑی ہے۔ اگر انھوں نے ۱۹۳۴ء میں یہ شعر کہا ہے ؎

یہ ہے خلاصۂ علمِ قلندری کہ حیات
خدنگ جستہ ہے لیکن کماں سے دور نہیں

تو کوئی نئی بات نہیں کہی۔ وہ اسی بات کو ۱۹۰۴ء میں یعنی تیس سال پہلے کہہ چکے تھے۔

صیاد آپ حلقۂ دامِ ستم بھی آپ — بام حرم بھی، طائر بام حرم بھی آپ
ہاں آشنائے لب ہو نہ رازِ کہن کہیں — پھر چھڑ نہ جائے قصۂ دار و رسن کہیں
عقدۂ اضداد کی کاوش نہ تڑپائے مجھے — حسن عشق انگیز ہر شے میں نظر آئے مجھے
کچھ دکھانے دیکھنے کا تھا تقاضا طور پر — کیا خبر ہے تجھ کو اے دل فیصلہ کیونکر ہوا
کھولی ہیں ذوق دید نے آنکھیں تری اگر — ہر رہ گزر میں نقش کف پائے یار دیکھ

ساتویں خصوصیت یہ ہے کہ بانگِ درا کی اکثر نظموں سے اقبال کی شخصیت اور سیرت کے پہلو نمایاں ہوتے ہیں اور اگر کوئی شخص چاہے تو اس کتاب کے مختلف اشعار سے ان کی سیرت کا مرقع تیار ہو سکتا ہے۔

(ا) نوجوانی میں اقبال ایک غزل گو شاعر کی حیثیت سے نمودار ہوتے ہیں۔

(ب) اُس زمانہ کے نامور محبانِ وطن کی تحریروں اور تقریروں سے متاثر ہو

ہو کر وطن کی عظمت کا راگ الاپنے لگتے ہیں۔

(ج) لیکن اہلِ ملک کی تنگ نظری، مسلم آزاری اور افتراق انگیزی کو دیکھ دیکھ کر ان کے دل کو سخت ایذا پہنچتی ہے اور وہ بیتاب ہو کر "مادر وطن" سے یہ کہتے ہیں کہ:

جل رہا ہوں کل نہیں پڑتی کسی پہلو مجھے
ہاں ڈبو دے اے محیطِ آبِ گنگا تو مجھے

(د) یورپ جا کر ان کے اندر انقلاب عظیم پیدا ہو جاتا ہے۔ وہ وطنیت کے ملت کش نظریہ سے ہمیشہ کے لئے متنفر ہو کر اسلامی اخوت اور مساوات کے علمبردار بن جاتے ہیں۔

(ہ) انگریزوں کی اسلام دشمنی کا مطالعہ کرنے کے بعد وہ اپنی شاعری (دل و دماغ کی بہترین قوتوں) کو اس قوم کی عیاریوں کا پردہ چاک کرنے کے لئے وقف کر دیتے ہیں چنانچہ اگر وہ ۱۹۲۲ء میں یہ کہتے ہیں۔

لے گئے تثلیث کے فرزند میراثِ خلیل
خشتِ بنیادِ کلیسا بن گئی خاکِ حجاز

تو وفات سے صرف تین ماہ پہلے اپنی قوم کو یوں متنبہ کرتے ہیں۔

مبر بیش فرنگی حاجتِ خویش ز طاقِ دل فرو ریز این صنم را

میرا خیال ہے کہ جو شخص بانگِ درا کا غور سے مطالعہ کرلے گا وہ اہل مغرب خصوصاً انگریزوں کی اسلام دشمنی سے بخوبی آگاہ ہو جائے گا۔

آٹھویں خصوصیت یہ ہے کہ بانگِ درا کی نظموں میں اقبال نے تہذیب مغرب کے زہر کا تریاق مہیا کیا ہے اور مسلمانوں کو صاف لفظوں میں آگاہ کر دیا ہے کہ تہذیب مغرب کی ظاہری ٹیپ ٹاپ پر فریفتہ مت ہو جانا، چنانچہ کہتے ہیں ؎

نظر کو خیرہ کرتی ہے چمک تہذیبِ حاضر کی
یہ صنّاعی مگر جھوٹے نگوں کی ریزہ کاری ہے

نویں خصوصیت یہ ہے کہ بانگِ درا سے محبت نوعِ انسانی کا سبق حاصل ہو سکتا ہے اور میری رائے میں اسی چیز نے اقبالؔ کی شاعری کو غیر فانی بنا دیا ہے

خدا کے بندے تو ہیں ہزاروں بنوں میں پھرتے ہیں مارے مارے
میں اُس کا بندہ بنوں گا جس کو خدا کے بندوں سے پیار ہوگا

دسویں خصوصیت یہ ہے کہ جس طرح حالیؔ نے ۱۸۷۹ء میں مسدس لکھ کر اُردو زبان میں اصلاحی شاعری کا دور شروع کیا تھا، اسی طرح اقبالؔ نے ۱۹۲۲ء میں خضرِ راہ لکھ کر اُردو زبان کو انقلابی شاعری سے روشناس کر دیا۔ آج جس قدر شعرا مظلوموں اور مزدوروں کی حمایت میں آواز بلند کر رہے ہیں۔ ان سبھوں کی رہنمائی خضرِ راہ ہی کے ان اشعار نے کی ہے ؎

اے کہ تجھ کو کھا گیا سرمایہ دارِ حیلہ گر
شاخِ آہو پر رہی صدیوں تلک تیری برات
ساحرِ الموط نے تجھ کو دیا برگِ حشیش
اور تو اے بے خبر سمجھا اسے شاخِ نبات

اُٹھ کہ اب بزمِ جہاں کا اور ہی انداز ہے
مشرق و مغرب میں تیرے دور کا آغاز ہے

بانگِ درا کی شاعرانہ خوبیاں

گذشتہ اوراق میں جو خصوصیات سپردِ قلم کی گئی ہیں ان کے مطالعہ سے یہ حقیقت بآسانی واضح ہو سکتی ہے کہ بانگِ درا تمام نقادانِ فن کی نظر میں اُردو ادب میں ایک بیش بہا اضافہ مثلاً ہندوستان کے نامور ادیب اور نقاد اور پروفیسر عبدالقادر سروری لکھتے ہیں کہ "اُردو زبان کی جو خدمت اقبالؔ کی شاعری انجام

دیتی ہے وہ نہایت مہتم بالشان ہے، میر اور غالب کو چھوڑ کر اُردو میں سوائے اقبال کے کوئی ایسا شاعر نہیں ملے گا جس نے زبان پر اتنا گہرا اثر ڈالا ہو، انھوں نے اُردو میں جتنے نئے اور خوبصورت الفاظ داخل کیے، جتنی ادبی ترکیبیں وضع کیں اور نفیس تشبیہوں اور استعاروں کا جس قدر وافر ذخیرہ فراہم کر دیا اس کی تفصیل کی اس اجمال میں گنجایش نہیں ہے۔" (جدید اردو شاعری ص ۱۸۹)

افسوس کہ میں بھی اس مختصر مقدمہ میں بانگ درا کے محاسن شعری بالوضاحت درج نہیں کر سکتا صرف چند نمایاں خوبیوں کے بیان پر اکتفا کروں گا۔

(۱) تشبیہ و استعارہ یہ کلام اقبال کی سب سے نمایاں خصوصیت ہے۔ اور بانگ درا ہی پر منحصر نہیں ہے یہ حسن ان کی ہر تصنیف میں پایا جاتا ہے لیکن بانگ درا میں انھوں نے اس کو اس فراوانی کے ساتھ استعمال کیا ہے کہ اگر کوئی شخص اس زاویۂ نگاہ سے اس کتاب کا مطالعہ کرے گا تو بے اختیار پکار اُٹھے گا کہ اقبال تشبیہ و استعارہ کا بادشاہ ہے۔ طلبہ اور عام شائقین کی سہولت کے لیے میں ان کی تعریف ذیل میں درج کرتا ہوں۔

(۱) تشبیہ: شبہ سے ماخوذ ہے۔ لغوی معنی مشابہت دینا۔

علم بیان کی اصطلاح میں تشبیہ کہتے ہیں ان دو چیزوں کو جو مختلف بالذات ہوں، کسی ایک معنی میں شریک کرنا۔ لیکن یہ اشتراک دونوں میں برابر نہ ہو، مثلاً:

چہرۂ انور سے تیرے ماہِ کامل آشکار
اور گیسوئے معنبر سے شب یلدا عیاں

یہاں معشوق کے چہرے کو ماہِ کامل سے اور اس کی زلفوں کو شب تاریک سے تشبیہ دی ہے۔

(ب) استعارہ:- عاریہ سے ماخوذ ہے۔ لغوی معنی مانگنا، طلب کرنا۔

علم بیان کی اصطلاح میں استعارہ کہتے ہیں، تشبیہہ کے مختصر کرنے اور اس میں مبالغہ پیدا کرنے کو، بالفاظ دیگر، جب ہم کسی لفظ کو مجازی معنی میں استعمال کریں تو حقیقی اور مجازی معنی میں مشابہت کا علاقہ پایا جائے، مثلاً بادام یا نرگس کہیں اور آنکھ مراد لیں، یا صنم کہیں اور معشوق مراد لیں، یا شیر کہیں اور مرد شجاع مراد لیں۔

(ج) اگر مُشبہ کو حذف کردیں اور مُشبہ بہ کو بیان کردیں تو یہ استعارہ تصریحیہ ہے اور اگر اس کے برعکس مشبہ بہ کو حذف کردیں اور مشبہ کو بیان کردیں تو یہ استعارہ بالکنایہ ہے۔ جیسے۔

خامہ انگشتِ بدنداں کہ اسے کیا لکھیے

ناطقہ سر بگریباں کہ اسے کیا کہیے!

واضح ہو کہ خامہ کوئی انسان نہیں ہے کہ انگشت بدنداں ہو سکے۔ دراصل شاعر نے خامہ کو انسان متحیّر کے ساتھ تشبیہہ دی ہے جو محذوف ہے واضح ہو کہ یہ وہ استعارہ ہے جس میں کنایہ کا رنگ پایا جاتا ہے۔

(د) مجاز مرسل:- ہم پہلے واضح کر چکے ہیں کہ کسی لفظ کو مجازی معنی میں استعمال کرنے کے لئے حقیقی اور مجازی معنی میں کوئی علاقہ ہونا ضروری ہے، اگر وہ علاقہ تشبیہہ کا ہے تو استعارہ ہے اور اگر غیر تشبیہی ہے تو اسے مجاز مرسل کہتے ہیں۔ مثلاً

(۱) ظرف بول کر مظروف مراد لینا، جیسے۔

ع سارے گھر کو ترے بیمار نے سونے نہ دیا

یہاں گھر سے گھر والے مراد ہیں۔

(۲) کُل بول کر جزو مراد لینا، جیسے گناہ ہاروت نے کی دیدۂ ماروت میں انگلی یہاں

انگلی سے انگلی کی پور مراد ہے۔

(۵) کنایہ: کنایہ کے لغوی معنی ہیں، مبہم بات یا مخفی اشارہ، اصطلاح میں کنایہ عبارت ہے، اس لفظ سے کہ اس کے معنی کا لازم مراد ہو، اگرچہ معنی مذکور کا لینا بھی جائز ہو۔ مثلاً:

آئینہ کو دیکھ جب وہ زلف سلجھانے لگے
ہند کے کالے حلب میں جا کے لہرانے لگے

یہاں کالے کو سانپ کے بجائے زلفوں کے معنوں میں استعمال کیا ہے۔

ساقی وہ دے ہمیں کہ ہوں جس کے سبب بہم
محفل میں آب و آتش و خورشید ایک جا

ظاہر ہے کہ یہ تینوں اوصاف شراب ہی میں پائے جاتے ہیں۔

(نوٹ، بانگ درا میں چونکہ یہ پانچ صنائع معنوی بکثرت پائی جاتی ہیں اس لیے میں نے ان پانچوں کی مختصر تعریف قلمبند کر دی تاکہ شائقین ان کو مدنظر رکھ کر خود کلام اقبال کی ان خوبیوں سے لطف اندوز ہو سکیں۔

تشبیہ کی مثالیں:۔

فیل بے زنجیر کی صورت اُڑا جاتا ہے ابر — ہائے کیا فرطِ طرب میں جھومتا جاتا ہے ابر

سر آپ کا اللہ نے کلغی سے سجایا — آنکھیں ہیں کہ ہیرے کی چمکتی ہوئی کنیاں

باغ تیرے دم سے گویا طبلۂ عطار تھا — تیرے احسان کا نسیم صبح کو اقرار تھا

نیل کے پانی میں یا مچھلی ہے سیم خام کی؟ — چرخ سے بالی گری ہے عروس شام کی؟

یا شمع جل رہی ہے پھولوں کی انجمن میں — جگنو کی روشنی ہے کاشانۂ چمن میں

یا جان پڑ گئی ہے مہتاب کی کرن میں — آیا ہے آسمان سے اڑ کر کوئی ستارہ

استعارہ کی مثالیں :۔

تو اگر کوئی مدبّر ہے تو سن میری صدا | ہے دلیری دستِ اربابِ سیاست کا عصا
سونے والوں کو جگا دے شعر کے اعجاز سے | خرمنِ باطل جلا دے شعلۂ آواز سے
بستۂ رنگِ خصوصیت نہ ہو میری زباں | نوعِ انساں قوم ہو میری، وطن میرا جہاں
شوق آزادی کے دنیا میں نہ نکلے حوصلے | زندگی بھر قیدِ زنجیرِ تعلق میں رہے

استعارہ بالکنایہ کی مثالیں :

ٹوٹ کر خورشید کی کشتی ہوئی غرقابِ نیل | ایک ٹکڑا تیرتا پھرتا ہے روئے آبِ نیل
ساتھ اے سیارۂ ثابت نما لے چل مجھے | خارِ حسرت کی خلش رکھتی ہے اب بیکل مجھے
اے کہ تیرا مرغِ جاں تارِ نفس میں ہے اسیر | اے کہ تیری روح کا طائر قفس میں ہے اسیر
خالی شرابِ عشق سے لالہ کا جام ہو | پانی کی بوند گریۂ شبنم کا نام ہو
صبحِ ازل جو حسن ہوا دلستانِ عشق | آوازِ "کُن" ہوئی تپش آموزِ جانِ عشق
دی عشق نے حرارتِ سوزِ دروں تجھے | اور گل فروشِ اشکِ شفق گوں کیا مجھے
غم خانۂ جہاں میں جو تیری ضیا نہ ہو | اس تفتہ دل کا نخلِ تمنّا ہرا نہ ہو

کنایہ کی مثالیں :۔

شاہدِ مضموں تصدّق ہے ترے انداز پر | خندہ زن ہے غنچۂ دلّی گلِ شیراز پر
بدلے یک رنگی کے یہ نا آشنائی ہے غضب | ایک ہی خرمن کے دانوں میں جدائی ہے غضب
اے شمع انتہائے فریبِ خیال دیکھ | مسجودِ ساکنانِ فلک کا مآل دیکھ
گوہر کو مشتِ خاک میں رہنا پسند ہے | بندش اگرچہ سست ہے مضموں بلند ہے
اس چمن کے نغمہ پیراؤں کی آزادی تو دیکھ | شہر جو اجڑا ہوا تھا اس کی آبادی تو دیکھ

مجازِ مرسل کی مثالیں :۔

پاک رکھ اپنی زباں تلمیذِ رحمانی ہے تو | ہو نہ جائے دیکھنا تیری صدا بے آبرو

وصل کے اسباب پیدا ہوں تری تحریر سے — دیکھ کوئی دل نہ دکھ جائے تیری تقریر سے

غافل ہے تجھ سے حیرتِ علم آفریدہ دیکھ — جویا نہیں تری نگہِ نارسیدہ دیکھ

پنہاں درونِ سینہ کہیں راز ہو ترا — اشکِ جگر گداز نہ غماز ہو ترا!

(۲) سلاست اور روانی: بانگِ درا کی اکثر غزلوں اور نظموں میں غضب کی روانی پائی جاتی ہے۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ اقبال شعر کہتے ہی اس وقت تھے جب ان کی طبیعت شعر گوئی پر مائل ہوتی تھی۔ چند مثالیں لکھتا ہوں، تصویر درد، ترانۂ ملی، شکوہ، جواب شکوہ، شمع اور شاعر، حضور رسالتمآب میں، طلوع اسلام اور خضرِ راہ، ان نظموں میں سلاست اور روانی کے بہترین نمونے مل سکتے ہیں بخوفِ طوالت اشعار نقل کرنے سے اجتناب کرتا ہوں۔

(۳) مصوری: بانگِ درا میں بہت سی نظمیں ایسی ہیں کہ جن میں اقبال نے مناظرِ قدرت کی تصویر کھینچی ہے چونکہ ان کی قوتِ متخیلہ بہت بڑھی ہوئی تھی اس لئے انھوں نے اس فن کے بہترین نمونے اپنی شاعری میں پیش کر دیئے ہیں۔

ہمالہ، ابرِ کوہسار، انسان اور بزمِ قدرت، ابر اور ایک شام، ان نظموں میں اقبال نے مصوری اور منظر کشی کا کمال دکھایا ہے۔ مشہور نظم ایک آرزو سے چند شعر نقل کرتا ہوں۔

صف باندھے دونوں جانب بوٹے ہرے ہرے ہوں — ندی کا صاف پانی تصویر لے رہا ہو

ہو دل فریب ایسا کہسار کا نظارہ — پانی بھی موج بن کر اُٹھ اُٹھ کے دیکھتا ہو

آغوش میں زمیں کی سویا ہوا ہو سبزہ — پھر پھر کے جھاڑیوں میں پانی چمک رہا ہو

پانی کو چھو رہی ہو جھک جھک کے گل کی ٹہنی — جیسے حسین کوئی آئینہ دیکھتا ہو

مہندی لگائے سورج جب شام کی دلہن کو

سُرخی لئے سنہری ہر پھول کی قبا ہو

(۴) رفعتِ تخیل اور بلندیٔ فکر: کلام اقبال کی یہ وہ خصوصیت ہے جس کی بنا پر ان کا شمار دنیا کے بہترین شعراء میں کیا جا سکتا ہے۔ ہندوستان میں عرفی، بیدل اور غالب کے علاوہ اور کوئی شاعر اس صنف میں ان کا ہمسر نہیں ہے۔

چند مثالیں ذیل میں درج کرتا ہوں :-

عشق کچھ محبوب کے مرنے سے مر جاتا نہیں　　روح میں غم بن کے رہتا ہے مگر جاتا نہیں

مرنے والے مرتے ہیں لیکن فنا ہوتے نہیں　　یہ حقیقت میں کبھی ہم سے جدا ہوتے نہیں

ستیزہ کار رہا ہے ازل سے تا امروز　　چراغِ مصطفویؐ سے شرارِ بولہبی

دفترِ ہستی میں تھی زریں ورق تیری حیات　　تھی سراپا دین و دنیا کا سبق تیری حیات

موت تجدیدِ مذاقِ زندگی کا نام ہے　　خواب کے پردے میں بیداری کا اک پیغام ہے

جھلکتی ہے تری امت کی آبرو اس میں　　طرابلس کے شہیدوں کا ہے لہو اس میں

برتر از اندیشۂ سود و زیاں ہے زندگی　　ہے کبھی جاں اور کبھی تسلیمِ جاں ہے زندگی

وہ یک گام ہے ہمت کے لئے عرشِ بریں　　کہہ رہی ہے یہ مسلمان سے معراج کی رات

بیجز تو جو ہرِ آئینۂ ایام ہے　　تو زمانے میں خدا کا آخری پیغام ہے

(۵) حسنِ ادا :- یہ کلامِ اقبال کی پانچویں خصوصیت ہے جو بانگِ درا کی غزلوں اور نظموں میں جا بجا نظر آتی ہے۔ اقبال کو خدا نے بات کہنے کا ایسا دلپذیر انداز عطا کیا ہے کہ ذوقِ سلیم وجد کرنے لگتا ہے۔ چند شعر ملاحظہ ہوں۔

حسن آئینۂ حق، اور دل آئینۂ حسن　　دل انسان کو ترا حسن کلام آئینہ

پہنچ سکتی ہے تو لیکن ہماری شاہزادی تک　　کسی دکھ درد کے مارے کا اشکِ آتشیں بنکر

تارے شررِ آہ ہیں انسان کی زباں میں　　میں گریۂ گردوں ہوں گلستاں کی زباں میں

نشہ پلا کے گرانا تو سب کو آتا ہے　　مزہ تو جب ہے کہ گرتوں کو تھام لے ساقی

اس ذرہ کو رہتی ہے وسعت کی ہوس ہر دم　　یہ ذرہ نہیں شاید سمٹا ہوا صحرا ہے

سورج نے جاتے جاتے شام سیہ قبا کو — طشتِ افق سے لیکر لالے کے پھول مارے

(۶) فلسفہ طرازی: یہ اقبال کا خاص رنگ ہے جو ہمالہ (۱۹۰۱ء) سے لے کر حضرتِ انسان (۱۹۳۸ء) تک کم و بیش ہر نظم میں موجود ہے۔ کہیں نمایاں کہیں پنہاں، اس کی وجہ یہ ہے کہ اقبال فلسفیانہ طبیعت لے کر دنیا میں آئے تھے۔ انھوں نے بانگ درا کی نظموں میں پیش پا افتادہ امور سے عمیق فلسفیانہ نکتے پیدا کیے ہیں، چند شعر ذیل میں درج کرتا ہوں:-

ہیں جذب باہمی سے قائم نظام سارے — پوشیدہ ہے یہ نکتہ تاروں کی زندگی میں

چاہے تو بدل ڈالے ہیئت چمنستاں کی — یہ ہستی دانا ہے، بینا ہے، توانا ہے

کمال وحدت عیاں ہے ایسا کہ نوکِ نشتر سے تو جو چھیڑ دے
یقیں ہے مجھ کو گرے رگِ گل سے قطرہ انسان کے لہو کا

قوم مذہب سے ہے، مذہب جو نہیں تم بھی نہیں
جذب باہم جو نہیں، محفلِ انجم بھی نہیں

ذرہ ذرہ دہر کا زندانیٔ تقدیر ہے — پردۂ مجبوری و بیچارگی، تدبیر ہے

جو ہے بیدار، انساں میں وہ گہری نیند سوتا ہے — شجر میں پھول میں حیوان میں پتھر میں ستارے میں

آشکارا ہے یہ اپنی قوتِ تسخیر سے — گرچہ اک مٹی کے پیکر میں نہاں ہے زندگی

خودی میں ڈوب جا غافل یہ سرِّ زندگانی ہے — نکل کر حلقۂ شام و سحر سے جاوداں ہو جا

(۷) سوز و گداز: یہی وہ وصف ہے جس کی بنا پر انجمن حمایت اسلام کے جلسوں میں ہزاروں آدمی (عالم کم جاہل زیادہ) کیف کی حالت میں مرحوم کی نظموں کو سنتے رہتے تھے اور جب ان کی زبان سے کوئی شعر سوز و گداز میں ڈوبا ہوا نکلتا تھا تو بے اختیار گریہ طاری ہو جاتا تھا۔ مثلاً جب ۱۹۲۲ء میں مرحوم نے خضرِ راہ کے یہ دو شعر پڑھے:-

بیچتا ہے ہاشمی ناموسِ دینِ مصطفےٰ ؐ خاک و خوں میں مل رہا ہے ترکمانِ سخت کوش
آگ ہے، اولادِ ابراہیم ہے، نمرود ہے کیا کسی کو پھر کسی کا امتحاں مقصود ہے

تو دیکھنے والوں کا بیان ہے کہ سارے مجمع میں کوئی شخص ایسا نہ تھا جس کی آنکھیں آنسوؤں سے لبریز نہ ہو گئی ہوں، خود اقبالؔ زار و قطار رو رہے تھے۔

چند شعر اور ملاحظہ ہوں:

الٰہی پھر مزہ کیا ہے یہاں دُنیا میں رہنے کا حیاتِ جاوداں میری نہ مرگِ ناگہاں میری
مِرا رونا نہیں رونا ہے یہ سارے گلستاں کا وہ گل ہوں میں خزاں ہر گل کی ہے گویا خزاں میری

دیکھ مسجد میں شکستِ رشتۂ تسبیحِ شیخ بتکدہ میں برہمن کی پختہ زناری بھی دیکھ
بارشِ سنگِ حوادث کا تماشائی بھی ہو امتِ مرحوم کی آئینہ دیواری بھی دیکھ
سازِ عشرت کی صدا مغرب کے ایوانوں میں سُن اور ایراں میں ذرا ماتم کی تیاری بھی دیکھ

تھا جنہیں ذوقِ تماشا وہ تو رخصت ہو گئے لے کے اب تو وعدۂ دیدارِ عام آیا تو کیا!
آہ جب گلشن کی جمعیت پریشاں ہو چکی پھول کو بادِ بہاری کا پیام آیا تو کیا!
آخرِ شب دید کے قابل تھی بسمل کی تڑپ صبح دم کوئی اگر بالائے بام آیا تو کیا!

نصوصیہ دردِ، صقلیہ، شمع و شاعر، فاطمہ بنت عبداللہ، والدہ کی یاد میں یہ نظمیں سراپا سوز و گداز میں ڈوبی ہوئی ہیں۔ میری رائے میں سوز و گداز، شاعری کی جان ہے چنانچہ اقبال خود کہتے ہیں:۔

سخن میں سوز الٰہی کہاں سے آتا ہے
یہ چیز وہ ہے کہ پتھر کو بھی گداز کرے

(۸) جوشِ بیان:۔ چونکہ اقبالؔ فطری شاعر ہیں اور ان کے دل میں جذبات کا سمندر موجزن ہے اس لئے ان کے کلام میں قدرتی طور پر جوشِ بیان کی صفت پیدا ہو گئی ہے جو ہر جگہ نظر آتی ہے۔ چند مثالیں لکھتا ہوں:۔

ہویدا آج اپنے زخم پنہاں کر کے چھوڑوں گا
لہو رو رو کے محفل کو گلستاں کر کے چھوڑوں گا

تصویرِ درد کا یہ پورا بند جوشِ بیان کی عمدہ مثال ہے :

وہ زمیں ہے تو مگر اے خواب گاہِ مصطفےٰ[۱] دید ہے کعبہ کو تیری حجِ اکبر سے سوا

یہ پورا بند بھی جوشِ بیان کی عمدہ مثال ہے، نیز شکوہ اور جوابِ شکوہ کے اکثر بند جوشِ بیان کی بہترین مثالیں ہیں۔

تجھے آبا سے اپنے کوئی نسبت ہو نہیں سکتی کہ تو گفتار وہ کردار، تو ثابت وہ سیّارا

اور اس کے بعد جو اشعار ہیں ان میں بھی یہی جوش و خروش پایا جاتا ہے۔

آشنا اپنی حقیقت سے ہو اے دہقاں ذرا دانہ تو کھیتی بھی تو باراں بھی تو حاصل بھی تو
وائے نادانی کہ تو محتاجِ ساقی ہو گیا مے بھی تو مینا بھی تو ساقی بھی تو محفل بھی تو
شعلہ بن کر پھونک دے خاشاکِ غیر اللہ کو خوفِ باطل کیا کہ ہے غارت گرِ باطل بھی تو

یہ ساری نظمیں جوشِ بیان سے لبریز ہیں۔ میں نے مثالاً تین شعر نقل کر دیئے۔

(۹) طنز اور شوخی: فلسفیانہ سنجیدگی کے ساتھ ساتھ اقبالؔ کی طبیعت میں ظرافت اور شوخی کا مادہ بھی کوٹ کوٹ کر بھرا ہوا تھا یہی وجہ ہے کہ ان کی شاعری بھی اس دولت سے مالا مال ہے، نظموں سے بڑھ کر غزلوں میں یہ رنگ نمایاں ہے۔

حصہ سوم میں نصیحت کے عنوان سے جو نظم انھوں نے لکھی ہے اس میں شوخی، طنز اور ظرافت تینوں خصائص کا خوشگوار امتزاج نظر آتا ہے۔ اس کے عنوان ہی میں طنز کا نشتر پوشیدہ ہے۔ چند متفرق شعر ذیل میں درج کرتا ہوں۔

غضب ہے یہ مرشدانِ خود بیں، خدا تری قوم کو بچائے
بگاڑ کر تیرے مسلموں کو، یہ اپنی عزت بنا رہے ہیں

نہ پوچھ اقبالؔ کا ٹھکانہ ابھی وہی کیفیت ہے اس کی کہیں سرِ رہگزار بیٹھا ستم کشِ انتظار ہوگا

بھلا نبھیگی تری ہم سے کیونکر اے واعظ کہ ہم تو رسمِ محبت کو عام کرتے ہیں
واعظ ثبوت لائے جو مے کے جواز میں اقبال کو یہ ضد ہے کہ پینا بھی چھوڑ دے
کوئی یہ پوچھے کہ واعظ کا کیا بگڑتا ہے جو بے عمل پہ بھی رحمت وہ بے نیاز کرے
بڑی باریک ہیں واعظ کی چالیں لرز جاتا ہے آوازِ اذاں سے

(۱۰) مضمون آفرینی: غالب کا یہ قول ہے کہ شاعری دراصل مضمون آفرینی کا نام ہے نہ کہ قافیہ پیمائی کا بانگ درا کی نظموں کو اس معیار پر جانچا جائے تو ناقد پریشان ہو جائے گا کہ مضامین کے انبار میں سے کس شعر کو منتخب کرے اور کسے چھوڑ دے اشعار تو کس شمار میں ہیں، یہاں تو پوری پوری نظمیں مضمون آفرینی کی جیتی جاگتی تصویریں ہیں مثال کے طور پر: انسان اور بزمِ قدرت، دردِ عشق، شمع، عاشقِ ہرجائی، محبت صبح کا ستارہ، ستارہ، پھولوں کی شہزادی، اور جگنو کا مطالعہ کیجئے تو آپ اس بات کے اعتراف پر مجبور ہوں گے کہ اس زمانے میں کوئی شاعر اس صفت میں ان کا ہمسر نہیں ہے۔ چند اشعار ذیل میں درج کرتا ہوں۔

ابر کے ہاتھوں میں رہوارِ ہوا کے واسطے تازیانہ دے دیا برق سرِ کہسار نے
چھیڑتی جا اس عراقِ دلنشیں کے ساز کو اے مسافر! دل سمجھتا ہے تری آواز کو
مجھ سے خبر نہ پوچھ حجابِ وجود کی شامِ فراق صبح تھی تیرے نمود کی
قصۂ دار و رسن بازیِ طفلانۂ دل التجائے ارنی سرخیِ افسانۂ دل
یارب اس ساغرِ لبریز کی مے کیا ہوگی جادۂ ملکِ بقا ہے خطِ پیمانۂ دل
تو سمجھتا نہیں اے زاہدِ ناداں اسکو رشکِ صد سجدہ ہے اک لغزشِ مستانۂ دل
انداز گفتگو نے دھوکے دیئے ہیں ورنہ نغمہ ہے بوئے بلبل بو پھول کی چہک ہے
کثرت میں ہو گیا ہے وحدت کا راز مخفی جگنو میں جو چمک ہے وہ پھول میں مہک ہے

(۱۱) مثال نگاری: کلامِ اقبال کی دل کشی کا ایک سبب یہ بھی ہے کہ وہ پہلے مصرع

ہیں جو بات کہتے ہیں دوسرے مصرعے میں اسے کسی مثال کے ذریعہ سے ثابت کر دیتے ہیں جس کا نتیجہ یہ نکلتا ہے کہ بات دل میں گھر کر جاتی ہے۔ چند مثالیں درج کرتا ہوں:

مرے اشعار اے اقبال کیوں پیارے نہ ہوں مجھکو ___ مرے ٹوٹے ہوئے دل کے یہ دردانگیز نالے ہیں

جوانی ہو تو ذوق دید بھی لطف تمنا بھی ___ ہمارے گھر کی آبادی قیام مہماں تک ہے

چشم نابینا سے مخفی معنیٔ انجام ہے ___ تھم گئی جس دم تڑپ سیماب سیم خام ہے

نہ ہو طبیعت ہی جن کی قابل وہ تربیت سے نہیں سنورتے

ہوا نہ سرسبز رہ کے پانی میں عکس سرو کنار جو کا

فرد قایم ربط ملت سے ہے تنہا کچھ نہیں

موج ہے دریا میں اور بیرون دریا کچھ نہیں

تیری خاک میں ہے اگر شرر تو خیال فقر و غنا نہ کر

کہ جہاں میں نان شعیر پر ہے مدار قوت حیدری

ہے اسیری اعتبار افزا جو ہو فطرت بلند ___ قطرۂ نیساں ہے زندان صدف سے ارجمند

(۱۲) رنگ تغزل: علامہ مرحوم نے اپنی شاعری غزل گوئی سے شروع کی تھی اس لئے بانگ درا میں انکی چند غزلیں بھی شامل ہیں اور ان میں میر، مومن، غالب اور داغ کا رنگ جھلکتا ہے لیکن جو چیز ان کو سب سے جدا کرتی ہے وہ یہ ہے کہ ان کی غزلوں میں فلسفہ اور مذہب یہ دونوں سنجیدہ عناصر بھی پائے جاتے ہیں، ذیل میں چند اشعار نقل کرتا ہوں جن سے ان کے رنگ تغزل کا اندازہ ہو سکے گا۔

مانا کہ تیری دید کے قابل نہیں ہوں میں ___ تو میرا شوق دیکھ، مرا انتظار دیکھ

پاس تھا ناکامی صیاد کا اے ہمصفیر ___ ورنہ میں اور اڑ کے آتا ایک دانہ کے لئے

میرے مٹنے کا تماشا دیکھنے کی چیز تھی ___ کیا بتاؤں ان کا میرا سامنا کیونکر ہوا

نہ پوچھو مجھ سے لذت خانماں برباد رہنے کی ___ نشیمن سیکڑوں میں نے بنا کر پھونک ڈالے ہیں

مل ہی جائیگی کبھی منزل لیلےٰ اقبال ــــ کوئی دن اور ابھی بادیہ پیمائی کر

تو بچا بچا کے نہ رکھ اسے ترا آئینہ ہے وہ آئینہ
کہ شکستہ ہو تو عزیز تر ہے نگاہ آئینہ ساز میں

(۱۳) عشق رسولؐ یہ رنگ چونکہ اقبال نے اپنے والدین سے ورثہ میں پایا تھا۔ اس لئے بانگ درا سے لیکر ارمغان حجاز تک ان کی ہر تصنیف میں موجود ہے اور میری رائے میں اسی کی بدولت انہیں بقائے دوام کی نعمت حاصل ہوئی چند شعر لکھتا ہوں۔

پھڑک اٹھا کوئی تیری ادائے ما عرفنا پر ــــ ترا رتبہ رہا بڑھ چڑھ کے سب ناز آفرینوں میں
ہوا ہو ایسی کہ ہندوستان سے اے اقبال ــــ اڑا کے مجھ کو غبارِ رہِ حجاز کرے
وہ زمیں ہے تو مگر اے خوابگاہِ مصطفیٰؐ ــــ دید ہے کعبہ کو تیری حج اکبر سے سوا
سالار کارواں ہے میرِ حجاز اپنا ــــ اس نام سے ہے باقی آرام جاں ہمارا
اقبال! کس کے عشق کا یہ فیض عام ہے ــــ رومی فنا ہوا، حبشی کو دوام ہے
کرم اے شہہ عرب و عجم کہ کھڑے ہیں منتظرِ کرم
وہ گدا کہ تو نے عطا کیا ہے جنہیں دماغِ سکندری

(۱۴) رمز و ایمائیہ یہ وہ خوبی ہے کہ جو کسی شاعر میں وسعت مطالعہ اور قدرت کلام کی بدولت پیدا ہو سکتی ہے، بانگ درا میں ایمائی شاعری کے نمونے بکثرت موجود ہیں، ذیل میں چند اشعار درج کرتا ہوں:۔

نشان برگ گل تک بھی نہ چھوڑ اس باغ میں گلچیں
تری قسمت سے رزم آرائیاں ہیں باغبانوں میں
کبھی میں غار حرا میں چھپا رہا برسوں ــــ دیا جہاں کو کبھی جامِ آخریں میں نے
اے آبرودِ گنگا! وہ دن ہیں یاد تجھ کو ــــ اترا ترے کنارے جب کارواں ہمارا
بادہ ہے نیم رس ابھی شوق ہے نارسا ابھی ــــ رہنے دو خم کے سر پہ تم خشتِ کلیسا ابھی

رو لے اب دل کھول کر اے دیدۂ خوں نابہ بار
وہ نظر آتا ہے تہذیب حجازی کا مزار

نکل کے صحرا سے جس نے روما کی سلطنت کو الٹ دیا تھا
سُنا ہے یہ قدسیوں سے میں نے وہ شیر پھر ہوشیار ہوگا

نہ ستیزہ گاہِ جہاں نئی، نہ حریف پنجہ فگن نئے
وہی فطرت اسد اللّٰہی وہی مرحبی وہی عنتری

(۱۵) اسلوب بیان: چونکہ فطرت نے اقبالؔ کو زبردست قوت متخیلہ کے ساتھ ساتھ زبان پر بھی قدرت عطا فرمائی تھی اس لئے ان کا اسلوب بیان بڑا دلکش ہے چند مثالیں مزید ملاحظہ ہوں :۔

اے کہ تجھ کو کھا گیا سرمایہ دار حیلہ گر
شاخ آہو پر رہی صدیوں تلک تیری برات

گھر میں پرویز کے شیریں تو ہوئی جلوہ نما
لے کے آئی ہے مگر تیشۂ فرہادؔ بھی ساتھ

سطوتِ توحید قائم جن نمازوں سے ہوئی
وہ نمازیں ہند میں نذرِ برہمن ہو گئیں

ان تازہ خداؤں میں بڑا سب سے وطن ہے
جو پیرہن اس کا ہے وہ مذہب کا کفن ہے

مجھے پھونکا ہے سوز قطرۂ اشک محبت نے
غضب کی آگ تھی پانی کے چھوٹے سے شرارے میں

نفیٔ ہستی اک کرشمہ ہے دل آگاہ کا
لا کے دریا میں نہاں موتی ہے الا اللہ کا

(۱۶) حقایق و معارف قرآنی: بانگ درا ہی نہیں بلکہ اقبالؔ کی پوری شاعری کی خصوصیت یہ ہے کہ انھوں نے شعر کے لباس میں اسلام کی تعلیمات کو پیش کیا ہے۔ بال جبریل اور ضرب کلیم میں یہ رنگ بہت شدت کے ساتھ پایا جاتا ہے لیکن بانگ درا میں بھی ہمیں اس کے بعض اعلیٰ نمونے مل سکتے ہیں چند شعر لکھتا ہوں :۔

بندۂ مومن کا دل بیم و ریا سے پاک ہے
قوتِ فرمانروا کے سامنے بیباک ہے

نرالا سارے جہاں سے اس کو عرب کے معمار نے بنایا
بِنا ہمارے حصارِ ملّت کی اتحادِ وطن نہیں ہے

ہے ترکِ وطن سنّتِ محبوبِ الٰہیؐ
دے تو بھی نبوّت کی صداقت پہ گواہی

بندہ و صاحب و محتاج و غنی ایک ہوئے
تیری سرکار میں پہنچے تو سبھی ایک ہوئے

فرد قایم ربطِ ملّت سے ہے تنہا کچھ نہیں!
موج ہے دریا میں اور بیرونِ دریا کچھ نہیں!

ہمنشیں مسلم ہوں میں، توحید کا حاصل ہوں میں
اس صداقت پر ازل سے شاہدِ عادل ہوں میں

چھوٹی نہ تھی یہود و نصاریٰ کا مال فوج
مسلم خدا کے حکم سے مجبور ہو گیا!

دامنِ دیں ہاتھ سے چھوٹا تو جمعیت کہاں
اور جمعیت ہوئی رخصت تو ملت بھی گئی

حنا بندِ عروسِ لالہ ہے خونِ جگر تیرا
تری نسبت براہیمی ہے معمارِ جہاں تو ہے

بتانِ رنگ و خوں کو توڑ کر ملّت میں گم ہو جا!
نہ تورانی رہے باقی نہ ایرانی نہ افغانی!

ولایت پادشاہی، علم اشیاء کی جہانگیری
یہ سب کیا ہیں؟ فقط اک نکتۂ ایماں کی تفسیریں

نوٹ: مجھے اعتراف ہے کہ اختصار کو مدِ نظر رکھنے کی وجہ سے بانگِ درا

کے محاسنِ شعری پر کماحقّہٗ تبصرہ نہ کر سکا لیکن جو کچھ میں نے لکھا ہے، طلبا، کی ضروریات کو پورا کرنے اور اقبال کی شاعری کو سمجھنے کے لئے کافی ہے۔ اس مختصر مقدمہ کے بعد اب میں بانگِ درا کی شرح شروع کرتا ہوں۔

سلیم چشتی

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

حصّہ اوّل

پہلی نظم ہمالہ

حلّ لغات اور تشریح مشکلات: ہمالہ لغوی معنی برف کا گھر مراد ہے، وہ پہاڑ جو ہندوستان کے شمال میں واقع ہے "ہم" سنسکرت میں برف کو اور "آلے" کو گھر کہتے ہیں خلوت گاہِ دل سے مراد ہے، خلوت میں غور و فکر، دامن کش سے مراد ہے مائل کرنیوالا۔ فصیل فصل سے نکلا ہے۔ لغوی معنی جدا کرنا مراد ہے دیوار (شہر یا قلعہ کی) دیرینہ روزی کہنگی، پرانا پن، کلیم طورِ سینا، حضرت موسیٰؑ جنہوں نے کوہِ طور پر خدا کی تجلی دیکھی تھی، چشمِ بینا سے مراد ہے عقلمند آدمی، امتحان دیدۂ ظاہر، لبظاہر مطلع اوّل، غزل یا دیوان کا پہلا شعر، دستارِ فضیلت سے بزرگی اور عظمت مراد ہے۔ خندہ زن ہے۔ یعنی آفتاب کو شرماتی ہے ثریا، چند ستاروں کا مجموعہ جو زمین سے بہت دور ہے۔ پہنا بمعنی وسعت یا چوڑائی، سیّال، جامد کی ضد ہے بمعنی بہتا ہوا۔ رہوار بمعنی گھوڑا۔ فراز بمعنی بلندی۔ کوثر و تسنیم جنت کی نہروں کے نام ہیں۔ شاہد بمعنی محبوب۔ "عراق" ایرانی موسیقی میں راگنی بھی ہے اور ایک ٹھاٹھ کا نام بھی ہے جس میں کئی راگنیاں گائی جاتی ہیں۔ زلفِ رسا بالوں کی درازی اور کثرت کو لفظ "رسا" سے ظاہر کرتے ہیں۔ آبشار جھرنا۔ آبائے انسان مراد ہے۔ قدیم زمانے کے لوگ۔

نظم کا مطلب: شاعر کوہِ ہمالیہ سے خطاب کرتا ہے کہ تو ہندوستان کی حفاظت

کے لیے دیوار یا شہر پناہ کا کام دیتا ہے اور تو اسقدر بلند ہے کہ آسمان بھی تیری پیشانی کو جھک کر چومتا ہے تو دنیا کی پیدائش کے وقت سے موجود ہے لیکن ابھی تک جوان ہے، تجھ میں کسی طرح ضعف کے آثار پیدا نہیں ہوئے حضرت موسیٰ نے تو جبل طور پر تجلی دیکھی تھی لیکن عقلمندوں کی نگاہ میں تو سراپا تجلی ہے، یعنی تیرا وجود از سر تا پا قدرت خداوندی پر شاہد ہے۔

بظاہر تو پہاڑ ہے لیکن دراصل قدرت نے تجھے ہندوستان کا محافظ بنا دیا ہے تو اس قدر اونچا ہے کہ اگر تجھے دیوان قرار دیا جائے تو یہ آسمان اس دیوان کا پہلا شعر ہے اور تجھے دیکھ کر ہر شخص کے دل میں تیری عظمت کا احساس پیدا ہوتا ہے۔ تیری چوٹیوں پر ہمیشہ برف جما رہتا ہے اور یہ برف ایسا معلوم ہوتا ہے گویا تیرے سر پر فضیلت (بزرگی) کی پگڑی بندھی ہوئی ہے اور یہ پگڑی اس قدر ارفع اور محترم ہے کہ کلاہِ آفتاب کو بھی شرماتی ہے۔ مطلب یہ ہے کہ شاعر ہمارے دل پر کوہ ہمالیہ کی بلندی اور عظمت کا نقش جمانا چاہتا ہے۔

اے ہمالہ! تیری چوٹیاں، ستاروں سے باتیں کرتی ہیں یعنی بہت بلند ہیں اگرچہ تو زمین پر قایم ہے لیکن وسعت کے لحاظ سے آسمان معلوم ہوتا ہے تیری وادیوں میں جو ندیاں بہتی رہتی ہیں ان کا پانی نہایت شفاف ہے اور ہوا۔ ان ندیوں کی سطح آب کو صاف کرتی رہتی ہے۔

بادل گویا ہوا کے گھوڑوں پر سوار ہیں اور بجلیاں گویا بادل کے ہاتھوں میں تازیانے ہیں تاکہ وہ ہوا کو زیادہ تیز چلا سکیں۔ قدرت نے تجھے عناصر اربعہ کے لیے بمنزلہ بازیگاہ (کھیل کا میدان) بنایا ہے۔ تیرے دامنوں میں بادل اس قدر تیزی کے ساتھ ہوا میں اڑتے ہیں، جیسے فیل بے زنجیر۔

تیرے دامن میں صدہا اقسام کے پھول کھلے ہوئے ہیں جو ہوا کے جھونکوں سے ہلتے

رہتے ہیں۔ ہر پھول اپنی پتی کی زبان سے یہ کہتا ہے کہ ہم تک کسی گلچیں کا ہاتھ نہیں پہنچ سکتا اور قدرت نے ہمارا گھر ایسے بلند مقام پر بنایا ہے کہ وہاں کسی کا گذر نہیں ہو سکتا۔

اب شاعر منظر کشی کا کمال دکھاتا ہے اور کہتا ہے کہ پہاڑ کی بلندی سے جو ندی گاتی ہوئی آرہی ہے اس کا پانی اس قدر شفاف اور خوشگوار ہے کہ جنت کی نہروں کے پانی سے مشابہ ہے اور اس میں ارد گرد کی چیزوں کا عکس بھی نظر آتا ہے۔ کبھی بڑے بڑے پتھروں سے بچکر نکل جاتی ہے اور کبھی ان سے ٹکرا جاتی ہے۔

چونکہ پہاڑی ندیوں کے بہنے سے بہت خوش آئند آوازیں پیدا ہوتی ہیں اس لیے شاعر نے ندی کو ایک گویا ماہر موسیقی فرض کر کے اس سے خطاب کیا ہے کہ اے ندی! تیری طرح میرا دل بھی نغموں سے لبریز ہے۔ میں تیرا ہمدم اور ہمراز ہوں، اس لیے تو میرے دل کے ساز کو بھی چھیڑتی جا جس میں نہایت دل کش موسیقی پوشیدہ ہے۔

یہ بہت خوبصورت مصرعہ ہے: شاعر نے پہلے تو اپنے دل کو ساز سے تشبیہہ دی ہے۔ پھر اس ساز کو "عراق دل نشیں" قرار دیا ہے۔

"دل سمجھتا ہے تیری آواز کو" اس کے دو معنی ہو سکتے ہیں! ایک تو وہ جو میں نے اوپر بیان کیے۔ دوسرے معنی یہ ہیں کہ اقبال کے یہاں ندی زندگی کی علامت ہے یعنی وہ زندگی کو ندی، یا جوئے آب سے تشبیہہ دیا کرتے ہیں چنانچہ اسی کتاب میں . . . جو نظم انھوں نے فلسفۂ غم کے عنوان سے لکھی ہے اس میں وہ لکھتے ہیں ؎

ایک اصلیت میں ہے نہر روان زندگی
گر کے رفعت سے ہجوم نوعِ انساں ہو گئی

اس معنی کو مدنظر رکھا جائے تو مطلب یہ ہوگا کہ اے ندی! میرا دل تیری حقیقت سے آگاہ ہے۔ کیوں کہ جس طرح تو مسلسل رواں ہے۔ انسانی زندگی بھی اسی نہج پر بسر ہو رہی ہے یعنی یہی حال حیات انسانی کا ہے۔

جب شام ہو جاتی ہے تو آبشاروں کی صدا بہت دلکش معلوم ہوتی ہے۔ پہاڑوں میں شام کی خموشی گفتگو سے بھی زیادہ دلپذیر ہوتی ہے یہ معلوم ہوتا ہے کہ گویا درخت کھڑے کچھ سوچ رہے ہیں اور رنگ شفق ایسا معلوم ہوتا ہے گویا کسی نے پہاڑ کے رخسار پر غازہ (پوڈر) لگا دیا ہو۔

اس کے بعد جب شاعر ہمالہ کی قدامت پر غور کرتا ہے تو قدرتی طور پر اس کا ذہن قدیم زمانہ کی طرف منتقل ہو جاتا ہے اور وہ اس زمانہ کا تصور کرتا ہے۔ جب انسان فیشن اور بناوٹ سے بالکل ناواقف تھا۔

تبصرہ: یہ اقبال کی سب سے پہلی نظم ہے جو ۱۹۰۱ء میں رسالہ مخزن کے پہلے نمبر میں شایع ہوئی تھی، اس کی دوسری خصوصیات حسب ذیل ہیں۔

(۱) اس میں وطن پرستی کے جذبات پوشیدہ ہیں۔

(۲) اسالیب بیان اور تراکیب الفاظ دونوں میں انگریزی ادب کا عکس نظر آتا ہے۔

(۳) اس کی زبان میں فارسی کا رنگ ہے۔

(۴) اس میں منظر کشی کا کمال نظر آتا ہے۔

(۵) اثر آفرینی کی غرض سے اقبال نے نہایت موزوں الفاظ کا انتخاب کیا ہے۔

(۶) سلاست اور روانی کے ساتھ ساتھ خیالات کی دلکشی اور رعنائی بھی موجود ہے۔

(۷) "چھیڑتی جا" کہہ کر اقبال نے شخصی رنگ پیدا کر دیا ہے اور اس طرز خطاب سے پوری نظم میں زندگی پیدا ہو گئی ہے۔

(۸) چونکہ یہ نظم وطن پرستی کے جذبہ کے تحت لکھی گئی ہے اس لیے مبالغہ کا رنگ جگہ جگہ نمایاں ہے۔ مثلاً:

ع چومتا ہے تیری پیشانی کو جھک کر آسماں

(۹) اس نظم میں اقبالؔ کا تخیل بہت حسین ہے اور ایسا معلوم ہوتا ہے کہ شاعر نے اپنی روح کو وطن کے اس منظر سے ہم آہنگ کر لیا ہے۔

(۱۰) اقبال کی شاعری کے پہلے دور کی دو خصوصیات ہیں، وطن پرستی اور ادبی مصوّری (منظر کشی) اور یہ دونوں خصوصیتیں اس نظم میں بطرز احسن موجود ہیں۔

(۱۱) اس نظم میں اُن صوری اور معنوی خوبیوں کے سارے ابتدائی نقوش پائے جاتے ہیں جنہوں نے آگے چلکر اقبالؔ کو زندۂ جاوید بنا دیا۔

(۱۲) اس نظم میں معنی اور صورت، دونوں کے لحاظ سے بہترین بند یہ ہے ؎

آتی ہے ندّی فرازِ کوہ سے گاتی ہوئی
کوثر و تسنیم کی موجوں کو شرماتی ہوئی

دوسری نظم گلِ رنگیں

حلِّ لغات اور تشریح مشکلات: شناسائے خراشِ عقدۂ مشکل، اس کے لفظی معنی ہیں مشکل مسئلہ کی پریشانی سے واقف، چونکہ گل کا شمار محبوبوں میں ہے اور محبوب کے متعلق شاعری میں طے کر لیا گیا ہے کہ وہ دنیا کی کسی تکلیف مصیبت پریشانی یا رنج و غم سے آشنا نہیں ہوتا۔ اس لیئے اس نظم میں شاعر نے "گل" سے بایں الفاظ خطاب کیا ہے تیرے پہلو میں دل نہیں۔

یعنی تیری زندگی سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ تو کبھی کسی پر عاشق نہیں ہوا، زیب محفل، بمعنی محفل کی رونق یا زیبایش، شریک سوزشِ محفل، یعنی تو عاشقوں کی جماعت میں شامل نہیں ہے۔ چمن سے مراد ہے دنیا۔ ہیں سراپا سوز و سازِ آرزو ہوں، یعنی عاشق ہوں۔ بے گداز آرزو یعنی تجھے کسی کی تمنا نہیں ہے۔ آئین بمعنی طریقہ یا ضابطہ، یہ نظر غیر از نگاہِ چشم صورت ہیں نہیں۔ یعنی یہ طریقہ ظاہر پرست لوگوں

کا ہوتا ہے جو حقیقت سے ناآشنا ہوتے ہیں + دستِ جفاجو۔ ظلم کرنے والا ہاتھ مراد ہے۔ گلچیں کا ہاتھ + دیدۂ حکمت۔ حکمت کی آنکھ یعنی فلسفی یا سائنس داں کا طریق کار + دیدۂ بلبل، بلبل کی آنکھ یعنی عاشق کا طریق کار + سوز بانوں پر گل کی پنیوں کو زبان سے تشبیہہ دیتے ہیں۔ برگ ریاضِ طور۔ لغوی معنی کوہ طور کے مقدس باغ کا پتہ یا پھول مراد ہے تو بھی اپنی اصل کے لحاظ سے مقدس ہے + ہیں چمن سے دور ہوں۔ اشارہ ہے حضرت آدمؑ کے جنت سے اخراج کی طرف۔ شاعر کا مطلب یہ ہے کہ میں بھی اپنے وطن سے دور ہوں زخمیِ شمشیرِ ذوقِ جستجو۔ لفظی معنی ذوقِ تلاش کی تلوار کا زخمی۔ مراد یہ ہے کہ انسان میں تحقیق اور تلاش کا مادہ پایا جاتا ہے۔ اور یہی جوہر اسے دیگر تمام حیوانات سے متمیز کرتا ہے + سامان جمعیت یعنی اطمینان قلب کا سبب، جگرسوزی، بمعنی کاوش، تلاش جستجو + چراغ خانۂ حکمت یعنی سائنس کی ترقی کا ذریعہ یا انسانی معلومات میں اضافہ کا وسیلہ + جام جمشید کا پیالہ جس میں ساری دنیا کا حال نظر آتا تھا۔ جمشید قدیم ایران کا نامور بادشاہ گذرا ہے۔ جام جمشید فارسی ادب میں مشہور ترکیب ہے۔ آئینۂ حیرت یعنی حیرت مراد ہے۔ وہ حیرت جو غور و فکر اور تحقیق کے وقت پیدا ہوتی ہے اور یہی حیرت انسان کو تحقیق اور تلاش پر اکساتی ہے۔ آئینہ حیرت کی ترکیب ادبی زاویہ نگاہ سے بہت خوب ہے، کیونکہ شعراء آئینہ کو خود حیران باندھتے ہیں + تلاش متصل جستجوئے مسلسل جو انسان کا خاصہ ہے توسن بمعنی گھوڑا۔ توسن ادراک انسان کو خرام آموز ہے۔ یعنی شاعر نے ادراک کو توسن قرار دیکر اس کے لیے خرام ثابت کیا ہے۔ یہ استعارہ بالکنایہ کی بہت عمدہ مثال ہے۔ مطلب یہ ہے کہ تلاش متصل ہی کی بدولت دنیا میں تمدن کی ترقی ہوتی ہے اسی لئے . . . .

تلاش کو شمع جہاں افروز سے تعبیر کیا ہے۔ تلاش اور تحقیق سے انسان کی قوت مدرکہ میں ترقی ہوتی ہے اسی کی ترقی سے دنیا ترقی کرتی ہے۔ اگر انسان میں تحقیق اور

تلاش کا مادہ نہیں تو آج نہ ریڈیو ہوتا۔ نہ تار نہ بجلی کی روشنی ہوتی، نہ ریل اور موٹر کار۔ نہ تہذیب و تمدن کا نشان ہوتا۔ نہ علوم و فنون کا چرچا ہوتا۔

تبصرہ : اس نظم میں بنیادی تصور یہ ہے کہ پھول بہت دلکش ہوتا ہے لیکن اس میں تحقیق اور تلاش کا مادہ نہیں ہے اور انسان اگرچہ سراپا درد و غم ہے یکسر سوز و گداز ہے لیکن اس میں ادراک یعنی علم حاصل کرنے کی قوت موجود ہے۔

دوسری بات غور طلب یہ ہے کہ یہ نظم اس زمانے کی ہے جب شاعر فطرت کا مطالعہ کر رہا تھا، اور تحقیق و تلاش میں مصروف تھا۔ تیسری بات یہ ہے کہ اس نظم کا موضوع بہت معمولی ہے لیکن شاعر نے اس سے بہت اعلیٰ نکتہ پیدا کیا ہے۔ اس نظم کا انداز بھی انگریزی نظموں سے ملتا جلتا ہے ایسا معلوم ہوتا ہے کہ اس زمانہ میں اقبال انگریزی شعراء کا مطالعہ کر رہے تھے۔

مطلب : اے گلاب کے حسین پھول! ایسا معلوم ہوتا ہے کہ تیرے سینہ میں دل نہیں ہے اگر ہوتا تو، تو بھی میری طرح سراپا تلاش اور آرزو ہوتا۔ تیری زندگی میں کوئی آرزو نہیں پائی جاتی۔ تو دردِ الفت سے واقف نہیں ہے لیکن میں تو سراپا آرزو ہوں۔ تو مطمئن رہ! میں نہ گلچیں ہوں! نہ صورت ہیں (ظاہر پرست) اس لئے میں تجھے شاخ سے جدا کر کے کسی قسم کی تکلیف نہیں پہنچاؤں گا۔ میں ماہر علم نباتات بھی نہیں ہوں کہ پہلے تجھے شاخ سے جدا کروں پھر تیری پتیاں الگ الگ کروں پھر ان کے ٹکڑے کروں اور دیکھوں کہ تیری پتی کن اجزا سے مرکب ہے بلکہ میں تو حسن پرست یعنی عاشق فطرت ہوں۔ میں تو تجھے عاشق کے زاویہ نگاہ سے دیکھتا ہوں یعنی تیرے حسن و جمال سے لطف اندوزی کے لئے تجھ کو شاخ سے توڑنے کی کوئی ضرورت نہیں ہے۔

اے گل تو چپ چپ رہتا ہے۔ یہ بات کیا ہے؟ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ تیرے

سینہ میں کوئی راز پوشیدہ ہے، کیا تجھے اپنے اصلی وطن۔ باغ جنت سے جدائی کا خیال ستا رہا ہے؟ یہ بات تو ٹھیک ہے، قرین قیاس ہے کیونکہ تیری اور میری دونوں کی اصل یہ دنیا تو نہیں ہے، تو بھی جنت سے آیا ہے اور میں بھی جنت ہی سے آیا ہوں۔

لیکن ہم دونوں میں فرق بھی ہے وہ یہ کہ تو اپنی حالت سے بالکل مطمئن ہے مگر میں تیری خوشبو کی طرح پریشان (منتشر) رہتا ہوں کیونکہ زخمی شمشیر تحقیق و تلاش ہوں۔ میرے اندر تحقیق و جستجو کا مادہ ہے اور یہ مادہ مجھے ہر وقت آمادہ تلاش رکھتا ہے۔

بظاہر تو میری زندگی سراپا سوز و گداز ہے۔ لیکن میں سمجھتا ہوں کہ فطرت نے میرے ساتھ ناانصافی نہیں کی ہے۔ میری یہ پریشانی ہی در اصل میری فارغ البالی کا سنگ بنیاد ہے اور تحقیق و تلاش کے سلسلہ میں جس قدر جگر سوزی اور کاوش مجھے کرنی پڑتی ہے اس کا صلہ یہ ملتا ہے کہ میرے علم میں اضافہ ہو جاتا ہے۔ بظاہر میں ناتواں ہوں، نہ شیر کے سے پنجے ہیں، نہ ناخن ہیں۔ لیکن یہی ناتوانی مجھے حفاظت کے سامان مہیا کر لنے پر آمادہ کرتی ہے۔ اور اگرچہ میں حیران رہتا ہوں، لیکن یہی حیرانی مجھے تحقیق پر راغب کرتی ہے۔ سچ تو یہ ہے کہ جستجوئے پیہم جو بظاہر مجھے پریشان رکھتی ہے اس دُنیا کی ساری دل فریبی کا سبب ہے۔ اگر یہ جذبہ کارفرما نہ ہوتا تو انسان ابھی تک عالم برہنگی میں غاروں کے اندر ہی زندگی بسر کرتا ہوتا۔ اسی جذبۂ تحقیق نے انسان کی قوت مدرکہ کو ترقی اور بلندی کی راہ پر گامزن کیا ہے۔ یعنی اسی کی بدولت تہذیب انسانی نے موجودہ بلند مرتبہ تک ترقی کی ہے۔

نظم عہدِ طفلی

حلِّ لغات اور توضیحِ مشکلات : دیارِ نو، بمعنی نیا شہر، نئی جگہ + وسعتِ آغوشِ مادر، مراد ہے ماں کی گود + شورشِ زنجیرِ در، لفظی معنی دروازے کی کنڈی کا شور، جب بچے روتے ہیں تو مائیں ان کو کنڈی بجا کر بہلاتی ہیں + دروغِ مصلحت آمیز لفظی معنی وہ جھوٹ جو کسی مصلحت کے لئے بولا جائے۔ جیسے مائیں بعض اوقات بچوں کے سوالات کے جواب میں بولا کرتی ہیں، مثلاً جب بچے دریافت کرتے ہیں کہ چاند میں یہ کالا کالا کیا ہے تو مائیں کہہ دیتی ہیں کہ بیٹا یہ بڑھیا ہے جو چرخہ کات رہی ہے۔ یہ ترکیب گلستان کے اس مشہور مقولہ سے ماخوذ ہے :

"دروغِ مصلحت آمیز، بہ زراستیٔ فتنہ انگیز"

اس نظم میں اقبال نے چھوٹے بچوں کی نفسیاتی زندگی کی تصویر کھینچی ہے جس سے ان کی قوتِ مشاہدہ کا ثبوت مل سکتا ہے۔

مرزا غالب

حلِّ لغات اور تشریحِ تراکیب : فکر۔ لغوی معنی غور، تردّد، تدبّر، سوچ بچار۔ فلسفہ کی اصطلاح میں فکر کہتے ہیں معانیٔ جدیدہ کی حصول کی غرض سے ذہنی تردد کرنا یعنی جن چیزوں کی معرفت ہمیں حاصل ہو چکی ہے ان کو اس غرض سے پیشِ نظر رکھنا کہ ان کی مدد سے کوئی نئی بات حاصل ہو سکے۔ فکر کا خاص وظیفہ یہ ہے کہ اس کی بدولت ہم نتائج نکالتے ہیں + تخیّل لغوی معنی ہیں خیال میں آنا منطق کی اصطلاح میں اس کا مفہوم یہ ہے کہ جب نفسِ مدرک اُن صُورِ جزیہ کا ادراک کرتا ہے جو بذریعہ حواسِ خمسۂ ظاہری خزانۂ خیال میں جمع ہو جاتی ہیں تو اس کیفیتِ ادراکیہ کو تخیّل کہتے

ہیں۔ شاعر کی عظمت اس کے تخیل کی بلندی پر موقوف ہے + بربط ایک عجمی ساز کا نام ہے۔ یہاں مراد ہے فنِ شاعری + سرمایہ دار سے مراد ہے محترم یا ذی وقار + انداز: یہاں مراد ہے اسلوبِ بیان + غنچۂ دلی سے مراد ہے، غالب کی شاعری، اور گلِ شیراز سے مراد ہے، حافظ اور سعدی کی شاعری + ویمر (WEIMAR) جرمنی میں ایک قصبہ ہے جس کی شہرت دنیائے ادب میں اس لیے ہے کہ یہاں ایک زمانہ میں جرمنی کے چار نامور ادیب رہتے تھے۔ یعنی گوئٹے، ہرڈر، شلر اور ویلینڈ۔ گوئٹے اسی جگہ مدفون ہے۔ قصبہ کی آبادی پچاس ہزار ہے۔ لطفِ گویائی سے شاعری مراد ہے۔ نظارہ آموز نگاہِ نکتہ بیں کا مطلب یہ ہے کہ ہندوستان کی سرزمین عقلمندوں کے لئے اپنے اندر بہت کچھ سامانِ عبرت رکھتی ہے + جہاں آباد دلی کا لقب ہے۔

ع: اے جہان آباد! اے اسلام کے دارالعلوم

شمس و قمر سے علماء اور ادباء مراد ہیں۔

تبصرہ : اس نظم میں جسے ہم مرثیہ بھی کہتے ہیں۔ اقبال نے ہندوستان کے سب سے بڑے فارسی شاعر کی خدمت میں خراجِ تحسین پیش کیا ہے۔ غالب ۱۷۹۷ء میں بمقام آگرہ پیدا ہوئے اور ۱۸۶۹ء میں بمقام دلی وفات پائی۔ ان کا مزار بستی نظام الدین (دلی) میں چونسٹھ کھمبا کی دیوار سے ملحق ہے۔ اقبال نے چونکہ غالب کے اندازِ بیان سے استفادہ کیا ہے اور ان کے کلام سے معنوی رنگ میں فیض بھی حاصل کیا ہے اس لئے انھوں نے بڑے خلوص کے ساتھ اس نظم میں غالب کے کمالات کو واضح کیا ہے اور اس کی ایک خوبی یہ ہے کہ اس میں ضمنی طور پر انھوں غالب کی شاعری پر تبصرہ بھی کر دیا ہے کہ اس میں کیا شک ہے کہ محاسنِ کلام غالب کو اقبال سے بڑھ کر کون سمجھ سکتا ہے؟ جیسا کہ میں مقدمہ میں لکھ چکا

ہوں۔ بانگ درا کی غزلوں اور نظموں کا بغور مطالعہ کیا جائے تو اقبال کی ابتدائی شاعری پر غالب کا اثر صاف نمایاں ہوسکتا ہے۔

نظم کا مطلب کہتے ہیں اگر کوئی شخص یہ معلوم کرنا چاہتا ہے کہ انسانی تخیل کا منتہا رسے پرواز کیا ہے؟ انسانی تخیل کہاں تک پرواز کرسکتا ہے؟ تو اسے غالب کے (فارسی) کلام کا مطالعہ کرنا چاہیئے[1]۔ اگر شاعری کی محفل کو جسم قرار دیا جائے تو غالب اس کی روح ہے "محفل سے پنہاں بھی رہا"۔ اسکے دو معنی ہیں ایک تو یہ کہ چونکہ روح نظر نہیں آتی اس لیے غالب پنہاں رہا دوسرے معنی یہ ہیں کہ اس جملہ میں لطیف اشارہ ہے۔ اس بات کی طرف کہ غالب کا کلام اس قدر بلند ہے کہ بہت کم لوگ اس کو سمجھ سکتے ہیں یعنی اس کے معنی عام لوگوں کی نگاہوں سے پنہاں ہیں۔ غالب اس حسن کا جویا ہے جو سوز حیات بن کر ہر شئے میں پوشیدہ ہے یعنی اس کے کلام میں حسن مطلق کا جلوہ نظر آتا ہے۔

دوسرا بند: جس طرح پہاڑی ندی کے شور (نغمہ) سے کوہساروں میں دلکشی اور جاذبیت پیدا ہوجاتی ہے۔ اسی طرح تیری شاعری (بربط) سے دنیا کی محفل میں وقار اور تمکنت کی شان پیدا ہوگئی ہے، تیرے تخیل کی بدولت، قدرت و فطرت کی خوبیوں کو واضح کردیا ہے۔ قوت متخیلہ کے علاوہ قدرت نے تجھے قوت مفکرہ یعنی غور و فکر کی طاقت بھی عطا کی ہے اور اس قوت کی بنا پر تو نے اپنے کلام میں نئے نئے (اچھوتے) مضامین باندھے ہیں۔ ان دو بنیادی خوبیوں کے علاوہ تیرے کلام میں ایسی شوخی پائی جاتی ہے کہ اس کی وجہ سے تیرے اشعار میں زندگی پیدا ہوگئی ہے تیرے کلام میں ادبی، مصوری کا کمال بھی پایا جاتا ہے۔ یعنی تو نے اپنے اشعار میں واردات عاشقی کی ہو بہو تصویریں کھینچ دی ہیں۔

---

[1] فارسی کی قید میں نے بڑھائی ہے اس لئے کہ غالب کے تخیل کی بلندی کا اندازہ اس کے فارسی کلام سے ہوسکتا ہے نہ کہ اردو سے ۱۲۔

تیسرا بند: تیرا کلام انسان کی قوت بیان کے لئے باعثِ صد عزّ و افتخار ہے اور تیرا تخیّل اس قدر بلند ہے کہ ثریّا بھی اس کی بلندی پر محو حیرت ہے. تیرا انداز بیان اس درجہ دلکش اور حسین ہے کہ خود مضامین اس پر نثار ہونے کو آمادہ نظر آتے ہیں، تیرے کلام میں اس قدر حلاوت اور شیرینی ہے کہ اس کے سامنے حافظ اور سعدی کا رنگ بھی پھیکا معلوم ہوتا ہے. شاعری میں تیرا ہم پلّہ تیرے ہمعصروں میں اگر کوئی ہوا ہے تو وہ جرمنی کا مشہور شاعر گوئٹے[1] تھا لیکن کیا زمانہ کا انقلاب ہے کہ تو جس شہر میں مدفون ہے وہ اُجڑ چکا ہے اور گوئٹے جس شہر میں مدفون ہے وہ آباد ہے یعنی تو اس قوم میں پیدا ہوا جو رو بہ زوال ہے اور وہ اس قوم میں پیدا ہوا جو رو بہ ترقی ہے.

چوتھا بند: شاعری کے میدان میں نہ ہی شاعر تیری ہمسری کر سکتا ہے. جسے قدرت نے تیری قوت متخیلہ اور قوت مفکرہ (تخیل اور فکر) دونوں عطا کی ہوں، کیسی عبرت کا مقام ہے کہ اب ہندوستان میں ایسے حالات پیدا ہو گئے ہیں کہ کسی دوسرے غالب کی ظہور کی توقع نہیں کی جا سکتی. حالانکہ زبان اُردو ابھی مرتبۂ کمال کو نہیں پہنچی ہے اس لیے ضروری ہے کہ کوئی شخص پیدا ہو جو اس کو سنوارے. یعنی زبان اُردو اس شمع کے مانند ہے جسے پروانہ (شاعر) کی دل سوزی درکار ہو.

پانچواں بند: اے دہلی! تو ہمیشہ سے علم و ہنر کا مرکز رہی ہے. تیری تاریخ ناموروں کے تذکرے سے معمور ہے. تیری عمارات زبانِ حال سے ان پر نوحہ خوانی کر رہی ہیں. تیری خاک میں بڑے بڑے نامور شاعر اور ادیب مدفون ہیں. لیکن میں سمجھتا ہوں کہ غالب جیسا دوسرا فخر روزگار شاعر تیری خاک سے پیدا نہیں ہوا.

تبصرہ: اس نظم میں اقبالؔ نے غالب کی شاعری پر ایسی جامع اور مانع تنقید کی ہے کہ اس سے بہتر شاید ہی ہو سکے. اس کے مطالعہ سے کلام غالب کی حسب ذیل

[1] گوئٹے ۱۷۴۹ء میں پیدا ہوا اور اس نے ۱۸۳۲ء میں وفات پائی.

خوبیاں ہمارے سامنے واضح ہو سکتی ہیں۔

(۱) غالب غیر معمولی قوت تخیّل اور قوتِ فکر کا مالک تھا۔ اقبال نے اس نظم میں متعدد طریقوں سے ان دونوں بنیادی خوبیوں کو واضح کیا ہے یہ وہ خصوصیات ہیں جن کی بنا پر غالب کو ہندوستان کے صفِ اوّل کے شعراء میں نمایاں مقام حاصل ہے، اور میری رائے میں بیدل کے علاوہ اور کوئی شاعر ان خصوصیات میں ان کی ہمسری نہیں کر سکتا، عرفی کا شمار بھی اسی صف میں ہے لیکن وہ ہندی نہیں تھا۔

(۲) غالب کے کلام میں سوز و ساز حیات کا رنگ پایا جاتا ہے۔

(۳) غالب اس دنیا میں حسن مطلق کے دیدار کا آرزومند تھا اس لئے اس کے کلام میں اس کی جستجو کا تصور جا بجا پایا جاتا ہے۔

(۴) اس کے کلام میں بلا کی شوخی پائی جاتی ہے۔

(۵) اس کا اسلوبِ بیان نہایت دلکش اور بدیع ہے۔

(۶) اس کے کلام میں حافظ اور سعدی کی سی سرمستی اور حلاوت موجود ہے۔

(۷) انیسویں صدی میں اگر دنیا میں کوئی شاعر اس کا ہمسر تھا تو وہ گوئٹے تھا۔

(۸) اس کے کلام میں پرواز تخیّل کے ساتھ ساتھ فکر کی بلندی بھی موجود ہے اور یہ امتزاج دنیا کے معدودے چند شعراء ہی کے کلام میں پایا جاتا ہے۔

واضح ہو کہ اقبال نے یہ محاسن غالب کے فارسی کلام کو مدنظر رکھ کر بیان کیے ہیں۔ کیونکہ یہ خوبیاں بطرز احسن اور بوجوہ اتم فارسی کلام ہی میں نظر آتی ہیں۔ چنانچہ غالب نے خود اس حقیقت کو واضح کیا ہے۔

فارسی بیں تا بہ بینی نقش ہائے رنگ رنگ
بگذر از مجموعۂ اردو، کہ بیرنگ من است

یعنی اے مخاطب! اگر تو میرے مرتبہ سے واقف ہونا چاہتا ہے تو میرے

اُردو کلام کے بجائے فارسی کلام کا مطالعہ کرے، میرا خیال یہ ہے کہ غالب کے فارسی دیوان کا جواب بیدل کے علاوہ سارے فارسی لٹریچر میں نہیں مل سکتا۔ افسوس کہ میں اس شرح میں اپنے اس دعوے پر دلائل پیش نہیں کر سکتا کیونکہ یہ شرح ان مباحث کی متحمل نہیں ہو سکتی اگر خدا نے دیوانِ غالب کی شرح لکھنے کا موقع دیا تو شاید کچھ عرض کر سکوں۔

ابرِ کوہسار

حلِّ لغات و شرحِ مشکلات: بلندی سے۔ یعنی بلندی کے سبب سے۔ فلک بوس آسمان کو چومنے والا یعنی بہت بلند + نشیمن بمعنی گھونسلہ یا آرام گاہ۔ یا جائے قیام + گلپاش، بمعنی پھول بکھیرنے والا۔ میرا دامن گل پاش ہے۔ یعنی بارش ہی پھولوں کے اگنے کا باعث ہے + دُر افشاں۔ لغوی معنی، موتی بکھیرنے والا۔ شاعر نے بوندوں کو موتیوں سے تشبیہ دی ہے، اور کسانوں کی نظر میں بارش کی بوندیں موتیوں سے بھی بڑھ کر ہوتی ہیں۔

ناقۂ شاہدِ رحمت کا حُدی خواں ہونا۔ مطلب یہ ہے کہ بادل اللہ کی رحمت کا نشان ہے، اسی لیے شاعر نے اُسے شاہدِ رحمت کے ناقہ کا حدی خواں ہونا قرار دیا ہے یہ مصرعہ استعارہ بالکنایہ کی بہت عمدہ مثال ہے۔ شاعر نے پہلے اللہ کی رحمت کو ایک پردہ نشیں حسینہ قرار دیا، پھر اس کے لئے ناقہ ثابت کی، کیونکہ شریف پردہ نشین حسینہ عموماً محمل ہی میں ہوتی ہیں اس کے بعد اس ناقہ کے لئے ایک حدی خواں ثابت کیا، کیونکہ جب حدی خواں ناقہ کو سرود سناتا ہے تو وہ تیز چلتی ہے + ناقہ بمعنی تیز رفتار اونٹنی + شاہد کثیر المعانی لفظ ہے۔ یہاں حسینہ مراد ہے + حدی وہ نغمہ یا سرود جو شتربان اونٹوں کو تیز چلانے کے لئے گاتے ہیں + غمزدا۔ زدودن بمعنی مٹانا۔ دور کرنا صاف کرنا، غمزدا، بمعنی غم کو دور کرنے والا + گیسو بنکر رخِ ہستی پہ بکھر جانا

ہوں، یہ مصرعہ استعارہ بالکنایہ کی عمدہ مثال ہے۔ جس طرح گیسو کسی حسینہ کے رخساروں پر بکھر جاتے ہیں۔ تو اس کے حسن کو چار چاند لگ جاتے ہیں، اسی طرح جب بادل زمین پر برستا ہے تو سبزہ لہلہانے لگتا ہے۔ اور زمین خوب صورت معلوم ہونے لگتی ہے۔ شانہ موجۂ صرصر بھی استعارہ بالکنایہ ہے پہلے ہوا کو ایک موج فرض کیا پھر گیسو کی رعایت سے موجۂ صرصر کو شانہ قرار دیا تاکہ وہ گیسوئے ابر کو سنوار سکے شانہ موجۂ صرصر سے سنور جاتا ہے۔ یعنی تیز ہوائیں مجھے دوبارہ مجتمع کردیتی ہیں۔ لب جو، یعنی نہر یا ندی کے کنارے + گرداب کی بالیاں پہناتا ہوں۔ جب پانی میں بوندیں پڑتی ہیں تو قدرتی طور پر حلقے پیدا ہو جاتے ہیں ان کو شاعر نے گرداب (بھنور) فرض کیا ہے، یہ مصرعہ تصویر کشی کی عمدہ مثال ہے + مزرع نوخیز بمعنی نئی اُگی ہوئی کھیتی + امید ہوں ہیں۔ یعنی اس کی شادابی مجھ پر موقوف ہے + زادۂ بحر۔ یعنی سمندر کا بیٹا۔ جب آفتاب سمندر پر چمکتا ہے تو پانی بھاپ بن کر اڑتا ہے اور وہ بھاپ اوپر جاکر بادل کی شکل اختیار کرلیتی ہے + پروردۂ خورشید یعنی مجھے آفتاب نے پالا پوسا ہے + چشمۂ کوہ بمعنی پہاڑی ندی، جو عموماً شور کرتی ہے + شورش قلزم بمعنی سمندر کی طغیانی یا اس کا جوش خروش جب پہاڑوں پر بارش ہوتی ہے تو پہاڑی ندیوں میں غیر معمولی جوش پیدا ہو جاتا ہے محو ترنم، نغمہ سرائی یا موسیقی میں مست + قُم عربی لفظ ہے۔ لغوی معنی ہیں۔ اٹھ مراد ہے زندہ کر دینا۔ جب بارش ہوتی ہے تو خشک گھاس ہری ہو جاتی ہے غنچہ کو ذوق تبسم دینے سے مراد یہ ہے کہ غنچہ شگفتہ ہو کر پھول بن جاتے ہیں۔

آخری شعر میں تنقید ہے۔ اس کی نثر یوں ہوگی۔ دامن کوہسار میں دہقانوں کے جھونپڑے میرے فیض سے شبستانوں کے نمونے بن گئے ہیں یعنی جب بادل گھر کر آتا ہے تو دہقانوں کے دل خوشی سے لبریز ہو جاتے ہیں۔

نظم ایک مکڑا اور مکھی

اس نظم میں اقبال نے بچوں کو یہ نصیحت کی ہے کہ دشمن کی چکنی چپڑی باتوں میں ہرگز نہ آنا چاہیے۔

نظم ایک پہاڑ اور گلہری

اس نظم کا مطلب یہ ہے کہ دنیا میں کوئی چیز بری نہیں ہے، یہ نظم ایمرسن (R.N. EMERSON) کے کلام سے ماخوذ ہے، امریکہ کا یہ نامور شاعر خطیب اور انشاء پرداز ۱۸۰۳ء میں بمقام بوسٹن (U.S.A) پیدا ہوا تھا اور اس کی نظموں کا مجموعہ ۱۸۴۶ء میں شایع ہوا تھا۔ اس نے بڑی عزت کی زندگی بسر کرنے کے بعد ۱۸۸۲ء میں وفات پائی۔

ہمدردی

اس نظم میں اقبال نے بچوں کو ہمدردی کا سبق دیا ہے یہ نظم مشہور انگریز شاعر ولیم کاؤپیر کے کلام سے ماخوذ ہے جو ۱۷۳۱ء میں پیدا ہوا تھا اور ۱۸۰۰ء میں فوت ہوا۔ اٹھارھویں صدی میں اس کی نظمیں انگلستان میں بہت مقبول تھیں۔

خفتگان خاک سے استفسار

<u>حلّ لغات و شرح مشکلات</u>: خفتگانِ خاک یعنی مردے۔ استفسار بمعنی سوال کرنا، دریافت کرنا + اٹھی نقاب روئے شام بمعنی شام ہو گئی، ۔ شانۂ ہستی

یہ گیسوئے شام بکھر گیا۔ یعنی دنیا پر تاریکی چھا گئی مگر بمعنی شاید آسمان لب کشا رہ

یہ جادو کر رہا ہے۔ یعنی لوگوں پر نیند کا غلبہ ہوتا جاتا ہے۔ زرا، بمعنی گھنٹہ + تقویر، ک

نفرت کرنے والا + حیرت خانہ امروز و فردا یعنی کیا وہاں بھی اس دنیا کی طرح دن کے بعد رات اور رات کے

بعد دن ہوتا ہے؟ پیکار عناصر، عناصر اربعہ کی لڑائی یا تصادم۔ اس سے کون و

فساد مراد ہے + دل کی مجبوری انسان کا مجبور ہونا مراد ہے + پہلو سے دل نکل

جاتا ہے۔ یعنی انسان بے چین ہو جاتا ہے + رشتہ و پیوند، مراد ہے رشتہ داری

یا دوستی + ایک معیشت اور سو افتاد سے مراد یہ ہے کہ ایک زندگی اور سیکڑوں

پریشانیاں لاحق ہیں۔ کیا وہاں کے انسان بھی اپنی اصلیت سے بیگانہ ہیں؟ مراد

تکبر اور غرور ہے انسان اگر اپنی اصلیت پر غور کرے تو کبھی تکبر نہیں کر سکتا کیونکہ

اس کی اصل مٹی ہے + امتیاز ملت و آئین سے فرقہ بندی اور باہمی نفرت مراد

ہے + حُسنِ ازل سے ذاتِ خداوندی مراد ہے + معصیت سوزی یعنی گناہ کو

جلانا۔ تادیب بمعنی ادب سکھانا۔ یا اصلاح کرنا + لن ترانی سے مراد یہ ہے کہ

انسان خدا کو نہیں دیکھ سکتا + قتیلِ ذوقِ استفہام سے مراد ہے دل میں جستجو

اور تلاش اور دریافت کا شوق، گنبد گرداں، یعنی لغوی معنی گھومنے والا گنبد

سے مراد ہے آسمان۔

خفتگان خاک سے استفسار کے پردے میں شاعر نے اس حقیقت کو

واضح کیا ہے کہ موت انسان کے لئے ایک معمہ ہے۔ اور ہر انسان اس کا راز

معلوم کرنا چاہتا ہے کہ مرنے کے بعد جو دنیا ہوگی وہ کیسی ہوگی؟ اس دنیا کی طرح

یا اس سے مختلف ہوگی؟ اس نظم کی خوبی یہ ہے کہ اس میں اقبال نے اس دنیا کی

زندگی کا صحیح اور موثر نقشہ کھینچ دیا ہے اور سب سے بڑا سوال یہ کیا ہے کہ یہاں تو ہم

خدا کو نہیں دیکھ سکتے تو کیا اس دنیا میں اس کی دید سے دلِ مہجور کو تسکین حاصل

ہو سکے گی یا وہاں بھی دیدار کے سوال کے جواب میں "لن ترانی" ہی سنیں گے؟
حضرت موسیٰ نے اللہ سے کہا تھا "ربّ ارنی" اے رب تو اپنے آپ کو مجھے
دکھا دے، تو اللہ نے جواب دیا: "لن ترانی" یعنی تو مجھے ہرگز نہیں دیکھ سکتا۔

شمع اور پروانہ

حلِّ لغات اور شرح مشکلات: سیماب وار، یعنی مضطرب + طواف۔
کسی کے گرد پھرنا۔ تفتہ بمعنی جلا ہوا۔ تفتہ دل، کنایہ ہے عاشق سے + تفتہ دل کا
نخل تمنا ہرا نہ ہو، مراد یہ ہے کہ عاشق کامیاب نہ ہو + عاشق حسنِ قدیم سے
خدا کا عاشق مراد ہے۔ اس مختصر نظم میں اقبال نے ایک مشہور مظہر فطرت یعنی شمع
و پروانہ کے باہمی تعلق کی دلکش انداز میں عکاسی کی ہے۔

نظم عقل اور دل

حلِّ لغات اور شرح مشکلات: رسا یہاں مراد یہ ہے کہ میری پہنچ بہت
دور تک ہے خضر، ایک مشہور روحانی بزرگ کا نام ہے، جو بھولے بھٹکوں کو راستہ
دکھاتے ہیں + خجستہ پا، لغوی معنی ہیں وہ شخص جس کے پاؤں بابرکت ہوں، مراد
ہے، جس کا وجود دوسروں کے لیے برکت کا باعث ہو + مفسر، تفسیر، یا شرح
کرنے والا + کتاب ہستی سے ہستی مراد ہے۔ مظہر شانِ کبریا۔ اللہ کی شان
کی مظہر، مظہر کو دو طرح پڑھ سکتے ہیں، مُظہر بمعنی ظاہر کرنے والا۔ اور مَظہر بمعنی جائے ظہور
یعنی عقل خدا کی شان کو ظاہر کرتی ہے یا عقل کے وجود میں خدا کی شان کا ظہور ہوتا ہے۔ دونوں
معنی صحیح ہو سکتے ہیں + غیرت لعل بے بہا۔ یعنی بیش قیمت لعل سے بھی بڑھ کر ہوں + راز
ہستی، یعنی کائنات کی حقیقت + مظاہر مظہر کی جمع ہے، معنی جائے ظہور۔ . . . . .

. . . یہاں مراد ہے وہ اشیاء جو آنکھوں سے نظر آئیں، یا جو اس کے ذریعہ سے محسوس ہوں۔ باطن بمعنی اندرونی یا پوشیدہ یہ مظاہر کی ضد ہے ہر شئے کا باطن وہ ہے جو آنکھ یا حواس سے مخفی ہو۔ مثلاً جسم انسان کا ظاہر ہے اور روح باطن ہے۔

علم کے معنی ہیں جاننا اور معرفت کے معنی ہیں پہچاننا۔ یہاں مراد ہے حقیقت سے آشنا ہو جانا۔ علم اور معرفت میں یہ فرق ہے کہ فلسفی یا منطقی کو خدا کا علم تو ہو سکتا ہے۔ لیکن اس کی معرفت حاصل نہیں ہو سکتی + بیتابی سے اس جگہ شک و شبہ یا حیرت یا پریشانی مراد ہے جو حقیقت سے آگاہ نہ ہونے کی بناء پر لاحق ہو جاتی ہے + صداقت سے مراد وہ حقائق ہیں جو علم یا فلسفہ کی بدولت حاصل ہوتے ہیں + حسن کی بزم سے عاشقانہ زندگی مراد ہے + زمان و مکان، دنیا میں کوئی شخص نہیں جو ان دو لفظوں سے واقف نہ ہو لیکن بہت کم لوگ ہیں جو انکی حقیقت سے آگاہ ہیں + رشتہ بپا، مراد ہے قیدی یا الجھا ہوا یا گرفتار، یعنی ہر شخص زمان و مکان کی قید میں ہے + طائر سدرہ آشنا۔ لغوی معنی وہ پرند جو سدرہ سے واقف ہو۔ یعنی جس کی پرواز درخت سدرہ تک ہو۔ سدرہ بیری کے درخت کو کہتے ہیں۔ یہ لفظ قرآن مجید کی سورت ۵۳ میں آیا ہے۔ یہ درخت ساتویں آسمان کے اوپر ہے اور فرشتے اس سے آگے نہیں جا سکتے، اسی لئے اس کو سدرۃ المنتہیٰ کہتے ہیں۔ عرش سے خدا کا تختِ حکومت یا اس کا اقتدار اور قبضہ مراد ہے۔ لغوی معنی چھت۔

<u>تبصرہ</u>: اس نظم میں اقبال نے عقل پر دل کی برتری ثابت کی ہے، عقل اور دل یہ انسان کی دو قوتوں کے نام ہیں۔ عقل وہ قوت ہے جس کی بدولت انسان نئی باتیں دریافت کرتا ہے مثلاً جزء اپنے کُل سے چھوٹا ہے۔ یا انسان فانی ہے۔

یہ باتیں انسان نے عقل کے ذریعہ سے معلوم کی ہیں۔ دل وہ قوت ہے جس کی مدد سے انسان ان حقایق کا یقین حاصل کر سکتا ہے جو حواس یا عقل کی دسترس سے بالاتر ہیں مثلاً خدا اور روح۔ خدا کی ہستی کا یقین دل کی بدولت پیدا ہو سکتا ہے۔

یہ نظم اقبال نے اپنی شاعری کے ابتدائی دور میں لکھی تھی اس وقت تک انھوں نے اپنا فلسفیانہ نظام جسے عرف عام میں فلسفۂ خودی کہتے ہیں مدوّن نہیں کیا تھا لیکن اس کے ابتدائی نقوش اس نظم میں بھی پائے جاتے ہیں۔ اقبال کے فلسفہ کا بنیادی نقطہ یہ ہے کہ حقیقت رسی کا ذریعہ عقل نہیں بلکہ دل ہے۔ اسی بنیادی تصور پر انھوں نے اپنے فلسفہ کا محل تعمیر کیا ہے اور یہ تصور نہایت واضح طور پر اس نظم میں موجود ہے۔ جو بات اقبال نے اس آسان نظم میں بیان کی ہے یعنی عقل پر عشق کی برتری، وہی بات انھوں نے ساری عمر اپنی ساری تصانیف میں مختلف الفاظ میں واضح کی ہے۔

ہم ذیل میں اس موازنہ کو آسان الفاظ میں بیان کرتے ہیں۔

عقل نے دل سے کہا:

(۱) میں دنیا میں ہر شخص کی رہنمائی کرتی ہوں اور اغلاط سے بچاتی ہوں۔

(۲) حقایق کائنات کو واضح کرتی ہوں اور فطرت کی قوتوں کو آشکارا کرتی ہوں۔

(۳) میری بدولت انسان کو خدا کی ہستی کا علم حاصل ہوتا ہے۔

یہ سنکر دل نے کہا کہ:

(۱) تو راز ہستی کو سمجھتی ہے یا خدا کے وجود پر دلائل قائم کرتی ہے لیکن میں اسے آنکھوں سے دیکھ سکتا ہوں۔ ؎ شنیدہ کے بود مانند دیدہ

(۲) تو صرف حوادث اور مظاہر کائنات سے تعلق رکھتی ہے۔ لیکن میں پردوں کو ہٹا کر باطن تک پہنچ جاتا ہوں تو بیرون در ہے۔ میں محرم راز درون ہوں۔

(۳) تو انسان کو علم عطا کرتی ہے لیکن میں اسے معرفت عطا کرتا ہوں اور سب جانتے ہیں کہ معرفت کا درجہ علم سے بدرجہا بڑھا ہوا ہے۔

(۴) تو خدا کو ڈھونڈتی ہے لیکن میں خدا کو دکھا سکتا ہوں۔

عقل "خدا جو" ضرور ہے لیکن اسے پا نہیں سکتی کیونکہ خدا کو پانا عقل کی طاقت سے باہر ہے۔ اس کے مقابلہ میں دل تو "خدا نما" ہے یعنی دل وہ طاقت ہے جس کی بدولت انسان خدا کو دیکھ سکتا ہے۔

(۵) علم کی انتہا یا اس کا ثمرہ بے تابی اور اضطراب کے سوا اور کچھ نہیں ہے لیکن دل (عشق) انسان کو اطمینان اور تسلی عطا کر سکتا ہے۔

(۶) عقل زمان و مکان کی قید میں رہتی ہے اور کبھی اس قید سے نہیں نکل سکتی لیکن دل عقل کے ان پیدا کردہ تصورات کی حدود و قیود کو توڑ کر سدرۃ المنتہیٰ تک پہونچ جاتا ہے۔ اسی حقیقت کو ۳۲ سال کے بعد اقبالؔ نے یوں بیان کیا ہے۔

خرد ہوئی ہے زمان و مکاں کی زناری نہ ہے زماں نہ مکاں لَآ اِلٰہَ اِلَّا اللّٰہ

(۷) آخری اور سب سے بڑا فرق عقل اور دل میں یہ ہے کہ عقل تو خدا کی ہستی میں شکوک پیدا کرتی رہتی ہے لیکن دل یہ وہ مکان ہے جہاں خود اللہ رہتا ہے۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ خدا عقل کی بدولت نہیں مل سکتا۔ اگر کسی کو خدا سے ملنا ہو تو عشق کا راستہ اختیار کرے۔

صدائے درد

حل لغات اور شرح مشکلات محیط، لغوی معنی احاطہ کرنے والا، مراد ہے، دریا کا پاٹ + قیامت کی نفاق انگیز ہے۔ یعنی بہت نفرت پیدا کرنے والی ہے + سرزمین سے اس جگہ مراد ہندوستان ہے + قرب فراق آمیز، ایسی نزدیکی جس میں دوری بھی شامل ہو + یعنی بظاہر ہندو اور مسلمان ایک دوسرے سے قریب ہیں لیکن اختلاف عقائد کی وجہ سے ان میں دوری بھی موجود ہے + یکرنگی بمعنی وحدت اتحاد یا اتفاق + خرمن۔ لغوی معنی کھلیان مراد ہے ہندوستان + دانوں سے مراد ہے ہندو مسلمان + اخوت بمعنی بھائی چارہ + چمن سے مراد ہے ملک + نغمہ پیرائی لغوی معنی موسیقی، مراد ہے ہندو مسلم اتحاد کا درس + قرب حقیقی بمعنی سچا اتحاد + اختلاط موجہ و ساحل سے مراد ہے تصادم یا اختلاف باہمی + دانہ خرمن نما، یعنی ایسا دانہ جس سے پورے خرمن کا حال معلوم ہو سکے + شاعر معجز بیان، یعنی ایسا شاعر جس کا کلام دوسروں کو عاجز کر دے اور دوسرے اس کی نظیر پیش نہ کر سکیں + واضح ہو کہ اقبال نے شاعر کو دانۂ خرمن نما سے تشبیہ دی ہے۔ کیونکہ شاعر بھی، پوری قوم کی کیفیت کا آئینہ دار ہوتا ہے۔ شاعر کا کلام وہ آئینہ ہے جس میں پوری قوم کی تصویر نظر آسکتی ہے + دانہ کی ہستی سے مراد، دانہ یعنی شاعر کا وجود بھی ہے، اور اس کی قدر و قیمت بھی۔ مطلب یہ ہے کہ اگر قوم ہی کا وجود نہ ہو (ہندو اور مسلمان اگر دونوں مل کر ایک قوم نہ ہو سکیں) تو پھر شاعر کا پیغام اتحاد بھی بے معنی ہے

خود نما اس کے دو معنی ہیں ایک مغرور دوسرے لغوی یعنی اپنے آپ کو ظاہر کرنے والا۔ یہاں دوسرے معنی مراد ہیں + ذوق گویائی۔ یعنی تقریر کی خواہش + آئینہ سے مراد دل، یا طبیعت ہے + جوہر سے مراد صفت یا خوبی ہے + آئینہ کی مناسبت سے جوہر کا لفظ اس مصرع میں بہت موزوں ہے۔ کیونکہ آئینہ کی صیقل کو جوہر سے تعبیر کیا کرتے

ہیں + کب زباں کھولی یعنی ہم نے اس وقت ہندو مسلم اتحاد کا پیغام دیا جب ہندو مسلم فسادات اور منافشات نے ہندوستان کو تباہ کر دیا۔

۱۹۰۵ء سے لے کر ۱۹۴۷ء تک ہندوستان کی تاریخ اقبال کی اسی نظم کی جیتی جاگتی تصویر ہے اقبال نے ہندو مسلمانوں کو ایک ہی خرمن کے دانوں سے تعبیر کیا ہے۔ یہ تصور انہوں نے سر سید احمد خاں مرحوم سے مستعار لیا تھا۔ جنہوں نے ایک تقریر میں یہ کہا تھا کہ :۔ ہندوستان ایک دلہن ہے اور ہندو مسلمان اس کی دو آنکھیں ہیں اور اس کا حسن دونوں آنکھوں کی بقاء پر موقوف ہے اگر ایک آنکھ جاتی رہے تو یہ دلہن کانی ہو جائے گی لیکن اگر کسی کو کانی ہی دلہن پسند ہو تو اس میں بے چارے سر سید یا اقبال کا کیا قصور ہے؟

اقبال اہلِ ملک کی ذہنیت سے اس درجہ مایوس ہو چکے تھے کہ وہ اس دیس ہی کو ترک کر دینا چاہتے تھے۔ اس نظم کے حسب ذیل اشعار جو بانگِ درا میں نہیں ہیں۔ اس حقیقت پر شاہد ہیں:۔

پار لے چل مجھے اے کشتیِ موجِ اٹک — اب نہیں بھاتی یہاں کے بوستانوں کی مہک

الوداع اے سیر گاہِ شیخ شیراز الوداع — اے دیار بالمیکِ نکتہ پرداز الوداع

الوداع اے مدفنِ ہجویریؒ اعجاز دم — رخصت اے آرام گاہِ شنکر جادو رقم

آفتاب ترجمہ گایتری

حلّ لغات اور شرحِ مشکلات: رواں بمعنی جان، زندگی۔ روحِ روانِ جہان یعنی دنیا کی زندگی۔ شیرازہ بند شیرازہ باندھنے والا۔ شیرازہ اصطلاح میں اس سلائی کو کہتے ہیں جس کی بدولت کتاب کے اوراق جلد شکستہ ہو جانے کے بعد بھی منتشر ہونے سے محفوظ رہتے ہیں + دفتر سے اس جگہ کتاب مراد ہے۔ کون و مکان سے یہ کائنات مراد ہے + مصرعہ کا مطلب یہ ہے کہ آفتاب کائنات کی کتاب کا شیرازہ بند ہے۔ اگر وہ نہ ہو تو کائنات تباہ ہو جائے + وجود و عدم فلسفہ کی اصطلاح ہے۔ عدم وجود کی ضد ہے۔ جو شئے معدوم ہے اسے موجود نہیں کہہ سکتے۔ وجود کے لغوی معنی وہ شئے جو پائی جائے + عدم بمعنی نیستی یا نہ ہونا + نمود بہ معنی ظہور + ہست و بود کے لغوی معنی، ہے اور تھا۔ مراد ہے یہ کائنات جس میں ہر وقت ہست و بود کا سلسلہ جاری ہے + عنصر۔ طبیعات کی اصطلاح ہے۔ وہ شے جو دوسری شئے کے لئے بمنزلہ اصل و بنیاد ہو۔ پہلے زمانے میں چار عناصر دریافت ہوئے تھے۔ آگ۔ پانی۔ مٹی اور ہوا۔ جن کو عناصر اربعہ کہتے ہیں۔ لیکن اب ان کی تعداد ۹۲ ہے + "عنصروں کا تماشا" اس سے مراد ہے۔ کائنات میں اشیاء کی تخلیق ترکیب یا ترتیب، جو ہر دم ہوتی رہتی ہے + زندگی کا تقاضا، یعنی زندہ رہنے کی خواہش یا صلاحیت، ثبات بمعنی استقلال، قیام، دوام + سوز و ساز۔ اقبالؔ نے اس ترکیب کو ہر کتاب میں صدہا مقامات پر استعمال کیا ہے۔ آفتاب، سوز و ساز کا سب سے بڑا مظہر ہے۔ سوز بمعنی آتش، حرارت یا جلنا۔ ساز بمعنی موافقت ۔ ضیائے شعور۔ شعور سے یہاں عقل و فہم مراد ہے۔ محفل وجود سے کائنات مراد ہے + ساماں طراز سے منتظم مراد ہے + یزداں ساکنانِ

نشیب و فراز۔ لغوی معنی اے آفتاب تو دنیا کی نیچی اور اونچی جگہوں کے رہنے والوں کا خدا ہے۔ اس مصرعہ میں یہی لغوی معنی مراد ہیں۔ کیونکہ اقبالؔ نے جس منتر کا ترجمہ کیا ہے۔ اس میں آفتاب کو "یزداں" ہی قرار دیا گیا ہے + حیات کا پروردگار۔ یعنی دنیا میں جس قدر زندگی ہے اور جہاں جہاں زندگی ہے وہ سب آفتاب ہی کی بدولت ہے۔ زندگی آفتاب ہی سے پیدا ہوتی ہے۔ زائیدگانِ نور سے فرشتے مراد ہیں + تاجدار سے سردار یا حاکم اعلیٰ مراد ہے + مطلب یہ ہے کہ فرشتے بھی نوری ہیں اور آفتاب بھی نوری ہے۔ بلکہ سراپا نور ہے + آزادِ قیدِ اوّل و آخر، یعنی اے آفتاب تو ازلی ابدی ہے۔ تیری روشنی ابتدا، اور انتہا کی قید سے پاک ہے۔ تو ہمیشہ سے ہے اور ہمیشہ رہے گا +

تبصرہ: اس نظم میں اقبالؔ نے رگ وید کے مشہور اور مقدس ترین منتر کا جسے گائتری منتر کہتے ہیں، آزاد ترجمہ کیا ہے۔ اور اس نظم میں جو خیالات پیش کئے گئے ہیں۔ وہ اقبالؔ کے ذاتی خیالات نہیں ہیں۔ مثلاً آخری شعر میں انہوں نے آفتاب کو ازلی اور ابدی قرار دیا ہے تو یہ انھوں نے منتر کا ترجمہ کیا ہے۔ اپنا عقیدہ بیان نہیں کیا۔

واضح ہو کہ گائتری منتر کو ہندو لوگ رگ وید کی روح سمجھتے ہیں۔ اسی لئے جب کوئی مرنے لگتا ہے تو اس کے پاس بیٹھے ہوئے لوگ اس کی آتما کی شانتی کے لئے گائتری منتر کا جاپ کرتے ہیں۔ رگ وید کے مشہور مفسر سائن آچاریہ نے لکھا ہے کہ رشیوں کی تعلیم یہ ہے کہ اگر کوئی شخص ۴۰ دن تک پانی میں کھڑے ہو کر گائتری منتر کا جاپ کرے تو اس میں روحانی طاقت پیدا ہو جاتی ہے۔

یہ منتر رگ وید کے تیسرے منڈل کے بھجن ۶۲ کے دسویں اشلوک میں آیا ہے۔ اس کے اصلی الفاظ یہ ہیں: "اوم بھو بھوا سُوَ تَت سَوِ تُیر وَرے نیَم بھرگو دیوسیہ دِمی مہی دِھیو یونہا پرچو دیاتِ۔" لفظی ترجمہ یہ ہے: "وہ جو ساری کائنات کا خالق ہے، وہی اس لائق ہے کہ اس کا ذکر، اور دھیان کیا جائے۔ جو ساری چمکیلی اشیاء کا خزانہ ہے، نور کا منبع ہے ہم اسی کا

دھیان (ذکر) کرتے ہیں۔ (اور اس سے پرارتھنا کرتے ہیں کہ) وہ ہماری عقل کو راہ راست پر چلائے۔ (تاکہ ہم نیکی پر عمل کر سکیں۔)

شمع

حلّ لغات اور شرح مشکلات | بزم جہاں، دنیا کی محفل، یعنی دنیا + فریاد در گزر، یعنی سراپا فریاد ہوں رصورت دانۂ اسپند + اسپند کے دانہ کی طرح واضح ہو کہ اسپند کے دانہ کو جب آگ میں ڈالتے ہیں تو وہ زور سے چٹختا ہے اور شعراء اس آواز کو فریاد سے تعبیر کیا کرتے ہیں + حرارتِ سوزِ درون۔ اس عشق کی گرمی جو دل میں پوشیدہ ہو + گل فروشِ اشکِ شفق گوں + شفق کی طرح سرخ آنسوؤں کے پھولوں کا بیچنے والا امراد ہے اس عاشق سے جو محبوب کی جدائی میں خون کے آنسو رو رہا ہو + شمعِ بزمِ عیش، یعنی وہ شمع جو عیش و عشرت کی محفلوں میں جلتی ہے + شمعِ مزار، وہ شمع جو کسی مزار پر روشن ہو + اشکِ غم سے ہمکنار رہی، ہمکنار بمعنی ہم آغوش جب شمع جلتی ہے تو موم پگھلتا ہے۔ اور اس کے قطرے طشت میں گرتے ہیں۔ ان کو شاعر نے شمع کے اشکِ غم سے تعبیر کیا ہے۔

یک بیں۔ لغوی معنی صرف ایک کو دیکھنے والی یہاں یک بیں سے مراد یہ ہے کہ شمع مسجد اور مندر میں کوئی امتیاز نہیں کرتی۔ دونوں جگہ یکساں جلتی ہے۔ دوسری خوبی یہ ہے کہ ہر شمع کی لَو ایک ہی ہوتی ہے۔ اور لَو کو اگر آنکھ فرض کیا جائے تو ظاہر ہے کہ ایک آنکھ سے کوئی شئے دو نظر نہیں آسکتی + صورتِ عاشقانِ راز۔ یہ یک بیں نظر کی صفت ہے کیونکہ عاشقانِ راز کو اس کائنات میں دوسری ہستی نظر نہیں آتی۔ واضح ہو کہ اس مصرعہ میں اقبالؔ نے دنیا کے اس اہم فلسفہ کے بنیادی تصور کی طرف اشارہ کیا ہے۔ جس کی تعلیم یہ ہے کہ اس کائنات میں اللہ کے سوا اور کسی ہستی کا وجود نہیں ہے — سالک جب اس طریق پر گامزن ہوتا ہے تو اس کا پہلا سبق یہ ہوتا ہے کہ وہ ہر شئے

میں اسی کا جلوہ دیکھے۔ دوسرے کے وجود کو تسلیم نہ کرے اس کو اصطلاح میں وحدۃ الوجود کہتے ہیں۔ یہ ۱۹۰۴ء کی نظم ہے۔ ۱۹۳۴ء میں اقبالؔ پر یہ رنگ پوری طرح چھا گیا تھا چنانچہ بالِ جبریل کے اشعار اس پر شاہد ہیں۔

عاشقانِ راز کی ترکیب بھی غور طلب ہے کیونکہ لفظ راز میں یہ راز پوشیدہ ہے کہ مسئلہ وحدۃ الوجود ایک راز ہے جس سے ہر شخص واقف نہیں ہو سکتا۔ یہ راز صرف ان لوگوں پر فاش کیا جاتا ہے جو اس کے اہل ہوں + مایۂ آشوب امتیاز لفظی معنی امتیاز و اختلاف کے ہنگامہ کی پونجی۔ امتیاز تصوف کی اصلاح ہے اس کے معنی ہیں اشیائے کائنات میں امتیاز کرنا۔ اس کی مثال۔

(۱) زید کو اپنا دوست یا بھائی سمجھنا اور رام چندر کو غیر یا دشمن سمجھنا۔

(۲) پھول کو اور بلبل کو اچھا سمجھنا اور کانٹے یا اُلّو کو برا سمجھنا۔

تصوف کی تعلیم اس کے برعکس یہ ہے کہ دنیا میں کوئی غیر نہیں ہے۔ سب اسی کے بندے ہیں۔ اور پھول کی طرح کانٹے میں بھی حُسن ہے۔ وہ بھی پھول کی طرح ایک مظہر ذاتِ باری ہے۔ یعنی جس طرح ایک حسین چیز میں خدا کا جلوہ نظر آتا ہے۔ اسی طرح ایک بدصورت شے میں بھی اسی کی شان دکھائی دیتی ہے۔ چونکہ اس امتیاز سے اختلاف اور اختلاف سے فسادات رونما ہوتے ہیں اس لئے شاعر نے آشوب کا لفظ استعمال کیا ہے + دود سیاہ، کالا دھواں۔ مطلب یہ ہے کہ شمع کی نگاہ میں دیر و حرم دونوں یکساں ہیں۔

آگہی بمعنی شعور، سمجھ + شرر۔ بمعنی چنگاری، شاعر نے آگہی کو شرر سے تعبیر کیا ہے + آتشکدہ وہ جگہ یا مکان جہاں آگ جلتی رہتی ہو۔ پارسیوں کی عبادت گاہ + اصل کشاکش من و تو، یعنی شعور کی بدولت دنیا میں "میں اور تو" کا امتیاز پیدا ہوتا ہے۔ اور اس امتیاز سے اختلافات رونما ہوتے ہیں + اصل بمعنی بنیاد یا سبب۔

دلستان ۔ دلفریب ۔ دل چھین لینے والا + کُن لغوی معنی ہیں "ہوجا" یہ لفظ قرآن مجید کی آیت سے ماخوذ ہے ۔جس کا مطلب یہ ہے کہ جب خدا کسی شئے کے پیدا کرنے کا ارادہ کرتا ہے تو کہتا ہے "کُن" یعنی "ہوجا" فیکون پس وہ شئے موجود ہوجاتی ہے + تپش آموزِ جانِ عشق ۔اس شعر میں دونوں جگہ عشق سے عاشق مراد ہے ۔یعنی کُن کی آواز نے عاشق کی جان میں تپش پیدا کر دی + حجاب وجود لفظی معنی ہیں ۔ وہ حجاب جو وجود کی بدولت لاحق ہو ۔مطلب یہ ہے کہ تصوف کی تعلیمات کی رو سے زید کا وجود ، زید اور خدا کے درمیان حجاب یا پردہ بن جاتا ہے +شام فراق صبح تھی میرے نمود کی + اس مصرعہ میں بھی تصوّف کا رنگ ہے ۔ مطلب یہ ہے کہ جب انسان خدا سے جدا ہوگیا ۔ تب اس کی نمود ہوئی + درختِ طور پر آشیانہ سے مراد ہے وہ زمانہ جب انسان دنیا میں نہیں آیا تھا + قفس کو چمن جانتا ہوں میں ۔اس کا مطلب یہ ہے کہ یہ دنیا دراصل قفس ہے جس میں روح مقید ہے لیکن جہالت یا غفلت کی وجہ سے انسان اس دنیا کو اپنا وطن سمجھتا ہے +غربت بمعنی پردیس ۔ غربت کا غمکدہ مراد ہے دنیا ۔فسردگی ، بمعنی رنج وغم + انتہائے فریبِ خیال سے مراد یہ ہے کہ انسان اس فریب میں مبتلا ہے کہ میں کوئی مستقل ہستی ہوں ۔اور یہ دنیا میرا وطن ہے +مسجود ساکنانِ فلک ، یعنی وہ ہستی جس کو فرشتوں نے سجدہ کیا تھا ۔کنایہ ہے انسان سے ۔ مآل بمعنی انجام یا نتیجہ +مضمون فراق کا ہوں ۔یعنی میری حقیقت یہ ہے کہ میں اپنی اصل (خدا) سے دور ہوں + ثریا نشاں ہوں ۔یعنی اصل کے اعتبار سے زمینی نہیں ہوں ۔ بلکہ خاک سے بہت بلند ہوں +آہنگِ طبعِ ناظمِ کون ومکاں یعنی کون ومکاں کے خالق کی طبیعت سے مناسبت رکھتا ہوں ۔یا خدا سے ایک خاص رابطہ رکھتا ہوں + باندھا ، یہ لفظ مضمون کی رعایت سے لائے ہیں جو پہلے شعر میں ہے ۔مطلب ہے پیدا کیا ۔ یعنی خدا نے مجھ کو اس لئے اپنے سے جدا کیا کہ وہ میری

نمود چاہتا تھا + دیوان ہست و بود سے یہ کائنات مراد ہے + تحریر کردیا یعنی پیدا کردیا + گوہر کنایہ ہے روح سے، مشتِ خاک کنایہ ہے جسم انسانی سے + بندش اگرچہ سُست ہے مضمون بلند ہے ۔ اس مصرع کے دو مفہوم ہیں ۔ ایک ظاہری دوسرا باطنی ۔ شاعری کی اصطلاح میں اگر مصرع کے الفاظ موزوں نہ ہوں یا ان سے مطلب ادا نہ ہو سکے تو کہتے ہیں کہ اس مصرع کی بندش سُست ہے ۔ دوسرے معنی یہ ہیں کہ اگرچہ انسان کی تخلیق پائیدار نہیں ہے ۔ لیکن انسان اپنی ذات کے اعتبار سے بہت بلند ہے ۔

واضح ہو کہ ان تین مسلسل اشعار میں اقبالؔ نے اپنی شاعرانہ قوت کا کمال دکھایا ہے ۔ یعنی استعارات اور کنایات کا ڈھیر لگا دیا ہے ۔

چشم غلط نگر سے مراد یہ ہے کہ انسان حقیقت سے آگاہ نہیں ہے ۔ ورنہ یہ عالم ذراتِ مادی کا کھیل نہیں ہے ۔ بلکہ جلوۂ ذوقِ شعور کا ظہور ہے ۔ یعنی عالم کی حقیقت یہ ہے کہ افراد اپنے ذاتی شعور کا اظہار چاہتے ہیں ۔ اس ذوق کی تسکین کے لئے خدا نے یہ عالم بنایا ہے ۔ لیکن انسان عموماً غلط نگر ہیں ۔ یعنی اس حقیقت سے آگاہ نہیں ہیں ۔ اگر وہ اس حقیقت سے آگاہ ہوتے تو دنیا میں فتنہ و فساد کے بجائے اپنے شعور کی تکمیل کرتے + زمان و مکان کا سلسلہ کمند ہے ، یعنی انسان زمان و مکان کی قید میں ہے اسی قید کو طوق سے تعبیر کیا ہے + طوقِ گلوئے حُسن تماشا پسند ہے یعنی حسن مطلق نے جو تماشا پسند ہے زمان و مکان کو طوقِ گلو بنا دیا ہے ۔ حسن مطلق سے خدا مراد ہے ۔ تماشا پسند اس حسن مطلق یا خدا کی صفت ہے ۔ تصوف کی رو سے خدا اپنی مخلوقات میں اپنا جلوہ دیکھ رہا ہے ۔ اس لئے اسے تماشہ پسند سے تعبیر کیا ۔ یعنی یہ کائنات دراصل وہ آئینہ ہے جس میں حسن (خدا) اپنا تماشا (جلوہ) دیکھ رہا ہے + منزل کا اشتیاق ہے منزل سے مراد وصال ہے ۔ ہر ذرے کی آخری منزل یہ ہے کہ وہ اپنی اصل سے وابستہ ہو جائے ۔

یہ مضمون مرشد رومی کے اس شعر سے ماخوذ ہے:-

ہر کسے کہ دُور ماند از اصل خویش　　　باز جوید روزگارِ وصلِ خویش

اسیر فریب نگاہ ہوں۔ یعنی مجھے دھوکا لگا ہوا ہے کہ میں اپنے آپ کو اس سے جدا سمجھتا ہوں یا اپنے وجود کو مستقل بالذات سمجھتا ہوں + ناز کنایہ ہے معشوق سے اور نیاز کنایہ ہے عاشق سے + راز کہن کنایہ ہے حسین ابن منصور حلّاج کے قول انا الحق سے + راز کہن، آشنائے لب نہ ہو جائے۔ یعنی حلاج کا قول میری زبان پر نہ آجائے۔ قصّہ دار و رسن کنایہ ہے حسین بن منصور کے قتل سے اس شعر میں تلمیح ہے اس قصّہ کی طرف کہ حسین بن منصور نے جوش مستی میں انا الحق کہہ دیا تھا یعنی میں خدا ہوں + اس پر اس کی تکفیر ہوئی اور اسے سولی پر چڑھا دیا گیا مطلب یہ ہے کہ سچی بات تو یہی ہے کہ حق مجھ میں پوشیدہ ہے۔ لیکن میں انا الحق اس لئے نہیں کہتا کہ وہ پرانا قصّہ دار و رسن کہیں پھر تازہ نہ ہو جائے۔

تبصرہ:- یہ نظم ہر اعتبار سے بہت غور طلب ہے۔

(۱) خیالات کی بلندی کے اعتبار سے اس سے زیادہ مشکل نظم ساری کتاب میں نہیں ہے۔

(۲) اس نظم میں اقبالؔ نے وحدۃ الوجود کا فلسفہ پیش کیا ہے۔

(۳) اس کے مطالعہ سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ تصوّف کا مذاق ابتداہی سے اقبالؔ کی طبیعت میں موجود تھا۔ عمر کے ساتھ ساتھ یہ رنگ پختہ تر ہوتا چلا گیا۔

(۴) اس نظم میں اقبالؔ نے شمع کیساتھ اپنا موازنہ کیا ہے۔ انداز بیان بالکل غالبؔ کا سا ہے۔ وہی فارسی تراکیب وہی بندش، وہی مضمون آفرینی، وہی فلسفہ طرازی۔

(۵) اقبالؔ نے اس نظم میں وحدۃ الوجود کی وہ تعبیر پیش کی ہے جو شیخ اکبر حضرت ابن عربیؒ کی تصانیف میں پائی جاتی ہے۔ یعنی

صیّاد آپ حلقۂ دام ستم بھی آپ　　　بام حرم بھی، طائر بام حرم بھی آپ

یہ وحدت الوجود کی وہ شکل ہے جس میں حُسن اور عشق ناز اور نیاز دونوں میں کوئی مغائرت نہیں ہوتی، جیسا کہ غالب نے لکھا ہے۔ ؎

اصل شہود و شاہد و مشہود ایک ہے
حیراں ہوں پھر مشاہدہ ہے کس حساب میں

آگے چل کر یعنی بال جبریل کے زمانہ میں اقبال نے اس تعبیر کو ترک کر کے حضرت مجدد الف ثانی رح کی تعبیر کو اختیار کر لیا تھا جس کی رو سے حُسن اور عشق (خالق اور مخلوق) میں مغائرت ہے۔ اس کی مختصر تشریح ہے:۔

(ا) ابن عربیؒ تو خدا کے علاوہ کسی کا وجود تسلیم ہی نہیں کرتے کائنات کا وجود موہوم ہے۔

(ب) حضرت مجددؒ مخلوقات کا وجود تسلیم کرتے ہیں لیکن یہ وجود ظلّی ہے۔ خدا کے سامنے مخلوقات کے وجود کی کوئی حقیقت نہیں ہے جس طرح دن کے وقت بھی ستارے موجود ہوتے ہیں لیکن آفتاب کے سامنے ان کی کوئی حقیقت باقی نہیں رہتی۔ یعنی نظر نہیں آتے۔ اسی طرح مخلوقات بھی ظلّی طور پر موجود ہیں۔ لیکن خدا کے سامنے ہیچ ہیں۔ اب میں اس نظم کا مطلب سلیس الفاظ میں لکھتا ہوں:۔

اے شمع! اس دنیا میں، میں بھی تیری طرح غمگین ہوں اور شدتِ غم سے نالہ و فریاد کرتا رہتا ہوں۔ تو محبت کی آگ میں جل رہی ہے اور میں فراق میں خون کے آنسو بہا رہا ہوں۔

تیری نظر میں دیر و حرم دونوں یکساں ہیں۔ لیکن میں ابھی تک اپنی نگاہ میں یہ بلندی پیدا نہیں کر سکا۔ تیرے دھوئیں میں آہ کا رنگ پایا جاتا ہے۔ اس سے مجھے یہ گمان ہوتا ہے کہ تیرے سینہ میں بھی عاشق کا دل پوشیدہ ہے تو بھی میری طرح کسی پہ عاشق ہے۔ تو کسی کے فراق میں جل رہی ہے۔ لیکن جو لوگ حقیقت سے آشنا نہیں ہیں وہ تیرے سوز کو نور سمجھتے ہیں۔

یہاں تک شمع اور شاعر دونوں میں مشابہت ہے۔ اب اختلاف شروع ہوتا ہے اس کی تفصیل یہ ہے کہ شمع کو اپنے عشق کا یا محبوب حقیقی سے فراق کا شعور نہیں ہے لیکن انسان کو یہ شعور حاصل ہے اور اس کی وجہ یہ ہے کہ انسان میں آگاہی یعنی شعورِ ذاتی کی صفت پائی جاتی ہے۔ چنانچہ شاعر شمع سے کہتا ہے :۔

تو جل رہی ہے لیکن تجھے خبر نہیں۔ میں بھی جل رہا ہوں لیکن مجھے یہ شعور ہے کہ میں جل رہا ہوں۔ میں شدتِ اضطراب سے تڑپ بھی رہا ہوں اور مجھے اس تڑپنے کا شعور بھی حاصل ہے۔ بات یہ ہے کہ مجھے خدا نے اس بات کا احساس عطا کر دیا ہے کہ میں جل رہا ہوں۔ میری یہ آگہی، میرا یہ شعور ذاتی یا احساس۔ بس یہی تو میری بیقراری کا باعث ہے۔ انسان میں اگر شعور ذاتی نہ ہوتا تو اسے نہ کوئی جستجو ہوتی نہ اضطراب، نہ سوز و گداز، نہ لذتِ فراق، نہ گریۂ نیم شبی، نہ نالۂ سحرگاہی، نہ کشمکش، نہ ہنگامہ۔ انسانی زندگی بھی حیوانات اور طیور کی زندگی کی طرح پرسکون ہوتی۔

اس شعور سے بلندی اور پستی کا امتیاز پیدا ہوا۔ گل میں خوشبو اور شراب میں مستی کا احساس پیدا ہوا۔ کائنات میں ہر قسم کا امتیاز اسی ذاتی شعور کی کارفرمائی ہے۔ جب زید نے کہا کہ میں زید ہوں تو دوسروں کو دیکھ کر یہ کہا کہ یہ مثلاً بکر ہے۔ یہ خالد ہے اور یہ دونوں میرے غیر ہیں۔ مجھ سے جدا ہیں۔ اسی طرح یہ باغ ہے، یہ بلبل ہے، یہ گل ہے، یہ خوشبو ہے۔ اور یہ سب ایک دوسرے سے جدا ہیں۔ اور باہم دیگر مغائر الوجود ہیں۔ (حالانکہ صوفی کی نگاہ میں "بستان و بلبل و گل و بو" ان سب کی اصل واحد ہے۔ اس لئے یہ سب ایک ہی حقیقت کی مختلف شکلیں ہیں جس طرح پانی کو گول برتن میں ڈال دو تو گول نظر آئے گا۔ اور مربع برتن میں چوکور دکھائی دے گا لاصل کے لحاظ سے اشیاء میں اختلاف نہیں ہے)

اقبال نے اس شعر میں اسی نکتہ کو واضح کیا ہے :۔

کمال وحدت عیاں ہے ایسا کہ نوکِ نشتر سے تو جو چھیڑے "
یقیں ہے مجھ کو گرے رگِ گل سے قطرہ انسان کے لہو کا

اس کے بعد اقبالؔ وحدت الوجود کا فلسفہ بیان کرتے ہیں جب تک کوئی شخص اس فلسفہ کے مبادی سے بخوبی واقف نہ ہو وہ اس نظم کو نہ سمجھ سکتا ہے اور نہ اس کے مطالب سے لطف اندوز ہو سکتا ہے۔ افسوس ہے کہ اس مختصر شرح میں ان مباحثِ عالیہ کی تفصیل بیان نہیں کی جا سکتی۔ میں اقبالؔ اور تصوف کے موضوع پر ایک مستقل کتاب لکھوں گا اس میں تفصیل کے ساتھ اس مسئلہ کو بیان کر دونگا۔ انشاء اللہ۔

اب اس نظم کے آخری بند کا جو صبحِ ازل سے شروع ہوتا ہے، مطلب لکھتا ہوں جب اللہ کو یہ منظور ہوا کہ کوئی ہستی ایسی ہو جو میرے حسن و جمال پر شیدا ہو تو اس نے کلمۂ کُن سے یہ کائنات پیدا کی اور حضرت انسان کو اس کا سردار بنایا اور اپنی محبت کی چنگاری اس کے دل میں پوشیدہ کر دی۔

اقبالؔ نے یہ مضمون کُنْتُ کَنْزاً مَخْفِیًا والی حدیث سے لیا ہے۔ یعنی اللہ نے فرمایا کہ میں ایک پوشیدہ خزانہ تھا، میں نے چاہا کہ میں پہچانا جاؤں، پس میں نے مخلوقات کو پیدا کیا۔

لیکن سوال یہ ہے کہ انسان کی روح کہاں سے آئی؟ اس کا جواب یہ ہے کہ روح خدا سے جدا کوئی مستقل وجود نہیں رکھتی۔ کائنات کی ہر شئے میں اسی کی یعنی ذات وصفات کی تجلّی جلوہ گر ہے اور یہ تجلی بدرجۂ اتم اور بطرزِ احسن حضرت انسان میں نظر آتی ہے۔ دوسرے لفظوں میں یوں سمجھو کہ روحِ انسانی اللہ کی آغوش میں تھی، اس سے جدا ہو کر دنیا میں آئی ہے اور جسم انسانی سے وابستہ ہو گئی ہے۔ اب آئندہ اشعار کا مطلب بآسانی سمجھ میں آ سکتا ہے۔

خدا نے انسان کو حکم دیا گلشنِ "کن" کی بہار دیکھ۔ یعنی ہر شئے میں ہمارا

جلوہ دیکھا واضح ہو کہ "اک آنکھ لے کے خواب پریشان ہزار دیکھ۔"

اس مصرع میں "خواب پریشان" کی ترکیب بہت اہم ہے کیونکہ اس میں ہمہ اوست کا راز بیان کیا گیا ہے۔ عقیدۂ ہمہ اوست کی رو سے ہماری حالت اس انسان کی سی ہے جو خواب دیکھ رہا ہو۔ خواب میں انسان جو کچھ دیکھتا ہے اسے بالکل صحیح اور حقیقی اور واقعی یقین کرتا ہے۔ مثلاً زید نے خواب میں دیکھا کہ میں بمبئی گیا ہوں، اور وہاں جاکر میں نے ایک حسین لڑکی سے شادی کی اور شام کے وقت میں موٹر میں سیر کو نکلا .... سڑک پر تصادم ہو گیا۔ یک لخت آنکھ کھل گئی تو نہ بمبئی تھی نہ وہ حسینہ تھی اور نہ وہ موٹر کار تھی۔ لیکن جب وہ خواب دیکھ رہا تھا اس وقت اسے نہ بمبئی کے وجود میں شک تھا اور نہ اس حسینہ کے وجود میں کوئی شبہ تھا۔

بس یہی حالت ہماری ہے۔ ہم سب خواب دیکھ رہے ہیں۔ جب موت آئیگی یعنی جب آنکھ کھل جائے گی تو نہ لاہور ہوگا نہ بانگ درا ہوگی اور نہ اس کی شرح ہوگی۔

ع خواب تھا جو کچھ کہ دیکھا، جو سنا افسانہ تھا

اب آگے بڑھئے اس مصرع کو "اک آنکھ لے کے خواب پریشان ہزار دیکھ" مطلب یہ ہے کہ کائنات میں جو کچھ نظر آتا ہے اس کی حقیقت خواب سے زیادہ اور کچھ نہیں ہے۔

ہر انسان اپنی زندگی میں ہزاروں حادثات اور واقعات سے دوچار ہوتا ہے۔ لیکن یہ تمام حادثات "خواب پریشاں" سے زیادہ کوئی حقیقت یا اصلیت نہیں رکھتے۔ اب آگے چلئے شاعر کہتا ہے کہ یہ تو سچ ہے کہ اللہ نے عشاق کا مجمع پیدا کر دیا۔ لیکن اس تخلیق کا بندہ کے لئے ایک ناخوشگوار پہلو یہ نکلا کہ روح اور خدا میں "وجود" کا حجاب حائل ہو گیا۔ اگر یہ حجاب درمیان سے دور ہو جائے تو پھر بقول اقبال صورت یہ ہو گی کہ ؎

صیاد آپ، حلقۂ دامِ ستم بھی آپ
بامِ حرم بھی طائرِ بامِ حرم بھی آپ

پھر دوئی کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔ اسی نکتہ کو ایک شاعر نے یوں بیان کیا ہے۔

وہ بزمِ یثرب میں آ کے بیٹھیں ہزار منہ کو چھپا چھپا کر
نگاہ عاشق کی دیکھ لیتی ہے پردۂ میم کو اٹھا کر

قصّہ مختصر، جب میری نمود کی صبح ہوئی۔ یعنی جب میرا ظہور ہوا تو محبوب سے جدائی ہوگئی۔ یعنی نمود فراق پر موقوف ہے۔ ہر انسان جو موجود ہے۔ اپنی اصل سے جدا ہو کر اس عالم میں موجود ہوا ہے۔

جب دنیا میں آیا تو جسم کی قید میں بھی آگیا۔ یعنی وہ دن گئے کہ قید سے میں آشنا نہ تھا۔ دنیا میں میری حالت قیدی کی سی ہے۔ لیکن افسوس کہ میں اپنی غفلت کی وجہ سے جیلخانہ "دنیا" کو اپنا وطن سمجھتا ہوں یہی تو وجہ ہے کہ پختہ سے پختہ عمارت بنواتا ہوں۔

ع سامان سو برس کا ہے کل کی خبر نہیں

اب اس نظم کا مشکل ترین حصّہ شروع ہوتا ہے۔ مضمون تو وہی ہے۔ لیکن اندازِ بیان بہت بلیغ ہے۔ اس لئے مضمون الفاظ کے پردہ میں پوشیدہ ہوگیا ہے۔ گویا اس نظم میں الفاظ اور معنی دونوں کا کمال نظر آتا ہے۔ اقبال نے ایک مشکل فلسفیانہ مضمون کو ادا کرنے کے لئے غالب کا مشکل اندازِ بیان اختیار کیا ہے۔

اے شمع انتہائے فریبِ خیال دیکھ، سے لے کر آخری شعر تک ہر مصرع استعارہ کنایہ۔ استعارہ بالکنایہ، مجازِ مرسل اور مجازِ عقلی سے لبریز ہے۔ اقبال نے ہر بات رمز و ایما کے پردوں میں بیان کی ہے۔ تیسری دشواری یہ پیدا کی ہے کہ فارسی تراکیب بکثرت استعمال کی ہیں۔ مثلاً مسجودِ ساکنانِ فلک کا مآل "" آہنگ طبع ناظم کون و مکان۔" بسر دیوان ہست و بود،" عالم ظہور جلوۂ ذوقِ شعور ہے یہ طوقِ گلوئے حُسن

تماشا پسند ہے" ان تراکیب سے مصرعوں میں بلاغت کا رنگ پیدا ہو گیا ہے۔ اور کلام بلیغ کا سمجھنا ہر شخص کا کام نہیں ہے۔

اب شاعر پھر شمع سے خطاب کرتا ہے اور اسے اپنی حقیقت سے آگاہ کرتا ہے۔ اقبالؔ نے حقیقت انسانی کی وضاحت کے لئے خدا کو شاعر قرار دیا ہے اور خطاب کے بعد تین مسلسل اشعار میں شاعری کی اصطلاحوں میں اپنا مطلب بیان کیا ہے۔ خدا کو شاعر قرار دے کر اقبالؔ نے اپنی ذات کو مضمون سے تعبیر کیا ہے کہتے ہیں:-

مضموں فراق کا ہوں ثریا نشاں ہوں میں

لفظ "مضمون" کی رعایت سے جملہ لوازمِ شاعری کا بیان کیا ہے۔ ملاحظہ ہو۔ مضمون۔ آہنگ۔ ناظم۔ باندھا۔ تحریر۔ دیوان۔ بندش۔

اگر پڑھنے والا اس تلازمۂ تصورات کو مدنظر رکھے تو اسے اقبالؔ کی قادر الکلامی کی داد دینی پڑے گی اور یہ نظم انہوں نے ۱۹۰۴ء میں لکھی تھی۔

انسان کیا ہے؟ فراق کا مضمون ہے۔ یعنی اللہ سے جدا ہو گیا ہے۔ اپنی ذات کے لحاظ سے ثریا کی طرح بلند ہے۔ بلکہ خدا سے ہم آہنگ ہے۔ جو لوگ اس عالم کو بالذات شئے سمجھتے ہیں وہ دراصل غلط نگر ہیں۔ حقیقت سے آشنا نہیں ہیں ـــ یہ کائنات کچھ نہیں ہے۔ محض ذوقِ شعور کے جلوہ کے ظہور کی شدت کا نام ہے۔ اگر اللہ کو یہ منظور نہ ہوتا کہ کوئی اسے دیکھے اور اس کی حمد و ثنا کرے" اس سے محبت کرے، تو یہ عالم موجود ہی نہ ہوتا۔ کیوں؟ اس لئے کہ عالم کی اصل وجود نہیں ہے بلکہ عدم ہے۔ اور عدم کا تقاضائے ذات عدم ہی ہوتا ہے۔ نہ کہ وجود یہ تو کسی کے موجود کرنے سے موجود ہوا ہے اور جب اس کی صفتِ تخلیق کی تجلی رک جائے گی۔ تو یہ کائنات اسی طرح معدوم ہو جائے گی۔ جس طرح "ریل" کے رک جانے سے پردۂ فلم پر تاریکی چھا جاتی ہے۔ نہ ثریا کا وجود باقی رہتا ہے۔ نہ مینا کا

بس اس کائنات کی حقیقت اسی قدر ہے کہ دکھائی تو دیتی ہے مگر فی الحقیقت موجود نہیں ہے

ہاں کھائیو مت فریبِ ہستی ہر چند کہیں کہ ہے نہیں ہے

اے شمع! میں اپنی منزلِ مقصود کا مشتاق ہوں۔ اور اس دنیا میں میری کیفیت ایک گم کردہ راہ مسافر کی سی ہے۔ میں گم کردہ راہ کیوں ہوں؟ اس لئے کہ اسیرِ فریبِ نگاہ ہوں۔ سبحان اللہ! اقبال نے ایک مصرعہ میں پوری انسانی زندگی کا خلاصہ بیان کر دیا ہے۔ ہم میں سے ہر شخص بلاشبہ "اسیرِ فریبِ نگاہ" ہے اور نگاہ کی سب سے بڑی آفت عورت ہے اور اس کے حصول کے لئے زر اور زمین کی ضرورت لاحق ہوتی ہے۔ اور دنیا انہی تین برکاتِ عالیہ سے عبارت ہے۔ سارے فتنے انہی کی بدولت پیدا ہوتے ہیں۔

اقبال کہتے ہیں اے شمع! میں اسیرِ فریبِ نگاہ ہوں۔ اور اسی لیے زن زر اور زمین کی محبت میں گرفتار ہوں، یا ان اشیائے کائنات کو اپنے سے غیر تصور کر کے ان کے حصول میں کوشاں ہوں۔ یا من و تو کے امتیاز میں مبتلا ہوں، ورنہ حقیقت یہ ہے کہ میں خود ہی صیاد ہوں، خود ہی صید ہوں، خود ہی حلقۂ دام ہوں۔ خود ہی بامِ حرم ہوں اور خود ہی وہ طائر ہوں جو بامِ حرم پر بیٹھا ہوا ہو۔ خود ہی عاشق ہوں خود ہی معشوق ہوں، خود ہی ناز ہوں، خود ہی نیاز ہوں آخر میں کہتے ہیں کہ مصلحتِ وقت یہی ہے کہ اب خاموش ہو جاؤں مبادا میرے ساتھ بھی وہی معاملہ ہو جائے جو چوتھی صدی ہجری میں حسین منصور حلاج کے ساتھ ہوا تھا۔

ایک آرزو

حل لغات اور شرح مشکلات | دل بجھ ہی گیا ہو۔ اس محاورہ سے مایوسی اور ناکامی کی انتہا کا اظہار ہوتا ہے۔ یعنی وہ حالت جب دل میں کوئی آرزو باقی نہ رہے۔ شورش

بمعنی ہنگامہ۔ عزلت بمعنی تنہائی، چشمے کی شورش سے پانی کی آواز مراد ہے ۔ جو پتھروں سے ٹکرانے کے بعد پیدا ہوتی ہے۔ جہاں نما، اشارہ ہے، جمشید کے ساغر کی طرف جس میں دنیا کا حال نظر آتا تھا۔ جلوت، خلوت کی ضد ہے۔ جلوت بمعنی انجمن یا محفل۔ دیر و حرم، بمعنی بتکدہ یا بت خانہ اور حرم بمعنی مسجد، مرادہ گھنٹہ جو قافلہ کی روانگی سے پہلے بجاتے ہیں۔

یہ نظم اپنی سادگی سلاست، تاثیر یعنی اثر آفرینی اور شاعرانہ خوبیوں کے لحاظ سے بانگ درا کی بہترین نظموں میں سے ہے۔ اقبال نے اس نظم میں شاعرانہ مصوری کا کمال دکھایا ہے۔ ان محاسنِ معنوی کے علاوہ انھوں نے اس میں پاکیزہ خیالات کا اظہار کیا ہے۔

یہ خیالات جن کا اظہار اقبال نے اس دلپذیر نظم میں کیا ہے کم و بیش ہر اُس شخص کے دل میں موجزن ہوتے ہیں جو دنیا اور دنیا والوں کی حقیقت سے آگاہ ہو جاتا ہے۔ اب اس کے بعد عمل کی منزل آتی ہے تو جن لوگوں کی قوتِ ارادی زبردست ہوتی ہے وہ ایک جھٹکے میں سارے تعلقات توڑ کر رکھ دیتے ہیں اور دامن کوہ میں ایک چھوٹا سا جھونپڑا بنا کر اپنی زندگی عزلت میں بسر کر دیتے ہیں اور جو اس نعمت (قوتِ ارادی) سے محروم ہوتے ہیں وہ راقم الحروف کی طرح ترک دنیا کی منصوبہ بندی ہی میں زندگی گذار دیتے ہیں۔

حضرتِ اقبال اگرچہ پورے طور سے اس آرزو کو عملی جامہ نہ پہنا سکے۔ لیکن یہ تسلیم کرنا پڑے گا کہ انھوں نے اپنی زندگی میں بڑی حد تک درویشی، استغنا اور عزلت کی شان پیدا کر لی تھی۔ اور ان کی زندگی میں سادگی تو اس درجہ نمایاں تھی کہ راقم الحروف نے آج تک اس کی نظیر نہیں دیکھی۔

اس نظم کی سب سے بڑی خوبی یہ ہے کہ عزلت نشینی کی آرزو کے باوجود اقبال

دوسروں کے لئے جینا چاہتے ہیں اور یہی ایک مسلمان کی شان ہے کہ وہ دوسروں کو فائدہ پہنچانے کے لیے جیتا ہے۔ اقبال اُن لوگوں کو جو بیہوش پڑے ہیں جگانا چاہتے ہیں اور مجھے خوشی ہے کہ اللہ تعالیٰ نے اپنے فضل و کرم سے ان کی یہ آرزو پوری کر دی آج جو کچھ مسلمانوں میں بیداری نظر آتی ہے یہ سب اقبال کے پیغام ہی کا ثمرہ ہے۔

آفتابِ صبح

حل لغات اور شرح مشکلات شورش میخانۂ انسان۔ انسانوں کی دُنیا کے ہنگامے زینت بزمِ فلک۔ آسمان کی محفل کی زینت۔ دُرِ گوش عروسِ صبح۔ صبح کی دُلہن کے کان کا موتی یا آویزہ۔ سیمائے اُفق۔ اُفق کی پیشانی۔ داغ مداد شب۔ رات کی سیاہی کا داغ۔ نقش باطل، وہ نقش جسے ثبات نہ ہو۔ کوکب ستارہ۔ چشم ظاہر۔ وہ آنکھ جو چہرہ پر ہوتی ہے۔ چشم باطن، دل کی آنکھ مراد ہے۔ دانش یا عقل قیدِ زنجیر تعلق۔ دنیاوی تعلقات کی قید۔ زیر و بالا، پستی اور بلندی۔ اوروں کے غم میں۔ دوسروں کی ہمدردی میں سرشک آباد ہو۔ آنسوؤں سے تر ہو۔ امتیاز ملت و آئین۔ دنیا کے مختلف مذاہب اور قوانین میں امتیاز کرنا۔ اس طرح کہ کسی کو اچھا سمجھنا اور کسی کو برا۔ بستہ رنگ خصوصیت، کسی جماعت سے وابستگی۔ رازِ نظمِ قدرت۔ قدرت کے انتظام کی حقیقت۔ شناسائے فلک۔ یعنی آسمان تک پہنچ سکے۔ شمع تخیل کا دھواں۔ مراد ہے شاعر کا تخیل یا اس کے خیالات عقدۂ اضداد کی کاوش۔ دنیا کے اختلافات کی الجھن یا وہ پریشانی جو اختلافات سے پیدا ہوتی ہے، نیر اعظم یعنی آفتاب، ہمسر یک ذرۂ خاک درِ آدم نہیں۔ یعنی آفتاب انسان کی ہمسری نہیں کر سکتا۔ نور مسجود ملک، یعنی انسان گرم تماشا۔ مصروفِ نظارہ یا مشاہدہ لیلیٰ ذوقِ طلب، یعنی جستجو کا جذبہ جو انسانی فطرت میں داخل ہے کشود عقدۂ مشکل۔ دشوار مسائل کا حل، سعی بے حاصل،

ایسی کوشش جس کا کوئی نتیجہ برآمد نہ ہو۔ دردِ استفہام۔ ذوقِ جستجو۔

تبصرہ جیسا کہ میں مقدمہ میں واضح کر چکا ہوں۔ اقبال اپنی شاعری کے ابتدائی دور میں فطرت کے مطالعہ میں منہمک تھے۔ اس نظم میں تلاش اور جستجو کا جذبہ کارفرما ہے۔ اقبال نے اس بات کو واضح کیا ہے کہ آفتاب ماہتاب اور دیگر مظاہر فطرت میں جستجو کا جذبہ نہیں پایا جاتا یہ صفت صرف انسان میں پائی جاتی ہے۔ اس کے علاوہ انھوں نے اس نظم میں ہمیں ہمدردی نوع انسان کا سبق سکھایا ہے جو اس نظم کا بہت دل کش اور موثر پہلو ہے۔

کہتے ہیں کہ آفتاب دنیا کے ہنگاموں سے دور ہے اس کا وجود آسمان کیلئے باعث زیب و زینت ہے۔ جب وہ طلوع ہوتا ہے تو تاریکی اور ستارے دونوں غائب ہو جاتے ہیں۔ تمام دنیا اس کی روشنی سے منور ہو جاتی ہے لیکن میں اُس روشنی کا طالب ہوں جس سے دل کی آنکھیں منور ہو جائیں۔

آفتاب انسانوں کی طرح مادی اور دنیاوی تعلقات میں گرفتار نہیں ہے اور وہ اس قدر بلند ہے کہ دنیا کی بلندیاں اور پستیاں دونوں اس کے لئے یکساں ہیں۔ شاعر کہتا ہے کہ میں بھی اپنے اندر یہی رنگ پیدا کرنا چاہتا ہوں۔ جس طرح آفتاب کا فیض ہر شخص کے لئے عام ہے کسی کی تخصیص نہیں ہے اسی طرح میں بھی امتیازات سے بالاتر ہو کر زندگی بسر کرنی چاہتا ہوں۔ یعنی میری آرزو یہ ہے کہ میں دنیا میں ہر انسان سے محبت کروں خواہ وہ کافر ہو یا مومن۔ کالا ہو یا گورا، میری ہمدردی کا دائرہ صرف قوم تک محدود نہ ہو۔ بلکہ میں نوعِ انسان کو اپنی قوم سمجھوں اور ساری دنیا کو اپنا وطن سمجھوں مجھے ہر شئے میں خالقِ فطرت کا جلوہ نظر آئے۔

میرے اندر ہمدردی کا ایسا جذبہ پیدا ہو جائے کہ میں دوسروں کی مصیبت سے متاثر ہو سکوں۔ اور عشق کا مسلک اختیار کروں تاکہ حقیقت سے آشنا ہو سکوں

میرے دل میں ساری کائنات کی محبت موجزن ہو اور انسانی ہمدردی کے علاوہ اور کوئی خیال میرے دل میں نہ آئے۔

اے آفتاب! اگر تو دنیا والوں کی مصیبت میں شریک نہیں ہے تو پھر تجھ کو کوئی فضیلت حاصل نہیں ہو سکتی اور اگر تجھ کو اپنے کمالات کا شعور حاصل نہیں تو پھر تو انسان سے ہمسری کا دعویٰ نہیں کر سکتا۔

تجھ میں اور مجھ میں فرق یہ ہے کہ تو ذوقِ جستجو سے محروم ہے، میں حقیقت سے آگاہ ہونا چاہتا ہوں اور اس کے لئے ہر دم کوشاں ہوں۔ مانا کہ مجھے اس میں کامیابی نہیں ہو سکتی۔ لیکن اس سعیٔ بے حاصل میں بھی ایک لطف پنہاں ہے۔ جس سے تو مطلق آشنا نہیں ہے۔ تیرے اندر نہ ذوقِ استفہام ہے اور نہ رازِ قدرت کی جستجو کا مادہ ہے۔

دردِ عشق

حل لغات اور شرح مشکلات | دردِ عشق۔ وہ درد جو عشق کی بدولت دل میں پیدا ہوتا ہے۔ مطلق عشق بھی مراد لے سکتے ہیں۔ گُہر آبدار۔ نہایت حسین موتی نامحرم، وہ لوگ جو عشق کی قدر و قیمت یا لذت سے آگاہ نہیں ہیں۔ دوسرے معنی ہیں وہ لوگ جو مسلکِ عشق کا انکار کرتے ہیں یعنی عقل پرست طبقہ۔ پنہاں تہہِ نقاب تری جلوہ گاہ ہے۔ یعنی اللہ جو محبوبِ حقیقی ہے نگاہوں سے پوشیدہ ہے۔ ظاہر پرست وہ لوگ جو صرف مادہ اور مادیات پر یقین کرتے ہیں۔ اور مادیات سے بالاتر کسی روحانی حقیقت کے معترف نہیں ہیں۔ محفل نو سے مراد ہے اس موجودہ دور کے مادہ پرست جو عشق کی طاقت سے منکر ہیں۔ آئی نئی ہوا۔ نئی ہوا سے مادہ پرستانہ خیالات مراد ہیں۔ جو مغربی تعلیم کی بدولت مشرقی اقوام میں شائع ہو رہے ہیں۔ چمن ہست و بود سے دنیا مراد ہے۔

درون، سینہ، دل کے اندر اشکِ جگر گداز، ایسے آنسو جن سے جگر خون ہو جائے۔ غماز بمعنی چغل خور، یا راز فاش کر دینے والا، گویا بولنے والی۔ نئے بمعنی بانسری۔ حیرت علم آفریدہ۔ وہ حیرت یا پریشانی جو علم کا لازمی نتیجہ ہے۔ واضح ہو کہ علم انسان کے اندر شکوک اور شبہات پیدا کرتا ہے۔ علم سے کسی بات کی حقیقت معلوم نہیں ہو سکتی۔ اس لیے انسان پریشانی اور حیرانی میں مبتلا ہو جاتا ہے۔ اس کے برعکس عشق سے انسان کو اطمینان قلب حاصل ہو جاتا ہے۔ یہی علم اور عشق میں بنیادی فرق ہے اور اسی لئے صوفیا عشق کا طریق اختیار کرتے ہیں۔ جویا بمعنی تلاش کرنے والی۔ نگہ نارسیدہ یا مجاز مرسل ہے۔ اس سے مراد ہے وہ انسان جس کی نگاہ ناقص ہو یعنی ایسا انسان جو عشق سے ناآشنا ہو۔ دیدۂ حکمت پسند سے مراد فلسفی ہے جو انجام کار حیرانی میں مبتلا ہو جاتا ہے۔ کشتۂ نظارۂ مجاز۔ وہ شخص جو ظاہر پرست ہو جس کی نگاہ صرف مادیات تک محدود ہو۔ خلوت سرائے راز سے مراد حقیقت کائنات ہے۔ یا ذات مطلق مئے خیال سے عقلی قیاسات مراد ہیں۔ آج کل کے کلیموں سے فلسفی لوگ مراد ہیں جو صرف عقل پر بھروسہ کرتے ہیں۔

مطلب اس دلکش نظم میں اقبال نے عشق سے خطاب کیا ہے۔ اور اس خطاب کے پردہ میں اس کی فضیلت، اہمیت اور قیمت واضح کی ہے۔ یہ نظم اسی اعتبار سے بہت اہم ہے اور ہماری خاص توجہ کی مستحق ہے کہ اس میں ہمیں اُن تصورات کے ابتدائی نقوش ملتے ہیں جن پر آگے چل کر اقبال نے اپنے فلسفہ کی بنیاد رکھی یہ تصور عشق جو انہوں نے بانگِ درا میں پیش کیا، دراصل وہ تخم ہے جو ارمغانِ حجاز میں ایک تناور درخت بن گیا۔

کہتے ہیں کہ اے عشق! تو ایک گوہر بے بہا ہے۔ اس لئے تو ان لوگوں پر ظاہر نہ ہو۔ جو تیری قیمت سے آگاہ نہیں ہیں۔ اس شعر کا حقیقی مطلب یہ ہے کہ عاشق کو

لازم ہے کہ وہ نااہلوں پر عشق کی حقیقت واضح نہ کرے۔ کیونکہ وہ جذبہ کی تحسین یا تکریم کی صلاحیت ہی نہیں رکھتے۔ جو لوگ مادہ پرست ہیں، خدا کے منکر ہیں۔ مادیت کے پیرو ہیں۔ اُن کے سامنے روحانی حقائق بیان کرنا ایسا ہی ہے جیسے کور مادر زاد کی آنکھوں میں سُرمہ لگانا۔

اے عشق! چونکہ اِس زمانہ کے لوگوں کا زاویہ نگاہ مادہ پرستانہ ہے اس لئے یہ مغرب زدہ لوگ تیری قدر و قیمت کا صحیح اندازہ نہیں کر سکتے یعنی اس زمانہ میں چونکہ لوگوں میں روحانیت کا فقدان ہے اور ظاہر پرستی کا شیوہ عام ہے اس لئے عاشقانِ خدا کو گوشۂ تنہائی اختیار کرنا مناسب ہے۔ خود نمائی۔ تشہیر اور شہرتِ طلبی سے اجتناب کرنا لازمی ہے۔ یہ باتیں سچے عاشقوں کے اصول کے خلاف ہیں۔

اے عشق! یا اے عاشقانِ الہٰی! آج کل کے فلسفی منطقی اور سائنس دان آپ لوگوں سے غافل ہیں بے تعلق ہیں ان کے دل میں آپ حضرات کی کوئی وقعت نہیں ہے ناقص اور خام طبع لوگ مغربی تعلیم کی بدولت بزرگان دین، اور عاشقان الٰہی کی تلاش نہیں کرتے۔ بلکہ اس تلاش کو رجعت پسندی اور اوہام پرستی سے تعبیر کرتے ہیں اسلئے آپ حضرات کو لازم ہے کہ حکمت پسند لوگوں کو وادیِ حیرت میں سرگرداں رہنے دیں یا مادہ پرست دنیا اور بہ زر پرست اور زن مرید لوگ عشق اور عاشقوں کی قدر نہیں کر سکتے" یہ انجمن یہ مادہ پرست دنیا اس لائق نہیں کہ اس میں اللہ کے بندے جہلا کے مجمع میں بیٹھ کر اپنے اوقاتِ عزیز ضائع کریں آج کل ہر شخص اپنے آپ کو ارسطو اور افلاطون کا ہم پایہ سمجھتا ہے اور بزرگوں کی صحبت میں بیٹھنے کو اپنے لئے باعثِ ذلت نیاں کرتا ہے۔

آج کل بھی کلیم پائے جاتے ہیں۔ لیکن ان کا "طور" وہ نہیں جہاں حضرت موسیٰ کو تجلی کی دولت حاصل ہوئی تھی۔ بلکہ ان کلیموں نے دولت کو اپنا کعبۂ مقصود

بنالیا ہے اس لئے عاشقوں کو ان سے دور رہنا چاہیئے۔

گلِ پژمردہ

حل لغات اور شرح مشکلات | موجِ صبا، ہوا کی موج، مراد ہے ہوا۔ گہوارہ جنباں۔ بچوں کا پالنا جو ہل رہا ہو۔ جنباں، جنبیدن کا فعل حال ہے۔ گلِ خنداں، یعنی شگفتہ پھول۔ طبلۂ عطار، عطر فروش کا صندوقچہ۔

اس نظم میں اقبال نے ایک مرجھائے ہوئے پھول کو دیکھ کر اپنے تاثرات کا اظہار کیا ہے کہتے ہیں کہ اے گلِ پژمردہ! تو مرجھا گیا اور مرجھانے کے بعد تیری حالت ایسی دگرگوں ہو گئی کہ اب کوئی شخص تجھ کو پھول نہیں کہہ سکتا۔ تو وہی ہے جو مرجھانے سے پہلے بلبل کا محبوب تھا اور بادِ صبا تیرا گہوارہ ہلاتی تھی۔ تیری وجہ سے نسیمِ صبح خوشبودار تھی اور اسی پر کیا منحصر ہے۔ سارا باغ تیری خوشبو سے مہک رہا تھا گویا عطر فروش کا صندوقچہ تھا۔

اب جبکہ تو مرجھا گیا تو میں تیری موت پر آنسو بہاتا ہوں، اور تیری طرح میرا دل بھی اُداس ہے۔ میرا دل بھی اسی طرح مرجھایا ہوا ہے۔ تو میری زندگی کے خواب کی تعبیر ہے اور میری بربادی کی چھوٹی سی تصویر ہے۔ بات یہ ہے کہ میں یعنی میری روح بھی اصل سے جدا ہو کر تیری طرح پژمردہ اور افسردہ ہو گئی ہے۔

فارسی شعر کا ترجمہ یہ ہے: بانسری کی طرح میں بھی اپنے نیستاں کی حکایت بیان کرتا ہوں۔ اے گل! میری داستان سن! میں اپنے محبوب سے جدائی کی داستان بیان کر رہا ہوں۔

نوٹ:۔ اس نظم کا بنیادی تصور یہ ہے کہ انسانی روح اپنی اصل سے جدا ہو گئی ہے اس لئے رنجیدہ رہتی ہے۔ یہ شعر مرشدی رومیؒ کے اس شعر سے ماخوذ ہے ؎

بشنو از نے چوں حکایت می کند
وز جدائیہا شکایت می کند

اس نظم سے معلوم ہو سکتا ہے کہ اقبال شروع ہی سے تصوف کی طرف مائل تھے اور یہ مذاق ان کے والدین نے پیدا کیا تھا۔

سیّد کی لوحِ تربت

حل لغات اور شرح مشکلات مرغِ جاں۔ اسیر کی رعایت سے جان کو مرغ قرار دیا ہے۔ مرغِ جاں سے مراد جان ہے۔ تارِ نفس سے نفس (سانس) مراد ہے نغمہ پیرا۔ گانے والے۔ گرویدۂ تقریر۔ تقریر کی طرف مائل۔ لوح۔ مزار کا پتھر، جس پر نام اور تاریخ وفات کندہ ہوتی ہے۔ واکرنا۔ کھولنا۔ ہنگامۂ محشر قیامت کا ہنگامہ یعنی بڑا ہنگامہ۔ وصل سے یہاں مراد اتحاد ہے۔ رنگ پر آنا۔ دلکش یا مفید ہونا مدبّر، سیاسی رہنما یا لیڈر۔ ہے دلیری، دستِ اربابِ سیاست کا عصا۔ یعنی سیاسی لیڈر کو جری اور دلیر ہونا چاہیئے۔ بیم دریا۔ خوف اور دکھاوا۔ خامۂ معجز رقم، یعنی وہ شخص جو بے نظیر تحریر لکھنے پر قادر ہو۔ جامِ جم جمشید کا پیالہ، جس میں ساری دنیا کا حال نظر آتا تھا۔ تلمیذِ رحمانی۔ خدا کا شاگرد، شاعر خدا کا شاگرد ہوتا ہے، کیوں کہ شاعری خالص عطیۂ الٰہی ہے۔ اعجاز، وہ بات، جو دوسروں سے ممکن نہ ہو سکے معجزہ، خرمنِ باطل، یعنی باطل، جلانے کی رعایت سے باطل کو خرمن سے تعبیر کیا ہے۔ چونکہ جلانے کا تلازمہ باندھا ہے۔ اس لئے خرمن اور شعلہ کے کے الفاظ لائے ہیں۔

سر سید احمد خاں مرحوم و مغفور انیسویں صدی میں انقلاب ۱۸۵۷ء کے بعد ہندوستان کے مسلمانوں کی مادی اور سیاسی پشت پناہ تھے مولانا محمد قاسم رح

نے دیوبند میں مسلمانوں کے دین کی بقا کے لیے مدرسہ قائم کیا۔ سر سید نے علی گڈھ میں ان کی دنیا سنوارنے کے لئے کالج قائم کیا۔ اگرچہ علی گڈھ تحریک سے اسلام کو اور ضمناً مسلمانوں کو کئی پہلوؤں سے نقصان پہنچا۔ لیکن اس کی ذمہ داری سر سید پر نہیں ہے۔ ان کی نیت بھی نیک تھی اور وہ انگریز پرستی کے بھی خلاف تھے نیز ان کے اندر اخلاقی جرارت تو اس قدر تھی کہ آج کل کے لیڈروں میں اس کا عشر عشیر بھی نظر نہیں آتا۔ اقبال نے سر سید کی زندگی اور اصلاحی کارناموں سے جو اثر قبول کیا۔ اس کو سر سید موصوف کی لوحِ تربت کی زبان سے اس نظم میں ادا کیا ہے۔ یعنی اقبال کی رائے میں سر سید نے اپنی قوم کے علماء، سیاسی قائدین اور شعراء کو حسب ذیل پیغام دیا ہے۔

سر سید علماء کو بایں الفاظ نصیحت کرتے ہیں کہ اگر آپ حضرات اپنی قوم کو دینی تعلیم دینی چاہتے ہیں تو بڑے شوق سے دیجیے، لیکن؛

(۱) دین کے ساتھ ساتھ دنیا کی اہمیت بھی ان کے دماغوں میں جاگزیں کیجیے

(۲) فرقہ بندی سے اجتناب کرنے کی تلقین کیجیے۔ کیونکہ اس سے قوم تباہ ہوجاتی ہے

(۳) تصنیف و تالیف میں دل آزاری کا رنگ پیدا نہ ہونے پائے ورنہ تصنیف کا مقصد فوت ہو جائے گا۔

(۴) اُن باتوں کو زیرِ بحث نہ لائیے جو گذر چکی ہیں۔ اور اب اُن کے دُہرانے سے کوئی فائدہ نہیں ہے۔

اس کے بعد مدبرین (اربابِ سیاست) کو یہ نصیحت کرتے ہیں کہ قوم کے لیڈروں میں دلیری اور اخلاقی جرارت کا پایا جانا پہلی شرط ہے۔ مسلمان کی پہچان یہ ہے کہ نہ وہ ڈرپوک ہوتا ہے اور نہ ریاکار یا منافق اور بادشاہوں

کے سامنے کلمۂ حق کہنے سے بالکل نہیں ڈرتا۔

اس کے بعد شعراء کو نصیحت کرتے ہیں کہ اپنی زبان کو ہجو۔ مذمت اور بدگوئی سے پاک رکھو اور کسی کی خوشامد مت کرو کیونکہ پھر تمہارا کلام بے وقعت ہوجائے گا اور اپنی شاعری کو قوم کے بیدار کرنے اور صداقت کی تبلیغ کے لیے وقف کردو۔

ماہِ نو

حل لغات اور شرح مشکلات | غرقابِ نیل۔ دریائے نیل میں ڈوب گئی روئے آب سیاں کی سطح پر۔ طشتِ گردوں۔ آسمان کا تھال یعنی آسمان۔ خونِ ناب خالص خون۔ نشترِ قدرت یعنی قدرت۔ سیمِ خام۔ کچّا اسلئے نہایت سفید چاندی بانگ درا۔ گھنٹے کی آواز۔ سیارۂ ثابت نما۔ چاند کو سیارۂ ثابت نما۔ اس لئے کہا کہ دراصل چاند گردش کرتا ہے لیکن بظاہر ساکن معلوم ہوتا ہے۔ طفلک سیماب پا بے قرار یا بے چین چھوٹا بچہ۔ مکتبِ ہستی، مراد دنیا ہے۔

تبصرہ | اس نظم میں اقبال نے تشبیہات اور استعارات کی خوبی کو کمال تک پہنچا دیا ہے۔ ماہِ نو کو خورشید کی کشتی کا ٹکڑا" عروسِ شام کی بالی" اور سیمِ خام کی مچھلی" قرار دینا کس قدر انوکھا خیال ہے۔ یہ تشبیہات ان کی قوتِ تخیل کی صناعی کی بہترین مثالیں ہیں۔

مطلب | کہتے ہیں کہ یہ پہلی رات کا چاند ہے یا خورشید کی کشتی کا ایک ٹکڑا ہے؟ یا عروسِ شام کی بالی ہے؟ یا سیمِ خام کی مچھلی ہے؟ یہ شفق کی سرخی ہے یا قدرت نے آفتاب کی فصد کھول دی ہے؟ اس کے بعد ماہِ نو سے خطاب کرتے ہیں اے چاند! تُو ایسی خاموشی سے اپنا سفر طے کرتا ہے کہ انسان تیرے چلنے کی آواز بالکل نہیں سُن سکتا۔ اے چاند! میں اس دنیا میں رہنا پسند نہیں کرتا، اس کی وجہ یہ ہے کہ میں نور کا طالب ہوں اس لئے تو مجھے بھی اپنے ساتھ لے چل تاکہ میں بھی مادی علائق سے بالاتر ہو کر نورانی زندگی بسر کر سکوں۔

انسان اور بزمِ قُدرت

حل لغات اور شرح مشکلات | درخشاں، چمکیلا۔ بزم معمورۂ ہستی مراد ہے

کائنات۔ پرتوِمہر۔ سورج کا عکس یا اس کی روشنی۔ سیم سیّال بہتی ہوئی چاندی کا مطلب یہ ہے کہ جب آفتاب کا عکس دریاؤں میں پڑتا ہے تو پانی بہتی ہوئی چاندی معلوم ہوتا ہے۔ سورۂ والشمس کی تفسیر سے گلزار مراد ہیں کیونکہ پھولوں میں رنگت اور تازگی آفتاب ہی کی بدولت پیدا ہوتی ہے۔ مئے گلرنگ، لال رنگ کی شراب۔ خم شام، شام کا مٹکا' مراد ہے شام، مستور۔ پوشیدہ۔ سطوت، شان وشوکت تقدیر کا اختر جل گیا۔ کنایہ ہے بدنصیبی یا ناکامی سے۔ بود ونبود۔ ہستی اور نیستی یا وجود اور عدم۔ صحیفہ، کتاب۔ اس لفظ میں عظمت اور تقدس کی شان پائی جاتی ہے۔ مثلاً صحیفہ آسمانی۔ یا صحیفۂ قدرت بار جو مجھ سے نہ اٹھا وہ اُٹھایا تو نے۔ اس مصرع میں تلمیح ہے اس آیت کی طرف :۔

اِنَّا عَرَضْنَا الْاَمَانَةَ عَلَى السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ وَالْجِبَالِ فَاَبَيْنَ اَنْ يَّحْمِلْنَهَا وَاَشْفَقْنَ مِنْهَا وَحَمَلَهَا الْاِنْسَانُ ۚ اِنَّهٗ كَانَ ظَلُوْمًا جَهُوْلًا ۙ (۳۳-۷۲)

اور ہم نے (اپنی) امانت کو آسمانوں اور زمین اور پہاڑوں پر پیش کیا۔ لیکن ان سب نے اس کے اٹھانے سے انکار کیا اور اس سے ڈر گئے۔ لیکن انسان نے اس بار (امانت) کو اُٹھا لیا۔ بیشک وہ ظلوم وجہول ہے۔

ہے منتِ خورشید چمک ہے تیری یعنی کائنات تو اپنی چمک دمک کے لیے آفتاب کی محتاج ہے۔ لیکن انسان اپنے روحانی کمالات کے لئے آفتاب کا محتاج نہیں ہے اگر آفتاب نہ ہو تو کائنات اپنا جمال وکمال مطلق ظاہر نہیں کر سکتی۔ لیکن انسان روحانی مدارج طے کرنے کے لیے یا اپنی خودی کو مرتبۂ کمال تک پہنچانے کے لئے آفتاب کا محتاج نہیں ہے۔ زنداں۔ قید خانہ۔ حلقۂ دامِ تمنا سے وہ آرزوئیں مراد ہیں جن میں انسان پھنسا رہتا ہے۔ پابند مجاز، یعنی ظاہر میں، حقیقت سے ناواقف۔ گرم نیاز، وہ شخص جو عاجزی یا ذلت میں گرفتار ہو۔

تبصرہ:۔ یہ نظم اس لحاظ سے بہت اہم ہے کہ اس میں اقبال نے فلسفۂ خودی کا ابتدائی خاکہ یا نقشہ بیان کیا ہے۔ فلسفۂ خودی کی بنیاد یہ ہے کہ انسان اشرف المخلوقات ہے اس کے اندر یعنی اس کی خودی میں روحانی ترقی کی غیر محدود صلاحیت مخفی ہے۔ اور یہی حقائق اقبال نے اس نظم میں بیان کئے ہیں۔

مطلب شاعر کہتا ہے کہ جب صبح کے وقت میں نے آفتاب پر نظر کی تو کائنات سے یہ دریافت کیا کہ اس آفتاب کی بدولت، تجھے اُجالے کی نعمت حاصل ہے اور تیرے اندر جو حسن وجمال ہے، مثلاً یہ باغ۔ پھول۔ رنگ برنگ کے درخت بادلوں کی سرخی شفق کی لالی، یہ سب آفتاب کا فیضان ہے۔ ساری چیزیں آفتاب کے نور سے فیضیاب ہیں۔ پھر یہ بات کیا ہے کہ میں اس نور سے محروم ہوں اور ظلمت میں گرفتار ہوں! میری بدنصیبی اور بدقسمتی کا کیا سبب ہے؟۔

جب میں نے کائنات سے یہ سوال کیا تو غیب سے یہ آواز میرے کانوں میں آئی دکائنات نے زبانِ حال سے یہ جواب دیا) کہ اے انسان! تو غلط فہمی میں مبتلا ہے اس کائنات کی ہستی دراصل تیرے نور سے وابستہ ہے اور اس کی شوکت وسطوت تیری ذات پر موقوف ہے تو اس کائنات کا باغبان (نگہبان) ہے۔ اگر تیری ہستی نہ ہو تو یہ ساری کائنات اُجڑ جائے۔ تو عشق کی کتاب ہے۔ اور یہ کائنات عشق کی تفسیر ہے تو اس کائنات کے بگڑے ہوئے کاموں کو بنانے والا ہے۔ تو نے امانتِ الٰہی (عشق یعنی اطاعتِ احکام الٰہی) کا وہ بارِ گراں اٹھا لیا جو اس ساری کائنات سے نہ اٹھ سکا۔ تو اس کائنات کا سردار اور آقا ہے تو اشرف المخلوقات ہے۔

یہ کائنات نورِ آفتاب کی محتاج ہے لیکن تو اس کا محتاج نہیں ہے۔ اس کائنات کی رونق آفتاب کے دم سے ہے۔ لیکن تیری خودی آفتاب کی دست نگر نہیں

ہے۔ افسوس یہ ہے کہ تو اس دنیا کی فانی دلچسپیوں میں منہمک ہو کر اپنی حقیقت سے غافل ہو گیا۔ تیرا مرتبہ یہ ہے کہ یہ ساری کائنات تیری محتاج ہے۔ لیکن تو طلسم رنگ و بو میں گرفتار ہو کر اس کائنات کا محتاج بن گیا۔ یہ کائنات تیری خادم ہے لیکن تو نے اپنی کوتاہ بینی کی بدولت اس کو اپنا مخدوم بنا لیا۔ در اصل یہ کائنات تیری طالب ہے لیکن تو نے اپنی غلط بینی سے اس کو اپنا مطلوب قرار دے لیا۔ اگر تو اپنی حقیقت سے خبردار ہو جائے تو پھر نہ سپہ لوٹر ہے اور نہ سپہ کار رہے۔

نوٹ:۔ یہ تمام مضمون قرآن مجید کی اس آیت کی تفسیر ہے۔

وَاِذْ قَالَ رَبُّكَ لِلْمَلٰٓئِكَةِ اِنِّیْ جَاعِلٌ فِی الْاَرْضِ خَلِیْفَةً ط

اور جب تیرے رب نے فرشتوں سے کہا کہ میں دنیا میں اپنا خلیفہ بنانے والا ہوں واضح ہو کہ انسان اس دنیا میں اللہ کا خلیفہ ہے اس لئے اشرف المخلوقات ہے یہی آیت اقبال کے فلسفۂ خودی کا سنگِ بنیاد ہے۔

انسان خلیفۃ اللہ ہے۔ یہ ساری کائنات انسان کی خادم ہے۔ اب انسان کا فرض یہ ہے کہ وہ طریق عشق پر گامزن ہو کر اللہ کے احکام کی اطاعت کرے۔ اس اطاعت سے اس کے اندر تسخیرِ کائنات کی طاقت پیدا ہو جائے گی اور جب وہ کائنات کو مسخر کر لے گا تو مقام خلافت و نیابتِ الہیہ پر فائز ہو جائے گا۔ اقبال نے اسرارِ خودی میں اسی نکتہ کی وضاحت کی ہے۔

پیامِ صبح

حل لغات اور شرح مشکلات | لانگ فیلو، مشہور اور ہر دلعزیز امریکن شاعر جس نے انگلستان میں بھی شہرت حاصل کی ۱۸۰۷ء میں بمقام پورٹ لینڈ (امریکہ) پیدا ہوا۔ امریکہ کی مشہور درس گاہوں میں ادبیات عالیہ کا پروفیسر رہا۔ ۱۸۸۲ء میں کافی

شہرت اور عزت حاصل کرنے کے بعد وفات پائی۔ بڑا عالم، بڑا شریف النفس، بڑا شاعر، بڑا فلیشن ایبل اور بڑا رقیق القلب تھا جوانی میں ایک دن شکار کھیلنے گیا اور چڑیا ماری ..... اس کے تڑپنے سے اس درجہ متاثر ہوا کہ پھر ساری عمر بندوق کو ہاتھ نہیں لگایا۔

جبینِ شب کی افشاں۔ شاعر نے رات کو ایک عورت فرض کر کے اس کے ماتھے پر افشاں چنی ہے۔ افشاں پہلے زمانہ میں مقیش بار یک کتر کے دلہن کی پیشانی پر چھڑک دیا جاتا تھا۔ جو موم شمع کی مدھم روشنی میں ستاروں کی طرح چمکتا تھا۔ اب چونکہ دُلہن کا فوٹو اخباروں میں شائع ہوتا ہے اس لئے افشاں چننا رجعت پسندی کی دلیل سمجھا جاتا ہے جبینِ شب کی افشاں کا اُجالا رخصت ہو گیا۔ یعنی صبح ہو گئی۔ یہ مصرع اقبال کے شاعرانہ کمال کی دلیل ہے کہ انھوں نے رات کی تاریکی کے بجائے "افشاں" کا اُجالا کہہ کر اپنا مطلب ادا کیا جبینِ شب کی افشاں سے چھوٹے چھوٹے ستارے مراد ہیں۔ نسیمِ زندگی پیغام لائی یعنی صبح ہو گئی۔ طلسمِ ظلمتِ شب، سورۂ والنور سے توڑا۔ سورۂ نور قرآن مجید کی ۲۴ ویں صورت ہے۔ اقبال نے نورِ آفتاب کو سورۂ نور سے تعبیر کیا ہے۔ مطلب یہ ہے کہ نورِ آفتاب نے رات کی تاریکی کو مٹا دیا شمع شبستان کا تاج زر کنایہ ہے شمع کی لَو سے۔ یعنی جب صبح ہو گئی تو شمع گل کر دی گئی۔ خوابیدگانِ دیر بتخانہ کے وہ پجاری جو رات گئے تک بتوں سے لَو لگائے بیٹھے رہتے ہیں لغوی معنی ہیں بت خانوں یا مندروں میں سونے والے۔ افسونِ بیداری جاگنے کا منتر پہلے زمانہ میں مارگزیدہ پر فی الحقیقت پنڈت لوگ افسون بیداری پڑھا کرتے تھے اس مصرع کا مطلب یہ ہے کہ مندروں کے پجاری بیدار ہو گئے بامِ حرم، مسجد کی چھت، کھٹکا، یہاں اس لفظ سے خوف یا ڈر مراد نہیں ہے۔ بلکہ تصور یا خیال جو عموماً موذن کے دل میں ہوتا ہے کہ مجھے طلوع آفتاب سے پہلے اٹھکر

اذان دیتی ہے گورِ غریباں سے عام قبرستان مراد ہوتا ہے۔

مطلب:۔ جب رات ختم ہوگئی تو زندگی صبح کا پیغام لائی یعنی دنیا میں پھر چہل پہل شروع ہوگئی۔ پرندے اپنے اپنے آشیانوں میں اور کسان کھیتوں کے کنارے بیدار ہوگئے۔ مندروں اور مسجدوں میں پجاری اور نمازی بیدار ہوگئے۔ برہمن نے ناقوس بجایا موذن نے اذان دی۔ باغوں میں نسیم صبح چلی تو غنچے شگفتہ ہونے لگے۔ قافلے فر پر روانہ ہونے لگے۔ جب زندگی قبرستان کی طرف گئی وہاں کا نظارہ دیکھ کر کہنے لگی کہ تم ابھی آرام سے لیٹے رہو، میں پھر آؤں گی، ساری دنیا کو سلادوں گی اور تم کو خواب سے جگادوں گی۔ مطلب یہ ہے کہ جب قیامت کی صبح نمودار ہوگی تو مردے دوبارہ زندہ ہوجائیں گے۔

عشق اور موت

حل لغات اور شرح مشکلات | ٹینی سن، انگلستان کا مشہور شاعر ۱۸۰۹ء میں پیدا ہوا۔ ۱۸۵۰ء میں ورڈسورتھ کی وفات کے بعد ملکہ انگلستان نے اس کو ملک الشعراء کے مرتبہ پر فائز کیا۔ بڑی عمر، بڑی عزت اور بڑی شہرت پاکر ۱۸۹۲ء میں وفات پائی۔ ۱۸۵۰ء اس کی زندگی کا مبارک ترین سال تھا۔ کیونکہ ملک الشعراء کا عہدہ پانے کے علاوہ اسی سال اس نے ایک ایسی بھاگوان عورت سے شادی کی جس نے اس کی زندگی کو مسرت سے لبریز کردیا نیز اسی سال اس نے اپنی مشہور نظم (IN MEMORIAM) شائع کی۔ جس کی بدولت اس کا شمار صفِ اوّل کے شعراء میں ہوگیا۔ ۱۸۸۴ء میں حکومت برطانیہ نے اس کو عوام خانہ سے نکال کر "لارڈ" بنادیا۔

سہانی، دلکش، نمود جہاں، دنیا کی پیدائش کی ابتدا تبسم فشاں، زندگی کی

کلی تھی ۔یعنی دنیا میں حیات کا آغاز ہو رہا تھا۔مہر کو تاج زرمل رہا تھا یعنی آفتاب میں نور اور چمک پیدا ہو رہی تھی۔سبب بیرہن شام کو دے رہے تھے یعنی کارکنانِ قضا و قدر دن اور رات کا نظام قائم کر رہے تھے ،تابندگی ،چمک دمک "کہیں شاخ ہستی کو لگتے تھے پتے" اس مصرع میں لفظ 'کو' خلاف محاورہ ہے ۔اس کی جگہ "میں" ہونا چاہئے ۔ مطلب یہ کہ کائنات میں مختلف اشیاء پیدا ہو رہی تھیں۔شعراء عموماً شبنم کو گریاں اور گل کو خنداں باندھتے ہیں خودی تشنہ کام بیخودی تھی۔خودی انسانی شخصیت یا انفرادی زندگی تشنہ کام ،پیاسی ' مئے بیخودی ،بیخودی کی شراب ،یعنی اجتماعی زندگی مصرعہ کا مطلب یہ ہے کہ اس وقت تک انسان اجتماعی زندگی (قبیلہ یا قوم) سے واقف نہیں ہوا تھا۔کوئی حور چوٹی کو کھولے کھڑی تھی۔کالی گھٹا کو حور کی چوٹی سے تشبیہ دی ہے ۔ زمیں کو تھا دعویٰ کہ میں آسماں ہوں۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ اس وقت تک کائناتِ منظم نہیں ہوئی تھی یا آسمان پیدا نہیں ہوا تھا نیز اس وقت تک مکاں اور لامکاں میں کوئی امتیاز قائم نہیں ہوا تھا ان دونوں مصرعوں کا انداز یا اسلوب بیان بہت اچھا ہے ۔نظارگی لغوی معنی دیکھنا مجازی معنی دیکھنے والا۔مصرعہ کا مطلب یہ ہے کہ دیکھنے محو حیرت ہو جائے جبینوں سے ،نور ازل آشکار : یعنی اُن کی پیشانی سے مقدس نور ظاہر ہو رہا تھا ۔بنتا ہمہ تن کا پتلا تھا یعنی مجسم اضطراب تھا۔قضا مراد موت نہیں آنکھ کو دید تیری گوارا ۔یعنی تیری صورت بہت خوفناک ہے ۔نور مطلق سے خدا مراد ہے، شرر سے مراد ہے عشق ۔

نوٹ :۔ بڑی دل کش نظم ہے اقبال نے اس حقیقت کو کہ عشق پر موت کا قابو نہیں چل سکتا۔بالِ جبرئیل میں یوں بیان کیا ہے :۔

مرد خدا کا عمل عشق سے صاحب فروغ
عشق ہے اصلِ حیات موت ہے اس پر حرام

زہد اور رندی

حل لغات اور شرح مشکلات | صوفی منشی، درویشی، پارسائی، اعالی دادانی
اعلیٰ اور ادنیٰ کی جمع ہے مضمر، بمعنی پوشیدہ لبریز مئے زہد سے تھی یعنی ان کا دل
زہد اور تقویٰ سے لبریز تھا۔ دُرد بمعنی تلچھٹ۔ خیال ہمہ دانی یعنی ان کو یہ غرور تھا کہ
میں بہت بڑا عالم اور خدا رسیدہ ہوں۔ مدت سے رہا کرتے تھے۔ ہمسایہ میں میرے،
یعنی مدت سے میرے ہمسایہ تھے۔ ("ہمسایہ میں رہتے تھے" یہ خلاف محاورہ ہے)
قمری شمشاد معانی۔ معانی کے اصطلاحی معنی تو علم معانی ہیں۔ جو بہت بلند پایہ
علم ہے۔ کیونکہ جب تک ایک شخص ادب اور منطق سے خاص قسم کی مناسبت
نہ رکھتا ہو وہ اس علم کو کما حقہ نہیں سمجھ سکتا۔ یہاں معانی سے فن شاعری مراد ہے
ترکیب کا مطلب یہ ہے کہ اقبال بہت بلند پایہ شاعر ہے۔ رشکِ کلیم ہمدانی،
یعنی کلیم ہمدانی سے بھی بڑھکر ہے کلیم شاہجہاں کے دربار میں ملک الشعراء تھا۔ ۱۰۶۱ھ میں بمقام
سری نگر (کشمیر) وفات پائی۔ تفصیلی حالات آئندہ درج کئے جائیں گے تشیّع، مذہب
شیعہ کی طرف میلان تفصیل علیؓ۔ حضرت علیؓ کو حضرت صدیق اکبرؓ پر فضیلت دینا
خاک اڑانی۔ یہاں اس محاورے سے توہین کرنی مراد ہے۔ حُسن فروش کنایہ ہے
شاہدان بازاری سے تلاوت۔ اصطلاحی معنی قرآن مجید پڑھنا۔ دل دفتر حکمت ہے
یعنی بڑا عالم فاضل ہے۔ خفقانی، سودائی۔ منصور کا ثانی۔ یعنی منصور کی طرح تصوف
کے رموز سے واقف ہے۔ نغز بیانی بلند پایہ اور حقائق سے لبریز گفتگو۔ زرہ قرب
مکانی ہمسائگی کی بنا پر قصور ہمہ دانی، یعنی آپ کی علمیت میں اس سے کوئی نقص
پیدا نہیں ہو سکتا۔ اشک فشانی۔ آنسو بہانا تمسخر۔ ہنسی

دل لگی۔

نوٹ:۔ اس نظم کی خوبی یہ ہے کہ اس میں اقبال نے واقعہ نگاری کا کمال دکھایا ہے انداز بیان میں شوخی اور طنز کی وجہ سے بہت دل کشی پیدا ہو گئی ہے اس نظم میں انھوں نے اپنی ابتدائی زندگی کے بعض پہلوؤں کو بے کم و کاست واضح کر دیا ہے۔ آخری شعر میں انھوں نے زندگی کی ایک بہت بڑی حقیقت کو بے نقاب کیا ہے۔ اس میں کیا شک ہے کہ دنیا میں بہت کم لوگ ایسے گذرے ہیں جنھوں نے اپنی حقیقت سے آگاہی حاصل کی ہے۔ یہ شعر صوفیا کے اس مشہور مقولہ سے ماخوذ ہے۔ مَنْ عَرَفَ نَفْسَهٗ فَقَدْ عَرَفَ رَبَّهٗ یعنی جس نے اپنے نفس کی معرفت حاصل کر لی اس نے اپنے رب (خدا) کی معرفت حاصل کر لی۔

شاعر

حل لغات اور شرح مشکلات | منزل صنعت کی رہ پیما ہیں یعنی افراد ہی سے قوم کی تشکیل ہوتی ہے مطلب اس نظم کا یہ ہے اگر قوم کو جسم فرض کیا جائے تو افراد اس کے اعضاء ہیں اور حکومت اس کا چہرہ ہے اور شاعر اس کی آنکھ ہے۔ جس طرح آنکھ سارے جسم کی ہمدردی ہوتی ہے اس طرح شاعر کے دل میں قوم کے تمام افراد کی محبت جاگزیں ہوتی ہے۔ شاعر کو قوم سے وہی نسبت ہے جو آنکھ کو جسم سے ہوتی ہے۔

لیکن اقبال نے اس نظم میں شاعر سے حقیقی شاعری مراد لی ہے جس کا دل قوم کی ہمدردی سے لبریز ہوتا ہے نہ کہ وہ شاعر جو شاعری کو گذر اوقات کا ذریعہ بناتا ہے اور خوشامد اور ضمیر فروشی سے اپنا پیٹ پالتا ہے۔

دل

حل لغات اور شرح مشکلات | دل۔ یہ اس نظم کا عنوان ہے اور اس سے مراد وہ مضغۂ گوشت نہیں ہے جو ہر شخص کے سینہ میں متحرک ہوتا ہے۔ بلکہ وہ لطیفۂ نورانی ہے جو مرکز عشق ہے۔ اقبال کے یہاں دل سے مراد حقیقت عشق یا قوت عشق ہے، جو عقل کے مد مقابل ہے۔

(۱) قصۂ دار و رسن بازی طفلانۂ دل۔ یعنی عشق کی نگاہ میں سولی پر چڑھ جانا (موت گوارا کر لینا) کوئی مشکل کام نہیں ہے۔ بلکہ عاشق اس کو بچوں کا کھیل سمجھتا ہے التجائے ارنی سرخی افسانۂ دل۔ یعنی عاشق کی داستان حیات کا عنوان یہ ہے کہ وہ خدا سے یہ درخواست کرتا ہے کہ مجھے اپنا جلوہ دکھا دے۔ یعنی دیدار الٰہی کی آرزو اس کی زندگی کا خلاصہ ہے۔

(۲) جادہ ملک بقا ہے خط پیمانۂ دل بقا یعنی ہمیشگی کو ملک فرض کر کے اس کے لئے راستہ ثابت کیا ہے اور دل پیمانہ (ساغر) فرض کر کے، اس کے لئے خط ثابت کیا۔ خط شراب کی مقدار کا اندازہ کرنے کے لئے پیمانہ میں لکیریں بنا دیتے ہیں۔ اس لکیر کو شاعر نے تخیل کی بنا پر واسطہ سے تشبیہہ دی ہے۔ بقا، ضد ہے فنا کی۔ اور عشق کی خاصیت یہ ہے کہ وہ عاشق کو صفت بقا عطا کر دیتا ہے۔ شاعر کہتا ہے کہ جب خط پیمانہ میں بقا کی شان پائی جاتی ہے تو جو شراب اس پیمانہ میں ہے اس کے پینے سے بدرجۂ اتم شان بقا پیدا ہو جائے گی۔ اس شعر میں تجاہل عارفانہ کی صنعت پائی جاتی ہے۔ بظاہر تو سوال کیا ہے لیکن بہ باطن دوسرے مصرعے میں جواب دیدیا ہے کہ "مے" میں شان بقا عطا کرنے کی بدرجہا زیادہ طاقت موجود ہے

(۳) ابر رحمت۔ مراد رحمتِ خداوندی + عشق کی بجلی مراد آتش عشق۔ مزرعہ ہستی

زندگی یا ہستی کی کھیتی + آگاد انہ دل یعنی دل زندہ ہوگیا۔ مطلب یہ ہے کہ جب عاشق اپنا تن، من اور دھن یہ تینوں چیزیں عشق کی آگ میں گرفتار کر دیتا ہے تو اس کا دل زندہ ہو جاتا ہے یا جب عاشق اپنی ہستی کو خاک کر دیتا ہے تو اس میں شان بقا پیدا ہو جاتی ہے۔ اس نکتہ کو شاعر نے تعجب کے انداز میں بیان کیا ہے کہ میں حیران ہوں کہ عشق کو کس چیز سے تعبیر کروں۔ ابر رحمت سے یا بجلی سے؟ ابر رحمت تو اس لئے نہیں کہہ سکتا کہ ہستی جل گئی، بجلی اس لئے نہیں کہہ سکتا دل سرسبز ہوگیا۔ یہ وہ شاعرانہ انداز بیان ہے جس نے شعر میں اس قدر دلکشی پیدا کر دی ہے اور اقبال بلاشبہ انداز بیان پر بڑی قدرت رکھتے ہیں۔

(۴) حسن سے محبوب مراد ہے + گنج گرانمایہ قیمتی خزانہ + ویرانہ دل نہ کھودا۔ یعنی شیریں کو اپنے دل میں تلاش نہ کیا + مطلب یہ ہے کہ فرہاد نے غلطی کی جو شیریں کو حاصل کرنے کے لئے پہاڑ کھودنے کی زحمت اٹھائی۔ اگر وہ اسے اپنے دل میں تلاش کرتا تو کامیاب ہو جاتا۔ شیریں سے بدرجہا زیادہ حسین محبوب تو خود اس کے دل میں پوشیدہ تھا۔ لیکن وہ اس حقیقت سے آگاہ نہ ہو سکا۔ اس لئے شیریں کے حصول میں سرگرداں رہا۔

(۵) مطلب یہ ہے کہ دل چونکہ خدا کا گھر ہے اس لئے مجھے اس پر کبھی عرش کا دھوکا نہیں ہوتا ہے، کبھی کعبہ کا۔ اس شعر کا انداز بیان بہت دلکش ہے۔

(۶) دل کسی اور کا دیوانہ ہے یعنی خدا کا عاشق ہے۔ مطلب یہ ہے کہ میرا دل تو خدا کا طالب ہے اور چونکہ اس طلب کی وجہ سے دل بذاتِ خود نہایت قیمتی اور قابل قدر ہوگیا ہے۔ اس لئے میں اپنے دل پر عاشق ہوگیا ہوں۔

(۷) رشک صد سجدہ ہے یعنی سینکڑوں سجدوں سے بہتر ہے۔ لغزش مستانۂ دل دل کی وہ لغزش جو بحالتِ مستی اس سے سرزد ہو جاتی ہے مطلب یہ ہے کہ عاشقِ صادق

سے اگر بحالتِ مستی کوئی غلطی بھی سرزد ہو جائے تو وہ عشق کی نگاہ میں نیکی سے بڑھکر ہے۔

(۸) خاک کے ڈھیر سے انسان مراد ہے مطلب یہ ہے کہ جو شخص عشق الٰہی میں فنا ہو جاتا ہے اس میں یہ تاثیر پیدا ہو جاتی ہے کہ وہ ان لوگوں کو جو اس کی صحبت میں بیٹھتے ہیں خدا رسیدہ بنا دیتا ہے۔

(۹) مطلب یہ ہے کہ دل کی شان ساری دنیا سے نرالی ہے انسان تو دام میں پھنس کر گرفتار ہو جاتا ہے۔ لیکن دل اگر دامِ عشق میں گرفتار ہو جائے تو (تمام دنیاوی قیود سے) رہا ہو جاتا ہے۔ دل کی حقیقت یہ ہے کہ اگر وہ دنیا کی طرف مائل ہو، تو تصوف کی اصطلاح میں اس میلان کو گرفتاری سے تعبیر کرتے ہیں۔ اور اس گرفتاری سے رہائی کی صورت یہ ہے کہ دل اللہ کی محبت میں فنا ہو جائے۔ اسی طرح اگر کسی درخت یا انسان پر بجلی گر پڑے تو وہ جل جاتا ہے۔ لیکن اگر دل پر (عشق الٰہی کی) بجلی گر پڑے تو سرسبز ہو جاتا ہے

خلاصۂ کلام یہ کہ انسان کا دل عالم مادی سے تعلق نہیں رکھتا اس لئے مادیات کے قوانین اس پر عائد نہیں ہو سکتے۔

موجِ دریا

حل لغات اور شرح مشکلات | دل بیتاب۔ سے یہاں موج کا تقاضائے ذات مراد ہے + عین ہستی۔ یعنی میری ہستی کی حقیقت + صورت سیماب۔ پارے کی مانند پایاب۔ گہر سے پانی کی ضد ہے + حلقہ گرداب۔ یعنی بھنور۔ توسن بمعنی گھوڑا خار ماہی بمعنی مچھلی کی ہڈی۔ جذبِ مہ کامل۔ جب چودھویں کا چاند سمندر پر چمکتا ہے تو قانون قدرت کے مطابق پانی میں تلاطم پیدا ہو جاتا ہے اور موجیں بہت اونچی ہو جاتی ہیں۔ ساحل سے سر پٹکنا۔ یعنی ساحل سے ٹکرانا۔ " محبت ہے مجھے منزل سے "

یعنی ہر موج ساحل تک ضرور پہنچتی ہے۔ پوچھے کوئی میرے دل سے یعنی تڑپنا موج کی خاصیت ہے۔ زحمت تنگی دریا۔ وہ کلفت جو دریا کی تنگی سے پیدا ہوتی ہے گریزاں بھاگنے والا۔

اس نظم میں اقبال نے موج کی کیفیت بیان کی ہے کہ حرکت اور روانی اس کی ذات کا خاصہ ہے۔ اس حرکت کو شاعر نے اضطراب سے تعبیر کیا ہے جس طرح سیماب کو ایک لمحہ کے لئے قرار نصیب نہیں ہوتا۔ اسی طرح موج بھی ہر وقت متحرک رہتی ہے۔ دریا میں کوئی شئے گرداب ہو یا مچھلی موج کی روانی کو نہیں روک سکتی۔ آخری شعر میں حسن تعلیل ہے۔ یعنی موج کی تڑپ کا باعث یہ ہے کہ وہ سمندر کی وسعت کی طالب ہے دریا کی تنگی سے پریشان رہتی ہے۔

رخصت اے بزم جہاں

حل لغات اور شرح مشکلات | اے بزم جہاں۔ اے اہل دنیا۔ آباد ویرانہ اس ترکیب میں صنعت تضاد پائی جاتی ہے۔ کیونکہ آباد ضد ہے ویرانہ کی۔ اقبال نے دنیا کو آباد ویرانے سے اس لئے تعبیر کیا ہے کہ بظاہر آباد ہے لیکن غور سے دیکھو تو اپنا کوئی نہیں۔ سب مطلب کے یار ہیں۔ دراصل کوئی کسی کا نہیں ہے۔ اس لئے شاعر کی نگاہ میں یہ آباد دنیا دراصل ویرانہ ہے۔ درخور محفل نہیں۔ لوگوں کی محفل میں شریک ہونے کے لائق نہیں ہوں کیونکہ افسردہ ہوں۔ اور افسردہ دل افسردہ کند انجمنے را۔

دربار سلطان قید ہے۔ بادشاہوں کا اور نوابوں کا دربار بظاہر بہت دل کش ہوتا ہے لیکن دراصل قید خانہ ہے۔ امیر وزیر اور درباری اور مصاحب جب تک ضمیر فروشی اور خوشامد نہ کریں۔ ترقی۔ انعام اعزاز اور اکرام کوئی چیز حاصل نہیں کر سکتے بادشاہوں اور نوابوں کے دربار میں کوئی شخص اپنی مرضی سے کوئی کام تو درکنار بات بھی نہیں

کر سکتا جیل خانوں میں تو صرف جسم قید میں ہوتا ہے لیکن درباروں میں تو جسم اور روح دونوں بادشاہوں کے غلام ہوتے ہیں۔ میری رائے میں بادشاہوں اور نوابوں کی قربت اور مصاحبت سے بڑھ کر دنیا میں کوئی لعنت نہیں زنجیر طلائی کا اسیر، بادشاہ اور نواب سونے اور چاندی کے زور سے یعنی زر پاشی کی بدولت شریفوں کو اپنا غلام بناتے ہیں خود آرا بمعنی خود پسند اور متکبر اور اپنی آرائش میں مشغول رہنے والا + موج بحر کی صورت چونکہ موجوں کو کبھی ایک لمحہ کے لئے بھی کسی جگہ قرار نہیں ہوتا۔ اس لئے شاعر ہمیشہ موج کو بیتاب اور مضطرب سے تعبیر کیا کرتے ہیں۔ شبستاں بمعنی خوابگاہ۔ وہ کمرہ جس میں دولت مندامرا کے وقت بیٹھتے یا آرام کرتے ہیں عموماً بہت آراستہ پیراستہ ہوتا ہے۔ اور لوازم عیش موجود ہوتے ہیں۔ ہنگامہ عشرت بمعنی عشرت کدہ ظلمت میں روشنی کی جستجو کرتا رہا۔ یعنی اس دنیا میں سکون کی تلاش کرتا رہا + خار میں نظارہ گل ڈھونڈا اس مکار دنیا میں شرافت کی تلاش کرتا رہا + وہ یوسف ہاتھ نہ آیا۔ یعنی اس دنیا میں (جس کے حصول کے لئے ہر شخص اپنا دین و ایمان بیچنے کے لئے تلا ہوا ہے) صداقت، دیانت اور وفا کہیں نہیں پائی جاتی۔

پہلے بند کا خلاصہ یہ ہے کہ یہ دنیا شریف مخلص اور دیانتدار آدمیوں کے رہنے کی جگہ نہیں ہے۔ اس کے حصول کی صورت مکر و فریب کے علاوہ اور کوئی نہیں چونکہ شریف آدمی نا خوشامد کر سکتا ہے نہ ضمیر فروشی نہ مکاری نہ بے ایمانی۔ اسلئے اس کے سامنے صرف ایک ہی راستہ ہے اور وہ یہ کہ سکوت ذہن کوہسار میں گھر بنائے اور انسانوں کے بجائے نرگس گل لالہ اور بلبل کی ہمسائیگی اختیار کرلے چنانچہ اقبال نے دوسرے بند میں زندگی کی تصویر کھینچی ہے۔

سکوت دامن کوہسار۔ پہاڑی کے دامن کی خاموشی اور تنہائی؛

آہ! یہ لذت کہاں موسیقی گفتار میں۔ یعنی جنگل کی خاموش فضا شہروں

کی ہنگامہ پرور محفلوں سے زیادہ دلکش ہوتی ہے + نرگس شہلا، سرخ رنگ کی نرگس جو واقعی بہت حسین ہوتی ہے اور پہلے زمانہ میں شاعر اسے معشوقہ کی نشیلی آنکھوں سے تشبیہہ دیا کرتے تھے۔ (اب نرگس اور صنوبر کا تذکرہ رجعت پسندی کی دلیل ہے)

اس بند کا مطلب یہ ہے کہ دنیا میں ہر شخص کو ہنگامہ اور جلسے محفلیں اور قہقہے پسند ہیں۔ لیکن شاعر کو خلوت اور خاموشی پسند آتی ہے۔ جہاں کوئی انسان نہ ہو صرف فطرت کی گلکاریاں ہوں۔ نرگس اس کی ہم نشین ہو گل اس کا رفیق ہو۔ اور بلبل اس کی ہمسایہ ہو۔ جب نیند آئے تو وہ سبزہ زار پر سو جائے اور صبح کو کوئل بولے تو بیدار ہو جائے۔

پیامی بزم قدرت کا ہوں میں۔ یعنی میں مظاہر فطرت کی ترجمانی کرتا ہوں؛ کائنات میں جس قدر اور جہاں کہیں فطری حسن پایا جاتا ہے شاعر اس کو دیکھتا ہے اس سے متاثر ہوتا ہے اور اپنے تاثرات کو شعر کے لباس میں دنیا کے سامنے پیش کرتا ہے۔ بالفاظ دگر شاعر فطرت کا پیغام رساں ہے + چمن کی خاموشی میں گوش بر آواز ہوں۔ یعنی شاعر صحرا کی خاموش فضا میں بڑے انہماک کے ساتھ فطرت کے حسن و جمال معنوی کا مطالعہ و مشاہدہ کرتا رہتا ہے + نازاں ہوں اپنے گھر پہ میں یعنی میں گوشہ تنہائی کو بادشاہوں کے محلات پر ترجیح دیتا ہوں + دارا ایران کا مشہور بادشاہ جسے سکندر رومی نے ۳۳۱ ق م میں اربیلا کی جنگ میں شکست فاش دی تھی + خندہ زن ہوں۔ یعنی دارا اور سکندر کے تخت شاہی کو حقارت کی نظر سے دیکھتا ہوں + جادو کا اثر۔ یعنی جب انسان مظاہر فطرت پر غور کرتا ہے تو اس کے دل کی گہرائی میں یہ یقین ہوتا ہے کہ یہ کائنات خود بخود موجود نہیں ہوئی ہے بلکہ اسے کسی علیم و حکیم اور قادر مطلق ہستی نے پیدا کیا ہے۔ آخری شعر اس فارسی نظم کا حاصل ہے اور اس کا مطلب یہ ہے کہ راز زندگی فلسفہ سے معلوم نہیں ہو سکتا بلکہ ع گل کی پتی میں نظر آتا ہے راز ہست و بود، یعنی اگر

کسی شخص کے دل میں رازِ کائنات کے معلوم کرنے کا شوق ہو تو اسے لازم ہے کہ وہ فلسفہ کے بجائے فطرت کا مطالعہ کرے۔

طفلِ شیر خوار

حل لغات اور شرح مشکلات | اے نووارد اقلیم غم چھوٹے بچہ کو اس رنج و غم سے لبریز دنیا میں نووارد کہنا۔ اقبال کی صداقت پسندی کی دلیل ہے۔ تیرا آئینہ تھا آزاد غبار آرزو یعنی جب تک تو رحم مادر میں تھا ہر قسم کی آرزو، اور خواہش سے پاک تھا۔ لیکن دنیا میں آتے ہی تیرے اندر آرزوؤں اور تمناؤں کا ایک طوفان برپا ہو گیا اور اب یہ آرزو تیری ہر حرکت سے ظاہر ہوتی ہے + آزادِ قیدِ امتیاز۔ جس طرح فطرت کافر اور مومن، کالے اور گورے میں کوئی امتیاز نہیں کرتی۔ اسی طرح چھوٹے بچے بھی ان امتیازات سے آشنا نہیں ہوتے۔ اس حقیقت کو اقبال نے اس طرح بیان کیا ہے کہ شاید تو فطرت کے طریق عمل سے واقف ہے۔ اسی لئے کسی قسم کا امتیاز پسند نہیں کرتا۔ ہم آہنگ۔ ساتھی متفق۔ ہم خیال + تلون آشنا وہ شخص جسے ایک حالت پر قرار نہ ہو، جو مستقل مزاج نہ ہو۔ تلون کے لغوی معنی ہیں رنگ بدلنا۔ مجازی معنی ہیں مزاج میں استقلال نہ ہونا۔ گاہ بمعنی کبھی، کسی وقت۔

اس نظم کا خلاصہ یہ ہے کہ انسان بھی طفلِ شیر خوار کی طرح متلون المزاج ہوتا ہے۔ عام طور سے بچوں کو نادان کہتے ہیں۔ لیکن غور سے دیکھو تو حضرت انسان بھی نادانی میں بچوں سے کم نہیں ہے۔ وہ بھی بچوں کی طرح عارضی لذت کا شیدائی اور حسن ظاہری کا تمنائی ہوتا ہے نیز عارضی اور فانی چیزوں کے حصول میں حقیقت سے غافل ہو جاتا ہے۔

تصویرِ درد

حل لغات اور شرح مشکلات | نہیں منتِ کشِ تابِ شنیدن + یعنی میری داستان اس قدر درد انگیز ہے کہ کوئی شخص اس کے سننے کی تاب نہیں لا سکتا دستورِ زباں بندی۔ یعنی محفل میں بات کرنے کا حکم نہیں ہے۔ ورق، اس لفظ کے دو معنی ہیں:۔ داستان کی رعایت سے اس کے معنی ہیں کتاب کے اوراق، اور پھول کی رعایت سے اس کے معنی ہیں پھول کی پتیاں، وطالہ کے سینہ میں داغ ہے نرگس کی آنکھ میں آنسو ہیں اور گل کا سینہ چاک ہے اقبال کہتے ہیں کہ یہ دراصل میری ہی حالتِ زار کا نقشہ ہے جو باغ میں نظر آتا ہے۔ ریاض یعنی باغ، میں حرفِ زیرِ لب شرمندہ گوشِ سماعت ہوں۔ یعنی میری حالت اس بات کی سی ہے جو نہ منہ سے نکل سکے، اور نہ کوئی اسے سن سکے۔ کنایہ ہے عاشق کی بے بسی سے کہ وہ معشوق کے سامنے اپنا دردِ دل بیان نہیں کر سکتا + کچھ نہیں کھلتا۔ یعنی یہ نہیں معلوم ہو سکتا کہ میں کیا ہوں۔ میری ہستی قدرت کا مقصد ہے۔ یعنی فطرت نے یہ کائنات میرے لئے پیدا کی ہے اگر میرا وجود نہ ہو تو یہ کائنات بے مقصد ہو جائے گی میں وہ ظلمت ہوں یعنی بظاہر میں خاکی ہوں اور خاک میں ظلمت ہوتی ہے لیکن میری حقیقت خاکی نہیں ہے، بلکہ نوری ہے۔ میں کہاں ہوں۔ یہاں میں سے ذاتِ شاعر مراد نہیں ہے بلکہ انسان، مراد ہے اور اس جملہ کا مطلب یہ ہے کہ دراصل انسان کا مرتبہ بہت بلند ہے۔ کس کی دولت ہوں۔ یعنی میں اس دنیا میں خدا کا نائب ہوں۔ نظر میری نہیں ممنونِ سیرِ عرصۂ ہستی۔ اس شعر میں تصوف کا رنگ ہے یعنی انسان عالمِ صغیر ہے۔ وہ اگر اپنی حقیقت سے آگاہ ہو جائے تو اسے کائنات کی سیر کرنے کی حاجت نہیں رہے گی۔ کیونکہ ساری کائنات خود اس کے اندر

پوشیدہ ہے۔ مولایت کے دو معنی ہیں ایک تو ملک یا اقلیم اور دوسرے معنی جب یہ لفظ تصوف میں استعمال ہو، اس بلند روحانی مقام کے ہیں جو سالک کو ریاضت اور مجاہدہ کی بدولت حاصل ہوتا ہے۔ صہبا بمعنی شراب۔ میخانہ بمعنی یعنی کائنات۔ ہر شئے کی حقیقت ہوں یعنی کائنات کی ہر شئے میرے وجود سے قیمت پاتی ہے اگر میں نہ ہوں تو آفتاب ماہتاب ستارے، سونا، چاندی، دریا، پہاڑ، باغ، صحرا، محلات، عمارات، کاغذ، قلم سب بیکار ہیں۔ رنگین بیانوں سے شعرا مراد ہیں بام عرش کے طائروں سے فرشتے مراد ہیں جنونِ فتنہ ساماں۔ اس ترکیب میں تغزل کا رنگ ہے۔ مراد ہے عشق حقیقی۔ آئینہ دل قضا کا راز داں ہے یعنی جو شخص عشق حقیقی میں فنا ہو جاتا ہے۔ وہ قضا و قدر کے اسرار سے واقف ہو جاتا ہے۔ نظارہ سے مراد ہندو مسلم افتراق ہے۔ جس کو دیکھ کر شاعر کا خون ہو گیا۔ کلکِ ازل۔ کلک بمعنی قلم۔ کلکِ ازل سے تقدیر الٰہی یا مشیت ایزدی مراد ہے + گلچیں سے برطانیہ اور باغبانوں سے ہندو اور مسلمان مراد ہیں۔ عنادل عندلیب کی جمع ہے۔ مراد ہے ہندو مسلمان۔ وظیفہ۔ کثیر المعانی لفظ ہے لغوی معنی ہیں وہ بات یا کام جسے پابندی کے ساتھ بار بار کیا جائے۔ یہاں اس سے مراد ہے کوئی دعا، جو بار بار پڑھی جاتی ہے یہی اس کے عرفی معنی ہیں۔ اسلوب بمعنی طور طریقہ یا طرز۔ ہویدا بمعنی ظاہر ہو رونا یعنی شدت کے ساتھ رونا۔ سوزِ پنہاں سے مراد ہے۔ عشق کی آگ، بکھرے ہوئے دانوں سے ہندو مسلم مراد ہیں۔ سینہ کاوی۔ لغوی معنی سینہ کھودنا۔ مراد ہے۔ دشواریوں میں زندگی بسر کرنا مصائب برداشت کرنا۔ چشم بینا سے وہ انسان مراد ہے جو حقیقت شناس ہو یہ مجاز مرسل کی عمدہ مثال ہے۔ زمانہ کی طبیعت کا تقاضا، یعنی عصر حاضر کا اقتضاء۔ دل بستۂ محفل، یعنی محفل کا گرویدہ دیکھی نہ اس آئینہ میں اپنی ادا۔ یعنی تو نے اپنی حقیقت پر غور نہیں کیا۔ تعصب سے

مراد ہے غیروں کو بُرا سمجھنا نالۂ بیدادِ سوزِ زندگی ہو جا۔ یعنی ان طاقتوں کے خلاف احتجاج بلند کر جو زندگی کے مقاصد کی تکمیل میں خارج ہوں۔ سپند آسا اسپند کے دانہ کی طرح۔ یعنی تو نے اپنے نالہ کو اسپند کی طرح اپنے دل میں بند کر رکھا ہے اسپند کے دانہ کو جب آگ میں ڈالتے ہیں تو وہ چٹختا ہے اور اس سے آواز پیدا ہوتی ہے کفِ آئینہ پر حنا باندھنا۔ یہ محاورہ ہے مطلب اس کا یہ ہے کہ جس طرح آئینہ کو رنگ حنا سے کوئی رابطہ نہیں ہے۔ اسی طرح دل کی صفائی کو رنگ تعلق سے کوئی واسطہ نہیں ہے دنیاداوں سے تعلقات میں خوبی پیدا کرنے سے دل میں صفائی پیدا نہیں ہو سکتی۔ چونکہ آئینہ پر حنا کا رنگ نہیں چڑھ سکتا۔ اس لیئے اس محاورہ کا مطلب بے سود کام کرنا بھی ہو گیا۔ کج بینی۔ غلط بینی یا طریقِ کار کی غلطی۔ مراد احمقانہ طرزِ عمل سطر قرآن سے مراد قرآن مجید کی بنائی ہوئی صحیح تعلیم یا صراطِ مستقیم ہے سطر بمعنی مسطور یا احکامِ قرآن۔ چلیپا بمعنی صلیب مراد کج یا خمیدہ یا راہ راست سے منحرف مثلاً زلفِ چلیپا بمعنی زلف خمدار۔ بت پندار۔ بمعنی غرور کا بت۔ مراد ہے غرور یا خود بینی جس میں ہر تعلیم یافتہ شخص مبتلا ہے اور اس سے نجات کی صورت صحبتِ مرشد کے علاوہ اور کوئی نہیں ہے۔ یوسف سے مراد صداقت ہے یعنی وہ اخلاقی تعلیمات جو تمام مذاہب میں یکساں طور پر پائی جاتی ہیں۔ مثلاً جھوٹ بولنا۔ چوری کرنا۔ فریب دینا زنا کرنا رشوت لینا۔ بلیک مارکیٹ کرنا۔ یتیم کا مال کھانا، غریبوں کو ستانا۔ ہر مذہب میں ممنوع ہے۔ مطلق۔ منطق کی اصلاح ہے۔ مقید کی ضد ہے مطلق وہ جو تمام قیود و حدود سے بالاتر ہو۔ مثلاً اللہ کی ذات مطلق ہے۔ چنانچہ خدا کو ذات مطلق سے تعبیر کرتے ہیں۔ کیونکہ ہم اس پر قیود وارد نہیں کر سکتے قادرِ مطلق میں بھی یہی تصور پوشیدہ ہے۔ مطلق کو مقید کر دیا یعنی مسلمانوں نے رحمت الٰہی کے نزول کو صرف مسلمانوں کے ساتھ مختص کر دیا۔ اقبال نے اسی اختصاص کو قید سے تعبیر کیا ہے

کیونکہ اللہ کی رحمت تو عام ہے۔ وہ رب العالمین ہے۔ اس لئے سب کی پرورش کرتا ہے
بوالہوس یا ابوالہوس۔ لغوی معنی ہوس کا باپ۔ مراد ہے وہ شخص جو سراپا ہوس کا بندہ ہے
اور ۹۹ ۱/۲ فیصدی افراد ہوس ہی کے بندے ہوتے ہیں۔ اللہ کے بندے تو شاذ و نادر
ہی نظر آتے ہیں جم، جمشید کا مخفف ہے جو ایران قدیم کا مشہور بادشاہ گذرا ہے
حکماء نے اس کے لئے ایک جام بنایا تھا جس میں سارے جہاں کا حال نظر آتا تھا فرقہ
آرائی۔ یعنی مختلف گروہوں میں بٹ جانا اور ہر گروہ کا اپنے سوا دوسروں کو برا سمجھنا
جیسے مسلمانوں کے مختلف فرقے ایک دوسرے کو برا سمجھتے ہیں۔ اس کا لازمی نتیجہ تعصب
ہے اور اقبال کی رائے میں کسی قوم کو تباہ کرنے کے لئے فرقہ بندی اور تعصب یہ دو
لعنتیں بالکل کافی ہیں۔ (ماشاء اللہ ہمارے ملک میں فرقہ بندی اور تعصب کے
علاوہ تیسری لعنت بھی موجود ہے یعنی ذات پات کا امتیاز) اسی لئے اقبال نے یہ
شعر لکھا ہے۔

فرقہ بندی ہے کہیں اور کہیں ذاتیں ہیں
کیا زمانہ میں پنپنے کی یہی باتیں ہیں

جنت سے نکلواتا ہے آدم کو۔ چونکہ اقبال نے فرقہ بندی کو شجر سے تشبیہ
دی ہے۔ اس لئے لفظِ شجر کی رعایت سے یہ ترکیب لائے ہیں۔ کیونکہ "شجر" ہی
کے پاس جانے کی بدولت آدم کو جنت سے نکلنا پڑا تھا۔ اس ترکیب نے شعر میں
بہت دلکشی پیدا کر دی ہے۔ ریاض روضہ کی جمع ہے یعنی باغات۔ یہاں اقبال
نے اس لفظ کو شجر کے معنی میں استعمال کیا ہے۔ اقبال نے مرہم کو مؤنث باندھا ہے
لیکن دلی والے اس کو مذکر قرار دیتے ہیں۔ مجروح تیغ آرزو۔ یعنی اگر انسان
روحانی اور اخلاقی اعتبار سے ترقی کرنا چاہتا ہے تو اسے اپنے دل میں "آرزو"
یا بلند ارادہ یا مقصد پیدا کرنا چاہیئے۔ یہ نکتہ اقبال کے فلسفہ میں بنیادی حیثیت

رکھتا ہے، چنانچہ انھوں نے اسرار خودی میں اس کو بڑی وضاحت کے ساتھ لکھا ہے میں صرف ایک شعر اس جگہ نقل کرتا ہوں۔ ؎

ماز تخلیقِ مقاصد زندہ ایم　　　از شعاع آرزو تابندہ ایم

یعنی انسان کی زندگی تخلیق مقاصد پر موقوف ہے جس کے دل میں آرزو نہیں وہ شخص مُردوں کی طرح ہے۔ آزاد احسان رفو۔ یعنی جرّاح کا احسان گوارا نہ کرنا۔ شراب بیخودی سے مراد یہ ہے کہ جب میں نے اپنی انفرادیت کو ملت میں گم کر دیا تو مجھ میں آسمان تک اڑنے کی طاقت پیدا ہو گئی، شکستن رنگ سے مراد یہ ہے کہ تمام ظاہری امتیازات سے کنارا کشی کی بدولت میرے اندر یہ صفت پیدا ہو گئی کہ میں نے بنی آدم کے دلوں میں مثل بو گھر بنا لیا ہے۔ یعنی جب میں ہر شخص کو اپنا بھائی سمجھتا ہوں تو لامحالہ ہر شخص مجھ سے محبت کرتا ہے۔ اسیر امتیاز ما و تو۔ یعنی اپنی قوم یا جماعت کو اپنا عزیز اور دوسری قوموں کو غیر، یا دشمن سمجھنا۔ ساغر سے مراد خود ذات حباب ہے، حباب ہے یعنی بلبلہ کی ساخت ایسی ہے کہ وہ ساغر سرنگوں (اوندھا پیالہ) معلوم ہوتا ہے۔ شاعر نے اس جگہ حسن تعلیل سے کام لیا ہے۔ یعنی اس کی ہیئت کی علت یہ بتائی ہے کہ حباب چونکہ مستغنی (بے نیاز) ہے اس لئے عین دریا میں رہ کر بھی دریا سے طالب آب نہیں ہوتا۔ او بیگانہ خواہ ہندو اور مسلمان مخاطب ہیں۔ جن کے دل تعصب سے لبریز ہیں۔

بخت خفتہ۔ سویا ہوا نصیبا۔ مطلب یہ ہے کہ جب کسی قوم کے افراد میں محبت کا رنگ پیدا ہو جاتا ہے تو قوم ترقی اور سربلندی سے ہمکنار ہو جاتی ہے دنیا کی کوئی حکومت یا طاقت اس قوم کو غلام نہیں بنا سکتی جس کے افراد میں باہمی محبت کا رنگ پایا جاتا ہو۔ علاج گردش چرخ کہن۔ یعنی حوادث و مصائب روزگار پر غالب آنے کی طاقت۔ دل کے جلانے سے محبت کرنا ہے۔ سراپا نور ہو جانا۔ یعنی مادی یا سفلی خواہشات سے بالاتر ہو جانا۔ روحانیت کے بلند مقام پر فائز ہو جانا۔ بیستوں، ایران میں ایک پہاڑ کا نام ہے۔ بعض

لوگوں کا یہ خیال ہے کہ شیریں کا محل اسی پہاڑ کے دامن میں واقع تھا اور فرہاد نے اسی کو کھود کر نہر نکالی تھی۔ تمیز ملت، و آئین سے مذہبی اختلاف مراد ہیں۔

نظم پر تبصرہ | یہ دل کش نظم اقبال نے ۱۹۰۴ء کے آغاز میں لکھی تھی۔ جب ان کی عمر ۳۰ سال کے قریب تھی۔ یہی وجہ ہے کہ اس نظم میں بھی جوانی کا رنگ نمایاں ہے یہ وہ زمانہ ہے جب اقبال پر وطن دوستی کا رنگ غالب تھا۔

اس نظم میں اقبال ایک وطن پرور (نیشنلسٹ) کی شکل میں قوم کے سامنے آتے ہیں اور جو رنگ ہمالہ نیا شوالہ اور ترانہ ہندی میں پایا جاتا ہے۔ وہی رنگ پوری شدت کے ساتھ اس نظم میں نظر آتا ہے۔ انھوں نے دل کھول کر اہلِ وطن کی نفاق انگیز روش پر نوحہ خوانی کی ہے۔ اور انہیں صاف لفظوں میں متنبہ کیا ہے۔ کہ اگر تم نے آنے والی مصیبت کا اندازہ کر کے آپس میں اتحاد نہ کیا تو تم مٹ جاؤ گے اور ع۔

تمہاری داستاں تک بھی نہ ہوگی داستانوں میں

بد قسمت وطن کی حالتِ زار انہیں اس درجہ متاثر کرتی ہے کہ وہ ہر وقت اسکے تاریک مستقبل پر آنسو بہانا چاہتے ہیں اس میں کوئی شک نہیں کہ اس نظم میں ایک سچے محبِ وطن کی مضطر روح آہ و فریاد میں مصروف نظر آتی ہے اور جو اشعار اس کے دل کی گہرائیوں سے نکلے ہیں وہ ہر محبِ وطن کو متاثر کر دینے کے لئے کافی ہیں۔ جس بند کا پہلا شعر یہ ہے۔

رلاتا ہے ترا نظارہ اے ہندوستاں مجھکو
کہ عبرت خیز ہے تیرا فسانہ سب فسانوں میں

یہ پورا بند اقبال کے وطن پرورانہ جذبات کا بہترین مرقع ہے۔
اس نظم میں آٹھ بند ہیں۔ ہم ہر بند کا مطلب جدا گانہ لکھیں گے۔

پہلا بند:۔ اس بند میں تمہید کا رنگ ہے۔ کہتے ہیں کہ میری داستان اس قدر دردناک ہے

کہ بہت کم لوگ اس کے سننے کی تاب لا سکتے ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ میں نے خموشی کو اپنا شیوہ بنا لیا ہے۔ قوم کے افراد اس قدر بے حس ہو گئے ہیں کہ وہ میری فریاد سننا نہیں چاہتے یہی وجہ ہے کہ میری زبان بات کرنے کو ترستی ہے۔ مطلب یہ کہ کوئی سننے والا نہیں ہے لالہ کے داغ جگر سے نرگس کی اشک فشاں آنکھوں سے اور گل کی سینہ چاکی سے میرے سوز دروں اور بیتابیٔ دل کا کچھ اندازہ ہو سکتا ہے۔ اور قمریوں، طوطیوں اور بلبلوں کے نغموں میں یہ سوز وگداز میری ہی طرزِ فغاں کی تقلید سے پیدا ہوا ہے۔ میری داستان اس قدر درد انگیز ہے کہ اگر شمع کو سناؤں تو وہ بھی رونے لگے۔

اے خدا! اندریں حالات اس دنیا میں جینے کا کیا فائدہ ہے۔ نہ زندگی میرے اختیار میں ہے نہ موت۔ اگر زندگی اختیار میں ہوتی تو میں ہمیشگی کی صفت پیدا کر لیتا اور اگر موت اختیار میں ہوتی تو ابھی مر جاتا۔ کیونکہ اب جینے میں کوئی لطف باقی نہیں ہے۔ میری گریہ وزاری اور میری بربادی دراصل ساری کائنات کی بربادی ہے کیونکہ انسان اشرف المخلوقات ہے جب وہ فنا ہو گیا تو سمجھو کہ ساری کائنات فنا ہو گئی ؎

دریں حسرت سرا عمریست افسونِ جرس دارم
ز فیضِ دل تپیدن ہا خروشِ بے نفس دارم

اقبال نے اس شعر کو ایک باکمال آرٹسٹ کی طرح پہلے بند کا آخری شعر بنایا ہے کیونکہ اس شعر میں اس بند کی روح سمٹ کر آ گئی ہے یہی وجہ ہے کہ یہ شعر ایسا معلوم ہوتا ہے گویا کسی کاریگر نے انگوٹھی میں نگینہ جڑ دیا ہو۔ مطلب اس کا یہ ہے کہ اس دنیا میں ایک مدتِ دراز سے میری کیفیت وہی ہے جو جرس کی ہے یعنی وہ بظاہر خاموش ہے لیکن اس کے اندر شور پوشیدہ ہے۔ اسی طرح میں بظاہر خاموش ہوں لیکن بقول غالب:

بھرا ہوں میں نغموں سے یوں راگ سے جیسے باجہ
اک ذرا چھیڑیئے پھر دیکھئے کیا ہوتا ہے

دوسرے مصرعہ کا مطلب یہ ہے کہ عشق۔۔ سے تپش دل پیدا ہوئی اور اس تپش دل کا نتیجہ یہ نکلا کہ میری شخصیت خروش۔ بے نفسی کا خزانہ بن گئی یعنی میرے سینے میں آہ و فریاد کا ایک طوفان پوشیدہ ہے لیکن بظاہر میں خاموش ہوں۔

دوسرا بند:۔ دوسرے بند میں شخصی رنگ پایا جاتا ہے اس میں شاعر نے اپنی شخصیت اور اپنے مقام کو واضح کیا ہے۔ کہتے ہیں کہ مجھے دنیا کی خوشیوں سے کوئی حصہ نہیں ملا خوشی بھی میری محرومی پہ روتی ہے اسی طرح گویائی بھی میری بدنصیبی پر ماتم کرتی ہے کہ کوئی شخص میری داستان غم سننے کو تیار نہیں ہے۔ میں بہت پریشان ہوں لیکن اس عقدہ کو حل نہیں کر سکتا کہ میں کون ہوں؟ سکندر (فاتح کائنات یا سردار عالم) ہوں یا آئینہ (کسی دوسری ہستی کا خادم ہوں) گرد کدورت (محض بیکار شئے) ہوں؟ یہ سب کچھ ہے لیکن میں اتنا ضرور جانتا ہوں کہ میں محور موجودات اور مرکز کائنات ہوں۔ میری ہستی قدرت کا مقصد ہے اگر میں نہ ہوں تو یہ ساری فطرت بیکار ہو جائے گی یہ سب کچھ میرے ہی لئے پیدا کیا گیا ہے۔ بظاہر ظلمت (مشت خاک) ہوں۔ لیکن میری حقیقت خاکی نہیں ہے نوری ہے۔ میری مثال اس خزانہ کی سی ہے جو کسی صحرا میں پوشیدہ ہو۔ بلاشبہ دنیا میں بہت کم لوگ انسان کے حقیقی مقام سے آگاہ ہیں۔ اگر کوئی شخص غور سے دیکھے تو انسان عالم صغیر ہے۔ جو کچھ ساری کائنات میں ہے وہ سب انسان میں موجود ہے اور جو شخص، اس حقیقت سے آگاہ ہو جاتا ہے کہ سب کچھ اندر ہی موجود ہے وہ پھر باہر کی اشیاء کو دیکھنے سے بے نیاز ہو جاتا ہے۔!

میں وہ چھوٹی سی دنیا ہوں کہ آپ اپنی ولایت ہوں"۔ یہ مصرعہ اس قدر بلیغ ہے کہ شرح سے بالاتر ہے اگر انسان اپنے دل کی سیر کرے تو اسے اس کے اندر ساری کائنات کا جلوہ نظر آئے گا۔ اس لئے وہ اس خارجی دنیا کی سیر سے بے نیاز ہو جانے گا اگر اس کائنات کو میخانہ فرض کیا جائے تو انسان نہ تو شراب ہے نہ ساقی ہے نہ مستی ہے

نہ پیمانہ ہے۔ بلکہ اس میخانہ میں جسقدر اشیاء نظر آتی ہیں۔ انسان ان سب اشیاء کی حقیقت ہے یعنی سب کچھ وہی ہے سب کچھ اسی کی بدولت ظہور میں آیا ہے۔ اگر وہ نہ ہو تو پھر کسی شئے کی کوئی قدر و قیمت نہیں ہے۔ کوئی مصرف نہیں ہے۔ کوئی مقصد نہیں ہے میں اپنے دل کے آئینہ میں ساری کائنات کا راز دیکھ سکتا ہوں۔ یعنی انسان کا دل وہ آئینہ ہے جس میں ساری کائنات منعکس ہے اور یہی وجہ ہے کہ میں جو دیکھتا ہوں وہی بے کم و کاست بیان کرتا ہوں۔

نوٹ:۔ اس بند کے چار اشعار میں اقبال نے تصوف کے حقائق و معارف بیان کئے ہیں اور اگر کوئی شخص ان اشعار کو:۔

یہ سب کچھ ہے مگر ہستی مری مقصد ہے قدرت کا

سراپا نور ہو جس کی حقیقت میں وہ ظلمت ہوں

سے لے کر "میں اس میخانہ ہستی میں ہر شئے کی حقیقت ہوں" غور سے پڑھے گا تو اسے اقبال کے فلسفۂ خودی کے ابتدائی نقوش بھی نظر آسکتے ہیں۔ افسوس ہے کہ میں اس مختصر شرح میں ان باتوں کی تفصیل بیان نہیں کر سکتا۔ بس اس قدر کہنے پر اکتفا کرتا ہوں کہ یہ شعر:۔

نہ صہبا ہوں نہ ساقی ہوں نہ مستی ہوں نہ پیمانہ

میں اس میخانہ ہستی میں ہر شئے کی حقیقت ہوں

مرشد رومی کے اس شعر سے ماخوذ ہے:۔

قالب از ما ہست شد نے ما ازو

بادہ از ما ہست شد نے ما ازو

یعنی شراب کی وجہ سے ہمارے اندر مستی پیدا نہیں ہوتی بلکہ ہماری وجہ سے شراب میں مستی پیدا ہوئی ہے۔

تیسرا بند:۔ اس بند میں اقبال نے اہل وطن کو متنبہ کیا ہے کہ اگر وہ عصرِ حاضر کے تقاضوں سے بے خبر رہے تو مصائب کا نزول یقینی ہے چنانچہ کہتے ہیں کہ خدا نے مجھ کو شعرا کی صف میں وہ مقامِ بلند عطا کیا ہے کہ میں فرشتوں کا ہم زبان ہوں اور میرا دل قضاء و قدر کے اسرار کا آئینہ بن گیا ہے۔ اس کے بعد ہندوستان سے خطاب کرتے ہیں کہ تیرے باشندوں کا طرزِ عمل، مصلحتِ وقت کے اس قدر خلاف ہے کہ میں آئندہ مصائبؑ کا تصور کر کے لرزہ بر اندام ہو جاتا ہوں اور بے اختیار میری آنکھوں سے آنسو رواں ہو جاتے ہیں۔ اگر باغبان (ہندو مسلم) اسی طرح آپس میں لڑتے رہے تو گلچیں (انگریز) اس باغ کو ضرور تاراج کر دے گا۔ اس کے بعد اہل وطن سے خطاب کرتے ہیں کہ دشمن تمہیں برباد کرنے کی فکر میں لگا ہوا ہے اس لئے عہدِ کہن کی داستانوں کو چھوڑ کر مستقبل کی فکر کرو۔ عہدِ کہن کی داستانوں سے مسلمان بادشاہوں سے فرضی مظالم کی وہ داستانیں مراد ہیں جو ہندو مورخین نے دیدہ و دانستہ اپنی تصانیف میں درج کی ہیں تاکہ ہندوؤں کے دلوں میں مسلمانوں کے خلاف نفرت کے جذبات پیدا ہوں۔

اے اہلِ وطن! ان لوگوں کے خلاف صدائے احتجاج بلند کرو جو ہندوستان کی مختلف اقوام میں منافرت پیدا کر رہے ہیں۔ اگر تم نے ایسا نہ کیا تو یقیناً مٹ جاؤ گے کیونکہ آئینِ قدرت یہی ہے کہ خدا اسی شخص کی مدد کرتا ہے جو امن و امان قائم کرنے کے لئے جدوجہد کرتا ہے۔

چوتھا بند:۔ اس بند میں اقبال نے یہ بات بیان کی ہے کہ کوئی سنے یا نہ سنے میں اپنی سی کوشش ضرور کروں گا میں اپنا دردِ دل اہل وطن کو ضرور سناؤں گا۔ میں اس ملک سے نفرت اور عداوت کی ظلمت کو ضرور دور کروں گا اور اپنی ساری قوتوں کو اہل وطن کے بیدار کرنے میں صرف کر دوں گا۔ بیشک منتشر افراد کو ایک پلیٹ فارم پر جمع

کرنا بہت مشکل کام ہے لیکن میں کوشش کروں گا کہ یہ مشکل آسان ہو جائے اور اقوام ہند میں اتحاد پیدا ہو جائے ۔ میں سب کو وطن کی محبت کا سبق پڑھاؤں گا اور جو حقیقت مجھ پر منکشف ہو گئی ہے کہ اتحاد ہی سے ہم کامیاب ہو سکتے ہیں۔ اس کو سب لوگوں پر ظاہر کروں گا۔

پانچواں بند: اس بند میں اقبال نے اقوام ہند کو یہ تلقین کی ہے کہ اپنے زاویۂ نگاہ میں وسعت اور خیالات میں بلندی پیدا کریں اور تعصب کو اپنے دل سے بالکل نکال دیں۔ کہتے ہیں کہ اے مخاطب! مجھے افسوس ہے کہ تو نے اپنے خیالات میں وسعت پیدا نہیں کی۔ ساری عمر پست خیالات میں بسر کر دی۔ تو نے اپنی جماعت کے تنگ حلقہ میں زندگی بسر کی نہ بجز ممالک اور دیگر اقوام کے طرز عمل کا مطالعہ نہیں کیا اور نہ تو نے کبھی اپنی حقیقت پر غور کیا کہ خدا نے تجھ کو بلند مقاصد کے حصول کے لئے پیدا کیا ہے اگر تو دنیا میں عزت کی زندگی بسر کرنی چاہتا ہے تو تعصب کو اپنے دل سے نکال دے۔ تو جن لوگوں کو برا سمجھتا ہے وہ لوگ در اصل تیرے بھائی ہیں۔ تو دنیاوی تعلقات کی درستی میں مشغول ہے اور یہ سمجھتا ہے کہ اس طریقہ سے تجھے صفائی قلب حاصل ہو جائے گی۔ یہ تیری غلط فہمی ہے تیرا یہ فعل ایسا ہی بے سود ہے جیسے کوئی شخص آئینہ پر مہندی لگا کر اسے رنگین کرنے کی کوشش کرے۔ تو نے قرآنی تعلیمات سے کوئی فائدہ حاصل نہیں کیا بلکہ اس کی غلط تعبیر کی اور اس طرح حقیقت سے دور ہو گیا تیرا یہ طرز عمل، تیری کج بینی اور غلط فہمی کی دلیل ہے۔ جس پر زمین اور آسمان دونوں ماتم کر رہے ہیں، تو زبان سے توحید کا دعویٰ کرتا ہے۔ لیکن تو قرآن کے بجائے اپنے نفس کی اطاعت کر رہا ہے اس لئے اس زبانی دعویٰ سے تجھے کوئی فائدہ حاصل نہیں ہو سکتا تو صرف اپنی جماعت سے محبت کرتا ہے، یعنی تو نے محبت کو جو ایک عالمگیر (مطلق) حقیقت ہے اسے صرف اپنی قوم کے افراد میں مقید کر دیا ہے۔ تو منبر پر بیٹھ کر اگر

وعظ و نصیحت کرتا ہے تو اس میں اپنی قوم کو ساری دنیا سے محبت کرنے کی تلقین نہیں کرتا بلکہ تیری نصیحت میں بھی افسانہ کا رنگ پایا جاتا ہے۔

چھٹا بند:۔ اس بند میں اقبال نے پانچویں بند کے خیالات کی مزید وضاحت کی ہے کہتے ہیں اے مخاطب! اپنی نگاہ کے اندر وسعت پیدا کر یعنی پروانہ کا رنگ پیدا کر۔ وہ کسی خاص شمع سے محبت نہیں کرتا بلکہ روشنی سے محبت کرتا ہے۔ خواہ وہ روشنی دیر میں ہو یا حرم میں اسی خیال کو ایک شاعر نے یوں ادا کیا ہے۔

ع پروانہ، چراغِ حرم و دیر نداند

یعنی تو اپنی آنکھ میں ایسی صلاحیت پیدا کر کہ وہ ہر شئے میں خدا کا جلوہ دیکھ سکے۔ اگر ایک انسان پر یہ حقیقت منکشف ہو جائے کہ کافر بھی اللہ ہی کی مخلوق ہے تو وہ اس پر مہربانی کرے گا جس طرح پروانہ ہر شمع سے محبت کرتا ہے۔ اسی طرح شبنم ہر پھول کو (خواہ وہ ہندو کے باغ میں ہو یا مسلمان کے) فیض پہنچاتی ہے۔

اے مخاطب! اللہ نے انسان کو آنکھیں صرف مختلف اشیاء کو دیکھنے کے لئے نہیں دی ہیں۔ بلکہ مقصد باری تعالیٰ یہ ہے کہ انسان ان کے ذریعہ سے ہر شئے میں خدا کا جلوہ دیکھے۔ اگر کوئی شخص اپنی حقیقت سے آگاہ نہ ہو سکے، یعنی اپنے آپ کو نہ دیکھ سکے تو اس نے ساری کائنات کو دیکھ لیا تو بھی کچھ فائدہ نہیں ہو سکتا۔ جس طرح جمشید نے اپنی ساری توجہ جام پر مبذول کی لیکن اس کے ذریعہ سے وہ اپنی حقیقت سے آگاہ نہ ہو سکا۔ یاد رکھو کہ فرقہ بندی وہ ناپاک درخت ہے جس کا پھل تعصب ہے یعنی فرقہ بندی سے انسان کے اندر تعصب کا رنگ پیدا ہو جاتا ہے، اور یہ تعصب جس شخص میں پیدا ہو جائے وہ اس دنیا میں کسی قسم کی ترقی نہیں کر سکتا۔ اسی پر قوم کو قیاس کر سکتے ہیں

جب تک تمہارے دل میں بلندی کی آرزو پیدا نہ ہو گی تم بلندی حاصل

نہ کر سکو گے چنانچہ دیکھ لو برگِ گل میں رفعت کی تمنا نہیں ہے۔ اس لئے وہ آفتاب کی طاقت جذب سے کوئی فائدہ حاصل نہیں کر سکتا۔ اس کے مقابلہ میں شبنم اوپر جانا چاہتی ہے اس لئے جذب آفتاب سے فائدہ حاصل کر لیتی ہے اور اوپر چلی جاتی ہے جو لوگ شیوۂ محبت اختیار کر لیتے ہیں وہ اس راہ میں دکھ بھی اٹھاتے ہیں لیکن وہ کسی سے اپنے دکھ کا مداوا (علاج) طلب نہیں کرتے۔ کیونکہ محبت اگر زخم لگاتی ہے تو مرہم بھی خود مہیا کر دیتی ہے۔ یعنی اگر اہل محبت کو دوسروں کے ساتھ ہمدردی کرنے کے سلسلہ میں کوئی تکلیف لاحق ہوتی ہے تو یہ احساس کہ ہم نے دوسروں کو فائدہ پہنچایا ان کی تکالیف کا مداوا (ازالہ) کر دیتا ہے۔ محبت میں یہ خاصیت ہے کہ دل میں خدا کا نور پیدا ہو جاتا ہے۔ بظاہر محبت بہت معمولی چیز ہے لیکن اس کی بدولت انسان خدا کا جلوہ دیکھ سکتا ہے۔

ساتواں بند:۔ اس بند میں اقبال نے اس بات کی تلقین کی ہے کہ دوسروں کے ساتھ مہربانی کا برتاؤ کرو لیکن کسی سے معاوضہ یا صلہ کی تمنا مت کرو۔ محبت کرو لیکن اس کا اجر صرف اللہ سے طلب کرو اگر تم دوسروں سے محبت کرو گے تو تمہاری تمام تکالیف دور ہو جائیں گی۔ اگر اس سلسلہ میں کوئی تکلیف پہنچے تو دوسروں سے شکایت مت کرو۔ کہتے ہیں کہ جب میں نے اپنی ہستی کو جماعت کی ہستی میں فنا کر دیا یعنی شراب بیخودی پی لی تو میری پرواز فلک تک ہو گئی۔ یعنی میرا مرتبہ بہت بلند ہو گیا میں نے اپنے آپ کو قوم ذات، قبیلہ اور خاندان کے رنگ سے پاک کر لیا اور اس کا نتیجہ یہ نکلا کہ ہر شخص کے دل میں میری عزت قائم ہو گئی۔ بُو سے مراد خوشبو ہے اور خوشبو کا کوئی رنگ نہیں ہوتا۔ اس کے باوجود وہ ہر پھول میں پوشیدہ ہوتی ہے میں ہر وقت وطن کی مصیبتوں پر روتا رہتا ہوں۔ آنسوؤں کو وضو کے پانی سے تعبیر کیا ہے اور عبادت کی رعایت سے وضو کا لفظ لائے ہیں ان خوبیوں کی وجہ سے مصرعہ

میں بہت دلکشی پیدا ہو گئی ہے چونکہ فرقہ بندی کی بنا پر ملک میں با عزت زندگی دشوار ہو گئی ہے۔ اس لئے اس ملک میں رہنے کو جی نہیں چاہتا۔ چمن سے وطن مراد ہے

اے مخاطب! اگر تو غور سے دیکھے تو صرف باہمی محبت وہ طاقت ہے جس کی بدولت قوم کو آزادی نصیب ہو سکتی ہے یعنی محبت انسان کو آزاد کر دیتی ہے۔ اور جو قوم آپس میں برسر پیکار رہتی ہے وہ ہمیشہ غلامی میں مبتلا رہتی ہے افراد قوم کو لازم ہے کہ اپنے اندر بے نیازی کی شان پیدا کریں۔ بلبلہ سے سبق لو کہ وہ چونکہ شان بے نیازی رکھتا ہے اس لئے دریا میں رہ کر بھی محتاج آب نہیں ہوتا۔

اے مخاطب! اگر تجھے دنیا میں عزت کے ساتھ زندگی بسر کرنے آرزو ہے تو اپنی قوم سے بے پروائی اختیار مت کر بلکہ سب سے محبت کر۔

نوع انسان کی محبت، ایسی شراب ہے کہ آدمی ساغر اور صراحی کے بغیر ہی مست رہتا ہے۔ دنیا کی تاریخ کا مطالعہ کرو یہ حقیقت واضح ہو جائے گی کہ جن قوموں نے دنیا میں ترقی کی ہے ان کے افراد کے دل میں ایک دوسرے کے لیے محبت کا جذبہ کارفرما رہا ہے۔

آٹھواں بند:۔ اس بند میں اقبال نے محبت کی حقیقت اور اس کا فلسفہ بیان کیا ہے۔ کہتے ہیں کہ محبت مجموعہ اضداد ہے۔ اس کے رموز نکات فہم انسانی سے بالاتر ہیں۔ اگر کوئی شخص قوم کی محبت میں ترک وطن کر دیتا ہے تو پردیس میں بھی اس کو وطن کا لطف حاصل ہو سکتا ہے۔ اور قفس میں رہ کر بھی اس کو چمن کی زندگی نصیب ہو سکتی ہے۔ جو لوگ اپنے وطن کے سلسلہ میں قید و بند کی سختیاں گوارا کرتے ہیں۔ انھیں وہ تمام تکالیف راحت معلوم ہوتی ہیں۔

عام طور سے لوگ محبت کو مرض قرار دیتے ہیں۔ لیکن یہ مرض ایسا ہے

کہ قوم کے تمام امراض کا مداوا کر دیتا ہے۔ اس کی بدولت گردشِ چرخِ کہن یعنی تمام مصیبتوں کا ازالہ ہو جاتا ہے۔ اگر کوئی شخص محبت کی آگ میں اپنے دل کو جلائے تو اس کا نتیجہ یہ ہوگا کہ اس کا دل سراپا نور ہو جائے گا۔ جس شخص کا دل محبت کی آگ میں جل جاتا ہے تو وہ شمع انجمن بن جاتا ہے یعنی ایک دنیا پروانوں کی طرح اس پر نثار ہونے کو تیار ہو جاتی ہے۔

اے مخاطب! یہ ساری کائنات مظہرِ خدا ہے۔ ہر شئے میں اسی کا حسن نظر آتا ہے۔ شیریں بھی اسی کا جلوہ ہے اور فرہاد بھی اسی کا۔ یاد رکھو! جن قوموں کے افراد نے آپس میں نفرت کا بازار گرم کیا ہے وہ صفحۂ ہستی سے نابود ہو گئی ہیں۔ کاش میرے اہل وطن اس نکتہ سے سبق حاصل کریں۔ یہ داستان بہت طویل ہے۔ اسلئے میں سکوت اختیار کرنا مناسب سمجھتا ہوں۔ ورنہ اگر چاہوں تو اس موضوع پر بہت کچھ لکھ سکتا ہوں اس نظم کو اقبال نے نظیری کے اس شعر پر ختم کیا ہے۔

نمی گردید کوتہ رشتۂ معنی رہا کردم
حکایت بود بے پایاں بخاموشی ادا کردم

یعنی میری داستان درد چونکہ بہت طویل تھی اس قدر طویل کہ اس کی کوئی انتہا ہی نظر نہیں آتی اسلئے میں نے خاموشی اختیار کرنی مناسب سمجھی۔

نالۂ فراق

حل لغات اور شرح مشکلات | اے مکان۔ مراد ہے ہندوستان مکین۔ مراد ہے ڈاکٹر آرنلڈ۔ ضیائے روزِ فرقت۔ یعنی فراق کے دن کی روشنی کشتۂ عزلت ہوں؛ یعنی تنہائی پسند ہوں۔ ایام سلف۔ گذرا ہوا زمانہ۔ دل کا ذرہ، دل مراد ہے۔ خورشید آشنا ہونے کو تھا، یعنی میرا دل علم کے نور سے

منور ہونے کو تھا۔ ٹوٹا ہوا آئینہ عالم نما ہونے کو تھا۔ اس سے بھی یہی مراد ہے کہ میں علم و حکمت میں ترقی کرنے والا ہی تھا۔ یا میرا سینہ معلومات کا خزانہ بننے ہی کو تھا (کہ استاد سے جدائی ہو گئی) ذرہ بمعنی پہاڑ کی چوٹی۔ کلیم ذروہ سینا۔ یے علم، علم کے پہاڑ کی چوٹی کا کلیم (کوہ سینا کی رعایت سے کلیم کا لفظ لائے ہیں) مراد سے بہت بڑا عالم۔ موج نفس، مراد ہے سانس یعنی شخصیت۔ بادنشاط افزائے علم وہ ہوا جو علم کی مسرت میں اضافہ کر دے، یعنی تیری صحبت میں رہ کر انسان اپنے علم میں اضافہ کر سکتا ہے۔ رہ پیمائی صحرائے علم۔ علم کے جنگل میں پیدل چلنا مراد ہے۔ علم حاصل کرنا۔ سودائے علم، یعنی تیری وجہ سے مجھے بھی علم حاصل کرنے کا شوق پیدا ہو گیا تھا۔ عقدۂ تقدیر۔ تقدیر کی گرہ۔ یعنی رکاوٹ دور ہو جائے گی۔ پنجاب کی زنجیر سے گورنمنٹ کالج کی ملازمت مراد ہے۔ گرویدۂ تقریر یعنی تقریر (لیکچر) سننے کا عادی یا شائق۔

تبصرہ:۔ یہ نظم اقبال نے اپنے استاد ڈاکٹر سر ٹی ڈبلیو آرنلڈ سی آئی ای ایم اے ڈی لٹ۔ آنجہانی کی یاد میں ۱۹۰۴ء میں لکھی تھی۔ جس طرح شمس العلماء مولانا سید میر حسن صاحب مرحوم نے ان کے اندر فارسی ادب اور شعر و سخن کا ذوق پیدا کیا تھا اسی طرح ڈاکٹر آرنلڈ نے ان کو فلسفہ اور حکمت کا شیدائی بنا دیا۔ حضرت علامہ نے اپنے استاد کو "کلیم ذروۂ سینائے علم" کے شاندار لقب سے یاد کیا ہے اور اس میں کوئی شک نہیں کہ آرنلڈ بجا طور پر اس لقب کا مستحق تھا۔ افسوس کہ میں اس مختصر تبصرہ میں ڈاکٹر آرنلڈ کے کمالات علمی کی تفصیل بیان نہیں کر سکتا صرف چند واقعات بیان کرنے پر اکتفا کرتا ہوں

ڈاکٹر آرنلڈ ۱۸۸۸ء کے قریب علی گڈھ کالج میں فلسفہ کے پروفیسر مقرر ہو کر آئے تھے۔ چونکہ وہ عربی کا بھی ذوق رکھتے تھے اس لئے انہوں نے

مولانا شبلی نعمانی مرحوم سے جو اس زمانہ میں وہاں فارسی اور عربی کے پروفیسر تھے، عربی ادب کی بعض اونچی کتابیں پڑھی تھیں اور مولانا نے ان سے فرنچ سیکھی تھی۔ ۱۸۹۵ء میں انہوں نے اپنی شہرۂ آفاق کتاب "پریچنگ آف اسلام" شائع کی۔ جس کو انہوں نے بیس سال کی مدت میں پایۂ تکمیل کو پہنچایا تھا۔ اور اس میں تاریخی شواہد کی بنا پر یہ ثابت کیا تھا کہ اسلام دنیا میں تلوار کے زور سے نہیں بلکہ اپنی ذاتی خوبیوں کی بدولت پھیلا ہے۔ انگریزی ادب ہی نہیں بلکہ سارے مغربی ادب میں یہ اپنی نوعیت کی واحد کتاب ہے۔ اس موضوع پر دوسری کتاب نہ اس سے پہلے کسی نے لکھی نہ بعد میں جب سرسید مرحوم نے اس کتاب کو دیکھا تو کہا کہ یہ کام ہمیں کرنا چاہئے تھا۔ جو ایک غیر مسلم نے کیا ہے اور اسی وقت مسٹر عنایت اللہ صاحب دہلوی کو جنہوں نے اسی زمانہ میں بی اے کیا تھا۔ اس کتاب کے ترجمہ پر معمور کردیا۔ چنانچہ ۱۸۹۶ء میں اس کا ترجمہ "دعوت اسلام کے نام سے شائع ہوا تھا۔

غالباً ۱۸۹۷ء میں ڈاکٹر آرنلڈ علی گڈھ سے لاہور آئے۔ اور یہاں حضرت علامہ کو ان کی شاگردی کا فخر حاصل ہوا۔ ۱۹۰۱ء میں ڈاکٹر آرنلڈ نے تفسیر کبیر کی ضخیم آٹھ جلدوں کا مطالعہ کرنے کے بعد وہ اقتباسات ایک کتاب کی صورت میں جمع کئے جو امام رازی نے معتزلی حکماء کی تفسیر سے اپنی تفسیر میں جابجا درج کئے ہیں۔ ۱۹۰۴ء کے شروع میں ڈاکٹر آرنلڈ ولایت واپس چلے گئے اور انڈیا آفس میں لائبریرین مقرر ہو گئے ۱۹۲۰ء میں لندن یونیورسٹی کے اسکول آف اورنٹیل اسٹڈیز میں عربی کے پروفیسر مقرر ہو گئے۔ اور ۱۹۳۰ء میں وفات پائی۔

نظم کا مطلب :۔ افسوس ڈاکٹر آرنلڈ کو ہندوستان کی سرزمین پسند نہ آئی۔ اسلئے وہ انگلستان واپس چلے گئے اور ان کے جانے کے بعد دنیا میری آنکھوں میں اندھیرا ہوگئی۔ استاد کے فراق میں مجھ کو روز روشن بھی رات کی طرح تاریک نظر آتا ہے۔ جب

سے میری نظر اس کو رخصت کرنے کے بعد اس کے دیدار سے محروم ہوئی ہے۔ بجھی ہوئی شمع کی طرح میری آنکھ کے پردوں میں سو گئی ہے یعنی محبوب کو رخصت کرنے کے بعد میری آنکھ بے نور ہو گئی ہے

جب سے وہ محبوب مجھ سے رخصت ہوا ہے، میں نے گوشۂ تنہائی اختیار کر لیا ہے۔ کسی سے ملنے جلنے کو جی نہیں چاہتا۔ جب دل میں خفقانی کیفیت پیدا ہوتی ہے تو جنگل کی طرف چلا جاتا ہوں۔ پھر جب گذرے ہوئے زمانہ کی یاد مجھے ستاتی ہے تو میں اس مکان کی طرف واپس آتا ہوں جہاں وہ محبوب رہتا تھا۔ اس کے مکان کے در و دیوار تو وہی ہیں لیکن میں اپنے آپ کو اجنبی سا محسوس کرتا ہوں، یعنی جب محبوب کو وہاں نہیں پاتا تو یہ محسوس ہوتا ہے کہ شاید میں کسی اجنبی مقام پر آ گیا ہوں۔

جب میرے اندر اپنے استاد سے فیض حاصل کرنے کی صلاحیت پیدا ہوئی تو ہم دونوں میں جدائی ہو گئی۔ اگر وہ کچھ دن اور یہاں قیام کرتے تو خدا معلوم میں کس قدر ان سے علم حاصل کرتا

ابرِ رحمت نے میرے گلزار سے کنارا کر لیا اور دور چلا گیا۔ بس میرے باغ کی کلیوں کو کچھ سیراب کیا اور اس کے بعد مجھ سے جدا ہو گیا۔

اے علم کے سمندر! تو مجھے پیاسا چھوڑ کر کہاں چلا گیا؟ تیری شخصیت میرے حق میں افزائشِ علم کا موجب تھی۔ اور تیرے ہی دم سے میرے دل میں حصولِ علم کا جذبہ موجزن تھا۔ تیرے جانے کے بعد میرا ذوقِ علمی سرد ہو گیا۔

اب لیلیٰ اور اس کے حسن و جمال کا کہیں چرچا ہی سننے میں نہیں آتا اس لئے اب جنون کے اندر ذوقِ بادیہ پیمائی پیدا ہو تو کیسے ہو؟

لیکن مجھے یقین ہے کہ فراقِ محبوب کی شدت، میری دشواریوں کو آسان کر دے گی یعنی میں اس کی ملاقات کے لئے ضرور پنجاب سے انگلستان جاؤں گا۔ بے شک

اس کی تصویر میرے پاس ہے لیکن میں تو اس کی گفتگو کا طالب ہوں اس لئے تصویر سے مجھ کو تسلی نہیں ہو سکتی۔ سچ کہا ہے کسی شاعر نے کہ تصویر منھ سے کچھ نہیں بول سکتی اس کی گفتگو تو اس کی خاموشی سے عبارت ہے۔

چاند

حل لغات اور شرح مشکلات: میرے ویرانہ سے یعنی اس دنیا سے جب ہے۔ مگر دریائے دل تیری کشش سے موجزن۔ بہت بلیغ مصرعہ ہے۔ مطلب یہ ہے کہ اگرچہ چاند اس دنیا سے بہت دور ہے اس کے باوجود دل میں اس کی محبت موجزن ہے اس میں خوبی یہ ہے کہ دل کو "دریا" قرار دیا ہے اور چاند کی وجہ سے دریا (سمندر) کی موجوں میں تلاطم برپا ہوتا ہے۔ زرد رو بمعنی پیلا۔ اس مصرعہ میں حسن تعلیل ہے شاعر نے رنج رہ منزل کو چاند کے چہرہ پر زردی کا سبب قرار دیا ہے۔ آفرینش بمعنی پیدائش۔ سیہ روزی بمعنی بدبختی۔ سوزِ اشتیاقِ دید۔ دیدار کی خواہش کی آگ۔ داغ منتِ خورشید۔ یعنی آفتاب کا ممنونِ احسان ہے۔ کیوں کہ اپنی روشنی اس سے حاصل کرتا ہے۔ فروزاں بمعنی روشن۔ سوزاں۔ بمعنی جلتا ہوا۔ طلب خو بمعنی حاجتمند یا وہ شخص جس کو مانگنے کی حاجت ہو حسن ازل سے خدا کی ذات مراد ہے۔ ماہ مبین بمعنی سب کو نظر آنے والا۔ یعنی روشن چاند۔ ذوق آگہی یعنی شعور ذاتی یا احساس خودی مطلب۔ اقبال نے اس نظم میں انسان اور چاند دونوں میں مماثلت ثابت کی ہے اس کے بعد یہ بتایا ہے کہ ایک امر میں یہ دونوں مختلف ہیں۔ اور وہ یہ ہے کہ انسان کو شعورِ ذات حاصل ہے۔ لیکن چاند اس نعمتِ عظمٰی سے محروم ہے کہتے ہیں کہ اے چاند! اگرچہ پیدائش کے لحاظ سے تو نوری ہے اور میں خاکی ہوں اس کے باوجود میں تیرا ہم نصیب ہوں مثلاً ہم دونوں کے دل میں سوز ہے۔ دونوں

قوانینِ فطرت کے پابند ہیں، دونوں سرگرداں ہیں، دونوں مسافر ہیں، دونوں خاموش ہیں، دونوں محتاج ہیں، دونوں تنہا ہیں۔ آفتاب کی موجودگی میں تیری ہستی مر جاتی ہے تو حسنِ ازل کے سامنے میری بھی کوئی حقیقت باقی نہیں رہتی۔ لیکن اس قدر مماثلت کے باوجود مجھ میں اور تجھ میں ایک فرق بھی ہے اور وہ یہ ہے کہ مجھے شعورِ ذاتی حاصل ہے اس لیے میں اپنی ہستی کے مقصد سے آگاہ ہوں اور تجھ کو یہ دولت حاصل نہیں ہے۔ اس لئے تو اپنے وجود کی غایت سے واقف نہیں ہے۔

بلال

حلِ لغات اور شرحِ مشکلات | مقدر کا ستارہ چمک اٹھا۔ یعنی نصیبے نے یاوری کی، یا تیری خوش نصیبی تجھے حبش سے حجاز میں لے آئی۔ اسی سے تیرے غمکدے کی آبادی ہوئی۔ یعنی حجاز میں آکر تجھے دولتِ اسلام نصیب ہوئی۔ غلامی کے صدقے ہزار آزادی۔ یعنی تو اگر حبش میں آزاد رہتا تو یہ نعمت تجھے حاصل نہ ہوتی۔ وہ آستانہ کنایہ ہے سرکارِ دو عالم صلعم کے شرفِ صحبت سے۔ کسی کے شوق میں تو نے مزے ستم کے لیے۔ یعنی آنحضرت صلعم کی محبت میں تو نے اپنے کافر آقا کے ظلم و ستم برداشت کئے۔ حضرتِ سلمانؓ۔ حضرت سلمان فارسی کی طرح۔ ایرانی النسل ہیں، صحابی ہیں اور یہ بھی سرکارِ دو عالم کے عشق میں بہت اونچا مقام رکھتے ہیں۔ جب ان سے کسی نے پوچھا کہ تمہارا نسب کیا ہے؟ تو انہوں نے جواب دیا۔ سلمانؓ ابن اسلام۔ نظر تھی صورتِ سلمانؓ ادا شناس تری۔ یعنی تو حضرتِ سلمانؓ کی طرح آنحضرت صلعم کا سچا عاشق تھا۔ اویسؓ طاقتِ دیدار کو ترستا تھا۔ اس مصرعہ میں تلمیح ہے حضرت اویس قرنی کے سوانحِ حیات کی طرف یہ بھی حضورِ انورؐ کے سچے عاشقوں میں بہت ممتاز حیثیت رکھتے ہیں۔ چونکہ ان کی والدہ بہت ضعیف تھیں، اس لئے آنحضرت صلعم نے اُن کو

یہ حکم دیا تھا کہ میری ملاقات کے لئے مت آؤ۔ بلکہ اپنی ماں کی خدمت کرو اسی میں میری خوشنودی مضمر ہے۔ یہی وجہ ہے کہ ان کو حضور انور صلعم کے دیدار کی مسرت حاصل نہ ہو سکی۔ نمری نظر کو رہی دید میں بھی حسرتِ دید۔ یہ ایک شاعرانہ انداز بیان ہے اس حقیقت کے اظہار کے لئے حضرت بلالؓ حضور انور صلعم کے سچے عاشقوں میں سے تھے اور ان کو حضور سے اس درجہ محبت تھی کہ مسلسل دیکھتے رہنے کے باوجود ان کے دل کو سیری نہیں ہوتی تھی۔ خنک دلے کہ تپید و دمے نیا سائید۔ یعنی ان کا دل لائق ہزار تحسین ہے کہ عشقِ رسول میں ساری عمر بیتاب رہا۔ کہ خندہ زن تری ظلمت تھی دستِ موسیٰ پر۔ اس مصرع میں تلمیح بھی ہے اور انداز بیان بھی ہے۔ دستِ موسیٰ اس معجزہ کی طرف اشارہ ہے جو اللہ نے ان کو عطا فرمایا تھا۔ وَنَزَعَ يَدَهٗ فَاِذَا هِيَ بَيْضَآءُ لِلنّٰظِرِيْنَ (۷/۱۰۸) اور جب حضرت موسیٰ نے اپنا ہاتھ (اپنی بغل میں سے) نکالا تو وہ دیکھنے والوں کو بالکل سفید نظر آیا۔ پس دستِ موسیٰ سے سفیدی مراد ہے۔ شعر کا مطلب یہ ہے کہ سرکار دو عالم صلعم کے عشق کی بدولت تیری شخصیت اس قدر دلکش ہو گئی کہ اگرچہ تو سیاہ فام تھا، لیکن مومنوں کی نظر میں تیری سیاہ رنگت حضرت موسیٰ کے ہاتھ کی سفیدی سے بھی زیادہ سفید معلوم ہوتی تھی۔ یہ شعر مضمون آفرینی کی بہت دلکش مثال ہے جبر برقِ جلوہ بخاشاک حاصلِ تو زوند۔ یعنی کارکنانِ قضا و قدر نے، شعلہ سے تپش، لیکر تیرے دل میں بھر دی۔ بلکہ یہ کہنا زیادہ مناسب ہوگا کہ محبت کی بجلی نے تیرے وجود کو یکسر جلا کر خاک کر دیا مطلب یہ ہے کہ تو عشق کی بدولت فنافی الرسول ہو گیا۔ ادائے دید سراپا نیاز تھی تیری۔ یعنی تیرے دیکھنے میں نیاز کا رنگ جھلکتا تھا۔ اذاں ازل سے تیرے عشق کا ترانہ بنی۔ یعنی عشق کی بدولت تیری آواز اذان میں عجیب سوز و گداز کا رنگ پیدا ہو گیا تھا۔ یثرب مدینۃ النبی کا اصلی نام ہے۔ خوشا وہ دور۔ یعنی وہ زمانہ کتنا مبارک تھا جب مسلمان حضور صلعم کے دیدار سے مشرف ہوتے تھے۔

تبصرہ:۔ اس نظم میں اقبال نے سیدنا حضرت بلالؓ کی شخصیت کے اس پہلو کو نمایاں کیا ہے جس کی بدولت ان کی زندگی میں حضرت فاروق اعظمؓ کی زبانِ مبارک سے "سیدنا" کا لقب حاصل ہوا اور موت کے بعد، حیاتِ جاوید نصیب ہو گئی، وہ پہلو کیا تھا محض عشق رسول صلعم۔ محبت رسول صلعم نے حضرت بلالؓ کی کو ابدی زندگی عطا کر دی۔ اور اقبال نے اس نظم میں عجیب والہانہ انداز سے اسی حقیقت کو واضح کیا ہے۔ حضرت بلالؓ حبشی تھے غلام تھے، مفلس تھے، بے یار و مددگار تھے لیکن ایک عشق رسول صلعم نے ان کو مسلمانوں کا سردار بنا دیا۔ اقبال نے اس نظم میں ان کی عاشقانہ زندگی کی ایسی دلکش تصویر کھینچی ہے کہ الفاظ کے ذریعہ سے اس کا حسن ظاہر نہیں ہو سکتا۔ صرف ذوقِ سلیم، دل ہی دل میں لذت اندوز ہو سکتا ہے۔

اس نظم کے مطالعہ سے یہ بھی معلوم ہو سکتا ہے کہ عشقِ رسول صلعم کی چنگاری شروع ہی سے اقبال کے دل میں پوشیدہ تھی۔ اور میرا عقیدہ ہے کہ اسی کی بدولت وہ خود اور ان کا کلام، دونوں زندہ جاوید ہو گئے۔

سرگذشتِ آدم

تمہید:۔ نظم اقبال کی جدتِ فکر کی بڑی عمدہ مثال ہے۔ اس قسم کی نظموں کے لئے تین باتیں شرط ہیں۔ پہلی یہ کہ شاعر کا علمی پایہ بہت بلند ہو۔ دوسری یہ کہ طبیعت میں جدت طرازی کا مادہ ہو تیسری یہ کہ کلام پر قدرت حاصل ہو۔

چونکہ یہ نظم از اول تا آخر تلمیحات سے معمور ہے اس لئے میں ہر شعر کا مطلب جداگانہ درج کرتا ہوں۔ اس نظم میں جیسا کہ اس کے عنوان ہی سے ظاہر ہے اقبال نے آدم کی سرگذشت از ابتدا تا انتہا بڑے دلکش پیرایہ میں بیان کی ہے۔

پہلا شعر:۔ غربت بمعنی وطن سے دوری۔ پیمانِ اولین میں اشارہ ہے۔ اس پیمان کی طرف

جو انسان نے دنیا میں آنے سے قبل، عالمِ ارواح میں اللہ سے باندھا تھا۔ یعنی جب اللہ نے بنی آدم کی ارواح کو پیدا کیا تو ان سے دریافت کیا اَلَسْتُ بِرَبِّکُمْ کیا میں تمہارا رب نہیں ہوں؟ تو انہوں نے یک زبان ہو کر "بَلٰی" ! ہاں

مطلب یہ ہے کہ انسان نے دنیا میں آکر اس پیمان کو بھلا دیا۔ اور بنی آدم کی اکثریت شرک میں مبتلا ہو گئی۔ حالانکہ خدا سے وعدہ کیا تھا کہ ہم تیرے سوا کسی کو اپنا معبود نہیں بنائیں گے۔

دوسرا شعر:۔ جب آدم اور حوّا کے اندر شعور ذاتی پیدا ہوا تو ان کا دل جنت سے اچاٹ ہو گیا۔ اس شعر میں اشارہ ہے ان دونوں کے جنت سے اخراج کی طرف۔

تیسرا شعر:۔ دنیا میں آکر انسان کے اندر ذاتی شعور کی بناء پر تحقیق و تلاش کا جذبہ پیدا ہو گیا اور اس سلسلہ میں اس نے اپنے تخیلات کی بلندی کا ثبوت دینا شروع کیا۔

چوتھا شعر:۔ چونکہ انسان فطری طور پر تبدیلی اور انقلاب کا آرزو مند ہے اس لیے ایک حالت میں زندگی بسر کرنا پسند نہ آیا یعنی انسان پہ انقلابات آنے شروع ہو گئے۔

پانچواں شعر:۔ اس شعر میں حضرت ابراہیم کی طرف اشارہ ہے کہ انہوں نے اللہ کی عبادت کے لیے خانہ کعبہ تعمیر کیا۔ یہ پہلا گھر تھا جو بتوں کے وجود سے پاک تھا لیکن بعد ازاں ان کی اولاد نے کعبہ کو بت خانہ بنا دیا۔

چھٹا شعر:۔ اس شعر میں حضرت موسٰی کی طرف اشارہ ہے کہ وہ اللہ سے ہمکلامی کی آرزو میں کوہِ طور پر تشریف لے گئے اور اللہ نے انہیں "ید بیضا" کا معجزہ عنایت فرمایا۔ نور از ل زیر آستیں، اسی معجزہ کی طرف اشارہ ہے۔

آٹھواں شعر:۔ اس شعر میں حضرت عیسٰی کی زندگی کی طرف اشارہ ہے۔ یعنی یہودیوں نے انہیں اپنی دانست میں مصلوب کر دیا، لیکن اللہ نے انہیں اس ذلت سے بچا کر آسمان پر پہنچا دیا۔

آٹھواں شعر:۔ اس شعر میں حضور انور صلی اللہ علیہ وسلم کی حیاتِ طیبہ کی طرف اشارہ ہے

کہ آنحضرتؐ نے قبل نبوت، کئی سال تک غارِ حرا میں خلوت اختیار فرمائی۔ یہیں آپ کو نبوت سے سرفراز کیا گیا۔ جامِ آخریں سے قرآن مجید مراد ہے۔

نواں شعر:۔ پہلے مصرعہ میں شری کرشن کی زندگی کی طرف اشارہ ہے کہ انہوں نے اہل ہند کو توحید کا پیغام سُنایا۔ سرودِ ربانی میں ان کی بانسری کی طرف اشارہ ہے۔ دوسرے مصرعہ میں افلاطون کی طرف اشارہ ہے۔ کہ جس نے اہلِ یونان کو توحیدِ الٰہی کا درس دیا۔

دسواں شعر:۔ اس شعر میں گوتم بدھ کی طرف اشارہ ہے۔ جس نے اہلِ ہند کو بت پرستی ترک کرنے کی تلقین کی تھی۔ لیکن جب ہندوؤں نے تلوار کے زور سے اس کے مذہب کا ہندوستان میں خاتمہ کر دیا تو اس کے پیرو ہندوؤں کے ظلم و ستم سے تنگ آکر چین میں چلے گئے۔

نوٹ:۔ اقبال نے بڑی خوبصورتی کے ساتھ بدھ دھرم کی تاریخ دو مصرعوں میں بیان کر دی ہے۔

گیارھواں شعر:۔ اس شعر میں مشہور فلسفی دیمقراطیس کی طرف اشارہ ہے جس نے چوتھی صدی قبل مسیح میں یہ تعلیم دی تھی کہ اس کائنات کا کوئی خالق نہیں ہے۔ یہ دنیا محض ذراتِ مادی کی ترکیب کا نتیجہ ہے۔ چونکہ مادہ کے علاوہ اور کوئی شئے موجود نہیں اس لئے انسان میں روح بھی نہیں ہے مرنے کے بعد وہ ہمیشہ کے لئے فنا ہو جاتا ہے۔ خدا اور روح دونوں کا انکار اہلِ دین کی تعلیمات کے سراسر خلاف ہے۔

بارھواں شعر:۔ اس شعر میں اسی آویزش کی طرف اشارہ ہے جو ازمنۂ وسطیٰ میں یورپ کے رومن کیتھولک کلیسا (مسیحیت) اور حکماء و فلاسفہ کے درمیان پیدا ہو گئی تھی۔ کلیسا کی تعلیم یہ تھی کہ حق وہ ہے کہ جو کلیسا پیش کرے اس کے خلاف حکماء یہ کہتے تھے کہ حق وہ ہے جو عقل سے ثابت ہو سکے۔ حکماء کا خاتمہ کرنے کے لئے کلیسا نے محکمۂ احتساب قائم کیا اور کئی سو سال تک ان کے قتل کا سلسلہ جاری رہا۔ بالآخر کلیسا کو شکست ہوئی اور یورپ میں عقلیت کا بازار گرم ہو گیا

تیرھواں شعر۔ اس شعر میں مشہور اطالوی عالمِ ہیئت گلیلیو کی طرف اشارہ ہے (ولادت

۱۵۴۶ء، وفات ۱۶۰۱ء) جس نے اجرام فلکی کی تحقیقات میں اپنی ساری عمر بسر کر دی۔

چودھواں شعر:۔ اس شعر میں کاپرنیکس (۱۴۷۳ء تا ۱۵۴۳ء) کی طرف اشارہ ہے جس نے کلیسا کی مخالفت کے باوجود اپنا یہ نظریہ دنیا کے سامنے پیش کیا کہ آفتاب ساکن ہے اور زمین اس کے گرد گھومتی ہے۔ کلیسا نے اس تعلیم کی بنا پر اسے کافر قرار دیا۔ اور قتل کی دھمکی دی لیکن اُس نے اس کی مطلق پرواہ نہیں کی۔ یہ حکیم موجودہ علم ہیئت کا بانی ہے۔ اس کے بعد کیپلر کاپرنیکس۔ گلیلیو اور نیوٹن نے اس کے نظریہ کی حمایت کی۔

پندرھواں شعر:۔ اس شعر میں نیوٹن (۱۶۴۲ء تا ۱۷۲۷ء) کی طرف اشارہ ہے جس نے کائنات میں کشش ثقل کا قانون دریافت کیا۔ ہویدا کیا یعنی ظاہر کیا۔ عقل کی دوربین لگا کر۔ یعنی عقل کی مدد سے

سولھواں شعر:۔ اس شعر کے پہلے مصرعہ میں ڈاکٹر رونٹجن (RONTGEN) اور ڈاکٹر فریڈے (FARADAY) کی ایجادات کی طرف اشارہ ہے۔ اوّل الذکر نے ۱۸۹۵ء میں اتفاقی طور پر ان شعاعوں کو دریافت کیا تھا جبکہ وہ مختلف قسم کے برقی تجربے کر رہا تھا چونکہ وہ اس وقت تک ان کی ماہیت سے ناواقف تھا اس لئے اس نے ان کا نام X ایکس ریز (شعاع غیر معلوم) رکھا آجکل ان شعاعوں کے ذریعہ سے جسم کے اندرونی اعضا کا فوٹو لیا جاتا ہے۔ آخر الذکر نے بجلی جس سے مختلف کام لئے جاتے ہیں۔ اور بلب روشن ہوتے ہیں) کے سلسلہ میں بہت مفید تحقیقات کیں۔ دوسرے مصرعہ کا مطلب یہ ہے کہ اس قسم کی مفید تحقیقات کی بدولت یہ دنیا جنت کی طرح آسائشوں سے معمور ہو گئی۔

سترھواں شعر:۔ لیکن ان تمام حیرت انگیز ایجادات کے باوجود انسان ہستی کی حقیقت سے آگاہ نہ ہو سکا۔ خرد سے جہاں کو تہ نگیں کیا یعنی تمام دنیا اپنے تصرف میں لے آیا۔ یا عقل کی بدولت میں نے قوائے فطرت کو مسخر کر لیا لیکن یہ نہ معلوم ہو سکا کہ اس کائنات کا بنانے والا کون ہے؟ اسی بات کو اقبال نے ضرب کلیم میں یوں بیان کیا ہے:۔

جس نے سورج کی شعاعوں کو گرفتار کیا   زندگی کی شب تاریک سحر کر نہ سکا

اٹھا! نواں شعر:۔ لیکن جب میری مظاہر پرستست (ظاہر بین) آنکھ روشن ہو گئی تو مجھے معلوم ہوا کہ میرا اور اس کائنات کا خالق تو میرے دل میں موجود ہے۔ اب سوال یہ ہے کہ انسان اس حقیقت سے کیسے آگاہ ہو سکتا ہے۔ اس کا جواب یہ ہے کہ عشق کی بدولت۔ خلاصہ اس نظم کا یہ ہے کہ دنیا کے حاصل کرنے کا طریقہ عقل ہے۔ اور خدا کے حاصل کرنے کا طریقہ عشق ہے

ترانۂ ہندی

حل لغات اور شرح مشکلات:۔ غربت۔ پردیس۔ پربت۔ پہاڑ، مراد ہمالہ۔ سنتری بمعنی پاسبان۔ رشکِ جناں۔ جنت کی طرح حسین اور دلکش۔ گنگا یہ ہندوؤں کا مقدس ترین دریا۔ بیر بمعنی دشمنی۔ دورِ زماں۔ زمانہ کی گردش پہلے زمانہ میں لوگوں کا عقیدہ یہ تھا کہ دنیا میں جس قدر واقعات رونما ہوتے ہیں، سب کا باعث گردشِ زماں ہے یہ ہندو قوم ابتک اسی عقیدہ پر قائم ہے۔

تبصرہ:۔ یہ ترانہ اقبال نے ۱۹۰۴ء میں لکھا تھا اور ۱۰ اگست ۱۹۰۴ء کو کانپور (یوپی) کے مشہور اردو رسالہ زمانہ کے ایڈیٹر منشی دیانرائن نگم کو اشاعت کے لیے بھیجا تھا اسمیں آخری مصرعہ یوں لکھا تھا:۔ "معلوم ہے ہمیں کو دردِ نہاں ہمارا" لیکن بعد میں انہوں نے اس میں تھوڑی سی تبدیلی کر کے یوں کر دیا۔ "معلوم کیا کسی کو دردِ نہاں ہمارا" اور اس میں شک نہیں کہ لفظ "کسی" نے مصرع میں سوز و گداز کی کیفیت میں اضافہ کر دیا ہے۔

جگنو

حل لغات اور شرح مشکلات:۔ کاشانہ۔ مکان، کمرہ، آشیانہ۔ کاشانۂ چمن یعنی چمن۔

سفیر بمعنی ایلچی۔ تکمہ پہلے زمانہ میں بٹن کا کام تکمہ سے لیتے تھے۔ حسنِ قدیم سے خدا مراد ہے رنگین نوا۔ خوش آواز۔ گل کو زبان دیکر تعلیم خاموشی دی۔ بمعنی زبان (پتی) کے باوجود گل خاموش رہتا ہے۔ شعراء گلاب کی پتیوں کو زبان سے تشبیہہ دیا کرتے ہیں۔ پری سے شفق مراد ہے بانکی سے دل کش یا حسین مراد ہے۔ لال جوڑا کنایہ ہے سورج کی روشنی سے۔ حسنِ ازلی سے خدا مراد ہے۔ کثرت تصوف کی اصطلاح ہے اور وحدت کی ضد ہے۔ کثرت سے وہ بیشمار مخلوقات مراد ہیں جو کائنات میں نظر آتی ہیں۔ وحدت خداوندی مراد ہے۔ یہ وحدت اس کائنات کی کثرت میں پوشیدہ ہوگئی۔ اگر غور سے دیکھو اور دیکھنے کے لئے دل کی آنکھیں شرط ہیں تو وہی ایک ذات ہے جو مختلف صورتوں میں جلوہ گر ہے کہیں وہ سخن ہے، کہیں وہ چمک ہے کہیں وہ چاندنی ہے۔ کہیں وہ کسک ہے کہیں وہ نغمہ ہے، کہیں وہ مہک ہے۔ وہی ذات تو احد ہے جو مختلف شکلوں میں نظر آرہی ہے۔

تبصرہ :۔ یہ پوری نظم اقبال کے تخیل کی بلندی پر شاہد ہے۔ اسکے پہلے بند میں لفظی خوبیاں (استعارات اور تشبیہات) پائی جاتی ہیں۔ اور تیسرے بند میں معنی کی خوبیاں (تصوف کی تعلیمات) نظر آتی ہیں۔ یہ نظم چونکہ میرے مذاق کے مطابق ہے۔ اس لئے میری نگاہ میں بہت اہم ہے اس میں بنیادی خیال یہ ہے کہ کائنات کی ہر شئے میں خدا کا جلوہ پوشیدہ ہے دراصل تو نظر آتا ہے لیکن میں نے لفظ پوشیدہ اس لئے استعمال کیا ہے کہ بجلی کی روشنی نے ہماری نگاہوں کو اس قدر خیرہ کر دیا ہے کہ "فلمی ستاروں" کے علاوہ اب کسی کو کچھ نظر نہیں آتا واضح ہو کہ یہ بنیادی خیال تصوف کی روح ہے۔ اس کی تعلیمات کا بس خلاصہ یہی ہے کہ کائنات میں اس کے سوا کسی کا وجود حقیقی نہیں ہے اور ہر شئے میں اسی کا جلوہ ہے۔ یہ ساری کائنات اس کی صفات کا مظہر ہے۔ ع ہر چہ بینی بدانکہ مظہر او ست

مطلب :۔ چمن میں جگنو چمک رہا ہے یا پھولوں کی محفل میں شمع جل رہی ہے؟ یا آسمان سے کوئی ستارہ باغ میں آگیا ہے؟ یا چاند کی کرن میں زندگی پیدا ہوگئی ہے؟ یا رات کی سلطنت،

ہیں دن کا ایلچی آیا ہے؟ یا ماہتاب کی قبا سے کوئی تکمہ گر پڑا ہے؟ یا سورج کے پیرہن میں کوئی ذرہ چمک رہا ہے یا یہ خدا کے حسن کی ایک جھلک تھی جسے قدرت خداوندی عالم بالا کی خلوت سے دنیا کی انجمن میں لے آئی! یہ جگنو، چھوٹا سا چاند ہے اس میں روشنی بھی ہے تاریکی بھی۔ جب وہ اپنی دُم کو اپنے بازوؤں سے چھپا لیتا ہے۔ تو تاریکی ہو جاتی ہے اور جب اڑتا ہے تو اس کی دُم چمکنے لگتی ہے۔ یوں دیکھنے میں تو پروانہ اور جگنو دونوں پتنگے ہی ہیں۔ لیکن کیا خدا کی قدرت ہے کہ پروانہ روشنی کا طالب ہے۔ اور جگنو خود روشنی ہے۔

اللہ نے ہر چیز میں کوئی نہ کوئی دلکشی یا خوبی یا خاصیت رکھ دی ہے مثلاً پروانہ کو چراغ کا سودا ہے۔ جگنو مجسم چراغ ہے۔ بلبل۔ مینا۔ قمری۔ کوئل یہ اگرچہ بے زبان ہیں لیکن ان کی آواز نہایت سریلی اور دلکش ہے۔ گل کے پاس بہت سی زبانیں ہیں۔ لیکن وہ خاموش ہے۔ شفق کو دیکھیے، کتنی خوبصورت ہوتی ہے۔ لیکن اس کی عمر بہت تھوڑی ہوتی ہے۔ شفق کی طرح، سحر کو بھی قدرت نے حسین بنایا ہے۔ اسی طرح کائنات میں ہر شئے اپنی جداگانہ خاصیت رکھتی ہے۔ ہوا چلتی رہتی ہے۔ پانی بہتا رہتا ہے۔ موجیں اٹھتی رہتی ہیں۔ جب ہماری رات ہوتی ہے تو جگنو کا دن ہوتا ہے۔

حقیقتِ حال یہ ہے کہ دنیا کی ہر شئے میں خدا کا جلوہ نظر آتا ہے۔ یا بالفاظِ واضح تر خدا کی صفات کا جلوہ مختلف چیزوں میں، مختلف شکلوں میں دکھائی دیتا ہے۔ جو شئے انسان میں گویائی ہے۔ وہی شئے غنچہ میں چٹک ہے۔ چاند کی چاندنی میں، اُس کی قدرت کا جو کرشمہ نظر آتا ہے وہی کرشمہ شاعر کے دل میں کسک بن کر ظاہر ہوتا ہے۔ دراصل یہ ہم نے مختلف اشیاء کے لیے مختلف الفاظ وضع کر لئے ہیں۔ ورنہ بلبل کے نغمہ میں بھی وہی پوشیدہ ہے اور پھول کی خوشبو میں بھی وہی مخفی ہے ع

ایں وحدت است ایک بہ تکرار آمدہ

وحدتِ ذاتِ باری اس دنیا کی کثرت (مخلوقات) میں مخفی ہو گئی ہے۔ ورنہ وہی ایک

ذات ہے جو جگنو میں چمک رہی ہے۔ اور پھول میں مہک رہی ہے۔ جب حقیقت یہ ہے کہ اس ذاتِ واحد کے علاوہ اور کسی کا وجود نہیں تو پھر مظاہر فطرت کا اختلاف باہمی ہنگاموں کا سبب نہیں ہونا چاہیئے۔ یعنی انسانوں کو ایک دوسرے سے نفرت یا دشمنی کرنی زیبا نہیں ہے کیونکہ ہر انسان میں اسی کا جلوہ پوشیدہ ہے۔

اس نظم کا آخری شعر بہت غور طلب ہے۔ یعنی جب ہر شئے میں خاموشی ازل (اسماء وصفاتِ خداوندی کا جلوہ) پنہاں ہے، تو پھر بظاہر اس کائنات میں جو اختلاف نظر آتا ہے یہ منافرت کا سبب نہیں بن سکتا۔ یعنی ہمیں ہر شخص سے محبت کا برتاؤ کرنا چاہیئے۔

نوٹ :۔ اگر دنیا والے اس اصول پر کار بند ہو جائیں تو یہ دنیا جنت کا نمونہ بن جائے۔

صبح کا ستارہ

حل لغات اور شرح مشکلات :۔ صبح کا ستارہ ایک خاص ستارہ ہے جو پچھلی رات کو طلوع ہوتا ہے۔ اور بہت روشن ہوتا ہے۔ صبوحی پینا، صبوحی اس شراب کو کہتے ہیں جو صبح کے وقت پیتے ہیں۔ قعر دریا۔ دریا کی گہرائی یا تلی۔ زیب گلو گلے کا زیور۔ خاتم۔ انگوٹھی۔ گہر ہائے گرانمایا۔ قیمتی جواہرات۔ سر مژگاں۔ پلک کی نوک۔ مستور۔ پوشیدہ۔ میدان دغا۔ میدان جنگ۔ شکیبائی۔ صبر۔ عارضِ گلگوں۔ سرخ رخسار۔

مطلب :۔ یہ نظم اقبال کی قوتِ تخیل کا کرشمہ ہے۔ مقصد اس نظم سے یہ ہے کہ اگر کسی کو حیاتِ ابدی کی آرزو ہو تو اپنے اندر عشق کا سوز پیدا کرے۔ اس حقیقت کو انہوں نے صبح کے ستارہ کی زبان سے ادا کیا ہے۔

صبح کا ستارہ کہتا ہے کہ میں اپنی موجودہ طرز حیات سے مطمئن نہیں ہوں۔ ہر روز سحر کے وقت طلوعِ آفتاب سے پہلے نمودار ہوتا ہوں۔ لیکن جب صبح ہو جاتی ہے تو میں فنا ہو جاتا ہوں اگر مجھے اختیار حاصل ہوتا، تو میں اختر کے بجائے گوہر بن جاتا۔ اور مجھ سے کسی بیگم کے تاج کی

زینت ہوتی۔ دیکھ تو گوہر بادشاہوں کی انگوٹھی میں جگہ پاتا ہے۔ لیکن گوہر کو بھی فنا سے مفر نہیں ہے اور میں وہ زندگی چاہتا ہوں جسے فنا نہ ہو۔ اس لئے کیا اچھا ہو اگر میں اس بیوی کی آنکھ کا آنسو بن جاؤں جس کا شوہر حب وطن سے مجبور ہو کر میدانِ جنگ میں جا رہا ہو اور وہ بادیدۂ نم اسے رخصت کر رہی ہو۔ وہ باوفا بیوی بہت غمگین ہو لیکن چپ ہو اور شوہر کی خوشنودی حاصل کرنے کی غرض سے اس کی جدائی پر صبر کرے۔ شوہر کو رخصت کرتے وقت اس کے سرخ رخسار فرطِ غم سے زرد پڑ جائیں اور یہ زردی اس کے حسن کو دوبالا کر دے۔ وہ لاکھ ضبط کرے لیکن آنسو اس کی آنکھوں سے ٹپکنے لگیں اور اس طرح میں اس کی آنکھ سے ٹپک کر خاک میں مل جاؤں اور خاک میں مل کر ابدی زندگی حاصل کر لوں۔ چونکہ یہ آنسو سچی محبت کی بنا پر اس کی آنکھوں سے نکلیں گے اس لئے اس کی محبت ان آنسوؤں کو زندۂ جاوید بنا دے گی۔

ہندوستانی بچّوں کا قومی گیت

حل لغات اور شرح مشکلات:۔ چشتی:۔ سلطان الہند خواجہ غریب نواز حضرت معین الدین حسین سنجری اجمیری۔ جنہوں نے ہندوستان میں اسلام کی شمع روشن کی۔ ۶۳۳ھ میں سلطان شمس الدین التمش کے عہد میں وفات پائی۔ حضرت کا آستانۂ مبارک تمام سلاطین ہند کا مرجع رہا ہے۔

من بداماںِ معین الدین حسن دستے زدم
سید من، خواجۂ من، خضر من، مولائے من

نانک:۔ جنہوں نے بتائید ایزدی، اسلام قبول کیا۔ اور پنجاب میں توحید اور مساوات کا درس دیا۔ جنکے مسلمان ہونے کا ثبوت آج بھی ان کے اس کرتہ سے مل سکتا ہے۔ جس پر سورۂ فاتحہ اور کلمۂ طیبہ لکھا ہوا ہے۔ لیکن ان کے پیرو غلطی سے ان کو غیر مسلم سمجھتے ہیں۔ تاتاریوں سے ترکانِ تیموری مراد ہیں۔ جنہوں نے ۱۵۲۶ء سے ۱۸۵۷ء تک حکومت کی۔ حجازیوں سے وہ عربی فاتحین

مراد ہیں جنہوں نے ۷۱۲ء میں سندھ فتح کیا تھا۔ یونانیوں کو جس نے حیران کردیا اشارہ ہے ہندو فلسفہ کی طرف واضح ہو کہ قدیم زمانہ میں ہندو قوم فلسفہ میں اہلِ یونان سے بھی بڑھی ہوئی تھی۔ فارس کے ستاروں سے وہ حکماء اور شعراء مراد ہیں جو مسلمانوں کی حکومت کے زمانہ میں فارس سے آکر یہاں آباد ہوگئے تھے۔ وحدت کی لے سے حضرت کرشن کی تعلیم کی طرف اشارہ ہے۔ میر عرب کو آئی ٹھنڈی ہوا اس میں آنحضرت صلعم کی حدیث کی طرف اشارہ ہے کہ آپ نے ایک مرتبہ فرمایا تھا کہ مجھے ہندوستان سے توحید کی خوشبو آتی ہے۔ بندے کلیم جس کے۔ اس سے مراد یہ ہے کہ قدیم زمانہ میں یہاں کے باشندوں نے عرفانِ الٰہی حاصل کیا تھا۔ نوح نبی کا آکر ٹھہرا جہاں سفینہ۔ اس مصرعہ میں اقبال نے اس روایت کو نظم کردیا ہے جو قدیم زمانہ میں یہاں مشہور تھی کہ حضرت نوح کا سفینہ ہندوستان کے کسی پہاڑ کی چوٹی پر آکر ٹھہرا تھا یہ روایت صحیح نہیں ہے۔

تبصرہ:۔ یہ نظم اقبال نے اس زمانہ میں لکھی تھی جب ان پر وطن پرستی (نیشنلزم) کا رنگ غالب تھا۔ چونکہ نظم آسان ہے اس لئے مطلب لکھنے کی ضرورت نہیں۔

نیا شوالہ

حل لغات اور شرح مشکلات:۔ صنم کدہ۔ بتخانہ۔ بت پرانے ہوگئے۔ یعنی بیکار ہوگئے۔ ان کی پوجا سے کوئی فائدہ حاصل نہیں ہوگا۔ جنگ و جدل سکھایا واعظ کو بھی خدا نے۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ واعظ نے خدا کے عطا کردہ مذہب کی غلط تفسیر کر کے جنگ و جدل کا شیوہ اختیار کر لیا۔ یہ شعر مجاز مرسل کی بہترین مثال ہے۔ مجاز مرسل وہ صنعت ہے جس میں الفاظ کچھ ہوتے ہیں۔ مراد کچھ ہوتی ہے۔ مثلاً خدا تخت کو سلامت رکھے" اس سے مراد ہے مالک تخت کی سلامتی۔ خاک وطن کا مجھ کو ہر ذرہ دیوتا ہے۔ یعنی اے برہمن! بتوں کی بجائے وطن کی پرستش کر۔ واضح ہو کہ یہ نظم اقبال نے اسی وطن پرستی کے دور میں لکھی تھی

جس کی تفصیل قبل ازیں سپردِ قلم کر چکا ہوں۔ نقش دوئی۔ یہ تصوف کی اصطلاح ہے یعنی کائنات میں دو ہستیوں کو (خدا کے علاوہ دوسری ہستی کو) موجود یقین کرنا۔ یہاں اس سے مراد ہے ہندو اور مسلمان کو دو یعنی دو قومیں تصور کرنا۔

شکتی۔ طاقت۔ شانتی۔ اطمینان۔ بھگت۔ عاشق۔ دھرتی۔ زمین۔ باشی۔ رہنے والا۔ مکتی۔ نجات۔ پریت۔ محبت۔

تبصرہ:۔ اس نظم کی معنویت تو مدتوں سے ختم ہو چکی ہے۔ ہاں شاعری کے اعتبار سے یہ نظم اقبال کے دورِ وطن پرستی کا بہترین نمونہ ہے۔ کیونکہ اس کا اندازِ بیان بہت مؤثر اور دل کش ہے۔ شاعر نے وطن کی عظمت کا نقش دلوں پر قائم کرنے کے لئے اپنی تمام شاعرانہ قوتوں کو صرف کر دیا ہے اکثر ناقدین اقبال کا یہ خیال ہے کہ ہندو مسلم اتحاد پر یہ اردو میں بہترین نظم ہے۔

داغ

حل لغات اور شرح مشکلات:۔ عظمتِ غالب ایک مدت سے پیوندِ زمیں ہے یعنی غالب کی وفات کو مدت گذر چکی ہے۔ پیوند زمین کنایہ ہے۔ فوت ہو جانے سے۔ شہر خموشاں کا مکیں ہے۔ یعنی میر مہدی مجروح بھی انتقال کر چکا۔

توڑ ڈالی موت نے غربت میں مینائے امیر

موت نے امیر مینائی کی زندگی کا پردیس میں خاتمہ کر دیا۔ مینائے امیر میں بڑی خوبی ہے۔ کیونکہ امیر حضرت شاہ مینا کی اولاد میں ہونے کی وجہ سے مینائی مشہور تھے چشمِ محفل میں ہے اب تک کیفِ صہبائے امیر۔ لیکن شاعری کے قدردانوں کی نگاہ میں امیر مینائی کا کلام ابھی تک نہایت دقیع اور دلکش ہے۔ بلبل دلی۔ کنایہ ہے داغ سے۔ اس چمن سے۔ عالم آخرت مراد ہے۔ آخری شاعر سے مراد یہ ہے کہ آئندہ اس پایہ کے شاعر کی پیدائش کی توقع

نہیں ہے بانکپن سے شعر کی دل کشی مراد ہے۔ واضح ہو کہ بعض اشعار میں بانکپن پایا جاتا ہے لیکن یہ صفت بذریعہ الفاظ نہیں سمجھائی جا سکتی۔ اس کے لیے اُس شاعر کے کلام کا مطالعہ لازمی ہے۔ مطلب یہ ہے کہ داغ کا کلام پڑھنے والے کے دل میں اسی طرح کھُپ جاتا ہے جس طرح کسی حسین کا حُسن و جمال۔ کافور پیری۔ کنایہ ہے۔ بالوں کی سفیدی سے کافور پیری میں جوانی کی آگ نہاں تھی یعنی بڑھاپے کے باوجود اس کے کلام میں جوانوں کی سی شوخی تھی یعنی زبان داغ پر جو آرزو ہر دل میں ہے۔ یعنی داغ نے تمام دنیا کے عاشقوں کے جذبات اور واردات کی ترجمانی کی ہے اور یہی معیار کمال شاعری ہے۔ لیلیٰ؛ ہاں بے پردہ ہے۔ شاعر نے واردات عاشقی کو لیلیٰ قرار دیا ہے مطلب یہ ہے کہ داغ نے جذبات عاشقی کو واضح طور پر اپنی شاعری میں بیان کر دیا ہے۔ یاں محل میں ہے۔ کنایہ ہے دلِ عاشق سے۔ یعنی جو بات عاشقوں کے دل میں پوشیدہ ہے وہ داغ کے کلام میں نمایاں ہے۔ اب صبا سے کون پوچھے گا سکوت گل کا راز؟ یہ مصرعہ بلاغت کی تصویر ہے۔ اور میں لکھ چکا ہوں کہ اقبال کی شاعری بلاغت کی کان ہے۔ اس قسم کے مصرعوں یا شعروں کی لفظوں کے ذریعہ سے تشریح نہیں ہو سکتی "بنز کون پوچھے گا"؟ اس استفہام نے مصرعہ میں غضب کی تاثیر پیدا کر دی ہے اور جس مصرعہ میں بلاغت اور تاثیر دونوں جمع ہو جائیں۔ اس کی دلکشی کا کیا ٹھکانا!

مطلب یہ ہے کہ شاعر اپنی قوت تخئیل کی بدولت بے زبان اور بے جان چیزوں کو گویا بنا کر ان سے ہم کلام ہو جاتا ہے۔ اور اسطرح فطرت کے بہت سے رازہائے سربستہ سے

نوٹ۔ (۱) امیر مہدی مجروح، مرزا غالب کے عزیز ترین شاگرد تھے ۱۹۰۲ء میں بمقام رامپور وفات پائی۔ (۲) امیر مینائی مرحوم داغ کے ہمعصر اور شاعری میں ان کے مدِّ مقابل تھے لیکن علم و فضل اور تقویٰ و طہارت کے لحاظ سے تمام شعراء پر فضیلت رکھتے تھے ۱۹۰۰ء میں بمقام حیدرآباد رحلت فرمائی۔

آگاہی حاصل کر لیتا ہے۔ مثال کے طور پر بانگِ درا ہی کی نظموں کو لے لیجیے۔ اقبال نے چاند، ستارہ، گل رنگیں، اور آفتاب سے گفتگو کی ہے ان کے جذبات کی عکاسی کی ہے۔ اسی طرح داغ نے اپنی شاعری میں صبا سے سکوتِ گل کا سبب دریافت کیا ہے۔ اور چمن میں جاکر بلبل سے اس کے نالہ کی وجہ معلوم کی ہے جو شئے شاعر کو تک بند سے ممیّز کرتی ہے وہ یہی قوتِ تخیّل تو ہے "نہ حقیقت سے نہ غفلت، فکر کی پرواز میں" لیکن تخیّل کبھی کبھی شاعر کے انداز بے راہ روی (حقیقت سے دوری) بھی پیدا کر دیتی ہے جب یہ قوت اعتدال سے متجاوز ہو جاتی ہے تو کلام یا مہمل بن جاتا ہے یا چیستاں۔ اس لئے اقبال کہتے ہیں کہ تخییل کی کرشمہ سازیوں کے باوجود داغ کا کلام حقیقت اور صداقت اور واقعیت سے دور نہیں ہے۔ یعنی یہ سچ ہے کہ داغ اپنے کلام میں آسمان سے تارے توڑ کر لایا ہے لیکن اس کے باوجود اس کی شاعری اصولِ فن کی بھی پابند رہی اور اخلاق وابہام کے عیوب سے بھی پاک رہی۔

یہ مطلب ہے اس مصرع کا "آنکھ طائر کی نشیمن پر رہی پرواز میں" اس شعر میں اقبال نے کتنا دلکش تلازمہ باندھا ہے۔ طائر۔ نشیمن پرواز سب کو ایک مصرع میں جمع کر دیا طائر سے شاعر۔ نشیمن سے شاعری کے اصول۔ اور پرواز سے فکرِ سخن مراد ہے مضمون کی باریکیاں۔ نازک خیالیاں، فکرِ نکتہ آرا۔ ایسی فکر (قوتِ مفکرہ) جو نکتے سجائے یعنی پیدا کرے۔

نوٹ:- ملک کے اکثر نوجوان انشاپرداز نقطہ کی جگہ نکتہ کا لفظ استعمال کرتے ہیں حالانکہ ان دونوں میں زمین و آسمان کا فرق ہے۔ مثلاً ان کی مراد یہ ہوتی ہے "نقطۂ نگاہ" لیکن لکھتے ہیں "نکتۂ نگاہ"۔ وہ لوگ لکھتے وقت اتنا نہیں سوچتے کہ نکتہ کا تعلق عقل سے ہے۔ نہ کہ نگاہ سے۔ اسی طرح تخیّل اور تخییل میں بہت فرق ہے۔

فلک پیمائیاں۔ خیال کی بلندی۔ پروازِ تخیل۔ تلخیِ دوراں مراد ہے انقلابات

عالم یا زمانہ کی سختیاں۔ تخیل کی نئی دنیا سے نئے نئے مضامین مراد ہیں۔ بلبل شیراز کنایہ ہے حافظ کے رنگ میں لکھنے والے سے۔ ساحر۔ کنایہ ہے نہایت مقبول شاعر سے جیسے جگر مراد آبادی۔ صاحب اعجاز۔ کنایہ ہے بہت بلند پایہ شاعر سے جس کا تتبع دوسروں کے لئے دشوار ہو۔ جیسے اکبر الہ آبادی۔ آذر حضرت ابراہیم کے باپ کا نام ہے۔ مراد ہے شاعر۔ تفسیریں لکھی جائیں گی۔ یعنی بہت سے دواوین مرتب ہوں گے۔ نوٹ:۔ اقبال نے ۱۹۱۵ء میں یہ مصرع محض شاعرانہ رنگ میں لکھا تھا لیکن آج ۱۹۵۱ء میں حقیقت بن کر ہمارے سامنے آگیا ہے۔ آج ہمارے ملک .... میں کوئی مہینہ خالی نہیں جاتا جب کسی شاعر کا مجموعہ کلام شائع نہ ہوتا ہو۔ ایسا معلوم ہوتا ہے۔ کہ اس ملک میں شاعروں اور فنکاروں کی بارش ہو رہی ہے۔

اڑ گیا ناوک فگن۔ تیر مارنے والا (داغ) دنیا سے رخصت ہو گیا۔ مارے گا دل پر تیر کون؟ کنایہ ہے داغ کی شاعری سے جس کا ہر شعر آج بھی اپنی جگہ قیامت ہے۔ اس مصرع کی صداقت کا ثبوت یہ ہے کہ داغ کے انتقال کو ۴۴ سال ہو چکے ہیں۔ لیکن ابھی تک ہندوستان میں اس کا جواب پیدا نہیں ہو سکا ہے۔ جگر مراد آبادی اور فراق گورکھپوری اور حسرت موہانی ان تین شعراء کے کلام میں اس کا رنگ ضرور جھلکتا ہے مگر وہ بات کہاں مولوی مدن کی سی" بیت الحرام۔ مذہب اہلِ سخن۔ کنایہ ہے دلی سے جس میں بہت سے باکمال شعراء پیدا ہوئے یا پروان چڑھے یا سکونت پذیر ہو گئے، دکن کی خاک میں۔ اشارہ ہے اس بات کی طرف کہ حضرت داغ کا انتقال حیدر آباد دکن میں ہوا تھا۔ حالی شمس العلماء خواجہ الطاف حسین صاحب حالی پانی پتی مرحوم، جو غالب کے شاگرد تھے تفصیلی حالات آئندہ لکھوں گا۔ آرزو کو خون رلواتی ہے بیداد اجل یعنی موت اس قدر ظالم ہے کہ انسان کی بہت سی آرزوئیں دل ہی میں رہ جاتی ہیں۔ یہ مصرع بھی مجاز مرسل کی بہت عمدہ مثال ہے۔ مارتا ہے تیر تاریکی میں اس مصرع میں اقبال نے وہ خیال نظم کر دیا ہے

جو عام طور سے دنیا میں رائج ہے کہ بعض آدمیوں کو "بے وقت" موت آجاتی ہے یا موت اپنا تیر تاریکی میں چلاتی ہے اور اس طرح اندھادھند لوگوں کو فنا کر دیتی ہے۔ جن کے مرنے کے دن ہوتے ہیں وہ بچ رہتے ہیں اور جن کے جینے کے دن ہوتے ہیں۔ وہ لقمۂ اجل بن جاتے ہیں۔ تاریکی میں تیر چلانا محاورہ ہے جس کا مطلب ہے اندھادھند مارنا۔ یہ تصور سراسر غیر اسلامی ہے۔ اسلام کی رو سے کسی کا یہ کہنا کہ زید کی بے وقت موت پر مجھے بہت افسوس ہے۔ صحیح نہیں ہے۔ کیونکہ بے وقت تو کوئی مر ہی نہیں سکتا۔

تبصرہ:۔ اکثر نقادان فن کا یہ فیصلہ ہے کہ داغ کی شاعری پر اس سے بہتر تنقید نہیں ہو سکتی موصوف کی شاعری کے عناصر ترکیبی حسب ذیل ہیں۔

(۱) بانکپن۔ مثلاً

بڑا فلک کو کبھی دل جلوں سے کام نہیں
جلا کے خاک نہ کردوں تو داغ نام نہیں

(۲) شوخی

اللہ رے حجاب بدگمانی تیری
بھیجی ہے مجھے نصف بدن کی تصویر

نوٹ:۔ حجاب۔ موجودہ زمانہ کی اصطلاح میں آج سے نصف صدی پہلے کلکتہ کی مشہور "آرٹسٹ" تھی، رقص و سرود اور نغمہ و طاؤس کے علاوہ شعر بھی کہتی تھی۔ داغ کی شاگرد تھی ۱۸۸۳ء میں اس نے اپنا بسٹ (BUST) استاد کو بھیجا تھا۔ اس پر موصوف نے ایک رباعی لکھ کر اسے بھیجی تھی جسکا دوسرا شعر میں نے شوخی کی مثال میں لکھا ہے۔

(۳) جذبات نگاری۔ یعنی واردات عشق کی تصویر کشی۔ مثلاً

بتان ماہوش اجڑی ہوئی منزل میں رہتے ہیں
جسے برباد کرتے ہیں اسی کے دل میں رہتے ہیں

(۴) دلکشی اور جاذبیت مثلاً

باغباں کلیاں ہوں ہلکے رنگ کی   بھیجنا ہیں ایک کمسن کے لئے

حقیقت یہ ہے کہ ان چار خوبیوں کے لحاظ سے جن کی طرف اقبال نے اپنی نظم میں نہایت بلیغ انداز میں اشارے کئے ہیں۔ داغ کا کلام اپنی جگہ بے مثل ہے چوتھی صفت دل کشی خود کئی صفات کا مجموعہ ہے۔ مثلاً جب تک زبان پر قدرت نہ ہو۔ انداز بیان میں سلاست نہ ہو۔ شوخی اور بانکپن نہ ہو۔ روزمرہ اور محاورہ کی چاشنی نہ ہو۔ جذبات نگاری اور محاکات کی افراط نہ ہو۔ رموز عاشقی کا بے پردہ اظہار نہ ہو۔ معشوق سے چھیڑ چھاڑ نہ ہو بندش کی چستی نہ ہو الفاظ کا صحیح انتخاب نہ ہو رمز و کنایہ نہ ہو۔ شعر میں دل کشی پیدا نہیں ہو سکتی مثلاً یہ شعر ؎

نہ ہم سمجھے نہ تم آئے کہیں سے ۔۔۔ پسینہ پونچھئے اپنی جبیں سے

اس لئے اس قدر دل کش ہے کہ اس میں بہت سی شاعرانہ خوبیاں بیک وقت جمع ہو گئی ہیں۔ افسوس ہے کہ میں بخوف طوالت اپنی اس شرح میں داغ کے محاسن کلام بیان نہیں کر سکتا صرف ان کی مختصر لائف لکھنے پر اکتفا کرتا ہوں۔

نواب مرزا خاں داغ دہلوی نواب شمس الدین خاں کے فرزند تھے جو نواب لوہارو کے چھوٹے بھائی تھے، داغ کی ولادت ۱۲۴۷ھ/۱۸۳۱ میں ہوئی جب وہ چھ سال کے تھے تو یتیم ہو گئے بزرگوں کے مشورے سے داغ کی والدہ محترمہ نے مرزا فتح الملک الملقب بہ مرزا فخرو ولیعہد بہادر شاہ ثانی سے عقد ثانی کر لیا۔ اس لئے داغ کی پرورش شاہی خاندان میں ہوئی۔ اور دہلی میں زبان پر وہ قدرت حاصل ہوئی جس نے ان کے کلام کو غیر فانی بنا دیا۔

اقبال نے بالکل سچ لکھا ہے ؏ ۔ اٹھ گیا ناوک فگن مارے گا دل پر تیر کون؟

چونکہ شاعری، شاعری ہے نہ کہ فلسفہ یا منطق کے مسائل کو نظم کرنا۔ اس لئے "ناوک فگنی" میں بلاشبہ اس زمانہ کا کوئی شاعر۔ داغ کا مقابلہ نہیں کر سکتا۔ مثلاً داغ کے اس معمولی سے شعر کا جواب اکثر دیوانوں میں نہیں نکل سکتا۔

پلٹ جاتے ہیں وہ بجلی کے ڈر سے ۔۔۔ الٰہی یہ گھٹا دو دن تو برسے

۱۲۷۲ھ میں مرزا فخرو کا انتقال ہو گیا اور ۱۲۷۴ھ (۱۸۵۷ء) میں لال قلعہ کا سہاگ اجڑ گیا جب داغ کے ہوش و حواس درست ہوئے تو تلاش معاش کی خاطر وطن کو خیر باد کہہ کر نکلے۔ کچھ عرصہ رامپور رہے۔ پھر وہاں سے دل اچاٹ ہو گیا تو ادھر ادھر قسمت آزمائی کرتے رہے۔ جب پریشانی حد سے گذر گئی تو اجمیر کا رخ کیا، اور کسی کے آستانہ پر حاضر ہو کر غلام گردش کے ستون سے لگ کر نظم کے پردہ میں حالِ دل بیان کیا۔ سننے والوں کا بیان ہے کہ جب داغ اپنی نظم پڑھ رہے تھے تو درودیوار پر وجد کا عالم طاری تھا۔ خود بھی اشکبار تھے اور سامعین بھی بے قرار تھے۔ میں بخوفِ طوالت صرف ایک مصرعہ اس جگہ درج کرتا ہوں۔ ع

کہ میں غریب ہوں خواجہ مرا غریب نواز

دوسرے دن اجمیر ہی میں حیدرآباد دکن سے طلبی کا پروانہ ملا اور مدتوں کی آوارہ گردی کے بعد کامیابی اور شادمانی کا دور شروع ہوا جو تا دم وفات قائم رہا۔

میر محبوب علی خاں نظام دکن نے اپنا استاد بنایا۔ رامپور میں ۲۵ روپے ماہوار ملتے تھے، یہاں پندرہ سو روپے ماہوار مقرر ہوئے۔ جو شاگرد پچاس لاکھ روپے کا ایک الماس خرید سکتا ہو۔ اگر اس نے اپنے استاد کو مالا مال کر دیا تو کیا تعجب ہے۔ ۱۹۰۵ء میں وفات پائی۔

ابر

حلِ لغات اور شرح مشکلات: سیاہ پوش ہوا کالی گھٹا کی رعایت سے سیاہ پوش کہا ہے۔ سربن۔ ایبٹ آباد کے مشرق میں پہاڑ کی چوٹی کا نام ہے جو ۲۴۲۲ فٹ بلند ہے۔ نہاں پوشیدہ۔ رخِ مہر یعنی آفتاب۔ زیرِ دامن ابر یعنی بادلوں میں۔ سوارِ توسنِ ابر۔ یعنی بادلوں کے گھوڑے پر سوار ہو کر۔ میکدۂ بے خروش چونکہ شراب نوشوں کی رائے میں کالی گھٹا دعوتِ مے نوشی دیتی ہے۔ اس لئے گھٹا کو خاموش شراب خانہ سے تعبیر کرنے میں بڑا معنوی لطف پیدا ہو گیا ہے

نشاطِ مدام۔ دائمی خوشی۔ قبائے گل میں گہر ٹانکنے کو آئی ہے۔ بہت دل کش اندازِ بیان ہے شاعر نے مینہ کی بوندوں کو گہر سے تعبیر کیا ہے۔ مطلب یہ ہے کہ گلاب کے پھولوں پر سفید بوندیں ایسی معلوم ہوتی ہیں جیسے سرخ قبا میں موتی ٹکے ہوئے ہیں۔ ہوا کے زور سے اُبھا رِ اس مصرع میں اقبالؔ نے گھٹا کے اٹھنے اور گھر آنے اور بھر برسنے کی تصویر کھینچدی ہے۔

کہسار کے نہال۔ کوہستانی درخت۔

نوٹ :۔ اقبال ۱۹۰۳ء میں بغرضِ تفریح ایبٹ آباد گئے تھے اور یہ نظم انھوں نے اس جگہ بیٹھ کر لکھی تھی، جہاں اب میونسپل کمیٹی کا باغ ہے سربن کی چوٹی اس باغ کے عین مقابل نظر آتی ہے۔

ایک پرندہ اور جگنو

حل لغات اور شرح مشکلات : سرِشام۔ شام کے وقت۔ مرغ نغمہ پیرا گانے نالا پرندہ۔ مثلاً بلبل۔ نوا ریز۔ آواز یا موسیقی برسانے والا۔ منقار ہوس تیز کرنا۔ کنایہ ہے کھا جانے سے۔ پتنگوں کا طور ہوں۔ یعنی تمام کیڑوں میں میرا وجود خدا کی قدرت کا کرشمہ ہے میرے اندر خدا کا جلوہ نظر آتا ہے۔ بہشت گوش یعنی دل کشی ہے۔ فردوس نظر۔ یعنی آنکھوں کو بھلی معلوم ہوتی ہے ضیا، روشنی، منقار۔ چونچ۔ مخالف ساز کا ہوتا نہیں سوز۔ واضح ہو کہ اقبال کے کلام میں یہ دو لفظ سوز و ساز بکثرت مستعمل ہیں سوز سوختن (جلنا) کا اور ساز، ساختن (بنانا یا ہم آہنگ کرنا) کا حاصل مصدر ہے۔ سوز۔ رنج و راحت اور ساز، خوشی اور راحت کا مظہر ہے، سوز و ساز۔ یہ کثیر المعانی لفظ ہیں۔ جگنو کی زندگی میں سوز کا اور مرغ نغمہ ریز کی زندگی میں ساز کا رنگ پایا جاتا ہے۔

جگنو نے اس گانے والی چڑیا سے کہا کہ اے چڑیا! جس خدا نے تجھے موسیقی عطا فرمائی ہے۔ اس نے مجھ کو یہ چمک دمک عنایت کی ہے۔ میرے اندر سوز ہے تیرے اندر

ساز ہے ہیں جل رہا ہوں (رنج و غم) تو گا رہا ہے (مسرت) یاد رکھو سوز ساز کا مخالف نہیں ہوتا بلکہ دوست اور رفیق ہوتا ہے۔ انہی دو چیزوں (حیات انسانی کے دو پہلوؤں) سے یہ کائنات قائم ہے سوز و ساز زندگی کی دو ایسی شاخیں ہیں جو ایک دوسرے سے جدا نہیں ہوتیں یہ دنیا سوز و ساز کی بدولت اس قدر دل کش ہے۔ اگر محض سوز ہوتا تو ہر شخص جینے سے تنگ آجاتا اور اگر محض ساز ہوتا تو ترقی کا جذبہ پیدا نہ ہوتا، سوز و ساز میں ایک مستقل ہم آہنگی ہے مطابقت ہے اور اسی مطابقت سے یہ دنیا اسقدر دلکش ہے۔

اقبالؔ نے اس نظم میں اسی حقیقت کو واضح کیا ہے کہ سوز اور ساز دونوں اپنی اپنی جگہ بہت ضروری ہیں۔ ان دونوں کی ہم آہنگی ہی سے دنیا میں دلکشی اور انسان میں ترقی کا جذبہ پیدا ہوتا ہے۔

بچہ اور شمع

حل لغات اور شرح مشکلات:۔ طفلک پروانہ خو۔ وہ چھوٹا بچہ جس میں پروانہ کی سی عادت پائی جائے۔ خاک تیرہ کا فانوس۔ کنایہ ہے جسم خاکی سے نور تیرا چھپ گیا زیر نقاب آگہی۔ یہ بہت بلیغ مصرع ہے۔ نور سے حقیقت انسانی مراد ہے۔ یعنی انسان اپنی اصل کے لحاظ سے مادی نہیں بلکہ نورانی ہے۔ اس کی روح ذرات مادی کی ترکیب کا نتیجہ نہیں ہے۔ بلکہ ایک جوہر نورانی ہے نقاب آگہی۔ آگہی سے مراد ہے شعور ذاتی۔ اس شعور ذاتی کی بدولت انسان مادی دنیا سے تعلقات پیدا کرتا ہے۔ اور رفتہ رفتہ ان تعلقات میں اسے اس قدر انہماک ہو جاتا ہے کہ وہ اپنی حقیقت سے غافل ہو جاتا ہے..... یعنی اسے یہ نہیں یاد رہتا کہ مجھے اس دنیا میں خدا کے لیے جینا ہے اور انجام کار اسی کی طرف لوٹ کر جانا ہے (اِنَّا لِلّٰہِ وَاِنَّا اِلَیْہِ رٰجِعُوْن) ان مطالب کو مد نظر رکھ کر مصرع کا مطلب سمجھ میں آسکتا ہے کہ انفرادی شعور انسان کو اپنی حقیقت سے غافل کر دیتا ہے

دوسرا مصرع پہلے مصرع کی مزید تشریح ہے کہ شعور کا حجاب دیدۂ بینا کے حق میں غبار بن جاتا ہے۔ دریائے بے پایانِ حسن۔ قدرت حسن کا غیر محدود سمندر ہے ہر قطرہ میں ہے طوفانِ حسن۔ یعنی ہر شے میں خدا کی قدرت نظر آتی ہے۔ ضوگستری، یعنے نور پاشی۔ روشنی پھیلانا۔ شفق کی گل فروشی۔ مراد ہے اس کی سُرخی۔ ساکنان صحنِ گلشن سے بلبور خوش الحان مراد ہیں۔ گم گشتہ شے کی ہے ہوس۔ کسی کھوئی ہوئی چیز کی تلاش ہے۔ گم گشتہ شے سے حسن مطلق مراد ہے یعنی ذات خداوندی۔ ماہی بے آب۔ کنایہ ہے بیقراری اور اضطراب سے۔

تبصرہ:۔ اس دل کش اور بلیغ نظم میں اقبال نے بچہ اور شمع کے پردہ میں اپنی جستجو اور تلاش کے جذبات کا اظہار کیا ہے۔ خلاصہ یا بنیادی تصور اس نظم کا یہ ہے کہ روحِ انسانی حُسنِ مطلق کی تلاش میں سرگرداں ہے یہ کائنات سراپا حُسن وجمال ہے، ہر شے میں حُسن موجود ہے اور حُسن وجمال کسی ایسی ذات کا پرتو ہے جو منبع حُسن ہے یعنی حُسن مطلق ہے۔ پس انسانی روح فطری طور پر اسی حُسن مطلق کو حاصل کرنا چاہتی ہے۔ یہ تصوّر اقبال کے نظام ..... افکار میں بنیادی مرتبہ رکھتا ہے اور اس نکتہ کو انہوں نے اپنی تمام تصانیف میں مختلف طریقوں سے بیان کیا ہے۔ مثلاً زبور عجم میں لکھتے ہیں ؎

گرفتم اینکہ جہاں خاک و ما کفِ خاکیم
بہ ذرہ ذرۂ ما دردِ جستجو زِ کجا ست

یعنی ہم نے مان لیا کہ یہ دنیا بھی مادی ہے اور ہم بھی مادی ہیں لیکن ہمارے اندر کسی کی تلاش کا جذبہ کہاں سے آگیا؟

نظم کا مطلب: اقبال چھوٹے بچے سے خطاب کرتے ہیں کہ تو شمع کو حیران ہو کر گھڑیوں سے کیوں دیکھتا رہتا ہے؟ کیا تو روشنی کو اپنی آغوش میں لینا چاہتا ہے تیرے

اس انداز سے مجھے یہ معلوم ہوتا ہے کہ تو دنیا میں آنے سے پہلے اس چیز کو دیکھ چکا ہے۔ لیکن میں تجھے بتانا چاہتا ہوں کہ شمع تو نار ہے اور تو نور ہے خدا نے اسے عریاں کر کے دنیا میں بھیجا ہے اور تجھ کو یعنی تیرے نور کو جسم خاکی میں پوشیدہ کر دیا ہے۔ چونکہ تیرے اندر ذاتی شعور بھی ہے اس لئے اس نے تجھے اپنی حقیقت سے غافل کر دیا۔ پس میں یہ کہہ سکتا ہوں کہ انسان کی زندگی، فراموشی، خوابِ غفلت، سرمستی اور بے ہوشی سے عبارت ہے کیونکہ مادی اور دنیاوی تعلقات میں شدید انہماک کی بدولت وہ اپنی اصلیت سے غافل ہو گیا ہے۔ اس کا فرض منصبی یہ ہے کہ وہ اپنے رب کی معرفت حاصل کرے۔ اور معرفت کے حصول کی شرط اطاعت ہے۔ لیکن انسان دنیا میں مستغرق ہو کر اپنے فرض کو بھلا دیتا ہے۔ اور کائنات میں خدا کو تلاش کرنے کے بجائے زن، زر، اور زمین کی جستجو کرتا رہتا ہے۔

اس کے بعد شاعر ہمیں اس حقیقت سے آگاہ کرتا ہے کہ اگر انسان اس کائنات کا بغور مطالعہ کرے تو اسے ہر شے میں حسن کی ایک جھلک نظر آئے گی محفل قدرت یعنی یہ کائنات دراصل حسن و جمال کا ایک سمندر ہے (اقبال نے اس بند میں عورت کے حسن کا ذکر اس لئے نہیں کیا کہ وہ ہر شخص کو نظر آتا ہے) مثلاً کوہستان کی ہیبت ناک خاموشی، آفتاب کی نور پاشی، رات کی سیاہی صبح کی روشنی، شفق کی سرخی۔ آثار قدیمہ یعنی پرانے کھنڈر۔ بچہ کی کوششِ گفتگو، پھول کی مہک۔ غنچہ کی چٹک۔ بلبل کی چہک۔ کہسار کی ندی، سورج کی کرن، ماہِ کامل کی چاندنی، چشمہ کی روانی غرض ہر شے سے حسن کی شعاعیں پھوٹی پڑتی ہیں۔

آخر میں شاعر یہ نکتہ بیان کرتا ہے کہ اگر یہ کائنات حسین ہے تو اس کی وجہ یہ ہے کہ اس کا بنانے والا منبع حسن ہے۔ حسن مطلق ہے، سراپا حسن ہے اسی لئے روحِ انسانی اس ذات پاک کی تلاش میں مضطرب۔ روحِ انسانی ان حسین مناظر سے

مطمئن نہیں ہوتی، بلکہ وہ ان کے سرچشمہ سے ملنا چاہتی ہے

کنارِ راوی

حل لغات اور شرح مشکلات :- سکوتِ شام۔ شام کے وقت فضا میں خاموشی پیدا ہو جاتی ہے۔ شور و غل کے بند ہو جانے سے۔ محو سرود ہے۔ گانے میں محو ہے شاعر نے دریا کے بہنے کو نغمہ سرائی سے تعبیر کیا ہے۔ یہ زیر و بم سجدہ کا پیام ہے۔ یعنی دریا کی روانی کو دیکھ کر میرے دل میں خدا کی ہستی کا یقین پیدا ہو گیا۔ اس لئے اس کے حضور میں سر جھکانے کو جی چاہتا ہے۔ زیر و بم موسیقی کی اصطلاح ہے۔ زیر نیچی آواز یا نیچے سروں کو کہتے ہیں اور بم اونچے سروں کو۔ جہاں تمام سوادِ حرم ہو گیا یعنی مجھے ساری دنیا مسجد نظر آنے لگی یعنی ساری دنیا میں خدا کی ہستی جلوہ گر نظر آنے لگی۔ خبر نہیں مجھ۔ یعنی مجھ پر ایک عالم محویت طاری ہو۔ شرابِ سرخ کنایہ ہے شفق سے جو سرخ ہوتی ہے لئے ہے پیرِ فلک۔ یعنی جب میں شفق کو دیکھتا ہوں تو یہ محسوس ہوتا ہے گویا کوئی بوڑھا آدمی اپنے کانپتے ہوئے ہاتھوں میں سرخ شراب کا پیالہ لئے ہوئے ہے۔ پیرِ فلک کی رعایت سے "عصا دار" کی ترکیب لائے ہیں۔ یہ مصرعہ استعارہ بالکنایہ کی نہایت دل کش مثال ہے۔ عدم کو قافلۂ روز تیز گام چلا۔ تیز گام۔ تیزی سے قدم اٹھانے والا۔ یعنی دن ختم ہوا چاہتا ہے عظمت فضائے تنہائی۔ تنہائی کی شان بڑھانے والے۔ صفت ہے مقبرۂ جہانگیر کے میناروں کی۔ خوابگہ شہسوار چغتائی۔ یعنی مقبرۂ جہانگیر۔ محل بمعنی مقام یا جگہ۔ فسانۂ ستمِ انقلاب ہے یہ محل اس مصرع میں اقبال نے رمز و ایما سے کام لے کر ہندی مسلمانوں کی داستان تلمیند کر دی ہے یعنی یہ کنارِ راوی۔ اور یہ مقبرۂ جہانگیر در اصل مسلمانوں کی عظمتِ رفتہ کے نشانات ہیں۔ زمانہ سلف بمعنی گذرا ہوا زمانہ یا زمنہ سابقہ۔ سرودِ خموش۔ ایسا نغمہ جس کو دل کے کان سن سکیں۔ انجمن بے خروش سے

درختوں کی کثرت مراد ہے۔ لیکن اس انجمن کی خصوصیت یہ ہے کہ اس کے افراد گفتگو نہیں کرتے۔ سرو خموش اور انجمن بے خروش۔ شاعری کی قوت تخئیل کی کرشمہ سازیاں ہیں۔ سفینہ بمعنی کشتی۔ گرم ستیز، ملاح موجوں سے جنگ کر رہا ہے۔ ستیز بمعنی لڑائی بمبکرری تیز روی۔ جہاز زندگی آدمی یعنی انسان کی زندگی بھی اسی طرح تیزی کے ساتھ مسافت عمر طے کرتی چلی جاتی ہے۔ ابد کے بحر سے زمانہ مراد ہے۔ جس کو اقبال نے سمندر سے تشبیہہ دی ہے۔ جسطرح کشتی دور جاکر نگاہ سے چھپ جاتی ہے۔ لیکن فنا نہیں ہوتی۔ اسی طرح انسان بھی نظر سے چھپ جاتا ہے لیکن فنا نہیں ہوتا۔ یعنی انسان کی روح ابدی ہے۔

تبصرہ:۔ اس نظم کا انداز ورڈسورتھ اور براؤننگ کی شاعری سے بہت مشابہ ہے یوں تو یہ نظم آسان ہے لیکن اس میں معنوی خوبیاں بہت پائی جاتی ہیں مثلاً پوری نظم شاعرانہ مصوری کی بہت دل کش مثال ہے (۲) استعارات اور تشبیہات رمز اور کنایہ اور ایمائی اثر آفرینی کے نادر نمونے اس میں موجود ہیں (۳) یہ رنگ بال جبریل میں اپنے کمال کو پہونچ گیا ہے (دیکھو مسجد قرطبہ) (۴) میناروں کی طرف اشارہ کرکے اقبال نے ہمارے ذہن کو مسلمانوں کی عظمت ماضیہ کی طرف بڑی خوبصورتی کے ساتھ منتقل کردیا۔ میناروں کے ساتھ مسلمانوں کے عروج کا نقشہ بھی ہماری نگاہوں کے سامنے آجاتا ہے۔ اور انسان کی توجہ میناروں کی بجائے گذشتہ زمانہ کی تاریخ پر مبذول ہوجاتی ہے۔ اس کا نتیجہ یہ نکلتا ہے کہ انسان کو خبر نہیں رہتی کہ وہ کہاں کھڑا ہوا ہے (۵) آخری بند میں اقبال نے کشتی کی روانی سے انسانی عمر کی روانی کی طرف اشارہ کیا ہے۔ اور ایک زبردست اخلاقی سبق اپنے ناظرین کو پڑھایا ہے کہ انسان ایک حقیقت ابدی ہے۔ موت انسان کو ہماری نظروں سے پوشیدہ کردیتی ہے لیکن فنا نہیں کرتی۔ نیز دنیا کی کوئی طاقت حتیٰ کہ موت بھی انسان کو شکست

نہیں دے سکتی۔ انسان کا انجام شکست یا فنا نہیں ہے جیسا کہ بعض "ترقی پسند" سمجھتے ہیں۔ بلکہ اگر وہ گرتا ہے تو پھر ابھرنے کے لیے۔ پس انسان کو موت سے گھبرانا نہیں چاہئے۔ خلاصہ کلام یہ ہے کہ یہ نظم ہمارے لئے امید اور رجائیت کا پیغام ہے۔

التجائے مسافر

حل لغات اور شرح مشکلات بر جناب محبی درگاہ۔ ستارے عشق کے تیری کشش سے ہیں قائم۔ سبحان اللہ! کیا بلیغ مصرع ہے یعنی تیری شخصیت مرکز عشق الٰہی ہے۔ اگر تو نہ ہوتا تو نظامِ عاشقی تہ و بالا ہو جاتا۔ تیرے دم سے عشق الٰہی کا سلسلہ قائم ہے۔ نظام مہر کی صورت نظام ہے تیرا۔ کس قدر بلیغ مصرعہ ہے لفظ نظام میں صنعتِ ابہام ہے۔ کیونکہ حضرت اقدس کا نام بھی نظام الدین ہے (۱) آپ کی ذات سے عاشقی کا نظام قائم ہے۔ (۲) آپ نے ہندوستان میں تبلیغ اسلام کیلئے جو نظام قائم کیا تھا اس کی طرف بھی ضمناً اشارہ ہے (۳) عاشقانِ الٰہی کی جماعت میں آپ کا وہی مرتبہ ہے جو آفتاب کا نظام شمسی میں ہے۔ لحد سے مزار مبارک مراد ہے۔ "زندگی دل کی" یعنی بزرگانِ دین اور عاشقانِ رسول کے مزارات کی زیارت سے دل زندہ ہو جاتا ہے۔

واضح ہو کہ اقبال نے اس نظم میں جس قسم کے خیالات ظاہر کئے ہیں، وہ نیچری معتزلی، عقل پرست، ظاہر بیں، فلسفی، نجدی اور وہابی ٹائپ کے مسلمانوں کی سمجھ میں نہیں آسکتے۔ مثلاً ایک نیچری یا وہابی ٹائپ کا مسلمان یہ سوال کر سکتا ہے کہ صاحب! قبروں کی زیارت سے دل کس طرح زندہ ہو سکتا ہے؟

اس کا جواب یہ ہے کہ صاحب!

(۱) انسان مع الجسد العنصری (اسی مادی جسم کے ساتھ) آسمان پر کیسے جا سکتا ہے (آنحضرتؐ)

(۲) انسان مردہ کو زندہ کسطرح کر سکتا ہے؟ (حضرت عیسیٰؑ)

(۳) انسان فرشتوں سے کس طرح ہمکلام ہو سکتا ہے؟ (انبیاء)

(۴) انسان، دریائے نیل کو خط کس طرح لکھ سکتا ہے؟ (فاروق اعظمؓ)

(۵) انسان خدا سے کس طرح ہمکلام ہو سکتا ہے؟ (حضرت موسٰی)

(۶) تکلم بغیر واسطہ خلاف عقل ہے، پس قرآن کس طرح کلام الٰہی ہو سکتا ہے؟ یعنی زبان کے بغیر: خدا نے اپنا کلام جبرئیل کو کیسے سنا دیا؟

(۷) نفس ناطقہ، جسم میں کسی جگہ نہیں ہے، تو وہ مدبر جسم کیسے ہے؟

(۸) سارے عقل پرست، مسلمانوں کو چیلنج ہے کہ وہ مل کر اس سوال کا جواب دیں کہ خدا قدیم ہے اور روح حادث ہے تو قدیم سے حادث کا صدور کس طرح ہو سکا؟ یہ تو عقل کے خلاف ہے کہ واحد سے کثرت یا قدیم سے حادث سرزد یا صادر ہو سکے پس حادث روح، قدیم خدا سے کیسے سرزد ہوئی بالفاظ دیگر ربط حادث بالقدیم کی عقلی توجیہہ پیش کریں۔

(۹) نیچری اور عقل پرست مسلمان مجھے بتائیں کہ خدا کی ذات کا اس کی صفات سے کیا علاقہ ہے؟ اگر صفات عین ذات ہیں تو قرآن خدا کو سمیع کیوں کہتا ہے؟ سمع کہنا چاہئے تھا، اور اگر غیر ذات ہیں تو تعدد قدما، لازم آگیا۔

(۱۰) اللہ مشخص ہے یا غیر مشخص؟ اگر وہ مشخص ہے تو محدود ہو گیا۔ اور اگر غیر مشخص ہے تو وہ قرآن میں اپنے لئے "میں" اور "ہم" کا لفظ کیوں استعمال کرتا ہے؟

جب عقل پرست مسلمان میرے دس سوالات کا یا ان میں سے نصف ہی کا جواب دیدیں گے تو میں بھی ان کو بتا دوں گا یا سمجھا دوں گا کہ بزرگانِ دین کی قبروں کی زیارت سے "دل" کیسے زندہ ہو جاتا ہے۔

حقیقت یہ ہے کہ اگر ایک مسلمان یہ کہتا ہے کہ "بزرگانِ دین کی قبروں کی زیارت

سے دل کا زندہ ہو جانا عقل کے خلاف ہے تو وہ نادانستہ طور پر ایسی مصیبت مول لے لیتا ہے۔ جس سے قیامت تک مفر نہیں ہے۔ یعنی ہم اس سے یہ کہتے ہیں کہ بندۂ خدا! اگر یہ اصول صحیح ہے کہ جو بات عقل میں آتے یا عقل کے خلاف ہو اسے قبول نہیں کرنا چاہیئے تو خدا بھی تو عقل میں نہیں آتا بلکہ اس کا وجود ہی عقل کے خلاف ہے۔ اس لئے عقل پرست مسلمان اگر واقعی مخلص ہے تو اسے سب سے پہلے خدا کا انکار کرنا چاہیئے۔ اس کے بعد ملائکہ کا اس کے بعد وحی کا اس کے بعد روح کا اس کے بعد حیات بعد الموات کا۔ کیونکہ یہ ساری باتیں عقل کے خلاف ہیں۔

نہاں ہے تیری محبت میں رنگ محبوبی۔ یعنی تو نے ایسے خلوص کے ساتھ اللہ کی محبت اختیار کی کہ اللہ نے تجھے اپنا محبوب بنالیا۔ یہ اشارہ ہے حضرت کے لقب "محبوبِ الٰہی" کی طرف۔ واضح ہو کہ یہ لقب تفسیر ہے اس آیت مبارکہ کی۔ اِنْ كُنْتُمْ تُحِبُّوْنَ اللّٰهَ فَاتَّبِعُوْنِیْ یُحْبِبْكُمُ اللّٰهُ۔ اے مسلمانو! اگر تم اللہ سے محبت کرنا چاہتے ہو تو اس کی بہترین صورت یہ ہے کہ میری (رسول کی) اتباع کرو اس اتباع کا ثمرہ یہ ملے گا کہ خود اللہ تمہیں اپنا محبوب بنالے گا" اس آیت سے معلوم ہوا کہ "محبوب الٰہی بننے کا طریقہ عقل نہیں ہے بلکہ "عشق" ہے اور حضرت محبوبِ الٰہی سلطان نظام الدین اولیاؒ نے عشق ہی کا طریقہ اختیار کیا تھا جو انسان کو اللہ سے ملا دیتا ہے

اگر سیاہ دلم داغِ لالہ زار توام

اگر میں گنہگار ہوں اور خطا کار ہوں تو بھی آپ ہی کا غلام ہوں، اور اگر نیک نہاد اور نکوکار ہوں تو بھی آپ ہی کا پروردہ ہوں۔

نکہت گل۔ پھول کی خوشبو۔ ہوا ہے صبر کا منظور امتحاں مجھ کو۔ یہ کس قدر دل کش اسلوب بیان ہے! مطلب یہ ہے کہ میں کئی سال تک اپنے والدین سے دور ممالک غیر میں زندگی بسر کروں گا۔ اور اس کے لئے بہت صبر کی ضرورت ہے۔ نگار خانہ تصویر کدہ

درخت صحرا ہوں یعنی کسی دولتمند باپ کا فرزند نہیں ہوں۔ فلک نشین صفت مہر ہوں یعنی آپ میرے حق میں اللہ سے دعا کیجئے کہ میں آفتاب کی طرح منور، مشہور اور اونچا ہو جاؤں۔ زد بان، بڑا مسی سمجھے منزل مقصود کارواں مجھکو یعنی قوم کے افراد مجھے اپنی منزل مقصود سمجھنے لگیں۔ یہ بڑا بلیغ مصرعہ ہے اور عجیب بات ہے کہ جو دعا اس فقرہ میں مضمر ہے وہ بجنسہٖ قبول ہو گئی۔ آج ہر مسلمان اقبال کو اپنی "منزل مقصود ہی" سمجھتا ہے۔ الاماشاء اللہ۔ تری جناب سے ایسی ملے فغان مجھکو بڑا بلیغ مصرع ہے۔ یعنی آپ دعا کریں کہ اللہ میرے کلام میں ایسی تاثیر پیدا کر دے کہ پڑھنے والوں کا دل پگھل جائے۔ آشیاں۔ کنایہ ہے وطن مالوف سے " پھر آ رکھوں" یہ ترکیب غیر فصیح ہے۔ مطلب ہے۔ پھر واپس آکر رکھوں۔ ساری بانگ درا میں اگر ایک جملہ غیر فصیح ہو تو اس سے شاعر کی قدرت کلام پر حرف، نہیں آسکتا۔ غالب کے کلام میں بھی ایک جگہ ایک غیر فصیح ترکیب موجود ہے۔ ع " بھوں پاس آنکھ قبلۂ حاجات چاہیئے"۔ " بھوں پاس" یہ ترکیب غیر فصیح ہے اور کانوں کو گراں گزرتی ہے شمع بارگہ خاندان مرتضوی۔ مراد ہے شمس العلماء مولانا میر حسن صاحب سیالکوٹی مرحوم و مغفور جس کے نفس سے میری کلی کھلی یعنی جس کے فیض صحبت نے مجھے انسان بنا دیا نفس سے مراد ہے تربیت۔ مروت۔ یہ کثیر المعانی لفظ ہے۔ اور بہت سی عمدہ خوبیوں کا جامع ہے۔ مراد ہے نوازش یا احسان عظیم۔ نکتہ داں مراد ہے۔ سخن فہم اور طباع۔ یوسف ثانی۔ کنایہ ہے بڑے بھائی شیخ عطا محمد سے، جنہوں نے علامہ مرحوم کی اعلیٰ تعلیم کا خرچ برداشت کیا اور ان کو اپنی اولاد سے زیادہ سمجھا۔ چنانچہ اقبال نے خود اگلے شعر میں اس حقیقت کا اعتراف کیا ہے۔ ہوائے عیش میں پالا کیا جواں مجھ کو جلا کے جس کی محبت نے دفتر من و تو۔ یعنی میرے بڑے بھائی نے مجھ سے اس طرح محبت کی کہ غیریت کا احساس مٹ گیا یعنی انہوں نے مجھ پر اس طرح اپنا روپیہ صرف کیا جس طرح کوئی اپنی ذات پر صرف کرتا۔ انہوں نے اپنی ذات اور مجھ میں کوئی

مغائرت نہیں سمجھی۔ یہ معنی ہیں اس ترکیب کہ "من وتو کا دفتر جلا دیا"۔ ریاض دہر۔ مراد ہے دنیا۔ خنداں۔ مراد ہے خوش وخرم۔ عزیز تر از جان۔ وہ جانِ جاں مجھ کو ادبی ا . . . . اعتبار سے بہت حسین مصرع ہے۔ مطلب یہ ہے کہ میں بھی اسے اپنی جاں کی برابر سمجھتا ہوں۔

نوٹ: یہ مبالغہ نہیں ہے۔ میں بھی اپنے ذاتی مشاہدہ کی بنا پر کہہ سکتا ہوں کہ علامہ اقبال کو اللہ نے بہت احسان مند دل دیا تھا۔ اگر کوئی شخص ان کے ساتھ ذرا سی مہربانی بھی کر دیتا تھا تو وہ اسے ہمیشہ یاد رکھتے تھے۔

تبصرہ: علامہ اقبال یکم ستمبر ۱۹۰۵ء کو لاہور سے روانہ ہوئے اور ۲، ستمبر کو حضرت محبوب الٰہیؒ کے آستانہ عالیہ پر حاضر ہو کر یہ دلآویز نظم بڑے ادب اور بڑی عقیدت کے ساتھ حضرت اقدس کے حضور میں پڑھ کر سنائی۔ اقبال کی کتنی خوش نصیبی ہے کہ حضرت کے وسیلہ سے اللہ نے اقبال کی سب دعائیں قبول کر لیں۔ اقبال اس عہد کے مسلمانوں سے اس قدر آگے ہے کہ جو لوگ "مفکر اور متکلم" کے لقب سے مشہور ہیں وہ اس کے کلام کو سمجھ بھی نہیں سکتے

اقبال کو بدو شعور سے بزرگانِ دین کے ساتھ ایک غیر معمولی عقیدت تھی جو آخر وقت تک قائم رہی۔ اور مجھے اقبال سے جو اس قدر محبت ہے اسکا سبب صرف یہ ہے کہ انہیں بزرگانِ دین سے عقیدت تھی۔ ورنہ شاعری کے لحاظ سے غالب اور بیدل ان سے بڑھے ہوئے ہیں۔ جس بات نے مجھے اقبال کا گرویدہ بنا دیا وہ یہ ہے کہ اس نے مجھے عشق رسولؐ کی اہمیت اور قدر وقیمت سے آگاہ کر دیا۔ یہ بات نہ شمس بازغہ سے حاصل ہوئی، نہ صدرا سے نہ میبذی سے اور نہ شرح ہدایۃ الحکمۃ سے۔

حضرتِ محبوب الٰہی سے سیدی ومولائی حضرت سلطان المشائخ خواجہ نظام الحق والدین اولیاء محبوب الٰہی مراد ہیں جن کی زندگی سے اقبال کو انہیں دل مومن

کا تصور حاصل ہو سکا۔ مرحوم نے ساری عمر مسلمانوں کو یہی پیغام دیا کہ اپنے اندر شانِ فقر پیدا کرو اور حضرت محبوب الٰہی شانِ فقر کے بہترین مظہر ہیں لیکن ان میں یہ شان مرشد کی صحبت میں بیٹھنے اور عشق رسول اختیار کرنے سے پیدا ہوئی تھی اس لئے اقبال نے ہمیں بھی ان دونوں کو اختیار کرنے کی تلقین کی ہے عجیب بات ہے کہ اس زمانہ کے مدعیان اصلاح نیچری، معتزلی، عقل پرست، اہل قرآن، اہل حدیث پیرداںِ باطل، نجدی اور وہابی۔ یہ سب "اسلامی جماعتیں" انہی دو باتوں کی منکر ہیں لیکن اقبال علیٰ رؤس الاشہاد یہ تلقین کرتے ہیں کہ:-

طبع مسلم از محبت قاہر است　　مسلم اَز عاشق نباشد کافر است

یعنی جو مسلمان عاشق رسول نہ ہو وہ کافر ہے یعنی مسلمان بننے کے لیے عشقِ رسول شرط ہے۔ اور یہ دولت سرمدی موقوف ہے صحبت مرشد پر۔ اسی لئے اقبال نے لکھا ہے:-

صحبت از علم کتابی خوشتر است　　صحبتِ مردانِ حُر، آدم گر است

آخر میں اپنے مرشد کے مختصر سوانح حیات درج کر کے اس کتاب کو اپنی نگاہ میں قیمتی بنانا چاہتا ہوں۔ حضرت موصوف ۱۳۴۴ھ ۱۸۲۴ء میں بمقام بدایوں (یوپی) پیدا ہوئے: الدین نے آپ کا نام محمد رکھا۔ آپ حسینی سیّد ہیں جب بدایوں میں حضرت کی دستار بندی ہوئی تو بعض بزرگوں نے یہ پیشگوئی کی کہ اس لڑکے کا سر کسی انسان کے آگے نہیں جھکے گا۔ مزید تعلیم کے لئے دہلی تشریف لے گئے۔ یہاں شیخ العالم حضرت بابا فرید الدین گنج شکرؒ کے چھوٹے بھائی سے مل کر دل میں اجودھن (پاک پٹن) کی لگن پیدا ہو گئی۔ اور ایک دن نماز فجر کے بعد پیادہ پا دلّی سے چل کھڑے ہوئے جب اجودھن پہونچے تو فوراً حضرت کی زیارت کے لئے مسجدؒ میں حاضر ہوئے محبوب نے عاشق کو دیکھ کر فوراً اپنا دل نچھاور کر دیا یعنی حضرت بابا صاحب نے

اپنے عاشق کو دیکھ کر یہ شعر پڑھا۔

اے آتش فراقت دلہا کباب کردہ
سیلابِ اشتیاقت جانہا خراب کردہ

خوشا نصیب اس مرید کے جس کا پیر خود اس پر عاشق ہو جائے۔ ناظرین خود اندازہ کر سکتے ہیں کہ اگر معشوق خود ہی عاشق پر عاشق ہو جائے تو عاشق کا کیا حال ہو گا قصہ مختصر اجودھن سے سلطان السلاطین اور محبوب الٰہی کا لقب حاصل کر کے مرشد کے حکم سے دلّی کو اپنی تبلیغی سرگرمیوں کا مرکز بنایا اور ۶۵۶ھ سے ۷۲۵ھ تک یعنی تقریباً ستر سال تک آپ کی ذات اسلام اور مسلمانوں کے لئے ایک عظیم الشان چشمۂ فیض بنی رہی۔ آپ نے ہزاروں غیر مسلموں کو اسلام میں داخل کیا اور ہزاروں مسلمانوں کو مبلغ اسلام بنا کر ہندوستان کے طول و عرض میں بھیجا۔ اور سیکڑوں مسلمانوں کو اپنی نگاہ سے مومن بنا دیا۔ جن کے سرتاج میرے روحانی مرشد حضرت شیخ نصیر الدین چراغ دہلیؒ ہیں جو حضرت کی وفات کے بعد ۷۲۵ھ میں مسند خلافت پر متمکن ہوئے حضرت محبوب الٰہیؒ نے ایک چھوڑ سات بادشاہوں کا زمانہ دیکھا لیکن مدۃ العمر دربار میں جانا تو درکنار حضرت نے کسی بادشاہ کو اپنے دربار میں بھی حاضری کی اجازت نہیں دی۔ محبوب الٰہی بننا آسان تو نہیں ہے

غزلیات

پہلی غزل

گلزار ہست و بود۔ مراد ہے دنیا۔ بیگانہ وار۔ بیگانوں یا غیروں کی طرح سے یعنی اس دنیا کو غور سے دیکھ۔ مثال شرار۔ یعنی مدت عمر بہت تھوڑی ہے۔ دم دے نہ جائے یعنی دھوکہ نہ دے جائے۔ یہ محاورہ اقبال نے اپنے استاد سے سیکھا تھا ؎

بدگمانی کی بھی حد ہے کوئی اللہ غنی!
میرا دم دینا سمجھتے ہیں وہ دم دینے کو

مانا، بمعنی مجھے تسلیم ہے۔ تیری دید کے قابل نہیں ہوں یعنی میں ایک گدائے بینوا ہوں، تو خالق کون و مکان ہے، اس لئے مجھے تجھ سے کوئی نسبت نہیں ہے لیکن تو اس حقیقت کو مدِنظر رکھ کہ میری محبت کس قدر پاکیزہ، کس قدر سچی اور کس قدر شدید ہے ہر رہگذر میں نقشِ کفِ پائے یار دیکھ۔ اس میں بھی تصوف کا رنگ ہے یعنی اگر تو غور اور ذکر سے کام لے تو ہر شئے میں تجھے خدا کا جلوہ نظر آسکتا ہے۔

دوسری اور تیسری غزل میں کوئی مشکل لفظ نہیں ہے۔

چوتھی غزل

حل لغات: لاؤں وہ تنکے کہاں سے آشیانہ کے لئے الخ۔ بڑا بلند مطلع ہے چونکہ معشوق کی راہ میں اپنی ہستی کو فنا کر دینا عاشقی کا کمال ہے اس لئے اس مطلع میں شاعر نے یہ آرزو ظاہر کی ہے کہ میں ان تنکوں سے آشیانہ بنانا چاہتا ہوں جن میں جل جانے کی صلاحیت ہو۔ یعنی ایسی زندگی بسر کرنی چاہتا ہوں جس کا انجام معشوق کی راہ میں

فنا ہو جاتا ہو۔ فی الجملہ عاشق مرمٹنے کے لیے آمادہ ہے اس شعر کی ساری دلکشی اس کے اسلوب بیان میں پوشیدہ ہے ورنہ کوئی نئی یا انوکھی بات نہیں ہے۔ ہفتاد و دو ملت یعنی بہتر مذاہب یا فرقے۔ اس ترکیب میں اشارہ ہے ایک حدیث کی طرف کہ حضور نے فرمایا کہ کچھ عرصہ کے بعد میری امت بہتر یا تہتر فرقوں میں منقسم ہو جائے گی۔ جن میں سے ایک ناجی ہوگا۔ اور باقی سب ناری۔ پس ہفتاد و دو ملت سے یہاں مسلمانوں کے مختلف فرقے مراد ہیں۔ لوٹ جائے یعنی بے تاب ہو جائے۔ پاس تھا ناکامیٔ صیاد کا اے ہمصفیر۔ یہ شعر مضمون آفرینی کی عمدہ مثال ہے۔ شاعر کہتا ہے کہ اے ہمدم! اگر میں دام میں گرفتار ہو گیا۔ تو اس لیے نہیں کہ میں دانہ کا بھوکا تھا۔ بلکہ اس لئے کہ مجھے صیاد (معشوق) کی خاطر منظور تھی اگر میں گرفتار نہ ہوتا تو اسے اپنی ناکامی پر ملال ہوتا اور میں چونکہ اس پر عاشق ہوں اس لئے اس کے ملال کی تاب نہیں لا سکتا ہمصفیر یعنی، دوست، ہم آواز، ہم پیشہ۔ ایک دانہ میں "ایک" شمار کے لئے نہیں ہے بلکہ تحقیر کے لئے ہے ایک دانہ سے مراد ہے "چند دانوں کے لئے"۔ اس چمن سے ہندوستان مراد ہے۔ مرغ دل سے محب وطن مراد ہے۔ واضح ہو کہ اس غزل میں مقطع بھی تھا جسے اقبال نے خارج کر دیا میں اسے ذیل میں درج کئے دیتا ہوں۔

ترک کر دی تھی غزل خوانی مگر اقبالؔ نے
یہ غزل لکھی ہمایوں کو سنانے کے لیے

پانچویں غزل

پہلا شعر۔ مطلب یہ ہے کہ دنیا میں آنے سے پہلے انسان کی روح عالم قدس میں رہتی تھی۔ یا حضرت آدم جنت میں رہتے تھے لیکن انہوں نے ایک غلطی کی جس کی

پاداش میں ان کو جنت سے نکلنا پڑا اور وہ دنیا میں آگئے۔ یہاں آکر ان کی اولاد دنیا کی دلفریبیوں میں گرفتار ہوگئی۔ ہوا یعنی حرص و طمع۔

دوسرا شعر: اس میں اس بات کی طرف اشارہ ہے کہ اگرچہ انسان بہت کمزور ہے لیکن اس کے باوجود اسے اللہ نے اپنا خلیفہ بنایا ہے خلعتِ شرافت سے مراد ہے، انسان کا اشرف المخلوقات ہونا۔

تیسرا شعر: اس شعر میں حضرت موسیٰ کے مشہور واقعہ کی طرف اشارہ ہے کہ انھوں نے اللہ سے دیدار کی درخواست کی تھی چنانچہ طور پر اللہ نے اپنی تجلی فرمائی۔ طور جل گیا اور حضرت موسیٰ بے ہوش ہو کر گر پڑے۔

چوتھا شعر: مطلب یہ ہے کہ انسان کسی حال میں بھی طلب کے جذبہ سے خالی نہیں ہو سکتا۔ مثلاً اگر وہ یہ دعا کرے کہ اے خدا میرے دل کو طلب سے پاک کر دے تو یہ بھی دراصل وہ طلب ہی ہے پس انسان کا دل دامِ تمنا سے رہا نہیں ہو سکتا۔

پانچواں شعر: یہ شعر مضمون آفرینی کی عمدہ مثال ہے۔ کہتے ہیں کہ جو لوگ تیرے سچے عاشق ہیں وہ تو تجھے اس دنیا میں بھی دیکھ لیتے ہیں لہٰذا ان کے لیے حشر میں دیدار کا وعدہ صبر آزما (تکلیف دہ) نہیں ہو سکتا۔

چھٹا شعر: اس شعر میں تصوف کا رنگ ہے کہتے ہیں کہ خدا تو پردوں میں پوشیدہ تھا وہ عیاں کیسے ہو گیا؟ جواب دیتے ہیں کہ چونکہ کمال کا ذاتی تقاضا اظہار ہے اور خدا منبع کمال ہے اس لئے اس کا حسن کامل اس کی بے حجابی کا سبب بن گیا۔

ساتواں شعر: معالج کہتا ہے کہ دردِ فراق لا دوا ہے۔ اس پر اقبال دردِ فراق کو مخاطب کر کے کہتے ہیں کہ چارہ گر دیوانہ ہے جب تمام علاج بیکار ہو جائیں گے تو میں موت کا نسخہ استعمال کروں گا۔ یہ شاعرانہ اندازِ بیان ہے اس حقیقت کے اظہار کے لیے کہ عاشق مر کر زندۂ جاوید ہو جاتا ہے

آٹھواں شعر:۔ اس شعر میں اقبال نے ہماری توجہ اس حقیقت کی طرف مبذول کی ہے۔ کہ گل اللہ کی ہستی پر شاہد ہے۔ ورنہ بے شعور مادہ گل میں یہ خوبی کس طرح پیدا کرتا ہے؟ اس میں یہ رنگت اور یہ خوبصورتی کیسے پیدا ہو جاتی!

نواں اور دسواں شعر: اس میں خالص رنگ تغزل ہے اور مطلب واضح ہے۔

چھٹی غزل

حلّ لغات:۔ سوزن۔ سوئی۔ خانماں برباد۔ وہ شخص جس کا گھر برباد ہو گیا ہو۔ رفیق راہ منزل سے انسان مراد ہے جس کی زندگی شرر کی طرح عارضی ہوتی ہے اس شعر میں اقبال نے انسان کی بے ثباتی کا نقشہ کھینچا ہے۔

ساتویں غزل

حل لغات اور شرح مشکلات:۔ دیدۂ دل وا کرے کوئی۔ کائنات کی حقیقت اس وقت سمجھ میں آسکتی ہے جب انسان اُسے دل کی آنکھ سے دیکھے دل کی آنکھ مرشد کی صحبت سے کھل سکتی ہے۔ اس کے علاوہ اور کوئی صورت نہیں ہے جب انسان دل کی آنکھ سے کائنات کو دیکھتا ہے تو اسے یہ معلوم ہوتا ہے کہ ہر شئے میں اسی کا جلوہ ہے واضح ہو کہ دل کی آنکھ بڑی مشکل سے کھلتی ہے خود اقبال کہتے ہیں ع

بڑی مشکل سے ہوتا ہے چمن میں دیدہ ور پیدا

لب گویا کنایہ ہے حسین ابن منصور کے قول "انا الحق" سے جس پر اُسے سولی دی گئی تھی۔ ہو دید کا جو شوق تو آنکھوں کو بند کر۔ یہ وہی مضمون ہے جسے مطلع میں بیان کیا ہے لفظ دید سے مراد "دیدار الٰہی" ہے جس کے لئے ظاہری آنکھیں بیکار ہیں۔ دیکھے مجھے کہ تجھ کو تماشا کرے کوئی۔ اس شعر میں تصوف

کا بلند ترین مقام بیان کیا گیا ہے۔ جب سالک اپنے آپ کو بواسطۂ رسول عشق الٰہی میں فنا کر دیتا ہے تو اس کے اندر خدا کی صفات کا رنگ پیدا ہو جاتا ہے۔ جس طرح لوہا، اگر کچھ دیر آگ میں پڑا رہے تو خود آگ ہو جاتا ہے اسی کو قرآنی اصطلاح میں "صِبْغَةَ اللہ" یعنی اللہ کا رنگ کہتے ہیں۔ عذر آفریں جرم محبت ہے حسن دوست۔ مطلب یہ ہے کہ اس کا حسن اس قدر دلکش ہے کہ مجھ کو ارتکابِ جرم پر مجبور کر دیتا ہے اس لئے مجھے اندیشہ ہے کہ کہیں میں حشر کے میدان میں اس کی شان میں کوئی گستاخی نہ کر بیٹھوں نگہ شوق محبت بھری نگاہ اڑ بیٹھے۔ دیدار الٰہی کی تمنا کی۔ دو چار دن جو میری تمنا کرے کوئی یعنی اگر معشوق کچھ دنوں کے لئے مجھ پر عاشق ہو جائے تو اس کو معلوم ہو کہ کسی کی تمنا کرنے میں کیا لطف پوشیدہ ہے

آٹھویں غزل

پہلا شعر: آرزوئے بیدلی۔ لفظی معنی ہیں عاشقی یا محبوب کا سودا یا اس کی تمنا۔ لیکن عاشقی میں چونکہ سراسر زیاں (نقصان) ہی ہے۔ اس لئے آرزوِ بیدلی سودائے زیاں سے عبارت ہے مطلب شعر کا یہ ہے کہ چونکہ میری زندگی کی رونق (قیمت) عاشقی سے ہے اور عاشقی میں سراسر زیاں ہوتا ہے اس لئے مجھے سودائے زیاں، یعنی آرزوئے بیدلی بے حد و بے حساب ہے۔ اس شعر کی دشواری اس کے اسلوب بیان کی وجہ سے ہے ورنہ مطلب بہت آسان ہے کہ میں اس کے عشق میں سراپا یا مجسم آرزو بن گیا ہوں۔ اس غزل کے تمام اشعار میں غالبؔ کا رنگ پایا جاتا ہے وہی دشوار اسلوب بیان، وہی مضمون آفرینی اور وہی رفعت تخیل، وہی فارسی تراکیب۔

دوسرا شعر: کہتے ہیں کہ مجھے گل و گلزار کی آرزو اسی وقت تک ہے جب تک میں اپنے ساقی سے جدا ہوں اگر اس کی صحبت حاصل ہو جائے اور وہ اپنے ہاتھ سے دو

چار جام مجھے پلا دے تو فروغِ شراب کا مجھ پر یہ اثر ہوگا کہ میں خود گلزار بن جاؤں گا۔
تیسرا شعر: صیاد اسی وقت تک باغ کو اپنے وجود سے زینت بخش رہا ہے جب تک میں نغمہ سرا ہوں۔ اور بجلی میرے ہی آشیانہ کو جلانے کے لئے بیتاب ہے میرے بعد نہ صیاد باغ میں آئے گا اور نہ بجلی میں یہ اضطراب باقی رہے گا غالب نے اس مضمون کو یوں ادا کیا ہے۔

در خورِ عرض نہیں جوہرِ بیداد کو جا!
نگہ ناز ہے سرمہ سے خفا میرے بعد

چوتھا شعر: میں بظاہر مشتِ خاک ہوں۔ بالکل بے حقیقت ہوں لیکن کسی کے عشق کا یہ فیض ہے کہ وسعت میں صحرا بن گیا ہوں۔ بلکہ میری وسعت زمین سے آسمان تک ہے۔ یہ بہت بلند شعر ہے۔ مطلب یہ ہے کہ عشقِ حقیقی انسان کو غیر محدود بنا دیتا ہے۔

ع سما سکتا نہیں وہ عالم میں مرد آفاقی

پانچواں شعر: مطلب اس کا یہ ہے کہ جس طرح نالہ و فریاد، جرس (گھنٹہ) کے اندر پوشیدہ ہے۔ اور جب قافلہ روانہ ہوتا ہے تو اس کی آواز ظاہر ہو جاتی ہے اسی طرح انسان کے اندر نالہ و فریاد پوشیدہ ہے جب اس کی زندگی کا قافلہ کوچ کرتا ہے یعنی جب وہ خود دنیا سے رخصت ہوتا ہے تو اپنی غفلت شعاری اور حماقتوں پر زبانِ حال سے نالہ و فریاد کرتا ہے۔

چھٹا شعر: یہ شعر اقبال کی مثال نگاری کی بہت عمدہ مثال ہے کہتے ہیں کہ بھنور پانی کی روانی سے پیدا ہوتا ہے اگر پانی ساکن ہو جائے تو بھنور کے دل میں کوئی عقدہ پیدا نہ ہو۔ یعنی بھنور کا وجود ہی نہ ہو۔ پس انسان کو لازم ہے کہ وہ دنیا حاصل کرنے کیلئے مضطرب نہ ہو بلکہ طمانیت پیدا کرے۔ اطمینان قلب سے ساری دشواریاں حل ہو جاتی ہیں۔ اگر انسان اپنے دل کو مطمئن کرنے اور یہ نعمت امداد الٰہی سے حاصل ہو سکتی

ہے۔ تو اسے کوئی پریشانی لاحق نہیں ہو سکتی، بہت عمدہ شعر ہے۔

ساتواں شعر: بلبل سے انسان اور خموشی سے بے عملی مراد ہے۔ مطلب یہ ہے کہ دنیا میں جو شخص عمل صالح نہیں بجا لاتا اس پر موت وارد ہو جاتی ہے۔ کیونکہ زندگی جدو جہد کا نام ہے۔

آٹھواں شعر: میہماں، کنایہ ہے جوانی سے۔ مطلب یہ ہے کہ عاشقی اور تمنائے دیدار کے لیے صرف جوانی کا زمانہ موزوں ہے۔ جبکہ انسان حصول مقصد کے لیے جدو جہد کر سکتا ہے۔

نویں غزل

یہ طویل غزل سراسر تصوف کے رنگ میں ڈوبی ہوئی ہے اور جن لوگوں کا دل سوزو گداز کی لذت سے آشنا ہے۔ ان کی نظر میں اس کا ہر شعر آبحیات کا حکم رکھتا ہے غور سے دیکھو تو یہ غزل نہیں ہے۔ بلکہ حقائق کے پھولوں کا گلدستہ ہے جسے اقبال نے عقیدت کے ہاتھوں سے سجایا ہے۔ اس میں حمد باری بھی ہے نعت رسول بھی ہے (روحی لہ الفداء) معرفت بھی ہے فلسفہ بھی ہے۔ تغزل بھی ہے۔ سوزو گداز بھی ہے وحدت الوجود بھی ہے۔ اور اللہ والوں کی صحبت کے فوائد کی طرف بھی اشارہ ہے۔ بخوف طوالت ہر شعر کا مطلب نہایت اختصار کے ساتھ لکھتا ہوں۔

پہلا شعر: کہتے ہیں کہ میں اپنی نادانی کے سبب سے مدتوں خدا کو کائنات کی وسعت میں تلاش کرتا رہا۔ لیکن جب مرشد رومیؒ کی باطنی توجہ سے میرے دل کی آنکھیں روشن ہو گئیں تو کیا دیکھتا ہوں کہ وہ محبوب حقیقی میرے دل میں پوشیدہ ہے۔

دوسرا شعر: اس میں بھی پہلے شعر کی طرح تصوف کا رنگ ہے۔ کہتے ہیں کہ جب اپنی حقیقت اپنی آنکھوں پر عیاں ہوئی اور یہ بات صرف مرشد کی صحبت میں

بیٹھ کر حاصل ہو سکتی ہے۔ تو یہ معلوم ہوا کہ یہ جو کچھ باہر نظر آتا ہے۔ یعنی ساری کائنات میرے دل میں موجود ہے۔

نوٹ :- پہلے مصرع کو یوں پڑھنا چاہیئے " حقیقت اپنی آنکھوں پر نمایاں جب ہوئی اپنی " واضح ہو کہ ان دو شعروں میں اقبال نے سارے تصوف کا خلاصہ بیان کر دیا۔ یعنی یہ کہ انسان عالمِ صغیر ہے۔ سب کچھ اس کے اندر موجود ہے اور جو شخص اپنی حقیقت سے آگاہ ہو جاتا ہے۔ اسے خدا کی معرفت (پہچان) بھی حاصل ہو جاتی ہے۔

تیسرا شعر : مذاقِ جبہ سائی، پیشانی گھسنے یا رگڑنے کی عادت یا خواہش مراد ہے رنگ نیاز کی لذت۔ سنگِ آستانِ کعبہ۔ خانۂ کعبہ (بیت اللہ) کی چوکھٹ کا پتھر جس پر امام لامحالہ بوقتِ سجدہ اپنا سر رکھتا ہے۔ جا ملتا جبینوں میں۔ یعنی سجدہ کرنے والوں میں شامل ہو جاتا مطلب یہ ہے کہ محبوب کے دروازہ پر سجدہ کرتے ہیں جو لذت ہے اگر سنگِ کعبہ اس سے آگاہ ہو جائے تو شاید وہ بھی عاشقوں میں شامل ہو جائے۔

چوتھا شعر : مجنوں قیس عامری کا مشہور لقب ہے۔ لیکن اس شعر میں مجنوں سے ہم انسان بھی مراد لے سکتے ہیں یعنی اے انسان تو اپنی نادانی کی وجہ سے دوسروں (معشوقوں) کی تلاش میں سرگرداں ہے اگر تو اپنی حقیقت سے آگاہ ہو جائے تو تجھے معلوم ہوگا۔ کہ تجھ میں وہ خوبیاں پوشیدہ ہیں کہ اگر تو ان کو بروئے کار لے آئے تو خود ایک دنیا تیری تلاش میں سرگرداں رہے گی۔ یعنی تیرے اندر محبوبی کی شان پوشیدہ ہے۔

پانچواں شعر :- اس شعر کا مطلب یہ ہے کہ۔

ایام مصیبت کے تو کاٹے نہیں کٹتے
دن عیش کے گھڑیوں میں گذر جاتے ہیں کیسے

چھٹا شعر : بہت بلیغ شعر ہے۔ کہتے ہیں کہ جو شخص عشقِ الٰہی میں فنا ہونا چاہتا ہے (ڈوبنا چاہتا ہے) تو اس کیلئے کسی خاص اہتمام کی ضرورت نہیں ہے۔ ایک شخص تخت

شناہی پر بیٹھ کر بھی اللہ سے لو لگا سکتا ہے اصلی چیز میلان طبع ہے نہ کہ ظاہری وضع اس کو اس مثال سے واضح کیا ہے۔ کہ جو لوگ ڈوبنے کی ٹھان لیتے ہیں وہ کشتی میں بیٹھے ہوئے بھی ڈوب جاتے ہیں۔ اس شعر کا سارا لطف اسی "ڈوب جاتے ہیں" میں مضمر ہے یہاں ڈوبنے سے فی الحقیقت ڈوبنا مراد نہیں ہے۔ کیوں کہ یہ خلاف عقل ہے۔ بلکہ اس سے کسی کی یاد میں فنا ہو جانا مراد ہے۔

ساتواں شعر: اس شعر میں وحدت الوجود کا رنگ ہے۔ یہ رنگ ساری عمر اقبال کے دل و دماغ پر چھایا رہا اگر کسی کو شک ہو تو ارمغانِ حجاز حصہ فارسی کا مطالعہ کر لے جو ان کا آخری کلام ہے۔ صرف ایک شعر لکھے دیتا ہوں۔

تلاشِ او کنی جز خود نہ بینی

تلاشِ خود کنی جز او نہ یابی

مطلب اس شعر کا یہ ہے کہ وہ تجھ میں اور تو اس میں ہے یہی وجہ ہے۔ کہ اگر تو اس کو تلاش کرے گا تو اپنے کو پا جائے گا۔ اور اپنے کو تلاش کرے گا تو وہ مل جائے گا۔ اب اس شعر کو پڑھیے مطلب واضح ہو جائے گا۔

کہتے ہیں کہ اس کائنات میں اس معشوق حقیقی کے سوا اور کوئی ہستی موجود نہیں ہے۔ چنانچہ تمام حسینوں (انسانوں) میں وہی جلوہ گر ہے جس نے اپنے آپ کو حضرت موسیٰ سے چھپایا تھا یعنی ہر شئی میں اسی کا جلوہ ہے کہیں ذات پاک بلبل کے نغمہ میں ظاہر ہو رہی ہے اور کہیں گلاب کی مہک میں۔

آٹھواں شعر: چونکہ عوام اس حقیقت کو نہیں سمجھ سکتے اس لئے اقبال نے ہمیں یہ بتایا ہے۔ کہ اگر وحدت الوجود کی حقیقت سے آگاہ ہونا چاہتے ہو تو مرشد کامل کی صحبت اختیار کرو۔ چنانچہ اگلے چار شعروں میں اسی چیز کو بیان کیا ہے۔

نواں شعر: کہتے ہیں کہ اے لوگو، اہل دل کے اندر یہ طاقت پوشیدہ ہوتی ہے

کہ وہ مُردوں کو زندہ کر سکتے ہیں۔ یعنی جن لوگوں پر روحانی اعتبار سے موت وارد ہو چکی ہو (جو مسلمان خدا اور رسولؐ سے بیگانہ ہو کر اشتراکی یا ترقی پسند بن چکے ہوں) یہ عاشقانِ خدا ان لوگوں کے اندر ایمان کی بجھی ہوئی شمع کو پھر روشن کر سکتے ہیں۔

دسواں شعر: اگر کسی شخص کو دردِ دل کی آرزو ہو یعنی اگر کوئی شخص اللہ کے عشق میں فنا ہو جانے کا آرزومند ہو تو اُسے مرشدانِ کامل کی صحبت اختیار کرنی چاہیئے۔ یہ دردِ دل یہ عشقِ الٰہی کی آگ صرف فقیروں کی جوتیاں سیدھی کرنے سے حاصل ہو سکتی ہے یہ وہ نعمت ہے، یہ وہ دولت ہے جو بادشاہوں کو بھی نصیب نہیں ہے۔ مطلب یہ ہے کہ اللہ صرف اللہ والوں کی صحبت اختیار کرنے سے مل سکتا ہے نہ کہ ایڈیٹری یا انتخابی دورے کرنے سے۔

ان عاشقانِ خدا کی شان یہ ہوتی ہے۔ کہ بظاہر گدڑی پہنے ہوتے ہیں لیکن بہ باطن انکی آستینوں میں "ید بیضا" پوشیدہ ہوتا ہے۔ ید بیضا حضرت موسیٰؑ کا مشہور معجزہ ہے جو فرعون کا مقابلہ کرنے کے لئے عنایت ہوا تھا۔ یہاں مراد ہے شان نبوت کے ظل سے یعنی اولیاء اللہ میں انبیا کی طرح خرقِ الفطرت طاقتیں پوشیدہ ہوتی ہیں ان کے پاس بھی ظلی طور پر "ید بیضا" ہوتا ہے۔

گیارھواں شعر: نگاہ نارسا سے مادہ پرستوں یا نیچری قسم کے مسلمانوں کی طرف اشارہ ہے۔ جن کے سینے "ارادت" کے جوہر سے معرا ہوتے ہیں۔ کہتے ہیں کہ جس رونق کے نظارہ کے لیے مادہ پرستوں کی نگاہیں ترستی رہتی ہیں وہ رونق وہ روحانیت وہ سوز و گداز وہ کیفیت اور سرمستی انہیں خلوت نشینوں کی بدولت اس دنیا میں مل سکتی ہے۔ یعنی اگر کسی کو اپنے دل میں سوز و گداز پیدا کرنا مقصود ہو تو ان بزرگوں کی صحبت میں بیٹھے۔

بارھواں شعر: اب یہاں سے شاعر نے نہایت خوبصورتی کے ساتھ نعتِ رسولؐ کا آغاز کیا ہے۔ کیونکہ حضور انور صلی اللہ علیہ وسلم کی ذاتِ گرامی جو محورِ کائنات اور

باعثِ تخلیق موجودات ہے۔ دراصل عاشقوں کی معراج ہے۔ اقبالؔ کا کمال دیکھئے پہلے عاشق کا ذکر کیا۔ پھر عشق کا پھر عاشقوں کی مجلس کا پھر معشوق کا۔

کہتے ہیں کہ اے مسلمان! اپنے خرمن دل کو کسی ایسے شرر سے پھونک کہ خورشید قیامت بھی تجھ سے حرارت کا طالب ہو جائے اور وہ چنگاری کون سی ہے جس میں آفتاب سے بھی زیادہ سوزش ہے۔؟ وہ چنگاری عشقِ رسولؐ کی ہے۔ جو اقبال کی رائے میں مسلمان کا مقصد حیات ہے

تیرہواں شعر: لیکن اے مخاطب! اگر تو عشقِ رسولؐ کی دولت حاصل کرنی چاہتا ہے۔ تو سب سے پہلے اپنے دل میں سوز و گداز پیدا کر لے۔ یعنی عاشقی کی صلاحیت۔

اقبالؔ نے اس شعر میں کس قدر واضح صداقت کا بیان کیا ہے! ہر شخص اس بات کو تسلیم کرے گا۔ کہ جب تک صلاحیت نہ ہو کسی فن میں کامیابی نہیں ہو سکتی مثلاً ایک لڑکا بہترین بولر (BOWLER) بننا چاہتا ہے۔ تو کرکٹ کا ماہر سب سے پہلا مشورہ اس کو یہی دے گا۔ کہ اپنے اعضائے جسمانی میں بولنگ (BOWLING) کے لیے مناسب اور ضروری لچک پیدا کر دو اگر تمہارے اعصاب سخت ہیں تو اس فن میں کمال پیدا نہیں کر سکتے۔ یعنی بولنگ کے لئے صلاحیت جسمانی شرط اولیں ہے۔

چودہواں شعر: کس خوبصورتی سے اقبالؔ نے سرکار دو عالم صلعم کا ذکر مبارک شروع کیا ہے! یعنی خود ناظرین سے سوال کر کے انہیں سراپا اشتیاق بنا دیا ہے کہتے ہیں کہ اے مخاطب تو خود سوچ کر بتا کیا دنیا میں تو نے ایسا "حسین" دیکھا ہے۔ جس کا عاشق خود سراپا حُسن بن جائے؟ ظاہر ہے کہ ایسا حسین اس دنیا میں صرف ایک ہی ہے۔ جو اس وقت گنبدِ خضرا میں محوِ استراحت ہے جو آج بھی اُسی طرح زندہ ہے۔ جسطرح ۱۱ھ میں تھا۔ جو آج بھی اپنے عاشقوں کو خواب

ہیں اپنا جمال دکھا کر ہمیشہ کے لئے دیوانہ بنا دیتا ہے جو آج بھی اپنے چاہنے والوں پر روحانی فیوضات کی بارش کرتا رہتا ہے۔ جس کے نام پر آج بھی دنیا کے بہ کروڑ مسلمان اپنا سر کٹانا باعث سعادت سمجھے ہیں۔

پندرھواں شعر: اب اقبال حضور انور صلعم سے براہ راست خطاب کرتے ہیں اور کہتے ہیں کہ اے باعثِ تکوینِ روزگار! جب آپ نے علم و معرفت کے انتہائی نقطہ پر فائز ہونے کے باوجود جنابِ باری تعالیٰ کی درگاہ میں اپنی عبدیت کا بایں طور پر اعتراف فرمایا مَا عَرَفْنَاكَ حَقَّ مَعْرِفَتِكَ یعنی اے مولا کریم! ہم نے (حضور نے افرادِ امت کو شامل فرما لیا) تجھ کو اس طرح نہیں پہچانا جس طرح کی پہچاننے کا حق ہے؛ سہ

پھڑک اٹھا کوئی تیری ادائے "مَا عَرَفْنَا" پر
ترا رتبہ رہا بڑھ چڑھ کے سب ناز آفرینوں میں

یعنی جب آپ نے اپنا سرِ نیاز اللہ کی بارگاہ میں جھکایا اور معرفت کے باوجود اپنے عجز کا اعتراف فرمایا تو اللہ نے آپ کو سارے حسینوں (انبیاء) کا سرتاج بنا دیا۔ بایں طور کہ آپ کو معراج کی رات اپنے پاس بلا کر دانائے سُبل ختم الرسل اور مولائے کل کے مراتب عالیہ پر فائز کر دیا۔

سولھواں شعر: اے میرے آقا! مدتوں سے حکماء اور فلاسفہ آپ کے مرتبہ اور مقام میں بحث و تمحیص کر رہے ہیں۔ لیکن آپ کے جمال سے ناواقف اور آشنا ہیں جس کی بنا پر انہیں بڑے مغالطے لاحق ہو گئے ہیں۔ مثلاً نجدیوں نے (ازراہِ نادانی) آپ کی مسجد (واقع مدینہ طیبہ) کی دیواروں سے آپ کے اسمائے مبارکہ میں سے رؤف اور رحیم یہ دو نام مٹا دیئے ہیں۔ حالانکہ قرآن مجید خود آپ کی شان میں یہ دونوں لفظ استعمال فرماتا ہے۔ وَبِالْمُؤْمِنِيْنَ رَؤُفٌ رَّحِيْمٌ

یعنی آپؐ (بھی) مومنوں پر رؤف اور رحیم ہیں۔

اس لئے اے میرے آقاؐ اور مولا! میں آپؐ سے درخواست کرتا ہوں کہ آپؐ کسی دن ان منکرینِ شانِ رسالت کو اپنے جمال جہان آرا کی ایک جھلک دکھا دیجئے

ستر ہواں شعر: چونکہ شاعر یہ محسوس کر رہا ہے کہ براہِ راست خطاب میں کہیں گستاخی یا بے ادبی کا کوئی پہلو پیدا نہ ہو جائے۔ نیز بادشاہوں کے دربار میں زیادہ گوئی بھی معیوب ہے اور حضورؐ کے سامنے مسلمان اونچی آواز سے بھی بات نہیں کر سکتا۔ اس لئے اقبال فوراً اپنے کو متنبہ کرتے ہیں کہ:

خموش اے دل! بھری محفل میں یہ شیون نہیں اچھا
ادب پہلا قرینہ ہے، محبت کے قرینوں میں

یعنی عاشق (مومن) کا پہلا فرض یہ ہے کہ وہ حضورؐ کی بارگاہ میں بہر حال ادب ملحوظ رکھے پس سر تسلیم خم کرنا تو محبت کی "الف۔ بے۔ تے" ہے

آخری شعر میں اقبال نے اس بات کی صراحت کر دی ہے کہ جو لوگ میرے مسلک عاشقی کے خلاف ہیں اور مجھ پر نکتہ چینی کرتے ہیں میں اُن کو بُرا نہیں سمجھتا کیونکہ مسلکِ عاشقی میں کسی کو بُرا کہنا سب سے بڑا جرم ہے علاوہ بریں وہ کہتے ہیں کہ میں تو خود اپنے اوپر نکتہ چینی کرتا رہتا ہوں تو دوسروں کو کیسے بُرا سمجھ سکتا ہوں؟

دسویں غزل

حل لغات: سادگی بمعنی بیوقوفی یا بھولا پن۔ صبر آزما۔ یعنی دشوار، جس میں صبر کے اظہار کا موقع مل سکے لن ترانی سنا چاہتا ہوں یعنی مجھے بھی حضرتِ موسیٰؑ کی طرح دیدار کی تمنا ہے۔ اور میں بھی وہی جواب سننا چاہتا ہوں۔ لن ترانی کے

لغوی معنی ہیں تو مجھے ہرگز نہ دیکھ سکے گا۔ چراغ سحر۔ اس ترکیب نے مصرع کے سوز و گداز میں اور بھی اضافہ کر دیا ہے قاعدہ ہے کہ سحر ہوتے چراغ بجھا دیتے ہیں۔ چراغِ سحر کنایہ ہے قرب وفات سے۔ راز کی بات۔ معشوق کی مہربانی کا تذکرہ:۔

گیارہویں غزل

<u>حل لغات</u>: بے نیاز بمعنی خدا۔ نیاز مند بمعنی بندہ یا انسان۔ دستِ کرم کشادہ کرے۔ جب بندوں پر کرم کی طرف مائل ہو۔ احتراز بمعنی بچنا۔ پرہیز کرنا۔ رند بمعنی عاشق۔ مدام۔ ہمیشہ۔ گوش بدل رہ۔ دل کی آواز پر کان لگائے رکھ یا دل کی حالت دیکھتا رہ۔ کہ اس میں سوز و گداز کا رنگ پیدا ہوا یا نہیں۔ کیونکہ دل اسی وقت خانۂ خدا بنتا ہے۔ جب اس میں یہ رنگ پیدا ہو جائے۔ اس نکتہ کو اقبال نے شاعرانہ رنگ میں یوں بیان کیا ہے کہ دل کی یہ خاصیت ہے کہ جب وہ ٹوٹ جاتا ہے تو اس میں سے "نوائے راز" نکلتی ہے۔ یہ بہت دل کش اسلوب بیان ہے اس حقیقت کو ظاہر کرنے کے لئے کہ جب دل کی سوز و گداز کی کیفیت پیدا ہو جاتی ہے تو اس میں جلوہ گر ہو جاتا ہے۔

"سخن میں سوز الٰہی! کہاں سے آتا ہے"۔ اس مصرع میں تجاہل عارفانہ کا رنگ ہے۔ اقبال سے بڑھ کر کون اس حقیقت سے آگاہ ہو سکتا ہے کہ سخن میں سخنور کے دل سے سوز آتا ہے۔ یعنی وہ اپنے اشعار میں خداداد قابلیت کی بدولت اپنے دل کا سوز و گداز منتقل کر دیتا ہے۔

"جہاں میں دانہ کوئی چشمِ امتیاز کرے" اس مصرع میں اقبال نے اس حقیقت کو واضح کیا ہے کہ دنیا میں مختلف اشیا میں امتیاز کرنے سے انسان

پریشانی کا شکار ہو جاتا ہے۔ اس بات کا ثبوت یہ ہے کہ بلبل نے لالہ و گل میں امتیاز کیا چونکہ ہر وقت ہر جگہ، ہر باغ میں، بلبل کو "گل" کی صحبت نصیب نہیں ہو سکتی اس لیئے جب وہ گل کے بجائے لالہ یا نسترن کو دیکھتی ہے تو گل کے فراق میں نالہ و فریاد کرتی ہے۔ واقعی بہت بلیغ شعر ہے۔ اور اقبال نے اس میں بڑی نکتہ آفرینی کی ہے زبان دراز کرنا برا بھلا کہنا، دو مصرعہ "کہ مجھ کو غبارِ رہِ حجاز کرے" یہ مصرع ۱۹۰۴ء کے آخر کا ہے اور اس سے معلوم ہوتا ہے کہ عشقِ رسولؐ کا رنگ اقبال کے دل میں جوانی ہی سے کارفرما تھا۔ یہ سچ ہے کہ وہ حجاز نہ جا سکے لیکن عشقِ رسولؐ کی بدولت لاکھوں مسلمانوں کے محبوب ضرور بن گیئے۔ اگر انہوں نے اپنے آپ کو سرکارِ دوعالمؐ کے عشق میں فنا کر دیا تو حضور نے بھی ان کو زندۂ جاوید کر دیا۔

بارھویں غزل

پہلا شعر: اس مطلع میں اقبال نے قرآن حکیم کی اس مشہور آیت کی تشریح کی ہے اِنَّہٗ کَانَ ظَلُوْمًا جَھُوْلًا جس کا ترجمہ یہ ہے "بیشک انسان ظالم اور جاہل ہے" اقبال نے ظالم اور جاہل ان دو لفظوں کی پہلے مصرع میں تشریح کی ہے کہ مومن اپنے دل پر سختی کرتا ہے یعنی اس کو خلافِ شرع امور سے روکتا ہے۔ اسلیئے ظالم ہے اور غیر اللہ سے غافل رہتا ہے۔ یعنی اللہ کے سوا کسی سے محبت نہیں کرتا اسلیئے جاہل ہے۔

دوسرا شعر: اس میں وحدت الوجود کا رنگ ہے یعنی انسان اسی وقت تک اپنے آپ کو موجود سمجھتا ہے جب تک اس کی آنکھ اللہ کے جلوہ سے محروم یا غافل رہتی ہے لیکن جب سالک پر تجلیاتِ ربانی کا ظہور ہونے لگتا ہے تو جس طرح آفتاب کے سامنے ستاروں کا وجود باطل ہو جاتا ہے۔ اسی طرح حق کے سامنے انسان کا وجود باطل

ہو جاتا ہے۔ اس نکتہ کو جو تصوف کی جان ہے (اور راقم الحروف کا ایمان ہے) اقبال نے نہایت دلکش اور شاعرانہ انداز میں بیان کیا ہے۔ دوسرا مصرع قرآن مجید کی اس آیت سے ماخوذ ہے۔ وَقُلْ جَآءَ الْحَقُّ وَزَهَقَ الْبَاطِلُ۔ حق آگیا اور اس کے آنے کا نتیجہ یہ نکلا کہ باطل مٹ گیا۔

تیسرا شعر: غوطہ زن۔ طالبانِ علم۔ گوہر بدست۔ موتی لے کر۔ خزف چین بہ لبِ ساحل۔ یعنی میں دریا کے کنارے سنگریزے چن رہا ہوں۔

چوتھا شعر: اس میں ہبوطِ آدم کی طرف اشارہ ہے۔ ذلت سے بہشت سے نکلنے کی طرف اور شرافت سے آدم کے اشرف المخلوقات اور خلیفۃ اللہ ہونے کی طرف اشارہ ہے یعنی خدائے تعالیٰ نے تو مجھ کو اشرف المخلوقات بنا کر جنت میں رکھا تھا لیکن مجھ سے ایک غلطی ہو گئی جس کی پاداش میں جنت سے نکلنا پڑا۔

پانچواں شعر: مطلب یہ ہے کہ انسان اس ساری کائنات سے اشرف اور افضل ہے کیونکہ وہ خلیفۃ اللہ یعنی اللہ کا نائب ہے اور یہ ساری کائنات اس کی خادم ہے

چھٹا شعر: اس شعر کا اسلوب بیان بڑا دلکش ہے۔ مطلب یہ ہے کہ جب سالک اپنی خودی کی معرفت حاصل کرنے کی کوشش کرتا ہے تو خود ہی مسافر ہوتا ہے اور خود ہی منزل ہوتا ہے۔ تلاش کون کرتی ہے؟ خودی۔ اور کس کو تلاش کرتی ہے؟ اپنے ہی آپ کو۔ پس ہر سالک بیک وقت مسافر بھی ہے اور منزل بھی ہے۔ یعنی منطقی اصطلاح میں خود ہی عالم ہے۔ خود ہی معلوم ہے خود ہی ناظر ہے اور خود ہی منظور ہے۔

تیرھویں غزل

پہلا شعر: تصوف کا رنگ لئے ہے یعنی اگر خدا کے دیدار کی آرزو ہو تو غیر اللہ سے قطع

تعلق کرلو۔

دوسرا شعر: کمالِ ترک۔ یعنی دنیا کی ہر شئے اور ہر آرزو کو ترک کردینا اقبال نے اس شعر میں واعظ پر طنز کی ہے کہ اگر "ترک" کا وعظ کرتے ہو تو پھر دنیا کے ساتھ ساتھ عقبیٰ بھی ترک کرو۔

تیسرا شعر: تقلید۔ کسی کی اندھا دھند پیروی کرنا۔ اس شعر میں اقبال نے افرادِ قوم کو اپنے اوپر اعتماد کرنے کا درس دیا ہے۔ یعنی خضر کے سہارے سے زندگی مت بسر کرو۔

چوتھا شعر: قلم کبھی اپنا ذکر نہیں کرتا اور نہ کبھی اپنا ذکر لکھتا ہے بلکہ دوسروں کی باتیں لکھتا رہتا ہے۔ اقبال کہتے ہیں کہ اے مخاطب! جب تیری کم مائیگی کا یہ عالم ہے کہ تو ہمیشہ دوسروں کے اقوال اور خیالات بیان کرتا رہتا ہے تو پھر اغیار کے علوم و فنون پر ناز کیسا! ناز اس کو زیبا ہے جو اپنے ذہن سے کوئی نئی بات پیدا کرے دوسروں کی دولت پہ ناز کرنا بہت بیجا ہے۔

پانچواں شعر: مطلب یہ ہے کہ اگر تو عشق اور وارداتِ عاشقی سے آگاہ نہیں ہے تو تجھے شاعری کی کوئی ضرورت نہیں ہے اسکے بجائے کوئی اور پیشہ اختیار کرلے۔

چھٹا شعر: مطلب یہ ہے کہ دل لگانے کی جگہ دنیا نہیں ہے۔ یہ عبرت کی جا ہے تماشا نہیں ہے اگر تو دنیا میں آیا ہے تو یہ مت سمجھ کہ تجھے یہاں ہمیشہ رہنا ہے۔

ساتواں شعر: عاشقی کا طریق یہ ہے کہ انسان سب سے الگ تھلگ محبوب کی یاد میں مستغرق رہے۔ خدا نہ بتخانہ میں ہے نہ حرم میں ہے نہ کلیسا میں۔ وہ تو اس شخص کے دل میں جلوہ گر ہوتا ہے جو اس کا سچا عاشق ہے۔

آٹھواں شعر: مطلب یہ ہے کہ انسان کو خدا کی عبادت بالکل خلوص کے ساتھ کرنی چاہیئے۔ اگر کوئی شخص جنت یا حوروں کے لیئے عبادت کرتا ہے تو وہ عابد نہیں ہے، بلکہ "تاجر" ہے۔

نواں شعر: بہت مشہور شعر ہے۔ مطلب یہ ہے کہ بیشک انسان کو اپنی عقل کے مشورہ پر چلنا چاہیے۔ لیکن جب سرکارِ دو عالم صلعم کی عزت پر کٹ مرنے کا سوال پیدا ہو تو پھر عقل کے بجائے دل کے اشارہ پر چلنا مناسب ہے۔ عقل کو "پاسبان" اس لئے کہا ہے کہ وہ انسان کو ہلاکت سے بچاتی ہے۔

دسواں شعر: مطلب یہ ہے کہ دوسروں کے بھروسے یا سہارے پر زندگی مت بسر کرو۔ اس نکتہ کو اقبال نے اس طرح بیان کیا ہے کہ "شہرت" کو انسان کا غیر تصور کیا ہے اور ہمیں صلاح دی ہے کہ اس غیر کا بھروسہ مت کرو۔

گیارھواں شعر: چونکہ دوسری مرتبہ سوال کرنے میں گستاخی کا رنگ پایا جاتا ہے اس لیے اطاعت کا تقاضا یہ ہے کہ سالک تقاضا کرنا چھوڑ دے یعنی اگر اللہ تعالیٰ سالک کی درخواست منظور نہ کرے تو شرطِ ادب یہ ہے کہ سالک سر تسلیم خم کر دے اور اپنی بات پر اصرار نہ کرے۔

بارھواں شعر: بہت مشہور شعر ہے۔ اقبال کہتے ہیں کہ مجھے واعظ سے اس درجہ اختلاف ہے کہ اگر وہ شراب کو جائز ثابت کر دے تو میں پینا چھوڑ دوں گا یعنی میں اسے حرام قرار دے دوں گا۔

حصّہ دوم

محبّت

حل لغات اور شرح مشکلات: عروسِ شب۔ رات کی دُلہن یعنی رات۔ زلفیں، خم سے نا آشنا تھیں یعنی ابھی کائنات میں دن اور رات کا سلسلہ شروع نہیں ہوا تھا۔ لذتِ رم۔ لفظی معنی ہیں بھاگنے کی لذت۔ مراد یہ ہے کہ ستاروں کی گردش ابھی قائم نہیں ہوئی تھی۔ لباسِ نو۔ یعنی نئی صورت۔ بیگانہ سا لگتا تھا یعنی ابھی ابھی پیدا ہوا تھا۔ آئینِ مسلّم۔ فطرت کا قانون جسے دنیا میں ہر شئے تسلیم کرتی ہے۔ امکان، یہ منطق کی اصطلاح ہے۔ حکماء کے نزدیک خدا تو اپنی ذات کے لحاظ سے "واجب" ہے۔ اس کے علاوہ ساری کائنات اپنی ذات کے لحاظ سے "ممکن" ہے۔ اس لئے کائنات کو عالمِ امکان یا میدانِ امکان کہتے ہیں۔ اقبالؔ نے یہاں لفظ "امکان" کو عدم کے معنی میں استعمال کیا ہے۔ اور اسی لئے "ظلمتِ خانہ" کا لفظ لائے ہیں کیونکہ ظلمت تاریکی کو کہتے ہیں۔ اور عدم کو تاریکی اور سیاہی سے تعبیر کیا کرتے ہیں۔ مصرع کا مطلب یہ ہے کہ دنیا ابھی ابھی عدم سے وجود میں آئی تھی۔ مذاقِ زندگی۔ یعنی زندگی۔ پنہائے عالم۔ دنیا کا طول و عرض یا اس کی وسعت مراد یہ ہے کہ دنیا میں ابھی ذی روح پیدا نہیں ہوئے تھے واضح ہو کہ اہلِ سائنس کا نظریہ یہ ہے کہ دنیا میں حیات کے اولین آثار کائنات کی پیدائش سے ۲۰ لاکھ سال کے بعد ظاہر ہوئے تھے۔ کمالِ نظم ہستی الخ کائنات میں ابھی تو انینِ فطرت جاری نہیں ہوئے تھے۔ ہویدا یعنی ظاہر۔ نگینہ۔ یعنی نگیں، یا گوہر۔ چشم خاتم، انگوٹھی

کی آنکھ، مراد ہے وہ خالی جگہ جس میں قیمتی پتھر جڑا جاتا ہے مطلب اس مصرع کا یہ ہے کہ ابھی دنیا میں قوانینِ فطرت کا نفاذ نہیں ہوا تھا۔

نوٹ: ان چاروں اشعار کا مطلب یہ ہے کہ ابھی دنیا کی ابتدا ہی ہوئی تھی۔۱۲۔

عالمِ بالا سے غیر مادّی عالم یا عالمِ ملکوت مراد ہے۔ صفا تھی جس کی خاک پا میں الخ مطلب یہ ہے کہ اُس کی خاکِ پا صفائی کے اعتبار سے جامِ جمشید سے بھی بڑھ کر تھی یعنی وہ دانائے اسرار و رموزِ کائنات تھا۔ کیمیا گر۔ وہ شخص جو ادنیٰ قسم کی دھاتوں کو سونے میں تبدیل کر سکے۔ یہاں مراد ہے فطرت (نیچر) لیکن لفظ فطرت سے نظم میں یہ دلکشی پیدا نہیں ہو سکتی۔ عرش کا پایہ۔ اس میں لطیف کنایہ ہے اس بات کی طرف کہ محبت عرش (خدا) سے آئی ہے یا نہایت پاکیزہ شئے ہے۔ اکسیر وہ مرکب جس کے لگانے سے ادنیٰ دھات سونا بن جاتا ہے۔ یا نہایت زود اثر دوا۔ وہ شئے جو کسی شئے کی ماہیت کو بدل دے (اکسیر تو قرآن میں موجود ہے، لیکن مسلمان اُسے جنگلوں میں تلاش کرتے پھرتے ہیں) چھپانے تھے فرشتے جس کو الخ کیونکہ وہ جانتے تھے کہ اگر آدم اس سے واقف ہو گیا تو وہ ساری کائنات پر متصرف ہو جائے گا۔ یا بالفاظ دگر، خدا کا نائب بن جائے گا۔ اسمِ اعظم۔ لفظی معنی خدا کا سب سے بڑا یا متبرک ترین نام۔ مراد ہے اللہ کا وہ اسم صفت جس میں غیر معمولی تاثیرات پوشیدہ ہیں۔ فکرِ اجزاء یعنی نسخہ کے اجزاء (مفردات) کی تلاش۔ میدانِ اِمکان، مراد ہے ساری کائنات بارگاہِ حق کا محرم یعنی وہ شخص جو اللہ کے ارادوں سے واقف ہو۔ تیرگی، بمعنی سیاہی۔ زلفِ برہم کنایہ ہے بکھرے ہوئے بالوں سے۔ مراد ہے رات کی وہ سیاہی جو دور دور تک پھیلی ہوئی نظر آتی ہے حرارت بمعنی زندگی نفس بمعنی سانس۔ مسیح ابنِ مریمؑ۔ حضرت عیسیٰ کو اللہ نے یہ طاقت عطا فرمائی تھی کہ وہ اپنی سانس سے مردہ کو زندہ کر دیتے تھے۔ ربوبیت۔ لغوی معنی اللہ کی صفت پرورش مراد ہے۔ ذات باری

یا اُلوہیت ۔ بے نیازی ۔ محتاج نہ ہونے کی صفت ۔ واضح ہو کہ اللہ کی سب سے نمایاں صفت یہ ہے کہ وہ بے نیاز (صمد) ہے ۔ کسی کا کسی رنگ میں بھی محتاج نہیں ہے مَلک بمعنی فرشتہ، عاجزی بمعنی شانِ عبودیت یا رنگ احتیاج ۔ اُفتادگی لغوی (زمین پر) گرنا مراد ہے، عاجزی مسکینی ۔ تقدیرِ شبنم ۔ اوس کی ہستی کا اندازہ ۔ تقدیر بمعنی قانونِ قدرت چشمۂ حیواں، اصطلاحی معنی ہیں وہ چشمہ فرضی جس کا پانی پی لینے کے بعد موت نہیں آتی ۔ مراد ہے ہمیشگی یا ابدیت یعنی محبت ایک ابدی شئے ہے ۔ نام پایا عرش اعظم سے ۔ یعنی خدا نے اس مرکب کا نام محبت رکھا ۔ مُہوِش ۔ مراد ہے کیمیا گر ، ہستی نوخیز یعنی کائنات جو نئی نئی پیدا ہوئی تھی ۔ گرہ کھولی ہنر نے اسکے الخ

مطلب یہ ہے کہ مہوش کے اس "ہنر" نے کائنات کی تمام دشواریوں کو حل کر دیا یا دنیا کا کارخانہ جو بند پڑا تھا جاری ہو گیا ۔ کس طرح اور کیونکر جاری ہو گیا ۔ اس کا ذکر اگلے شعر میں ہے کہ "ہوئی جنبش عیاں" یعنی جب محبت کارفرما ہوئی تو کائنات میں حرکت پیدا ہو گئی ۔ ذرّوں نے لطفِ خواب کو چھوڑا ۔ یعنی ذراتِ مادی متحرک ہو گئے ۔ گلے ملنے لگے الخ یعنی ذرات میں ترکیب کا عمل شروع ہو گیا ۔ ہمدم سے مراد ہے یکساں صفات رکھنے والے ذرّات غنچوں نے چٹک پائی ۔ مراد یہ ہے کہ ہستی یا کائنات کا نظم و نسق اپنے مرتبۂ کمال کو پہنچ گیا ۔

تبصرہ: یہ دوسرے دَور کی پہلی نظم ہے جس کی بندش یہ بتا رہی ہے کہ اقبالؒ نے اس کو بہت غور و فکر کے بعد مرتب کیا ہو گا ۔ اس کے شاعرانہ محاسن سے بخوفِ طوالت قطع نظر کرتا ہوں ۔ اور معنوی خوبیوں میں سے بھی صرف ایک خوبی کی تفصیل پر اکتفا کرتا ہوں ۔ واضح ہو کہ تصوّف کی مسلمہ تعلیم یہ ہے کہ "حرکت بدونِ محبت، محال ہے" اگر محبت نہ ہوتی تو حرکت نہ ہوتی اور حرکت

نہ ہوتی تو کائنات بھی نہ ہوتی۔ یعنی اس کائنات کا وجود محبت پر موقوف ہے اقبال نے تصوف کی اسی بنیادی تعلیم کو شاعرانہ انداز میں پیش کیا ہے جس کا خلاصہ یہ ہے کہ:۔

(۱) محبت باعثِ ایجادِ عالم ہے۔ وہ ایسی لطیف طاقت ہے جو اس کائنات کی رگ و پے میں جاری ہے۔

(۲) محبت غیر مادی شئے ہے۔ اس کے عناصر ترکیبی سب غیر مادی ہیں۔

(۳) محبت زر اصل کائنات کے تمام محاسن کا مجموعہ ہے اس لئے اس میں حسن بھی پوشیدہ ہے۔

(۴) اقبال نے اس نظم میں کائنات کے حسن کو بھی ضمنی طور سے واضح کر دیا ہے جس طرح چمک تارہ کا حسن ہے، اسی طرح سیاہی رات کا زیور ہے۔ وقس علیٰ ہذا۔

(۵) محبت ایک غیر فانی شئے ہے نیز یہ کہ محبت نہ ہوتی تو دنیا نہ ہوتی۔

(۶) اس نظم میں اقبال نے اپنے فن (شاعری) کے اُس پہلو کو نمایاں کیا ہے جسے رمزیت کہتے ہیں۔

(۷) یہ نظم اقبال نے ۱۹۰۶ء میں لکھی تھی اور اس کے مطالعہ سے یہ بات عیاں ہو سکتی ہے کہ انھوں نے اپنا مقصدِ حیات اسی زمانہ میں متعین کر لیا تھا یعنی دنیا کو محبت کا درس دینا۔ چنانچہ ان کی آئندہ شاعری تادمِ آخر اسی مقصد کے لئے وقفِ عمل رہی۔

(۸) دنیا میں جہاں کہیں کوئی حُسن و خوبی یا نیکی یا صداقت ہے وہ سب محبت ہی کا ظہور ہے۔ یہی وجہ ہے کہ ان کی نظر میں حُسن۔ صداقت اور نیکی، یہ تینوں ایک ہی چیز (محبت) کے تین پہلو ہیں۔

حقیقتِ حُسن

حل لغات اور شرح مشکلات: لازوال، جسے فنا نہ ہو یعنی ابدی، تصویر خانہ، تصویر کی نہ کوئی حقیقت ہوتی ہے اور نہ اس میں پائیداری ہے۔ یہی حال دنیا کا ہے۔ شبِ دراز عدم کا فسانہ۔ عدم کی طویل رات کا افسانہ۔ یعنی دنیا کی کوئی اصلیت یا حقیقت نہیں ہے، رنگِ تغیر، یعنی تغیر یا تبدیلی۔ دنیا کی بُنیاد تغیر یا انقلاب پر ہے۔ یہاں کسی شئے کو دوام نہیں ہے اس لئے زوال اور فنا ہر شئے کی حقیقت میں داخل ہے۔ اخترِ سحر سے وہ خاص ستارہ مراد ہے جو طلوعِ آفتاب سے پہلے مشرق اُفق پر نمودار ہوتا ہے۔ سوگوار یعنی رنجیدہ یا غمگین۔

تبصرہ اس نظم میں اقبالؔ نے تمثیلی رنگ میں اس صداقت کا اظہار کیا ہے کہ دنیا کی بنیاد تغیر پر ہے۔ اس لئے یہاں کسی چیز کو ہمیشگی حاصل نہیں ہو سکتی لہٰذا حُسن کی حقیقت دوام نہیں بلکہ زوال ہے۔ قمر، اختر، سحر، شبنم، پھول، کلی، موسم، بہار اور ان سب حسینوں کا سرتاج "شباب" یہ سب حسین اشیاء رو بہ زوال اور فانی ہیں۔

پیام

حل لغات اور شرح مشکلات: تجھ سے ہر پڑھنے والا مخاطب ہے۔ ذوقِ تپش۔ تڑپنے کی لذت۔ یعنی اضطرابِ مسلسل جو عشق کا ثمرہ یا نتیجہ ہے۔ بزم سے دنیا اور دنیا والے مراد ہیں، شمعِ بزم، وہ شمع جو محفل میں جلتی ہے۔ یہاں بزم سے محفل مراد ہے۔ حاصلِ سوز و ساز۔ بہت بلیغ ترکیب ہے۔ اور اس سے وہ لطیف اور پاکیزہ جذبات مراد ہیں جو عاشقانہ زندگی کی

بدولت حاصل ہوتے ہیں۔ یا وہ روحانی فوائد جو عشق کا لازمی نتیجہ ہیں۔ بتان کرم سے اللہ کا فضل و کرم مراد ہے "عشق گرہ کشا" عشق حقیقی کی خاصیت یہ ہے کہ وہ تمام گرہوں (دشواریوں) کو کھول (حل کر) دیتا ہے۔ اور تمام خرابیوں کا ازالہ کر دیتا ہے جب بندہ اللہ سے ملنا چاہتا ہے تو اسکی راہ میں دشواریاں پیش آتی ہیں لیکن عشق ان کو دُور کر دیتا ہے اور بندہ اللہ سے واصل ہو جاتا ہے وہ دشواریاں جیسا کہ میں پہلے لکھ چکا ہوں پانچ ہیں۔ شہوت، غضب، فریفتگی، حرص، اور تکبر، دیر و حرم۔ بتخانہ اور مسجد قید، بمعنی تخصیص۔ گریۂ جاں گداز سے سوز و گداز کی وہ کیفیت مراد ہے جو عشق کی بدولت دل میں پیدا ہو جاتی ہے اور اسی پر ساری روحانی ترقی موقوف ہے۔ تارے میں وہ، وہ سے خدا کی صفات کی طرف اشارہ ہے۔ یعنی ہر شئے میں اُسی کا جلوہ پوشیدہ ہے چشم نظارہ ہیں نہ تو الخ۔ بہت دلکش انداز بیان ہے مطلب یہ ہے کہ جب تو اشیائے کائنات کو دیکھے تو ان میں امتیاز مت کر کہ یہ پھول اور یہ کانٹا ہے۔ پھول میں بھی وہی پوشیدہ ہے اور کانٹے میں بھی اُسی کا جلوہ ہے۔ اس شعر میں وحدت الوجود کا رنگ پایا جاتا ہے۔ بلند بال بمعنی عالی حوصلہ۔ رسم و رہِ نیاز بمعنی عاجزی یا غلامی کا طریقہ۔ پیر مغاں۔ لغوی معنی ہیں آتش پرستوں کا مذہبی پیشوا چنانچہ حالیؔ لکھتے ہیں ؎ آتش پیر مغاں نے راگ کا پایا تیر امراد ہے میخانہ کا مالک یا منتظم۔ فرنگ کی نئے۔ یعنی مغربی تعلیم و تہذیب نشاط بمعنی مسرّت یا خوشی۔ یہ بہت بلیغ لفظ ہے جو اقبالؔ نے اس مصرع میں اپنے مفہوم کو ادا کرنے کے لئے استعمال کیا ہے۔ لفظی معنی تو یہ ہوئے کہ فرنگ کی شراب سے نشاط (مسرت) حاصل ہوتی ہے۔ لیکن مطلب شاعر کا یہ ہے کہ مغربی تہذیب اور مغربی تعلیم سے انسان دولت یا ثروت یا عہدہ حاصل کر سکتا ہے۔ اور اس مادّی ترقی سے اُسے سطحی قسم کی مادی مسرت حاصل ہو سکتی ہے۔ لیکن اس میں "کیف غم" نہیں ہے یعنی مغربی تہذیب سے دل میں عشقِ الٰہی کی آگ روشن نہیں ہو سکتی۔ خانہ ساز۔ لغوی معنی وہ شراب جو گھر میں

کشید کی گئی ہو۔ یہاں مراد ہے اسلامی علوم اور اسلامی تہذیب۔ بزمِ کہن بدل گئی پرانی محفل بدل گئی یعنی مسلمانوں کی زندگی میں انقلاب رونما ہو چکا ہے وہ پہلے حاکم تھے اب محکوم ہیں۔ مئے مجاز۔ لغوی معنی مجاز کی شراب مراد ہے۔ مجاز کی تعلیم۔ واضح ہو کہ اقبالؔ کے یہاں یہ تین ترکیبیں بہت مستعمل ہیں۔ حقیقت و مجاز۔ سوز و گداز اور ناز و نیاز۔ مجاز حقیقت کی ضد ہے۔ مثلاً شیر کے حقیقی معنی ایک خونخوار درندہ کے ہیں لیکن مجازی طور پر بہادر آدمی کو بھی "شیر" کہہ دیتے ہیں۔ مطلب اقبالؔ کا یہ ہے کہ مسلمانوں کے رہنماؤں کو لازم ہے کہ اب قوم کو حقیقت سے روشناس کریں۔ "مجاز" کی وادی میں تو وہ مدت دراز تک سرگرداں رہ چکی ہیں۔ مثلاً جب ہم دیوانِ حافظؔ میں شراب اور شاہد کا ذکر پڑھتے ہیں تو استاد بچوں یا طلبا سے یہ کہہ دیتا ہے کہ یہاں شراب اور شاہد کے لغوی معنی مراد نہیں ہیں۔ بالفاظِ دگر ہم مجازی معنی مراد لیتے ہیں اقبالؔ کہتے ہیں کہ اب قوم کو دیوانِ حافظ اور اس قسم کی دوسری کتابوں کے بجائے قرآن اور حدیث کا مطالعہ کرنا چاہئے۔

تبصرہ: یہ بہت غور طلب نظم ہے۔ کیونکہ ایک تو اس میں خیالات بہت بلند ہیں دوسرے یہ کہ اس سے اقبالؔ کے اُس ذہنی انقلاب کا علم حاصل ہو سکتا ہے جو یورپ جا کر اُن کے اندر پیدا ہوا یعنی یہ پہلی نظم ہے جس میں انھوں نے "پیغام گو" کی حیثیت اختیار کی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ اس نظم کا عنوان "پیام" ہے۔ ضربِ کلیم میں بھی پیام کی مَے ہے جو چہار آتشہ ہو گئی ہے۔ دوسری خصوصیت اس نظم کی یہ ہے کہ اس میں وحدۃ الوجود کا رنگ پایا جاتا ہے۔ جو ابتدا ہی سے اُن کے دل و دماغ پر چھایا ہوا تھا۔

پہلا شعر: کہتے ہیں کہ اے مخاطب! اگر عشقِ حقیقی تیرے اندر سوز و گداز کا رنگ پیدا کر دے (شاعر نے یہ فرض کر لیا ہے کہ یہ رنگ پیدا ہو چکا ہے) تو تیرا فرض ہے کہ جس طرح شمع، اہلِ محفل کو اپنے سوز و گداز (جلنے) سے فائدہ روشنی پہنچاتی ہے، اُسی طرح تو اُن (دنیا والوں) کو اپنے سوز و گداز (ہمدردی) سے فائدہ پہنچائے۔ یعنی

عشق حقیقی انسان کے اندر بنی آدم کے ساتھ حُسن سلوک۔ اور ہمدردی کا جذبہ پیدا کر دیتا ہے۔

دوسرا شعر: عشق کا دار و مدار کسی خاص مقام یا ظاہری خصوصیت پر نہیں ہے بلکہ فضل الٰہی پر ہے۔ یعنی اگر خدا کا فضل شاملِ حال ہو جائے تو کافر اور سبہ کار بھی نعمتِ عشق سے مالا مال ہو سکتا ہے۔ بالفاظ دگر خدا مسجد یا مندر میں محدود نہیں ہے اور نہ اس کا فضل کسی خاص فرد سے وابستہ ہے۔

تیسرا شعر: سوز و گداز کے بغیر انسان کے اندر نورانیت یا روحانیت پیدا نہیں ہو سکتی۔ چنانچہ دیکھو شمع نے پہلے اپنے اندر سوز و گداز کا رنگ۔ پیدا کیا تو قدرت نے اُسے نور کی قبا (نورانی زندگی) عطا کی۔ واضح ہو کہ یہ حُسن تعلیل ہے

چوتھا شعر: اے انسان! اپنی آنکھ میں امتیاز (مختلف اشیاء میں تمیز کرنے) کا سُرمہ مت لگا۔ ہر شئے میں اُسی کا جلوہ پوشیدہ ہے۔ اور ہر جگہ اُسی کی صفات کا ظہور ہو رہا ہے۔

پانچواں شعر: اقبال کی رائے میں عشق کا تقاضا یہ نہیں کہ عاشق اپنی خودداری کو بالائے طاق رکھ دے۔ اگر حُسن مستِ ناز ہے یعنی عاشق سے تغافل کرتا ہے تو عاشق کو بھی خودداری سے کام لینا چاہیے۔

چھٹا شعر: اے مسلمانوں کے لیڈر! انگریزی تعلیم اور مغربی تہذیب مسلمانوں کے لیے کبھی مفید نہیں ہو سکتی۔ مغربی تعلیم و تربیت کا نتیجہ "نشاط" (مادّی فارغ البالی) کی شکل میں ظاہر ہوتا ہے۔ حالانکہ مسلمان کے لئے جو چیز ضروری ہے وہ "کیف غم" یعنی عشق رسولؐ ہے۔ اس لئے اے رہنما! تو مسلمانوں کو "خانہ ساز" شراب پلا یعنی اسلامی تعلیمات سے روشناس کرا اور اُن کے دلوں میں عشقِ رسولؐ پیدا کر۔

ساتواں شعر: اے رہنمائے قوم! کیا تجھ کو خبر نہیں کہ زمانہ بدل گیا۔ مسلمانوں کی

زندگی میں ایک عظیم الشان انقلاب رونما ہو چکا ہے۔ وہ جس ملک میں صدیوں تک حاکم رہے، اب اُسی ملک میں محکوم ہیں۔

اس لیئے اب اُن کو مجازی کی شراب مت پلا۔ یعنی مجازی دنیا سے نکال کر حقیقی دنیا میں لا۔ اور زندگی کے حقائق سے روشناس کر۔ بالفاظِ دگر انھیں یہ بتا کہ :-

خدا نے آج تک اُس قوم کی حالت نہیں بدلی
نہ ہو جس کو خیال آپ اپنی حالت کے بدلنے کا

نوٹ : افسوس صد افسوس کہ ہندوستان اور پاکستان کے مسلمانوں نے ابھی تک حقائقِ حیات سے آگاہی حاصل نہیں کی۔ وہ بدستور خوابِ غفلت میں گرفتار کرشمۂ قدرت کے اُمیدوار ہیں حالانکہ قدرت (اللہ) صرف اُن کی مدد کرتی ہے جو اپنے آپ کو امداد کا مستحق ثابت کر دیتے ہیں

شوامی رام تیرتھ

حل لغات اور شرحِ مشکلات : ہم بغل۔ واصل یا متحد۔ دریا سے مراد ہے ذاتِ الٰہی قطرۂ بے تاب سے مراد ہے انسان۔ واضح ہو کہ فلسفۂ وحدۃ الوجود میں خدا کو دریا اور انسان کو قطرہ سے تشبیہہ دیتے ہیں۔ اور مقصدِ حیات یہ ہے کہ قطرہ دریا میں شامل ہو جائے پہلے گوہر تھا انسان۔ بلحاظ ذات گوہر، (روح) ہے، مادی نہیں ہے۔ گوہر نایاب۔ نایاب کے دو معنی ہیں (۱) لغوی معنی وہ شئے جس کا وجود نہ ہو جو کہیں پائی نہ جائے۔ جب انسان خدا سے واصل ہو جاتا ہے تو اس کا ذاتی وجود باقی نہیں رہتا (۲) مجازی معنی قیمتی گوہر جب انسان واصل بحق ہو جاتا ہے تو

خود خدا ہو جاتا ہے اور اس لحاظ سے وہ بلا شبہ "گوہر نایاب" بن جاتا ہے۔ کس ادا سے! یعنی کیسے دلپذیر انداز سے۔ رازِ رنگ و بو یعنی اس کائنات کی حقیقت۔ اسیرِ امتیازِ رنگ و بو یعنی میں ابھی تک حقیقت سے ناآشنا ہوں۔

نوٹ: حقیقتِ کائنات یہ ہے کہ اس کی کوئی حقیقت نہیں ہے حقیقت صرف خدا کی ہے جو واحد ہے یعنی خدا کا وجود حقیقی ہے کائنات کا وجود غیر حقیقی ہے اور یہ جو کچھ نظر آتا ہے بظاہر کثرت ہے، بباطن وحدت ہے بظاہر اختلاف ہے، بباطن اتحاد ہے۔ جاہل آدمی امتیازات میں اسیر ہے یعنی یہ میری کتاب ہے، وہ زید کا قلم ہے، یہ مکان میرا ہے، یہ مکان تیرا ہے، یہ میرا بیٹا ہے یہ تیری بیٹی ہے۔ یہ ہندو ہے وہ مسلمان ہے۔ یہ میرا دوست ہے، وہ میرا دشمن ہے وغیرہ وغیرہ لیکن جس شخص پر رازِ رنگ و بو کائنات کی حقیقت عیاں ہو جاتی ہے۔ وہ جانتا ہے کہ یہ امتیازات سب اعتباری ہیں۔ درحقیقت کسی شئے کا وجود ہی نہیں تو یہ امتیازات کا وجود کہاں سے اور کیسے ثابت ہو سکتا ہے، تو پھر ہے کیا؟ وہی ایک ذات پاک جو پھول میں بھی ہے اور کانٹے میں بھی۔ بقول اقبال ؒ

تارے میں وہ قمر میں وہ جلوہ گہہ سحر میں وہ

غوغا معنی شور و غل۔ شورشِ محشر یعنی قیامت کا ہنگامہ۔ شرارہ بمعنی چنگاری۔ آتش خانہ آذر۔ آذر، حضرت ابراہیمؑ کے باپ کا نام تھا جو بت پرست تھے۔ اس سے مراد آتشکدہ بھی ہو سکتی ہے اور وہ خاص آگ بھی جو حضرت ابراہیمؑ کو جلانے کے لیے تیار کی گئی تھی۔ مطلب یہ ہے کہ جب انسان مر جاتا ہے تو بظاہر اس کی روح کا شرارہ بجھ جاتا ہے۔ لیکن دراصل وہ واصل باللہ ہو کر

آتش کدہ (مرکز حیات) بن جاتا ہے۔ یلفی ہستی یعنی اپنی ہستی فنا کر دینا۔ یہ فنائے کلی کا مقام ہے یعنی وہ حالت جب سالک اپنی ہستی کو بواسطہ مرشد کامل خدا کی ہستی میں فنا کر دیتا ہے جس طرح لوہا آگ میں پڑ کر اپنی ہستی کو آگ میں فنا کر دیتا ہے واضح ہو کہ جب سالک اپنی ہستی خدا میں اس طرح فنا کر دیتا ہے تو اس میں خدا کی صفات کا رنگ پیدا ہو جاتا ہے۔ کرشمہ۔ دلکش ادا یا قابلِ تحسین فعل۔ دلِ آگاہ۔ وہ شخص جو اپنی اور اس کائنات کی حقیقت سے آگاہ ہو اور پہلے واضح کر چکا ہوں کہ انسان اور کائنات دونوں کی کوئی حقیقت (واقعیت یا اصلیت) نہیں ہے جو کچھ نظر آتا ہے یہ سب فریبِ نظر ہے لا کے دریا میں نہاں الخ۔ صداقت کے لحاظ سے ساری کتاب میں اس مصرع کا جواب نہیں ہے۔ بخوفِ طوالت صرف اس قدر مطلب لکھنا کافی ہے کہ اگر کسی شخص کو اللہ سے ملنے کی آرزو ہو تو اسے اپنی اور کائنات کی نفی کرنی لازمی ہے بالفاظ دیگر الا اللہ تک پہنچنے کیلئے اسے لا کی منزل سے گذرنا ہوگا۔ اللہ کو وہ شخص پا سکتا ہے جو پہلے اپنی ہستی کو بواسطہ مرشد اس کی ہستی میں فنا کر دے۔ اس فنا کے بعد پھر بقا ملے گی۔ بلکہ حقیقت یہ ہے کہ اس کے بعد پھر بقا ہی بقا ہے۔ کیونکہ قطرہ جب دریا میں مل گیا تو پھر فنا کہاں؟ چشمِ نابینا۔ دل آگاہ کی ضد ہے یعنی وہ شخص جو اپنی اور کائنات کی حقیقت سے آگاہ نہیں ہے جو اپنے آپ کو اور اس کائنات کو بھی موجود سمجھتا ہے۔ ایسا شخص تصوّف کے زاویہ نگاہ سے اندھا ہے اور اس لیے زندہ انجام کے مفہوم سے ناواقف ہے۔ دیکھو! اگر سیماب (پارہ) سے تڑپ زائل ہو جائے تو اس میں اور کچی چاندی میں کوئی فرق نہیں ہے۔ یعنی سیماب اگر اضطراب چھوڑ دے تو اپنی حقیقت سے دور ہو جائے گا۔ اسی طرح اگر انسان خدا سے ملنے (واصل ہونے) کی آرزو چھوڑ دے، اگر عشقِ الٰہی سے دست بردار ہو جائے تو پھر اپنی حقیقت سے بیگانہ ہو جائے گا۔ انسان کا انجام یہ ہے کہ وہ عشقِ الٰہی کی بھٹی میں اپنی ہستی کو فنا کر دے۔ اس فنا میں

اس کے لئے بقا کا پیغام پوشیدہ ہے لیکن مادہ پرست انسان اس نکتہ کو نہیں سمجھ سکتا۔ مستیٔ تسنیم عشق۔ یعنی شرابِ عشق کی مستی۔ تسنیم جنت کی ایک نہر کا نام ہے۔

تبصرہ: اس نظم میں اقبال نے سوامی رام تیرتھ کی خدمت میں خراجِ عقیدت پیش کیا ہے سطحی نگاہ رکھنے والوں کے دل میں شاید یہ شبہ پیدا ہو کہ سوامی جی تو ہندو تھے پھر اقبال نے ان کی وفات پر اپنی محبت کا اظہار کیوں کیا؟ اس کا جواب یہ ہے کہ ع "پروانہ چراغِ حرم و دیر ندانند" یعنی اقبال مسلکِ عشق کے قائل ہیں اور سوامی جی بھی اسی راہ پر گامزن تھے تو اختلاف کیسا؟ اس کی تفصیل یہ ہے کہ سوامی جی یہ کہتے تھے کہ:۔

ایشور (اللہ) بھگتی (محبت) سے مل سکتا ہے اور اقبال یہ کہتے ہیں کہ اللہ (ایشور) محبت (بھگتی) سے مل سکتا ہے تو دراصل دونوں ایک ہی مسلک پر عامل ہیں۔

سوامی جی کا اصلی نام تیرتھ رام تھا۔ وہ ۱۸۷۳ء میں ضلع گوجرانوالہ کے ایک گاؤں میں پیدا ہوئے تھے۔ ان کے والدین بہت غریب تھے اس لئے انہوں نے بہت عسرت کی حالت میں تعلیم حاصل کی۔ انٹرنس پاس کرنے کے بعد وہ گورنمنٹ کالج لاہور میں داخل ہوئے۔ ٹیوشن کے ذریعہ سے انھوں نے ایم اے (ریاضی) پاس کیا۔ اور مشن کالج لاہور میں ریاضی کے پروفیسر مقرر ہو گئے۔ ویدانت کا رنگ شروع ہی سے ان پر چڑھا ہوا تھا۔ عمر کے ساتھ یہ رنگ اور بھی گہرا ہوتا گیا۔ جب ان پر رام کی محبت کا غلبہ ہوتا تھا تو وہ ہفتوں بارہ دری کامراں (کنار دریائے راوی) میں عالم محویت میں بیٹھے رہتے تھے اور کبھی کبھی دریا کے کنارے کنارے اپنے محبوب کو ڈھونڈتے ہوئے دور نکل جاتے تھے۔ کچھ دنوں کے بعد ان کی

رام بھگتی (رام سے عشق) کا شہرہ ہو گیا اور یہ حالت ہوئی کہ لاہور کے بڑے بڑے دولتمند (عورتیں اور مرد) ان کے نقوش کفِ پا کو آنکھوں سے لگاتے تھے۔ بخوفِ طوالت ان کے سوانح حیات تو درج کر نہیں سکتا۔ صرف اس قدر لکھتا ہوں کہ ۱۹۰۶ء میں وہ حسبِ معمول موسمی تعطیلات بسر کرنے کے لیے ہردوار (ضلع سہارنپور) گئے تھے۔ ایک دن وہ اپنے شاگردوں اور عقیدت مندوں کے ہجوم میں دریائے گنگا کے کنارے بیٹھے ہوئے تھے اور ویدانت کے دریا بہا رہے تھے۔ یکایک انھوں نے اشنان کا ارادہ ظاہر کیا اور تیرتے ہوئے دور تک نکل گئے۔ اسی حالت میں اُن پر رام کی محبت کا غلبہ ہوا اور انھوں نے عین دریا میں سمادھی لگا دی یعنی ان پر حالتِ جذب و مستی طاری ہو گئی۔ نتیجہ یہ نکلا کہ وہ لہروں میں غرق ہو گئے۔ تین دن کے بعد ان کی نعش خود بخود کنارے سے آلگی جسے اُن کے عقیدت مندوں نے بڑے احترام کے ساتھ نذرِ آتش کر دیا۔

نوٹ: سمادھی لگانا ویدانت کی اصطلاح ہے۔ اس سے مراد ہے۔ عاشق (بھگت) کا یہ تصور کرنا کہ محبوب مجھ سے جدا نہیں ہے بلکہ میرے گھٹ میں سمایا ہوا ہے، کچھ عرصہ کے بعد عاشق خود محبوب بن جاتا ہے۔ یعنی "او در من و من در وے" والا معاملہ ہو جاتا ہے ۱۲۔

سوامی جی اور اقبالؔ میں فرق یہ ہے کہ اقبالؔ نے تصوّف کے اُصول پر عمل نہیں کیا۔ لیکن سوامی جی نے ویدانت پر عمل کر کے دنیا کو دکھا دیا۔ چنانچہ اقبالؔ نے اس نظم میں خود اس بات کا اعتراف کیا ہے ؎

آہ کھولا کس ادا سے تو نے رازِ رنگ و بو
میں ابھی تک ہوں اسیرِ امتیازِ رنگ و بو

خلاصہ کلام یہ ہے کہ سوامی جی اور اقبالؔ دونوں مسلکِ وحدۃ الوجود کے قائل ہیں فرق یہ ہے کہ سوامی جی نے جو زبان سے کہا اس پر عمل کر کے

کبھی نہ کھا دیا۔

نظم کا مطلب: بظاہر یہ نظم مشکل نہیں ہے لیکن اس میں اقبالؔ نے وحدۃ الوجود (ویدانت) کے بعض رموز و نکات بیان کیے ہیں ان کی وجہ سے اشعار کا مطلب دشوار ہو گیا ہے اس لئے میری رائے میں یہ نظم بہت غور سے پڑھنے کے لائق ہے کہتے ہیں کہ (۱) سوامی جی نے وفات نہیں پائی بلکہ قطرہ (روح یا آتما) دریا (پرماتما یا خدا) سے مل گیا۔ اس مصرع میں اقبالؔ نے ویدانت کی بنیادی تعلیم بیان کر دی ہے۔ انسان کی روح کا خدا سے وہی رشتہ ہے جو قطرہ کا دریا سے ہے یعنی انسان اور خدا دونوں کی اصل ایک ہی ہے جس طرح قطرہ اور دریا کی۔ دریا قطروں کے مجموعہ ہی کا دوسرا نام ہے۔ سوامی جی وفات یا وصال سے پہلے اگر بمنزلہ گوہر تھے تو واصل ہو کر گوہر نایاب بن گئے۔ یعنی خدا سے واصل ہو کر خود خدا ہو گئے۔ اقبالؔ نے خدا کو گوہر نایاب سے تشبیہ دی ہے کیونکہ گوہر نایاب اُسے کہتے ہیں جس کی نظیر نہ مل سکے۔۔ اور خدا کا مثیل بھی ناممکن ہے۔

(۲) سوامی جی نے اپنے طرز عمل سے (تصوف یا ویدانت سراسر عمل کا نام ہے) اس کائنات کا راز فاش کر دیا یعنی اس کی حقیقت سے آگاہی حاصل کر لی۔ وہ کیا؟ یہ کہ یہ کائنات سراسر فریب نظر ہے۔ اس کی کوئی حقیقت نہیں ہے بالکل دھوکہ کی ٹٹی ہے۔ صرف اللہ (پرماتما) موجود ہے۔ اس کے سوا اور کوئی شے موجود نہیں ہے اور جو کچھ نظر آتا ہے پھول، کانٹے، عورت، مرد، وحوش و طیور، ہندو مسلمان، دوست، دشمن یہ سب اسی ذات واحد کی تجلیات کا پرتو یا عکس ہے

(۳) جب انسان مر جاتا ہے تو بظاہر اس کی زندگی کا غوغا مٹ جاتا ہے۔ لیکن در اصل وہ انسان شورشِ محشر بن جاتا ہے۔ یعنی اس کی زندگی میں بدرجہا زیادہ شدت اور طاقت پیدا ہو جاتی ہے (شورش محشر غوغائے زندگی سے بدرجہا

زیادہ شدید ہوتی ہے) اور اس کی وجہ یہ ہے کہ انسانی زندگی مرنے کے بعد خدائی زندگی سے واصل ہو جاتی ہے۔ قطرہ جب دریا میں مل جاتا ہے تو اس میں بھی پورے دریا کے سیلان کی طاقت پیدا ہو جاتی ہے۔

(۴) اپنی ہستی کی نفی وہی شخص کر سکتا ہے جو حقیقت سے آگاہ ہو جاتا ہے حقیقت کیا ہے؟ یہ کہ اِلَّا اللہ کا موتی لَا کے دریا میں پوشیدہ ہے۔ یعنی اگر کسی کو اللہ سے ملنے کی خواہش ہو تو پہلے اپنے آپ کو فنا کر دے۔ اسی کو نفی ہستی کہتے ہیں سوال یہ ہے کہ انسان اپنے آپ کو فنا کس طرح کرے؟ اس کا جواب تو بہت تفصیل طلب ہے جس کی متحمل یہ شرح نہیں ہو سکتی۔ مختصر یہ کہ جس طرح لوہا جب آگ میں پڑ کر اپنی ہستی کو فنا کر دیتا ہے تو اُسے دوبارہ نئی زندگی حاصل ہوتی ہے اور وہ زندگی ایسی ہوتی ہے کہ لوہا خود آگ ہو جاتا ہے۔ اسی طرح جب سالک اپنی ہستی کو عشق الٰہی کی آگ میں جلا کر فنا کر دیتا ہے تو اسے فنا کے بعد نئی زندگی حاصل ہو جاتی ہے اور وہ زندگی ایسی ہوتی ہے کہ سالک خود خدا بن جاتا ہے اور وہ یہ دیکھ کر حیران رہ جاتا ہے کہ میں جسے ڈھونڈتا تھا وہ تو میرے اندر ہی پوشیدہ تھا ؎

جنہیں میں ڈھونڈتا تھا آسمانوں میں زمینوں میں
وہ نکلے میرے ظلمت خانۂ دل کے مکینوں میں

اب اگر کسی کو یہ شبہ ہو کہ لَا کی منزل سے اِلَّا کی منزل کیسے نصیب ہو سکتی ہے یعنی فنا سے بقا کیسے ہو سکتی ہے؟ تو اس کا صاف اور سیدھا جواب یہ ہے کہ اگر کوئی شخص آپ سے یہ پوچھے کہ ہائیڈروجن اور آکسیجن کے ملانے سے پانی کیسے بن جاتا ہے تو اس کے علاوہ آپ اور کیا جواب دے سکتے ہیں کہ تجربہ گاہ میں ملا کر دیکھ لو اور ملانے کا طریقہ کسی پروفیسر سے پوچھ لو وہ بتا سکتا ہے کہ ان دونوں غازوں (گیسوں) کو کس تناسب سے ملایا جائے۔ اسی طرح میں

سائل کو یہ جواب دوں گا کہ کسی خانقاہ میں بیٹھ کر دیکھ لو اور فنا ہونے کا طریقہ کسی شیخ سے دریافت کر لو وہ بتا سکتا ہے کہ فنا فی اللہ کیسے ہو سکتے ہیں۔ ع

کس طرح جاتا ہے دل، بیدل سے پوچھا چاہیئے

(۵) جو لوگ نابینا (حقیقت سے ناواقف) ہیں وہ حیاتِ انسانی کے انجام سے آگاہ نہیں ہو سکتے۔ انسان کا انجام یہ ہے کہ وہ ہمیشہ عشقِ الٰہی کی آگ میں جلتا رہے اور تڑپتا رہے۔ سیماب سے اگر تڑپ کی کیفیت زائل ہو جائے تو پھر وہ سیماب نہیں بلکہ سیم خام بن جائے گا۔ اسی طرح اگر روح سے عشق کی صفت زائل ہو جائے تو روح اپنی ذات کے تقاضے سے محروم ہو جائے گی یعنی اپنے مرتبے سے گر جائے گی۔

واضح ہو کہ اقبال کی نظر میں انجام (فنا) کا مطلب فنائے ذات نہیں ہے یعنی فنا سے ان کی مراد مٹ جانا یا نیست و نابود ہو جانا نہیں ہے۔ بلکہ فنا تصوّف کی اصطلاح میں وہ حالت ہے جب کہ سالک اپنی خواہشات کو بکلّی خدا کی مرضی کے تابع کر دیتا ہے یعنی مطیع کامل ہو جاتا ہے اور یہ مسلّم ہے کہ اطاعت محبت کے بغیر ناممکن ہے اسی لئے تصوف میں عشق (محبت) کو شرطِ اوّلین قرار دیا ہے۔ اقبال کی رائے میں عاشق کا انجام فنا (نیستی) نہیں ہے، بلکہ مسلسل اضطراب ہے۔ چنانچہ اس حقیقت کو انھوں نے سیماب کی مثال سے واضح کر دیا ہے۔

(۶) عشق وہ طاقت ہے جس کی بدولت ہستی کا بت ٹوٹ جاتا ہے یعنی عشق کی بدولت سالک اپنی ہستی کو خدا کی مرضی میں فنا کر دیتا ہے۔ واضح ہو کہ اپنی ہستی کو کسی کی مرضی میں فنا کر دینا بہت مشکل ہے کیونکہ ہر شخص کی خودی کا تقاضا یہ ہے کہ دوسرے میری اطاعت کریں۔ لیکن عشق وہ طاقت ہے کہ اس کی بدولت انسان اپنی خواہشات کو خدا کی مرضی کے سامنے فنا کر دیتا ہے۔ مثلاً نفس امّارہ کہتا ہے کہ پہلے رشوت کے ذریعہ سے دولت حاصل کرو۔ پھر ہوٹلوں میں جا کر اس دولت

کے ذریعہ سے عورت حاصل کرو۔ لیکن خدا کہتا ہے کہ رشوت بھی حرام ہے اور غیر منکوحہ عورت بھی حرام ہے اس لئے دونوں سے اجتناب کرو۔ اب اگر کوئی مسلمان (جیسے موجودہ دور میں رجعت پسند کہا جاتا ہے) خدا کے حکم پر عمل کرے تو تصوّف کی اصطلاح میں ہم یوں کہتے ہیں کہ اس نے اپنی مرضی کو خدا کی مرضی میں فنا کر دیا اس کا ثمرہ بقاء ہے۔

دوسرے مصرعہ میں اقبال نے "دارو" کو مذکر باندھا ہے۔ لیکن میں اسے مؤنث سمجھتا ہوں۔ کہتے ہیں کہ عشق حقیقی کی مستی (مدہوشی) دراصل ہوش کی دارو ہے یعنی عشق حقیقی انسان کے اندر صحیح شعور یا معرفت کا رنگ پیدا کر دیتا ہے۔

واضح ہو کہ عام طور سے مستی ہوش و حواس کو زائل کر دیتی ہے۔ لیکن عشق کی مستی میں عجیب خاصیت ہے۔ اس کی بدولت انسان کو ہوش آجاتا ہے یعنی وہ اپنی حقیقت سے آگاہ ہو جاتا ہے۔ یہ نکتہ مدنظر رہے کہ صوفی کے زاویۂ نگاہ سے صرف وہ شخص ذی ہوش یا صاحب شعور ہے جو عشقِ الٰہی میں سرشار ہو۔ اور جو عاشق نہیں ہے وہ ہوش و خرد سے محروم ہے۔ اس مصرعہ کی خوبی اسی نکتہ سنجی پر منحصر ہے

طلبہ علی گڑھ کالج کے نام

حل لغات اور شرح مشکلات: واضح ہو کہ اقبال نے یہ نظم از اوّل تا آخر رمز و ایماء کے پردہ میں لکھی ہے۔ اس لیے ساری نظم میں کسی لفظ کے حقیقی یا لغوی معنی مراد نہیں ہیں۔ اوروں سے اربابِ خرد یا پیروانِ مسلکِ عقل مراد ہیں۔ میرا پیام اور ہے یعنی اقبال قوم کو عشق کا درس دینا چاہتے ہیں۔ طائرِ زیرِ دام سے (۱) غلام یا محکوم۔ (۲) یا عقل پرست شخص مراد ہے۔ طائرِ بام سے مردِ مومن مراد ہے رازِ حیات، یعنی زندگی کی اصلیت یا حقیقت، سکون سے وہ پرانی کی تعلیم مراد ہے جس کی

رو سے نجات کا انحصار معرفت پر ہے ۔ معرفت حاصل کرنے کے لئے مراقبہ (دھیان) ضروری ہے اور مراقبہ کے لئے سکون شرط ہے ۔ اس لئے لفظ سکون پورے ویدانتی نظام پر حاوی ہے ۔ مور بمعنی چیونٹی ۔ لطفِ خرام یہ سکون کی ضد ہے اور اس سے جدوجہد (عمل صالح) مراد ہے ۔ واضح ہو کہ کوہ مجسم سکون ہے اور چیونٹی مجسم جدوجہد ہے ۔ جذبِ حرم سے عشق رسولؐ یا عشقِ اسلام مراد ہے فروغ بمعنی آب و تاب، ترقی، رونق، عروج، انجمن حجاز سے ملت اسلامیہ مراد ہے ۔ مقام سے مرتبہ یا اعزاز یا درجۂ بلند مراد ہے ۔ نظام سے وہ بنیادی اصول مراد ہیں جن پر دین اسلام مبنی اور موقوف ہے ۔ ذوقِ طلب سے وہی عشق رسولؐ مراد ہے ۔ گردشِ آدمی سے حالتِ عشق و مستی مراد ہے گردشِ جام سے عیش و عشرت کی زندگی مراد ہے ۔ سوز سے عشق حقیقی مراد ہے ۔ ساز سے کامیابی مراد ہے ۔ واضح ہو کہ اقبالؔ نے ان دو لفظوں کو اپنی ہر کتاب میں استعمال کیا ہے اور مختلف معانی مراد لئے ہیں ۔ یہاں اس شعر میں سوز و ساز سے یہی مفہوم ظاہر ہوتا ہے ۔ غمکدۂ نمود سے یہ دنیا مراد ہے ۔ اقبالؔ نے ان دو لفظوں میں اس دنیا کی حقیقت بھی واضح کر دی ہے ۔

(۱) غمکدہ اس لئے کہا کہ یہاں ہر شخص جس قدر زیادہ دنیا میں منہمک ہوتا ہے اسی قدر زیادہ غمگین ۔ رنجیدہ اور پریشان ہوتا ہے ۔ جس کا جی چاہے تجربہ کر کے دیکھ لے ۔

(۲) نمود اس لئے کہا کہ اس دنیا کی کوئی حقیقت نہیں ہے ۔ یہ صرف نظر آتی ہے ۔ نمود کے لفظی معنی ہیں نمائش یا دکھاوا یا ظہور ۔ دنیا صرف دکھائی دیتی ہے ۔ در اصل موجود نہیں ہے ۔ اس نکتہ کو قبل ازیں واضح کر چکا ہوں ۔

شرط دوام بمعنی ابدی زندگی حاصل کرنے کی شرط ۔ بادہ سے عشق رسولؐ یا اسلامی انقلاب برپا کرنے کا جذبہ مراد ہے ۔ بادہ ہے نیم رس ابھی ۔ ابھی شراب میں نشہ کی کیفیت پورے طور سے پیدا نہیں ہوئی ہے ۔ شوق ہے نارسا ابھی ۔ ابھی عشق میں پختگی کا رنگ

پیدا نہیں ہوا ہے۔ مصرع کا مطلب یہ ہے کہ ابھی ملت اسلامیہ ہندیہ کے افراد کے اندر اسلامی انقلاب برپا کرنے کی صلاحیت پیدا نہیں ہوئی ہے خُم بمعنی مٹکا شراب کا مراد ہے ملت اسلامیہ یا علی گڑھ کالج کے مسلمان طلبہ خشت کلیسا بمعنی گرجہ کی اینٹ، مراد ہے (۱) انگریز پرنسپل) یا (۲) انگریزی حکومت یا (۳) انگریزی تعلیم و تربیت یا کافرانہ نظام تعلیم۔

تبصرہ: یہ نظم اقبالؔ نے ۱۹۰۷ء میں لکھی تھی۔ اس میں خصوصیت یہ ہے کہ انھوں نے پہلی مرتبہ اپنی قوم کے نوجوانوں سے خطاب کیا ہے اور انھیں وہ پیغام دیا ہے جو ان کی شاعری اور اُن کے فلسفہ کی ساری کائنات ہے یعنی عشق رسولؐ کا پیغام۔ اسی بات نے انھیں مسلمانوں کی آنکھ کا تارا بنا دیا اور ان کے کلام کو سندِ دوام عطا کردی واضح ہو کہ ۱۹۰۷ء کا زمانہ ہندوستان میں علی العموم اور بنگال میں علی الخصوص سیاسی شورش کا زمانہ تھا، چونکہ مسلمانان ہند کے سامنے کوئی نصب العین نہیں تھا اور ان کے گمراہ ہو جانے کا قوی اندیشہ تھا اس لئے اقبالؔ نے قوم کے نوجوانوں کو عشق اور عمل کا پیغام دیا۔ اس نظم میں ہمیں ان تصورات کا ابتدائی نقش نظر آتا ہے جنھوں نے آگے چل کر ایک منظم فلسفۂ زندگی کی صورت اختیار کرلی۔ بالفاظ دگر اس نظم میں وہ چنگاریاں پوشیدہ ہیں جو کچھ عرصہ کے بعد شعلہ بن گئیں۔

اس نظم کا مفہوم پہلے شعر میں پوشیدہ ہے یعنی اگر پہلے شعر کا مطلب سمجھ لیا جائے تو ساری نظم کا مطلب سمجھ میں آجائے گا۔ کہتے ہیں کہ اربابِ عقل، قوم کو یہ تلقین کرتے ہیں کہ عقل کی پیروی کرو، لیکن میں یہ کہتا ہوں کہ عشق کا اتباع کرو۔ بالفاظ دگر اس نظم میں عقل اور عشق کا موازنہ پیش کیا ہے۔ یہ اقبالؔ کا وہ محبوب موضوع ہے جسے انھوں نے پیام مشرق سے لے کر ارمغانِ حجاز تک ہر کتاب میں بیان کیا ہے یعنی عقل پر عشق کی برتری۔ اب سوال یہ ہے کہ مسلکِ عقل اور مسلکِ عشق میں کیا فرق ہے؟ اس کا

جواب تو بہت تفصیل طلب ہے مختصراً یوں سمجھ لیجئے کہ مسلکِ عقل سے شریعت کے ظاہری پہلو کی اتباع مراد ہے اور مسلکِ عشق میں ظاہری پہلو کے علاوہ باطنی پہلو کی اتباع بھی شامل ہے۔ اس کو ایک مثال سے واضح کرتا ہوں۔

مثلاً زید، شریعت کے ظاہری ارکان۔ نماز، روزہ، زکواۃ اور حج پہ پابندی کیساتھ عمل کرتا ہے تو ارباب عقل (اوروں) کے نزدیک وہ اسلام کے تمام تقاضوں کو پورا کر رہا ہے یہ طبقہ زید سے کسی مزید عمل کا مطالبہ نہیں کرتا لیکن ارباب عشق کے نزدیک ابھی زید کا ایمان برنقص ہے وہ یہ کہتے ہیں کہ زید حقیقی معنی میں اس وقت مسلمان ہو گا جب اس کے اندر سرکار دو عالم صلی اللہ وسلم کے نام پر سر کٹانے کا جذبہ پیدا ہو جائے

اُردو کے شاعرِ یکتا اور ملتِ اسلامیہ کے نامور فرزند حضرت مولانا ظفر علی خاں صاحب قبلہ نے اسی نکتہ کو یوں بیان کیا ہے: ؎

نماز اچھی حج اچھا روزہ اچھا اور زکواۃ اچھی ! مگر میں باوجود اس کے مسلماں ہو نہیں سکتا
نہ جب تک کٹ مروں میں خواجۂ یثرب کی عزت پر خدا شاہد ہے کامل میرا ایماں ہو نہیں سکتا

خلاصۂ کلام یہ ہے کہ مسلکِ عشق کی رو سے مسلمان کا ایمان، اس وقت کامل ہو سکتا ہے جب وہ عشق رسولؐ میں سرشار ہو کر اپنا تن، من اور دھن سب کچھ سرکارِ دو عالم صلی اللہ علیہ وسلم کی بارگاہ میں نذر کر دے۔

ایک شخص پانچوں وقت کی نماز پڑھتا ہے اور رمضان کے تیسوں۳۰ روزے رکھتا ہے ہر سال زکوٰۃ ادا کر دیتا ہے۔ اور بشرطِ استطاعت فریضۂ حج بھی بجا لاتا ہے۔ لیکن جب اسلام کے نام پہ سر کٹانے کا موقع آتا ہے تو بڑی خاموشی کے ساتھ گھر کا دروازہ بند کر کے بیٹھ جاتا ہے۔ اقبالؔ کی اصطلاح میں یہ شخص مسلکِ عقل پر گامزن ہے کیونکہ عقل اُسے سمجھاتی ہے کہ اگر تو مارا گیا تو پھر تیرے بیوی بچے برباد ہو جائیں گے۔

اقبالؔ کہتے ہیں کہ اس کے بجائے مسلکِ عشق اختیار کرو، جو یہ کہتا ہے کہ کچھ پروا نہیں اگر تیرے بیوی بچے برباد ہو جائیں اور تیرا سارا گھر لٹ جائے اور مقصدِ حیات، زندہ

فرزند نہیں بلکہ اسلام ہے۔ اس کی حفاظت اور بقا کے لئے بے خطر میدان جہاد میں سر کٹا دے۔

(۱) اوروں یعنی عقل کے منشاء پر چلنے والوں کی تلقین اور ہے: جو یہ ہے کہ دنیا میں خوب ترقی حاصل کرو، دولت حاصل کرو، عہدے حاصل کرو، خطابات حاصل کرو، لیکن میں کچھ اور کہتا ہوں یعنی عقل والوں کے مسلک کے خلاف مسلکِ عشق اختیار کرنے کی تلقین کرتا ہوں اور عشق سے میری مراد عشقِ رسولؐ ہے جس میں مسلمانوں کو نہ سرکار سے خطابات ملیں گے نہ جاگیریں ملیں گی نہ عہدے ملیں گے اور نہ دولت ملے گی بلکہ جو کچھ پاس ہے اُسے بھی خدا اور رسولؐ کی راہ میں خرچ کر دینا ہوگا۔ ورنہ ایمان کامل نہ ہوگا۔

(۲) اے نوجوانو! تم اپنی قوم کے محکوم اور غلام رہنماؤں کی تقریریں تو بہت سُن چکے ہو، اب ذرا ایک مومن کا پیام بھی سُن لو۔ دوسرا مطلب یہ ہو سکتا ہے کہ مردِ مومن کا پیغام غلام کے پیغام سے مختلف ہے۔

(۳) عیش پسند، عافیت کوش اور کاہل افراد یہ کہتے ہیں کہ، سکون (بے عملی) ہی انسانی زندگی کا مقصد ہے۔ لیکن چیونٹی کی طرح جدوجہد کرنے والے اس کے خلاف یہ تلقین کرتے ہیں کہ زندگی کا لطف جدوجہد اور کوشش میں پوشیدہ ہے۔

(۴) ملّتِ اسلامیہ کی ساری عزت عشقِ رسولؐ پر منحصر ہے۔ اگر افرادِ قوم کے دل میں عشقِ رسولؐ کا جذبہ کارفرما ہوگا تو قوم کو فروغ حاصل ہوگا۔ اے نوجوانو! عشقِ رسولؐ کا مقام بہت بلند ہے۔ اور عشق انسان کی زندگی میں بہت بلند پایہ نظام پیدا کر دیتا ہے عشق کا مقام اور اس کا قائم کردہ نظام دنیا کی ہر شئے سے اعلیٰ اور ارفع ہے۔

(۵) اگر کسی شخص کے دل میں ذوقِ طلب نہ ہو یعنی عشقِ رسولؐ کا جذبہ موجزن نہ ہو تو اس کا انجام فنا ہے۔ وہ شخص کبھی حیاتِ ابدی حاصل نہیں کر سکتا۔ یاد رکھو! گردشِ جام یعنی عیش و عشرت اور گردشِ آدمی یعنی جذبۂ محبتِ رسولؐ دونوں میں زمین و آسمان کا فرق ہے۔ یاد رکھو کہ شراب کی مستی کو عشقِ رسولؐ کی مستی سے کوئی نسبت نہیں ہے۔

اگرچہ مستی دونوں جگہ موجود ہے۔

(۶) صبح ہوتے شمع نے اپنے ختم ہونے سے پہلے یہ نکتہ بیان کیا کہ اے اہلِ محفل! اگر زندگی کو کامیاب بنانا چاہتے ہو تو دل میں سوز پیدا کرو۔ کیونکہ سازِ حیات سوز وگداز پر موقوف ہے۔ جب تک عشق اختیار نہ کرو گے (سوز عشق کا لازمی نتیجہ ہے) تم مقصدِ حیات میں کامیاب نہیں ہو سکتے۔ یاد رکھو اس دنیا میں جو غمکدۂ نمود سے زیادہ حقیقت نہیں رکھتی۔ شرطِ دوام صرف یہ ہے کہ آدمی عشق (رسولؐ) اختیار کرے۔ اس کے بغیر اُسے ہمیشگی کی زندگی کبھی حاصل نہیں ہو سکتی۔

(۷) اے نوجوانو! تمہاری شراب (خواہش انقلاب) ابھی پختہ نہیں ہوئی ہے۔ اور تمہارا جذبۂ شوق (عشق رسولؐ) بھی ابھی مرتبۂ کمال کو نہیں پہونچا ہے لیعنی ابھی تمہارے اندر اسلامی انقلاب برپا کرنے کی صلاحیت پیدا نہیں ہوئی ہے۔ اسلئے مصلحتاً تم ابھی کچھ عرصہ کیلئے اپنے کارنج کا نظم ونسق انگریز پرنسپل (انگریزی حکومت) ہی کے ہاتھ میں رکھو۔

اخترِ صبح

حل لغات اور شرح مشکلات: ملی نگاہ۔ شاعر نے ستارۂ صبح (ایک خاص ستارہ کا نام ہے جو بہت روشن ہوتا ہے) کی روشنی کو نگاہ سے تعبیر کیا ہے۔ فرصتِ نظر نہ ملی یعنی صورت حال یہ ہے کہ یہ ستارہ آخر شب یعنی ۴ بجے طلوع ہوتا ہے۔ اور صبح کے وقت جب آفتاب طلوع ہوتا ہے تو اس کی روشنی نور آفتاب میں گُم ہو جاتی ہے۔ مطلب اس بند کا یہ ہے کہ ستارۂ صبح کی زندگی بہت مختصر ہوتی ہے۔ بساط کیا ہے؟ یہاں بساط سے مراد طاقت یا حیثیت ہے۔ یعنی ستارۂ صبح کی کوئی حقیقت نہیں ہے بس یوں سمجھو جیسے پانی کا بلبلہ یا شرارے کی چمک، زیورِ جبینِ سحر، صبح کی پیشانی کا زیور۔ سحر کو دلہن فرض کر کے، ستارۂ صبح کو اس کی پیشانی کا زیور قرار دیا ہے۔

اس نظم کا مطلب یہ ہے کہ اگر کسی کو غیر فانی ہونے کی آرزو ہو تو شیوۂ محبت اختیار کرلے۔ اس کے ثبوت میں اقبالؔ خود اپنے کلام کو پیش کرتے ہیں اور کہتے ہیں کہ عشق نے میرے کلام کی بنیاد مثلِ ابد پائیدار کردی ہے۔

حسن و عشق

حل لغات اور شرح مشکلات: پہلا بند، تشبیہہ مسلسل کی بہت عمدہ مثال ہے کشتیٔ سیمیں۔ قمر۔ چاند کی چاندی کی کشتی یعنی چاند۔ نور خورشید کے طوفان میں، یعنی سورج کی روشنی میں۔ مہتاب کا ہمرنگ۔ واضح ہو کہ کنول کا پھول چاند کی طرح سفید ہوتا ہے۔ جلوۂ طور سے اللہ کی صفات کی تجلّی مراد ہے۔ جیسکے سامنے حضرت موسیٰؑ کے ہاتھ کی سفیدی (ید بیضا) کی کوئی حقیقت نہیں ہے شمیم۔ بمعنی خوشبو۔

پہلے بند کا مطلب یہ ہے کہ جس طرح سورج کی روشنی کے سامنے چاند کی۔ اور چاند کی روشنی کے سامنے کنول کی۔ اور جلوۂ طور کے سامنے یدِ بیضا کی اور باغ کی خوشبو کے سامنے کلی کی کوئی حقیقت نہیں ہے، اسی طرح تیرے سیلِ محبّت کے سامنے میرے دل کی کوئی حقیقت نہیں ہے یعنی اسقدر حسین وجمیل ہے کہ تیری ایک نگاہ مجھے دیوانہ بنا دینے کے لئے کافی ہے۔

تو جو محفل ہے یعنی تیری ذات مرکز عشاق ہے۔ ہنگامۂ محفل ہوں میں یعنی میرے دم سے تیری محفل کی رونق وابستہ ہے۔ اگر عاشق نہ ہو تو معشوق کی محفل سونی ہو جائے گی حسن کی برق ہے تو، چونکہ معشوق عاشق کے دل کو جلاتا ہے اس لئے شاعر نے محبوب کو برق سے تشبیہہ دی ہے۔ عشق کا حاصل ہوں میں یعنی با لحاظ عشق بازی مرتبۂ کمال پر پہنچا ہوا ہوں۔ تو سحر ہے تو میرے اشک ہیں شبنم تیری یعنی عاشق کی ذات معشوق کے حسن کو درجۂ کمال تک پہنچاتی ہے۔ مثلاً اگر معشوق کو "سحر" قرار دیا جائے تو سحر کے لئے شبنم ضروری ہے۔ اگر شبنم نہ ہو تو سحر کا وجود کیسے ثابت ہوگا؟ پس جس طرح شبنم سحر کا تکملہ ہے

اسی طرح عاشق معشوق کے لئے باعث تکمیلِ ذات ہے۔ عاشق نہ ہو تو معشوق کا وجود کیسے ثابت ہوگا؟

دوسرے بند کا مطلب یہ ہے کہ اگر تو اپنے حُسن میں بے نظیر ہے تو میں اپنے عشق میں بے مثال ہوں۔ اگر تیرا کوئی ثانی نہیں ہے تو میرا بھی کوئی ثانی نہیں ہے ہرے باغِ سخن کے لئے تو بادِ بہار یعنی تیری محبت میرے دل میں بہترین شاعرانہ خیالات پیدا کرتی ہے۔ واضح ہو کہ عشق شعر و شاعری کے لئے سب سے بڑا محرک ہے میرے بیتاب تخیل کو دیا تو نے قرار یعنی تیری ذات میرے دل کی تسکین کا موجب ہے۔ نئے جوہر ہوئے پیدا مرے آئینہ میں۔ یعنی میرے دل میں اچھوتے خیالات پیدا ہونے لگے حُسن سے عشق کی فطرت کو ہے تحریک کمال یعنی ذاتِ محبوب، عشق کو درجۂ کمال تک پہنچاتی ہے۔ اگر محبوب کی توجہ عاشق پر مبذول نہ ہو، یا بدرجۂ اقل، اگر محبوب کی ذات موجبِ تسکینِ قلبِ عاشق نہ ہو تو عشق مرتبۂ کمال کو نہیں پہنچ سکتا۔ نہال یعنی پودا۔ قافلہ ہو گیا آسودۂ منزل میرا یعنی تیری ذات میرے لئے باعثِ تسکین ہے۔

اس بند میں شاعر نے یہ بتایا ہے کہ معشوق کی ذات عاشق کے مخفی جوہروں (صلاحیتوں) کو اُبھارتی ہے اور اُس کو مرتبۂ کمال تک پہنچاتی ہے۔

" واضح ہو کہ یہ نظم خالص رومانی شاعری کی مثال ہے اور اقبالؔ نے اس میں محبت کی جو خوبیاں بیان کی ہیں وہ شیلےؔ اور کیٹسؔ کے خیالات سے بہت ملتی جلتی ہیں جیسا کہ سب جانتے ہیں شیلےؔ (SHELLEY) کے نزدیک محبت ہی بنیادِ کائنات ہے۔ اجزائے کائنات کا ربطِ باہمی اسی جذبۂ محبت پر موقوف ہے بالفاظِ دگر اجزائے کائنات کی وابستگی کا دوسرا نام محبت ہے۔ جس کے بغیر اس کائنات کا وجود ناممکن ہے اور انسانی زندگی ہر قسم کے کیف و سرور سے معرا ہو جائے گی جو شئے انسانیت کو میکانیت (MECHANISM) سے جدا کرتی ہے۔ وہ یہی محبت تو ہے اگر

محبت نہ ہو تو پھر انسان اور مشین میں کیا فرق ہے؟

..... کی گود میں بلّی دیکھ کر

حل لغات اور شرح مشکلات: دزدیدہ نگاہی۔ یہ طرز دید۔ محبت کے آغاز کا ثبوت ہے۔ یعنی جب کوئی لڑکی کسی لڑکے سے محبت شروع کرتی ہے تو اس کی ابتدا اس طرح ہوتی ہے کہ وہ اُسے چُھپ چُھپ کر دیکھتی ہے اور جب وہ اس کی طرف دیکھتا ہے تو فوراً آنکھیں چرا لیتی ہے یعنی دوسری طرف دیکھنے لگتی ہے۔ رمز، بمعنی طرز یا طریقہ، نیلی آنکھوں سے۔ یہ ترکیب اقبال قوتِ مشاہدہ پر دلالت کرتی ہے، ذکاوت، یعنی دانائی، عقلمندی۔ نور آگاہی سے روشن تیری پہچان ہے کیا؟ اس مصرع کا مطلب یہ ہے کہ باطنی شعور کی بدولت تجھ میں حُسن کی معرفت پیدا ہو گئی ہے۔ یعنی فطرت نے تجھے یہ صلاحیت عطا کر دی ہے کہ تو حسین اشیاء کو پہچان لیتی ہے۔ چڑ، بمعنی۔ نفرت۔ اتاریں گے۔ یہ غلط ہے اس کی جگہ "اتاریں گی" ہونا چاہیے تجسس، بمعنی تلاش۔ آہ! کیا تو بھی اسی چیز کی سودائی ہے؟ یعنی کیا تجھے بھی "ان" سے محبت ہے؟ حسن کا احساس، انسان سے خاص نہیں ہے، یعنی دنیا میں ہر ذی روح کے دل میں حسن کا احساس پایا جاتا ہے۔ شیشۂ دہر میں مانند مئے ناب ہے عشق یعنی عشق کا جذبہ دُنیا کی ہر شئے میں پوشیدہ ہے۔ خونِ رگ مہتاب ہے عشق یعنی جذبۂ عشق چاند کی رگوں میں بھی دوڑ رہا ہے یعنی سورج، چاند، گوہر، اشک، شبنم، غرضکہ دنیا کی ہر شئے میں اس کی جھلک پائی جاتی ہے۔ اس نظم کا خلاصہ یہ ہے کہ محبت وہ فطری جذبہ ہے کہ جو ہر ذی روح میں پایا جائے

کلی

حل لغات اور شرح مشکلات: جب دکھاتی ہے سحر۔ یعنی جب صبح ہوتی ہے

کھول دیتی ہے کلی یعنی کلی شگفتہ ہو کر پھول بن جاتی ہے۔ سینۂ زریں کلی کے اندر زرد رنگ کا مادہ جمع ہوتا ہے جسے عرفِ عام میں پھول کا زیرہ کہتے ہیں، اس کی وجہ سے اقبالؔ نے کلی کے وسطہ کو سینۂ زریں (سنہرا) سے تعبیر کیا ہے۔ جلوہ آشام لغوی معنی جلوہ پینے والا۔ مراد ہے طالب، جلوۂ خورشید۔ اقبالؔ میخانہ کی رعایت سے آشام کا لفظ لائے ہیں۔ خورشید کے پیمانہ میں یعنی کلی کی شگفتگی، آفتاب کی روشنی پر موقوف ہے۔ سینہ شگافی کے مزے لیتی ہے۔ یہ شاعرانہ اندازِ بیان ہے۔ مطلب یہ ہے کہ کلی آفتاب پر شیدا ہے، کیوں کہ اس کی شگفتگی اور تازگی سب اس کی روشنی پر موقوف ہے میرے خورشید یعنی اے میرے محبوب! طرب اندوزِ حیات یعنی میرا دل زندگی کی مسرت سے لبریز ہو جائے گا۔ جوہر اندیشہ بمعنی اندیشہ یا قوت متفکرہ۔ شعرا عموماً اندیشہ کو "جوہر" سے تشبیہہ دیا کرتے ہیں کیونکہ جوہر وہ ہے جو بذات خود قائم ہو۔ اور قوت متفکرہ بھی بذات خود قائم ہے غالبؔ کہتے ہیں ؎

عرض کیجئے جوہر اندیشہ کی گرمی کہاں
کچھ خیال آیا تھا وحشت کا کہ صحرا جل گیا

ہو عیاں جوہر اندیشہ میں پھر سوزِ حیات۔ یعنی اگر محبوب اپنی نقاب اٹھا کر، شاعر کو اپنا جمال دکھا دے تو اس کا دل خوشی سے لبریز ہو جائے گا۔ اور اس کی روح میں پھر زندگی کا سوز پیدا ہو جائے گا۔ "جان مضطر کی حقیقت کو نمایاں کر دوں۔" بہت عمدہ مصرع ہے کیونکہ جان مضطر کی حقیقت کو نمایاں کرتا ہے وہ اس طرح کہ عاشق کی جان مضطر کی حقیقت اس کے سوا اور کیا ہے کہ وہ ہر وقت محبوب کا نظارہ کرتی رہے۔ دل کے پوشیدہ خیالوں کو عریاں کر دوں یعنی اپنے جذباتِ عشق کا اظہار کر دوں۔ لیکن ان سب باتوں کے لئے محبوب کا نظارہ شرطِ اولین ہے۔ اس نظم کا خلاصہ یہ ہے کہ اقبالؔ اپنے محبوب سے خطاب کرتے ہیں کہ جس طرح کلی کی شگفتگی

آفتاب پر موقوف ہے۔ اسی طرح میرے دل کی شگفتگی تیری نگاہِ التفات پر منحصر ہے

چاند اور تارے

حل لغات اور شرح مشکلات: دم سحر سے۔ سحر کی پھونک سے یعنی سحر سے، مطلب یہ ہے کہ سحر کا وجود، تاروں کے حق میں پیامِ موت ہے، اس لئے وہ دمِ سحر سے ڈرتے ہیں۔ بیتاب ہے یعنی متحرک ہے۔ نہیں ہے یعنی دنیا میں سکون کہیں موجود نہیں ہے ستم کش سفر۔ یعنی کائنات کی ہر شئے ہر وقت سفر میں ہے۔

ہر شئے مسافر، ہر چیز راہی کیا چاند تارے کیا مرغ و ماہی

مزرعِ شب کے خوشہ چینو۔ لغوی معنی رات کی کھیتی سے بالیاں چننے والو شاعر نے رات کو مزرع قرار دے کر تاروں کو خوشہ چیں باندھا ہے یعنی تارے رات ہی میں چمکتے ہیں۔ ان کی زندگی رات پر منحصر ہے۔ اشہب زمانہ زمانہ کا گھوڑا یعنی زمانہ۔ طلب کا تازیانہ لغوی معنی جب زمانہ کے گھوڑے پر خواہش کا کوڑا پڑتا ہے تو وہ تیز دوڑتا ہے۔ مطلب یہ ہے کہ دنیا میں ہر شئے کو کسی نہ کسی شئے کی طلب ہے اور یہ طلب ہر شخص کو عمل پر آمادہ کرتی ہے اور عمل، حرکت کے بغیر ناممکن ہے ”مقام بے محل ہے“۔ یعنی اس دنیا میں سکون و مقام خلاف مصلحت ہے قرار بمعنی سکون۔ واضح ہو کہ اقبالؔ کے یہاں حرکت میں زندگی ہے اور سکون میں موت ہے۔ انھوں نے اپنی ساری تصانیف میں اسی حقیقت کو مختلف طریقوں سے واضح کیا ہے۔ چلنے والے نکل گئے ہیں۔ یعنی جدوجہد کرنے والے کامیاب ہو جاتے ہیں اور جو لوگ بے عمل ہیں وہ فنا ہو جاتے ہیں انجام ہے اس خرام کا حسن۔ یعنی جدوجہد کا نتیجہ یہ نکلتا ہے کہ انسان کے اندر کمال (حسن) پیدا ہوتا ہے۔ پس جو شخص مرتبۂ کمال حاصل کرنا چاہے اُسے لازم ہے کہ اپنے نصب العین سے

عشق اختیار کرے۔ عشق انسان کو کامیابی سے ہمکنار کر دیتا ہے۔

تبصرہ: بظاہر یہ بہت آسان نظم ہے لیکن اس میں اقبال نے رمز و کنایہ کے پردے میں اپنا فلسفہ بیان کیا ہے جس کا خلاصہ یہ ہے کہ زندگی سراپا عمل اور جد و جہد کا نام ہے۔ عمل پیہم اور سعیِ مسلسل یہ زندگی اور ترقی کے لوازم ہیں۔

عمل زندگی ہے۔ سکون، موت ہے یعنی جو قومیں مصروفِ عمل ہیں وہ ترقی کرتی ہیں اور جو قومیں بے عمل ہیں وہ فنا ہو جاتی ہیں۔ جب کوئی قوم جد و جہد اور عمل سے بیگانہ ہو جاتی ہے۔ تو وہ دوسری قوم کی غلام ہو جاتی ہے۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ بے عملی سے اجتماعی احساس فنا ہو جاتا ہے اور جب یہ جوہر فنا ہو جاتا ہے تو ہر فردِ ملّت کی بقا سے غافل ہو کر اپنی انفرادی بقا کے لئے کوشش کرتا ہے اور وہ اس حقیقت سے بیگانہ ہو جاتا ہے کہ ع "فرد قائم ربطِ ملت سے ہے تنہا کچھ نہیں" اس کا لازمی نتیجہ یہ نکلتا ہے کہ ہر فرد اپنی جگہ فنا ہو جاتا ہے یعنی قوم کی ہستی کا چراغ گل ہو جاتا ہے ہندی مسلمانوں کی گذشتہ تاریخ اس تلخ حقیقت پر شاہد ہے۔ اسی لئے قرآن حکیم نے جہاد اور عمل صالح کو کامیابی کی شرط قرار دیا ہے۔ چونکہ اقبال کا فلسفہ جس کو فلسفۂ خودی یا فلسفۂ عمل یا فلسفۂ فقر کہتے ہیں۔ سراسر قرآن حکیم سے ماخوذ ہے۔ اس لئے اُن کے یہاں بانگِ درا سے ارمغانِ حجاز تک ہر کتاب میں جہاد اور عمل ہی کا پیغام نظر آتا ہے۔ اس نظم کا خلاصہ یہ ہے کہ زندگی حرکت (عمل) پر موقوف ہے۔

وصال

حلِّ لغات اور شرحِ مشکلات: گل سے شاعر کا محبوب مراد ہے بلبل۔ گل کی رعایت سے ہمدم یا دوست کے لئے، بلبل کا لفظ استعمال کیا ہے۔ چمن والوں سے حلقۂ احباب مراد ہے۔ رنگین نوا۔ خوش الحان۔ ارتکابِ جرمِ الفت۔ کنایہ ہے

ہم آغوشی سے۔ نامرادی بمعنی ناکامی۔ محفل گل۔ کنایہ ہے معشوق کی مجلس سے آئینہ دارِ شب دیجور۔

میری صبح کالی رات کی طرح سیاہ تھی۔ آئینہ دار بمعنی وہ کنیز جو کسی بیگم کو آئینہ دکھائے۔ مراد یہ ہے کہ میری صبح کالی رات کی خادمہ تھی یعنی اسی کی طرح سیاہ تھی مطلب یہ ہے کہ میں ناکام تھا۔ از نفس در سینۂ خوں گشتہ الخ مطلب یہ ہے کہ چونکہ میں نامراد اور ناکام تھا اور مایوسیوں کا شکار تھا۔ اس لئے ہر نفس یعنی ہر سانس جو میرے خون سے لبریز سینہ کے اندر جاتی تھی، وہ سانس وہاں جا کر نشتر کا کام کرتی تھی۔ اگرچہ بظاہر میں خاموش تھا۔ لیکن میرے دل میں قیامت کا ہنگامہ پوشیدہ تھا۔

تاثر کا جہاں یعنی عاشقانہ زندگی۔ کھیلتے ہیں بجلیوں کے ساتھ یعنی میرے نالوں میں غضب کی گرمی ہے۔ یا یہ کہ میرے نالوں میں بجلی کی کیفیت پیدا ہو گئی ہے۔ غازۂ الفت سے الخ مطلب یہ ہے کہ محبت نے میرے جسم کو مادیت اور کثافت سے پاک کر کے منور کر دیا ہے۔ آئینہ میں عکس ہمدم الخ یعنی میرے وجود میں محبوب سما گیا ہے قید میں آیا یعنی جب میں نے عشق اختیا کیا تو بظاہر میں عشق کی قید میں آ گیا۔ لیکن بباطن مجھے تمام دنیا کی قیود سے آزادی حاصل ہو گئی۔ دل کے لٹ جانے سے الخ۔ جب کوئی شخص عشق حقیقی اختیار کرتا ہے تو بظاہر اس کا دل تباہ ہو جاتا ہے۔ لیکن دراصل الخ اسے سارے جہان کی دولت حاصل ہو جاتی ہے۔ ضو سے اُس خورشید کی الخ۔ خورشید سے محبت بھی مراد ہو سکتی ہے اور ذات محبوب بھی۔

اختر مرا تابندہ ہے۔ یعنی میری زندگی کامیاب ہے یا اس کا مطلب یہ ہے کہ میں اس عورت سے محبت کرتا ہوں جو اس قدر حسین ہے کہ اس کی راہ کا غبار بھی چاندنی سے زیادہ دلکش ہے۔ اے خنک روزے الخ مطلب یہ ہے کہ

اے محبوب! تو نے مجھ پر ایک نظر ڈالی اور ایک ہی نظر میں مجھے محبّت کے رموز و نکات سے آگاہ کر دیا۔ اور ایسا گرویدہ بنا لیا کہ اب قیامت تک تیری محبت کا اثر زائل نہیں ہو سکتا، کس قدر مبارک تھا وہ دن تو نے میرے جسم کو اپنی محبت کی آگ میں جلا کر خاک سیاہ کر دیا۔

تبصرہ: اقبال نے یہ نظم ۱۹۰۸ء کے آغاز میں بمقام میونخ (MUNICH) واقع ملک جرمنی لکھی تھی۔ جہاں سے انھوں نے فلسفہ میں پی، ایچ ڈی کی ڈگری حاصل کی۔ اس میں خالص تغزل کا رنگ پایا جاتا ہے۔ شاعر نے بڑے دل کش انداز میں واردات عاشقی کا بیان کیا ہے اور یہ بتایا ہے کہ لوگ جسے قید سمجھتے ہیں عاشق اس کو آزادی سمجھتا ہے۔ لوگ جسے بربادی کہتے ہیں عاشق کی نگاہ میں وہ سراسر آبادی ہے۔ الفت کے غازے میں یہ تاثیر ہے کہ خاک سیاہ آئینہ ہو جاتی ہے یعنی محبت عاشق کو مادیات سے بالاتر کر دیتی ہے۔

سلیمیٰ

حل لغات اور شرح مشکلات: نمود لغوی ظہور مراد ہے، نظیر، شبیہہ، یا نمونہ چشم ستارہ بیں۔ مراد ہے ماہر فلکیات یا ہیئت دان صوفی نے جس کو دل کے الخ مراد ہے خدا کی قدرت کا جلوہ، جو صوفی کو اپنے دل میں نظر آتا ہے۔ قدرت کا بانکپن یعنی قدرت (NATURA) کی کاری گری۔ مثلاً تتلی کے بازو۔ ہویدا بمعنی ظاہر، واضح ہو کہ جس کی چمک ہے پیدا جس کی مہک الخ اس شعر میں صنعتِ لف و نشر مرتب ہے۔ یعنی اس کی نثر یوں ہوگی جس کی چمک شبنم کے موتیوں میں پیدا ہے اور جس کی مہک پھولوں کے پیرہن میں ہویدا ہے؟ صحرا کو ہے بسایا الخ شاعر کو صحرا کی خاموشی میں بھی حُسن نظر آتا ہے۔ ہنگامہ جس کے دم سے الخ یعنی باغ میں جو کچھ حُسن نظر آتا ہے یہ سب فطرت کی کرشمہ سازی ہے۔ ہر شے میں ہے نمایاں الخ

مطلب یہ ہے کہ فطرت کا حسن وجمال کائنات کی ہر شئے میں نظر آتا ہے۔ لیکن اس حسن وجمال کا کمال محبوبہ کی آنکھوں میں نظر آتا ہے۔

اس نظم میں شاعر نے کمال خوبی کے ساتھ اپنی محبوبہ کی آنکھوں کی دلکشی کو بیان کیا ہے۔ خلاصہ یہ ہے کہ دنیا کی کوئی حسین شئے محبوبہ کی آنکھوں کی دلکشی کا مقابلہ نہیں کر سکتی۔ واضح ہو کہ اقبال نے اس نظم میں بہت بڑی حقیقت کا اظہار کیا ہے۔ بلاشبہ دنیا کی کوئی شئے دلکشی میں آنکھ کا مقابلہ نہیں کر سکتی۔

عاشقِ ہرجائی

حل لغات اور شرح مشکلات: مجموعۂ اضداد۔ اضداد جمع ہے ضد کی۔ لفظ ضد کو مثالوں سے سمجھ سکتے ہیں جیسے زندگی ضد ہے موت کی۔ حادث ضد ہے قدیم کی۔ مجموعۂ اضداد سے مراد یہ ہے کہ اقبال کی طبیعت میں متضاد باتیں جمع ہو گئی ہیں مثلاً وہ رونق محفل بھی ہے اور تنہا بھی ہے۔ زینتِ گلشن بھی ہے، آرائش صحرا بھی ہے زمین فرسا بھی ہے فلک پیما بھی ہے۔ رفعتِ پرواز سے بلندی تخیل مراد ہے زمین فرسا لغوی معنی زمین گھسنے والا مراد ہے زمین پر چلنے والا۔ فلک پیما۔ لغوی معنی آسمان ناپنے والا مراد ہے۔ وہ شخص جس کے خیالات بہت بلند ہوں۔ رنگ مشرب مینا، یعنی شراب نوشی کا انداز یا طریقہ۔ حکمت آفریں یعنی فلسفی۔ لیکن تجھے سودا بھی ہے یعنی فلسفی (عقلمند) ہونے کے باوجود، تو کچھ بیوقوف بھی ہے۔ یہاں سودا سے حماقت مراد ہے۔ جانبِ منزل رواں۔ یعنی تو سرگرم عمل ہے اُفتادۂ رہ رواں کی ضد ہے یعنی ساکن۔ حُسنِ نسوانی ہے بجلی۔ یعنی عورتوں کے حُسن سے متاثر ہو جاتا ہے۔ تیر اعشق بے پروا بھی ہے یعنی تو ان کی طرف مائل نہیں ہوتا۔ ہستی سے یہاں زندگی مراد ہے۔ آئینِ تفنّن۔ تفریح یا دل لگی کا انداز۔ تفنن کا مادہ فن ہے۔ اس کے لغوی معنی

ہیں مختلف النوع ہونا۔ یہاں ہنسی دل لگی مراد ہے۔ شعر کا مطلب یہ ہے کہ تیری عاشقی میں دل لگی کا رنگ نظر آتا ہے۔ آج ہندہ پر مائل ہے کل سعدیٰ پر۔ ایک آستانہ جبیں فرسا الخ مراد یہ ہے کہ تو کسی ایک محبوب سے مستقل طور پر محبت نہیں کرتا۔ آستانہ کنایہ ہے، ذاتِ محبوب سے۔ تلوّن کیش۔ وہ شخص جس کا مذہب ہی تلوّن (رنگ بدلنا) ہو جیسے ایک طریقہ برقرار نہ ہو وہی مطلب ہے جو اوپر بیان ہو چکا۔ یعنی تو عاشق ہر جائی ہے۔

آشفتگی، پریشانی، یہ عشق کا لازمہ ہے۔ مشتِ خاک سے عاشق کی شخصیت مراد ہے۔ مجازی معنی جسم کے ہیں۔ زیر قبا۔ پیراہن کے اندر مطلب یہ ہے کہ عشق کی آشفتگی نے میری شخصیت میں غیر محدودیت کی شان پیدا کر دی ہے۔ صحرا کنایہ ہے وسعت سے۔ ہیرا کنایہ قلب عاشق سے۔ ترشا ہوا۔ ہیرے کی قدر و قیمت اس کی تراش پر موقوف ہے۔ جس طرح ہیرے کے بہت سے پہلو ہوتے ہیں اسی طرح دل پر ہزاروں کیفیات طاری ہوتی رہتی ہیں۔ چنانچہ اگلے مصرعہ میں اقبالؔ نے خود شرح کر دی ہے کہ دل نہیں شاعر کا، ہے کیفیتوں کی رستخیز۔ رستخیز بمعنی ہنگامہ۔ بے نیازی سے ہے پیدا الخ مطلب یہ ہے کہ میں حُسنِ مقید (وہ افراد جن میں حُسنِ مطلق کی جھلک پائی جاتی ہے) سے چونکہ بے نیاز ہوں، اس لئے بے نیازی کی بدولت میری فطرت میں حُسنِ مطلق (ذاتِ خداوندی) کی آرزو (رنگ نیاز) پیدا ہو گئی۔ اس آرزو سے میرے اندر نیاز (طلب یا احتیاج) کا رنگ پیدا ہو گیا اس لئے میں ہر وقت اُس حُسنِ مطلق کی جستجو کرتا رہتا ہوں۔ موجب تسکین تماشائے الخ اس کی تشریح یوں ہو گی۔ "تماشائے شرار جستہ، موجب تسکین نہیں ہو سکتا" تماشائے شرارِ جستہ۔ لغوی معنی ہیں اُس چنگاری کا نظارہ جو آگ سے نکلتی ہے، اور ایک لمحہ میں فنا ہو جاتی ہے۔ کنایہ ہے محبوب کے حُسن فانی سے۔ دل برق آشنا رکھتا ہوں برق کنایہ ہے حُسنِ مطلق سے جسے فنا نہ ہو۔ مطلب یہ ہے کہ میرا دل فانی حسینوں پر مائل نہیں ہے۔ بلکہ میں حُسن مطلق کا طالب ہوں۔ ہر تقاضا عشق کی فطرت کا الخ

یعنی میں اس تجلّی کامل کا آرزو مند ہوں جس سے عشق کے تمام تقاضوں (خواہشوں) کی تسلّی ہو سکے تجلّی سے حسنِ مطلق (ذاتِ خداوندی) مراد ہے۔ ابرار سے وہ حسین افراد مراد ہیں جن میں اس حسنِ مطلق کا جلوہ نظر آتا ہے "حسنِ بے پایاں، درد لادوا رکھتا ہوں میں" بہت بلیغ مصرعہ ہے بلکہ ساری نظم کی جان ہے۔ شاعر کہتا ہے کہ میں بلحاظِ ذات محدود ہوں، اور حسنِ مطلق بلحاظ ذات غیر محدود (بے پایاں) ہے اس کے باوجود میں اس ذاتِ غیر محدود کو حاصل کرنا چاہتا ہوں اور یہ ناممکن ہے کہ محدود، غیر محدود تک پہنچ جائے یا اُسے اپنے اندر جذب کرلے۔ اس لئے میرا درد لادوا ہے۔ اقبالؔ کے نزدیک رازِ حیات اسی نکتہ میں مضمر ہے کہ انسان غیر محدود کو حاصل کرنے کی مسلسل کوشش کی جائے۔ مقصد میں کامیابی ہو یا نہ ہو انسان کو اس عشق کی بدولت حیاتِ ابدی حاصل ہو جائے گی۔ انھوں نے اسی نکتہ کو اگلی نظم میں وضاحت کے ساتھ بیان کیا ہے جس کا عنوان ہی "کوششِ ناتمام" ہے اور فلسفہ اس نظم کے آخری شعر میں لکھ دیا ہے ؎

رازِ حیات پوچھ لے خضرِ خجستہ گام سے
زندہ ہر ایک چیز ہے کوششِ ناتمام سے

اقبالؔ کہتے ہیں کہ ابدی زندگی کے لئے پہلی شرط یہ ہے کہ عاشق اپنے معشوق سے واصل نہ ہو۔ اگر وصل ہو گیا تو جدوجہد ختم ہو جائے گی۔ اور جب یہ ختم ہو گئی تو زندگی ختم ہو گئی یعنی عاشق پر فنا وارد ہو جائے گی۔ اس مضمون کو انھوں نے پیامِ مشرق میں یوں بیان کیا ہے ؎

تو نہ شناسی ہنوز شوق بمیرد ز وصل
چیست حیاتِ دوام؟ سوختنِ ناتمام

یعنی اے مخاطب! تو ابھی تک اس نکتہ سے واقف نہیں ہوا ہے کہ وصل عشق کے لئے پیامِ موت ہے۔ ہمیشہ کی زندگی کیا ہے؟ مسلسل جلتے رہنا۔ چونکہ یہ شعر

فلسفۂ اقبال کے بنیادی تصوّر کا حامل ہے۔ اس لئے میں نے اس کی قدرے وضاحت کردی ہے۔ یہ مضمون اقبال کی ہر تصنیف میں پایا جاتا ہے۔

زندگی الفت کی درد انجامیوں سے ہے الخ یعنی میری عاشقی میں وصل کا باب کہیں نہیں ہے۔ وہ تو سراسر درد فراق سے لبریز ہے۔ عشق کو آزاد دستور وفا الخ یعنی میں کسی حسن مقیّد (کسی خاص محبوب) کا پابند نہیں ہو سکتا۔ کیونکہ میں تو ہر مقیّد میں حسنِ مطلق کو تلاش کرتا ہوں۔ اور مطلق کہیں ملتا نہیں، اس لئے میں کسی مقیّد سے پیمان وفا نہیں باندھ سکتا۔ سچ اگر پوچھئے تو افلاس تخیّل ہے الخ اے مخاطب! اگر تو سچ پوچھے تو کسی عاشق کا، کسی خاص محبوب (حسن مقید) سے پیمان وفا باندھنا اس بات کی دلیل ہے کہ وہ قوت متخیلہ کی دولت سے محروم ہے۔ اس کی تفصیل یہ ہے کہ اگر کوئی شخص مثلاً سعدیؔ سے محبت کرتا ہے اور اس کے علاوہ کسی دوسرے محبوب کی طرف متوجہ نہیں ہوتا یا کسی اور کی تلاش نہیں کرتا تو اس کے معنی یہ ہیں کہ اس کے ذہن (تخیّل) میں یہ بات کبھی نہیں آتی کہ جس محبوب سے میں نے پیمان وفا باندھا ہے ممکن ہے دنیا میں اُس سے خوب تر محبوب بھی کہیں موجود ہو۔ مطلب یہ ہے کہ حُسن مقید (خاص محبوب) پر قناعت کر لینا دلیل ہے اس بات کی کہ عاشق حُسن مطلق کے تخیّل سے بالکل محروم ہے فیضِ ساقی شبنم آسا الخ یعنی شاعر کہتا ہے کہ صورتِ حال یہ ہے کہ میرا دل تو دریا (حُسن مطلق) کا طالب ہے اور ساقی (خدا) کا فیض شبنم (حُسن مقید) سے زیادہ نہیں ہے اس لئے میں ہر وقت پیاسا (جویا) رہتا ہوں۔ آتش زیر پا، یعنی بے قرار نقش ہوں اپنے مصور سے گلہ الخ مطلب یہ ہے کہ خدا نے مجھے پیدا تو کیا محدود طاقتوں کے ساتھ اور غیر محدود کے حصول کی آرزو محدود دل میں رکھدی۔ اس لئے مجھے بجا طور پر اپنے مصوّر (خدا) سے شکایت ہے۔ محفل ہستی میں جب ایسا الخ مطلب یہ ہے کہ سابقہ مضمون کو ماند از دگر باندھا ہے۔ یعنی جب دُنیا میں حُسن مطلق کہیں نظر نہیں آتا ہر جگہ حُسن مقید

ہی پایا جاتا ہے تو میں بجا طور پر یہ سوال کر سکتا ہوں کہ پھر خدا نے مجھے غیر محدود تخیل کیوں عطا کر دیا؟ یعنی حُسنِ مطلق (ذاتِ غیر محدود) کے حصول کی آرزو کیوں دل میں رکھدی؟
تنک جلوہ وہ حُسن جس کا جلوہ چند روزہ ہو یعنی فانی ہو۔ تنک قلیل کے معنی میں آتا ہے
در بیاباں طلب پیوستہ الخ ہم عاشقی کے میدان میں مسلسل کوشش کرتے رہتے ہیں لیکن کامیاب نہیں ہوتے۔ کیونکہ کامیابی کے بعد جدوجہد ختم ہو جائے گی اس لئے ہماری حالت سمندر کی موجوں کی سی ہے کہ قعرِ دریا سے بلند ہوتی ہے اور ساحل سے ٹکراتی ہیں۔ اور ان کا یہ سلسلہ کبھی ختم نہیں ہوتا۔ جس طرح "شکست" موجوں کی ذات میں داخل ہے۔ اسی طرح ناکامی ہم محدود انسانوں کی ذات میں داخل ہے۔ محدود عاشق، غیر محدود معشوق کو بھلا کیسے اندر جذب کر سکتا ہے؟ ہاں یہ ضرور ہے کہ وہ اس "سوختنِ ناتمام" یا کوششِ ناتمام کی بدولت حیاتِ ابدی حاصل کر سکتا ہے۔ اور یہی انسانی زندگی کا مقصود ہے۔ اور یہی اقبال کے فلسفہ کا خلاصہ ہے، جس کی تشریح میں اُنھوں نے ساری عمر بسر کر دی۔

تبصرہ: یہ نظم اس لحاظ سے بہت غور طلب ہے کہ اس میں اقبال نے فطرتِ انسانی کی ترجمانی کی ہے۔ انسان کی فطرت کا تقاضا یہ ہے کہ وہ "غیر محدود" کو جسے صوفیا "حُسنِ مطلق" سے تعبیر کرتے ہیں اپنے اندر سمو لینا یا جذب کر لینا چاہتا ہے۔ عاشقی کی اصطلاح میں یوں کہتے ہیں کہ عاشق یہ چاہتا ہے کہ معشوق اس کے اندر سما جائے یہ چاہت اُسے ہر وقت مثلِ صبا، مصروفِ جستجو رکھتی ہے اس سعیٔ پیہم سے وہ اپنے محبوب سے قریب تر ہوتا چلا جاتا ہے۔ یعنی تصوف کی اصطلاح میں اس کے اندر محبوب کا رنگ پیدا ہو جاتا ہے۔ جب اس رنگ میں شدت پیدا ہو جاتی ہے تو عاشق بھی "زمان و مکان" سے بالاتر ہو جاتا ہے کیونکہ غیر محدود کی بنیادی صفت یہ ہے کہ وہ زمان و مکان کی قید سے بالاتر ہوتا ہے چونکہ محدود کبھی غیر محدود نہیں ہو سکتا

اس لئے عاشق کی جدو جہد کبھی ختم نہیں ہو سکتی اس کا نتیجہ یہ نکلتا ہے کہ عشق میں بھی شان ابدیت پیدا ہو جاتی ہے یعنی اسے حیاتِ دوام کی نعمت حاصل ہو جاتی ہے اور یہ سب کچھ عشق کی بدولت ممکن ہو سکتا ہے پس عشق ہی طبیب ہے، عشق ہی خضر ہے عشق ہی رہنما ہے عشق ہی سب کچھ ہے عشق ہی فانی کو غیر فانی اور مقید کو مطلق اور محدود کو غیر محدود بنا سکتا ہے بایں معنی کہ اس میں بھی غیر محدودیت کا رنگ پیدا ہو جاتا ہے۔ جس طرح لوہا کچھ عرصہ تک آگ میں رہے تو اگرچہ وہ آگ نہیں ہو جاتا لیکن اس میں آگ کے خواص ضرور پیدا ہو جاتے ہیں۔

میں نے چند لفظوں میں اقبالؒ کا سارا فلسفہ طلبہ اور اساتذہ دونوں کے لئے قلمبند کر دیا ہے۔ اب اتنی صراحت اور کر دوں کا یہ فلسفہ قرآن مجید کی اس آیت سے ماخوذ ہے۔ صِبْغَةَ اللّٰهِ وَمَنْ اَحْسَنُ مِنَ اللّٰهِ صِبْغَةً ط
یعنی اے مسلمانو! دنیا والوں سے کہہ دو کہ ہم نے تو اپنے آپ کو اللہ کے رنگ میں رنگین کر لیا ہے اور سچ تو یہ ہے کہ) اللہ کے رنگ سے بہتر اور خوب تر کس کا اور کون سا رنگ ہو سکتا ہے؟ میں اس مختصر شرح میں اس آیت کی تفسیر تو لکھ نہیں سکتا صرف اتنا اشارہ کافی ہے کہ عشق کے بغیر کوئی مسلمان اپنے آپ کو اللہ کے رنگ میں رنگین نہیں کر سکتا۔ اس جگہ یہ سوال پیدا ہوگا کہ عشق کس سے کیا جائے؟ اس کا جواب یہ ہے کہ اس ذات سے جسے خود خدا نے "مقامِ محمود پر فائز کیا ہو" اس ذات سے جس کی شان میں خود خدا نے یہ فرمایا ہو!

قُلْ اِنْ كُنْتُمْ تُحِبُّوْنَ اللّٰهَ فَاتَّبِعُوْنِيْ يُحْبِبْكُمُ اللّٰهُ

اے رسولؐ! آپ مسلمانوں سے فرما دیجئے کہ اگر تم لوگ اللہ سے محبت کرنا چاہتے ہو تو میری اتباع کرو۔ یعنی مجھ سے محبت کرو (کیونکہ اتباعِ رسولؐ عشقِ رسولؐ کے بغیر ناممکن ہے) اس کا نتیجہ یہ ہوگا کہ اللہ خود تم سے محبت کرنے لگے گا۔ اسی لئے

اقبالؔ نے عشقِ رسولؐ کو اپنے فلسفہ کا سنگِ بنیاد قرار دیا۔ اور ساری عمر قوم کو اسی عشق رسولؐ کا درس دیا۔ اب میں ناظرین کی سہولت کے لئے اقبالؔ کے فلسفہ کا خلاصہ درج کئے دیتا ہوں۔

(۱) انسان کی فطرت کا تقاضہ یہ ہے کہ وہ غیر محدود کو اپنے اندر جذب کر لینا چاہتا ہے۔ ہر شخص (جو حیوانات کی سطح سے بالا تر ہے) اپنے دل کی گہرائیوں میں یہ آرزو پوشیدہ رکھتا ہے۔

(۲) یہ بات اُسی وقت کسی حد تک ممکن ہو سکتی ہے جب انسان، زمان و مکان کی قیود سے بالاتر ہو جائے۔

(۳) یہ صفت انسان میں اُسی وقت پیدا ہو سکتی ہے جب وہ عشق اختیار کر لے کیونکہ کائنات میں صرف عشق ہی وہ طاقت ہے جو انسان کے اندر غیر محدودیت کی شان پیدا کر سکتی ہے۔

(۴) عشق اس ذات سے کرنا انسب ہے جو سب حسینوں کی سرتاج ہو بلکہ صاف لفظوں میں کیوں نہ کہہ دوں کہ عشق اُس سے کرنا چاہیے جس پر خود خدا عاشق ہو۔ بقول اقبالؔ

پھڑک اٹھا کوئی تیری ادائے مَاعَرَفْنَا پر
ترا رتبہ رہا بڑھ چڑھ کے سب ناز آفرینوں میں

کوششِ ناتمام

حل لغات اور شرح مشکلات: فرقتِ آفتاب میں الخ یعنی صبح، اپنے وجود کے لئے طلوع آفتاب کی محتاج ہے۔ اس لئے آفتاب کے لئے کوشاں رہتی ہے۔ چشم شفق اضافت بیانی ہے یعنی شفق خوں فشاں ہے یعنی آرزو مند ہے۔ اختر شام اور اختر صبح۔ یہ دونوں خاص ستارے ہیں۔ ایک شام کو طلوع ہوتا ہے دوسرا صبح کو قطب آسماں۔ وہ تارہ

جو اپنی جگہ سے حرکت نہیں کرتا (خطب از جامی جنید) سوتوں کی ندیوں کا شوق یعنی نالے ندیوں میں گرنے کے لئے بیتاب ہیں۔ اور ندیاں سمندر میں گرنے کے لئے تیزی کے ساتھ بہتی چلی جارہی ہیں۔ موجہ بحر کو تپش الخ۔ سمندر چاند سے ملنے کے لئے مضطرب ہے۔ حُسنِ ازل یعنی حُسنِ مطلق بھی اپنا جلوہ دکھانے کے لئے بے قرار ہے۔ خجستہ گام یعنی مبارک قدم زندہ ہر ایک چیز ہے الخ یعنی زندگی مسلسل کوشش پر موقوف ہے اگر حرکت ختم ہو جائے تو زندگی بھی ختم ہو جائے گی۔ اس چھوٹی سی نظم میں اقبال نے قوم کو عمل (جدو جہد) کا پیغام دیا ہے۔ جو دراصل قرآنِ حکیم کی تعلیمات کا خلاصہ ہے۔ اس کتابِ مقدس نے متعدد مقامات پر اس حقیقت کا اثبات کیا ہے کہ ایمان بغیر عمل بالکل بیکار، بلکہ مردہ ہے۔ اسی لئے ہر جگہ ایمان کے ساتھ عملِ صالح کی قید لگی ہوئی ہے

نوائے غم

حل لغات اور شرح مشکلات: رباب۔ ایک مشہور ساز ہے۔ آغوش سے خود رباب کا وجود، یعنی رباب مراد ہے جس کے اندر نغمے پوشیدہ ہوتے ہیں۔ بربط بھی ایک مشہور ساز ہے۔ بربطِ کون و مکاں یعنی ساری کائنات۔ نغموں کے مزار یعنی سینکڑوں نغمے پوشیدہ ہیں۔ محشرستان۔ جائے حشر۔ مراد ہے وہ جگہ جہاں زبردست ہنگامہ بپا ہو محشرستانِ نوا۔ آوازوں یا شور و غل یا آہ و فریاد کا ہنگامہ۔ منت کش ہنگامہ یعنی ہنگامہ کا ممنون کرم۔ نسیمِ چمنِ طور یعنی طور کے باغ کی ہوا۔ ہوائے نفسِ حور، کی سانس کی خوشبو۔ اشک کے قافلہ کو بانگ درا الخ یعنی مجھ پر نا امیدی کا عالم طاری ہو جاتا ہے اور آنکھوں سے آنسو بہنے لگتے ہیں۔ رفعتِ شبنم ہے مذاقِ رم سے الخ یعنی شبنم کی بلندی موقوف ہے اس بات پر کہ اس میں رمیدن (زمین سے اُڑ کر آسمان کی طرف جانے کی خو (عادت) پائی جاتی ہے۔

تبصرہ: اس نظم میں شاعر نے یہ حقیقت واضح کی ہے کہ غمِ آشنائی یا کیفیتِ سوز و گداز بلندی فطرت کی دلیل ہے۔ یہ غمِ آشنائی، اقبال کے کلام میں نمایاں حیثیت رکھتی ہے جیسا کہ اس شعر کی شرح میں بیان کر چکا ہوں۔

پیرِ مغاں! فرنگ کی مے کا نشاط ہے اثر!
اس میں وہ کیفِ غم نہیں مجھ کو تو خانہ ساز دے

یہاں "کیفِ غم" سے وہی نوائے غم مراد ہے جو اس نظم کا عنوان ہے۔ یہ غمِ آشنائی عاشق کی خصوصیت ہوتی ہے کیونکہ عشق انسان کے اندر سوز و گداز کی صفت پیدا کر دیتا ہے۔ اس کا نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ انسان دنیا میں ہر غمزدہ کے غم میں شریک ہو جاتا ہے بالفاظِ دگر ہر وقت کسی نہ کسی کے غم میں مبتلا رہتا ہے۔ یہی کیفیت، انسانیت کا معیار ہے کیونکہ جو شخص کسی غمزدہ کے ساتھ غمگساری نہیں کر سکتا۔ اس میں اور حیوانات میں کوئی فرق نہیں ہے خلاصہ کلام یہ ہے کہ انسانی فطرت کی بلندی، غمِ آشنائی پر موقوف ہے۔ جو انسان غم سے آشنا نہیں ہے وہ زندگی کی حقیقت سے آشنا نہیں ہو سکتا۔

دوسرا مطلب یہ ہے کہ یہ دنیا بظاہر بہت حسین اور دلچسپ ہے لیکن دراصل یہاں ہر راحت میں رنج اور ہر شادی میں غم کا پہلو پوشیدہ ہے۔ اس لئے جو شخص غم آشنا نہ ہو، رنج کا خوگر نہ ہو، وہ نہ اس دنیا سے واقف ہو سکتا ہے اور نہ اپنی فطرت کی تکمیل کر سکتا ہے۔

عشرتِ امروز

حل لغات اور شرح مشکلات: اجل ہے پیامِ عیش و سرور۔ یعنی مجھ کو یہ نصیحت مت کرو۔ کہ مرنے کے بعد جنت میں عیش و عشرت کا سامان مہیا ہو گا۔ شراب طہور۔ جنت میں جو شراب ملے گی اس میں نشہ نہیں ہو گا، وہ ہر قسم کی برائی سے پاک ہو گی۔ اس لئے

اسے شرابِ طہور کہتے ہیں۔ پَری کو شیشے میں اُتارنا۔ یہ مشہور محاورہ ہے مطلب ہے کسی نازک مزاج شخص کو راضی کرنا۔ اس مصرعہ کا مطلب یہ ہے کہ محض لفظوں سے یا زبانی وعدوں سے کہ مرنے کے بعد جنّت میں حوریں ملیں گی۔ اپنے دل کو تسکین مت دو۔ سلسبیل یہ بھی جنّت میں ایک نہر ہے۔ مجھے کلام نہیں یعنی مجھے شک نہیں، یا اعتراض نہیں۔

تبصرہ: اقبالؔ نے اس نظم میں یہ نکتہ واضح کیا ہے کہ جوانی عشرتِ آئندہ کی امید پر زندہ نہیں رہ سکتی۔ اس کی فطرت یہ ہے کہ وہ عشرتِ امروز پر ایمان رکھتی ہے۔ بالفاظِ دگر جوان آدمی کی فطرت کا تقاضا یہ ہے کہ وہ حوروں کے انتظار میں اپنی جوانی بسر نہیں کر سکتا یہ سچ ہے کہ اقبالؔ نے اس حقیقت کو بڑے دلکش انداز میں بیان کیا ہے لیکن "ہم سخن فہم ہیں غالبؔ کے طرفدار نہیں" حق یہ ہے کہ ان کے اُستاد داغؔ نے جو بات ایک شعر میں بیان کر دی وہ شاگرد سے پوری نظم میں پیدا نہ ہو سکی آپ بھی سُن لیجئے

حوروں کا انتظار کرے کون حشر تک!
مٹی کی بھی بنے تو روا ہے شباب میں

راقم الحروف کی رائے میں یہی بات تو تھی جس نے اقبالؔ کو داغؔ کے لیئے یہ شعر لکھنے پر مجبور کر دیا:۔

نہ ہوگا کھینچے گا لیکن عشق کی تصویر کون؟
مر گیا ناوک فگن مارے گا دل پر تیر کون؟

انسان

حلِ لغات اور شرحِ مشکلات: رازجو بمعنی جویائے اسرارِ کائنات یعنی انسان دنیا کی حقیقت معلوم کرنے کا آرزومند ہے۔ اور یہ جذبہ اس کی فطرت میں داخل ہے۔ بیتاب ہے ذوقِ آگہی کا یعنی حقیقت سے آگاہ ہونے کے لئے بیقرار ہے لیکن جب تک ایک شخص

مسلکِ عشق اختیار نہ کرے کسی راز سے آگاہ نہیں ہو سکتا۔ حیرت آغاز و انتہا ہے یعنی فلسفہ کی ابتدا بھی حیرت سے ہوتی ہے اور انتہا بھی حیرت پر ہوتی ہے۔ یہ افلاطون کا مشہور قول ہے۔ جو فلسفہ کے ہر طالب علم کو معلوم ہے۔ چنانچہ پروفیسر میور ہیڈ (MUIR HEAD) نے اپنی کتاب علم الاخلاق اسی جملہ سے شروع کی ہے آئینہ کے گھر ہیں یعنی دنیا میں۔

مطلب: کہتے ہیں کہ قدرت (اللہ) کی کارفرمائی انسان کی سمجھ سے بالاتر ہے ایک طرف تو قدرت نے انسان کے اندر تحقیق کا اور جستجو کا مادہ رکھ دیا ہے یعنی وہ اپنی اور کائنات کی حقیقت سے آگاہ ہونا چاہتا ہے۔ دوسری طرف اس حقیقت کو اس سے پوشیدہ کر دیا ہے نتیجہ یہ نکلتا ہے کہ ہر فلسفی اپنی جگہ حیران نظر آتا ہے۔

گرم خرام، یعنی تیزی سے رواں ہے، جادہ پیما، لفظی معنی راستہ ناپنے والا مراد ہے چلنے والا۔ مستِ شرابِ تقدیر یعنی قانون قدرت کے پابند ہیں۔ زندانِ فلک ہیں پا بہ زنجیر یعنی اپنے مقررہ راستوں سے ہٹ نہیں سکتے۔ عابد سحر خیز۔ نماز کے لئے طلوع آفتاب سے پہلے اٹھنے والا۔ پیام بر خیز۔ جب صبح ہوتی ہے تو سب لوگ خواب سے بیدار ہو جاتے ہیں۔ پیتا ہے مئے شفق کا ساغر یہ شاعرانہ اسلوب بیان ہے مطلب یہ ہے کہ جب شام ہو جاتی ہے تو شفق پھولتی ہے۔ اس سرخی کو شاعر نے شراب سے تعبیر کیا ہے لذت گیر وجود ہر شئے، کائنات کی ہر شئے محض اپنے موجود ہونے کو غنیمت جانتی ہے، اور اپنے وجود ہی سے لذت حاصل کرتی ہے سرمست مے نمود ہر شئے۔ اس کا مطلب بھی یہی ہے کہ کائنات میں ہر شئے اپنی نمود اور اپنے ظہور ہی کو اپنی معراج سمجھتی ہے مثلاً غنچہ کی شگفتگی ہی اس کا مقصد حیات ہے۔ اس کے علاوہ اس کی ہستی کا اور کوئی مقصد نہیں ہے مطلب یہ ہے کہ کائنات میں ہر شئے، قوانین فطرت کی پابند ہے۔ مثلاً ندی، دریا میں جا کر ملجاتی ہے۔ دریا سمندر میں جا کر گرتا ہے۔ ہوا چلتی ہے تو بادل اڑتے چلے جاتے ہیں بعض ستارے اپنی جگہ سے حرکت اور بعض مقررہ راستوں سے سر مو تجاوز نہیں کر سکتے۔ آفتاب

صبح کو طلوع ہوتا ہے، شام کو غروب ہو جاتا ہے۔ کائنات میں ہر شئے محض موجود ہونے پر مطمئن ہے۔ اس سے زیادہ اور کچھ نہیں چاہتی، لیکن حضرت انسان کا حال، دنیا کی تمام اشیا سے مختلف ہے۔ وہ اپنی اور کائنات کی حقیقت معلوم کرنی چاہتا ہے۔ اور اس معاملہ میں کائنات کی کوئی شئے اس کی غمگسار یا اس تحقیق میں اس کی شریک حال نہیں ہے۔ اسلئے انسان کی زندگی، سراپا پیچ و تاب اور سوز و اضطراب ہے۔

خلاصہ کلام یہ ہے کہ کائنات میں ہر شئے، اپنی شخصیت کو نمایاں کرنا چاہتی ہے اور اس نمود ہی کو اپنی ہستی کا مقصد سمجھتی ہے۔ لیکن انسان اس سے بالاتر مقصد کے حصول میں منہمک ہے۔ وہ یہ کہ وہ اپنی اور اس کائنات کی حقیقت معلوم کرنی چاہتا ہے

جلوۂ حُسن

تبصرہ: یہ نظم اقبال نے اس حقیقت کو واضح کرتے کے لئے لکھی ہے، کہ شباب میں ہر متمدن شخص اپنے تخیل کی دنیا کو ایسی حسینہ اور جمیلہ عورت کے تصور سے آباد کرتا ہے، جس کا ثانی دنیا میں ناممکن ہے۔ ہر نوجوان یہ چاہتا ہے کہ وہ ایسی عورت کو اپنی محبوبہ بنائے جو حُسن و جمال کے لحاظ سے ساری دنیا میں بے نظیر ہو، لیکن ایسا حُسن اس دنیا میں کہیں موجود نہیں ہے کیونکہ حسین ترین عورت سے بھی زیادہ خوبصورت عورت کا تصور ممکن ہے۔ چونکہ یہ نظم مسلسل ہے اس لئے میں پوری نظم کا مطلب یکجا لکھے دیتا ہوں:۔

کہتے ہیں کہ حسن میں یہ تاثیر ہے کہ انسان کے جذبات (نفسانی) میں تلاطم برپا ہو جاتا ہے، تمنائیں بیتاب ہو جاتی ہیں، اور آرزوئیں سینہ میں مچلنے لگتی ہیں عالم شباب میں ہر نوجوان اپنے تخیل کو ایک آئیڈیل حسینہ سے آباد کر لیتا ہے اس حسینہ کا عالم خارجی میں کہیں وجود نہیں ہوتا۔ صرف اس نوجوان کے ذہن میں

اس کا تصور ہوتا ہے۔

اس حسینہ کے تصور کی بدولت، ہر نوجوان کو یہ دنیا بہت پیاری معلوم ہونے لگتی ہے، چنانچہ وہ بھولے سے بھی موت کا تصور نہیں کرتا کیونکہ اس سے وہ اپنے آئیڈیل (اُس مثالی حسینہ) سے دور ہو جائے گا۔ اس فرضی حسینہ کے تصور میں انسان اس طرح کھو جاتا ہے کہ اُسے یہ محسوس ہونے لگتا ہے کہ یہ دنیا فانی نہیں ہے۔ بلکہ میں، میرا عشق، اور میری معشوقہ، یہ سب ہمیشہ اسی طرح سبزہ زار پر دریا کے کنارے، گلگشت میں مصروف رہیں گے۔ حُسن میں یہ طاقت ہے کہ انسان کے دماغ سے موت یا فنا کے تصور کو فنا کر دیتا ہے۔ عاشق اگر یہ سمجھ جائے کہ یہ عورت خواہ وہ لیلیٰ ہو یا عذرا۔ فانی ہے اور اس کا حُسن بقول شوپن ہاور وہ جال ہے جس میں فطرت نوجوانوں کو پھانسنا چاہتی ہے۔ تو پھر جذبۂ عشق معاً سرد پڑ جائے۔

ہر نوجوان اپنی مثالی محبوبہ کے تصور میں گھنٹوں سرگرداں بیٹھا رہتا ہے اور تصور میں اُس سے باتیں کرتا رہتا ہے۔ اور منظر عالم حاضر یعنی اپنی گرد و پیش کی دنیا سے بالکل بے خبر رہتا ہے۔ بلکہ کچھ عرصہ کے بعد مستقل طور پر بے خبر ہو جاتا ہے اس کا تجربہ جوانی میں ہر عورت اور ہر مرد کو ہو جاتا ہے۔

جلوۂ حُسن کا خاصہ یہ بھی ہے کہ عاشق کو بڑی سے بڑی قربانی کے لئے آمادہ کر دیتا ہے۔ اقبالؔ نے اس بات کو ادراک کی خامی کی دوری سے تعبیر کیا ہے۔ کیونکہ عاشق کے زاویۂ نگاہ سے ؎

عشق ہو مصلحت اندیش تو ہے خام ابھی

عام حالات میں عقل (ادراک) جذبات (تاثر) کی غلامی نہیں کرتی بلکہ معاملہ برعکس ہوتا ہے۔ عاشقی کی اصطلاح میں اسی کو ادراک کی خامی کہتے ہیں جب عاشق پر جلوۂ حُسن کی بدولت عشق کا غلبہ ہوتا ہے تو اس کی عقل اس کے

تاثرات (جذبات) کی غلام ہو جاتی ہے۔ اور جب یہ حالت پیدا ہو جاتی ہے تو عاشق اپنی جان پر کھیل جاتا ہے۔

لیکن افسوس کہ ایسا حسن جس کی بدولت یہ سب باتیں ممکن ہو جائیں تصور میں تو ممکن ہے لیکن خارج میں کہیں موجود نہیں ہے۔ کیونکہ دنیا میں ایک سے ایک بڑھ کر حسینہ موجود ہے۔ آپ جس عورت کو حسین ترین قرار دینگے ممکن ہے اس سے بھی زیادہ حسین عورت کسی گوشہ میں موجود ہو۔

مطلب یہ ہے کہ اگر کسی کو حُسن مطلق کی تلاش ہو، تو وہ دنیا کے کسی فرد میں نہیں مل سکتا۔ ایسا حُسن صرف خالقِ حسن کی ذات میں پایا جاتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ عقلمندوں نے کبھی فانی عورتوں سے دل نہیں لگایا، بلکہ اُس ذات پاک کو اپنا مقصود بنایا، جو سراپا حُسن ہے سراپا جمال ہے بلکہ منبع کمال ہے۔

نوٹ:۔ آخری مصرع فن کے لحاظ سے بہت لائق تحسین ہے۔ خاتم دہر یعنی دہر (دنیا) خاتم (انگوٹھی) کی رعایت سے نگیں کا لفظ لائے ہیں۔ نگیں بمعنی "قیمتی پتھر" مراد ہے "حسن" ۱۲۔

ایک شام

حل لغات: نوا فروش یعنی پرندے۔ سبز پوش یعنی درخت اور پودے مراقبہ تصوف کی اصطلاح ہے۔ سالک کا تصور ذات میں محو ہو جانا۔ یعنی گیان دھیان۔

تبصرہ: ماہ اگست ۱۹۰۷ء میں اقبال کچھ دنوں کے لئے میونخ یونیورسٹی سے ہائیڈل برگ (جرمنی) گئے تھے، تاکہ وہاں مزید علمی تحقیقات کر سکیں۔ یہ شہر اپنی یونیورسٹی اور لائبریری کی وجہ سے ساری دنیا میں مشہور ہے۔ دریائے نیکر (NECKAR) کے بائیں کنارے پر آباد ہے۔ یہاں کی یونیورسٹی ۱۳۸۵ء میں

قائم ہوئی تھی۔ اور اس کی لائبریری میں پانچ لاکھ سے زیادہ کتابیں موجود ہیں شہر کی آبادی ۴۸ ہزار ہے۔

اس زمانہ میں اقبال پر تصوف کا رنگ بہت غالب تھا۔ غالباً کسی دن شام کے وقت، وہ سیر کے لئے دریا کے کنارے گئے ہوں گے۔ وہاں جو کیفیت ان پر طاری ہوئی اُسے انہوں نے اس دلکش نظم میں بیان کیا ہے۔ اس نظم میں مشہور انگریزی شاعر ورڈسورتھ (WORDSWORTH) کا تخیل کارفرما ہے۔ وہی دلکش اور سادہ زبان، وہی فطرت کی عکاسی، اور وہی اندازِ بیان۔ اس نظم میں جذبات زبان اور تخیل تینوں باتوں نے مل جل کر عجیب دلکشی پیدا کر دی ہے۔ اس کو غور سے پڑھو تو یہ معلوم ہوتا ہے کہ شاعر نے اپنے آپ کو فطرت کی وسعتوں میں گم کر دیا ہے۔ فطرت کے ساتھ ایسی ہم آہنگی، اردو کی بہت کم نظموں میں نظر آسکتی ہے۔

شاعر کہتا ہے کہ اس وقت ہر شئے پر خاموشی اور سکون طاری ہے قمر کی چاندنی، درختوں کی شاخیں، وادی کے پرندے۔ پہاڑوں کے درخت، ستارے کوہ، صحرا، دریا، غرضکہ ساری فطرت خاموش ہے بلکہ یہ معلوم ہوتا ہے۔ کہ مراقبہ میں ہے۔

لیکن شاعر کا دل کسی کی یاد میں مضطرب ہے۔ اس لئے وہ اپنے دل سے کہتا ہے کہ اے دل! جب اس وقت ساری فطرت ساکن اور خاموش ہے تو مناسب ہے کہ تو بھی فطرت سے ہم آہنگ ہو جا۔ یعنی یادِ جاناں میں محو ہو جا۔ یہ آخری شعر اس ساری نظم کی جان ہے۔

تنہائی

حل لغات: حزیں بمعنی غمگین۔ نسترن زار۔ وہ جگہ جہاں سفید گلاب کے

پھول اُگے ہوئے ہوں۔ ہم نفس یعنی دوست۔

تبصرہ: یہ نظم بھی گذشتہ نظم سے ملتی جلتی ہے۔ کیونکہ اس میں بھی اقبالؔ نے فطرت کی عکاسی کی ہے۔ شاعر اپنے دل سے مخاطب ہو کر کہتا ہے۔ کہ تو رات کی تنہائی میں اس قدر رنجیدہ کیوں ہے؟ اگر اس وقت کوئی غمگسار یار از دار تیرے پاس نہیں ہے تو کیا ہوا؟ کیا تارے تیرے ہمنشین نہیں ہیں؟ (تاروں کو ہمنشین کہنا اقبالؔ کے تخیل کی بلندی پر شاہد ہے) ذرا آنکھ کھول کر فطرت کا مطالعہ کر! اس وقت آسمان، زمین، بلکہ سارا جہان خاموش ہے۔ فطرت کے مناظر دیکھ! چاند ستارے کوہ، صحرا، کس قدر حسین ہیں! ایسا معلوم ہوتا ہے کہ ساری فطرت گلشن بن گئی ہے اور ان سب مناظر فطرت سے بڑھ کر تیرے آنسو حسین ہیں! اگر تو غور سے دیکھے تو یہ آنسو موتیوں سے بھی زیادہ قیمتی ہیں۔ جب ساری فطرت تیری ہمدم اور ہمراز ہے تو پھر تو کیوں اس قدر افسردہ ہے؟

پیامِ عشق

حل لغات: سن اے طلب گارِ دردِ پہلو! یعنی عشق، عاشق سے خطاب کرتا ہے غزنوی۔ چونکہ شاعر نے دل کو سومنات قرار دیا ہے۔ اس لئے غزنوی کا لفظ لایا ہے۔ ایاز۔ سلطان محمود غزنوی کا مشہور غلام۔ ہلال سے شخصیت مراد ہے۔ دامن دراز۔ طلب میں شدت کا رنگ پیدا کر۔ آتش زنِ طلسمِ مجاز ہو جا یعنی انفرادی زندگی بسر کرنی چھوڑ دے۔ ہند کے فرقہ ساز سے ہندو قوم مراد ہے آذری کر رہے ہیں۔ یعنی تجھے بت پرستی کی طرف مائل کر رہے ہیں۔

تبصرہ: اس نظم میں اقبالؔ نے پہلی مرتبہ مسلمانوں کو عشق رسولؐ کا درس دیا ہے چنانچہ بطحا اور حجاز، یہ دو لفظ اس نظم کی جان ہیں۔ اسی مضمون کو آئندہ نظموں میں

اقبال نے وضاحت کے ساتھ بیان کیا ہے۔

(۱) مطلب یہ ہے کہ اگر عاشق، اپنے مقصد میں کامیاب ہونا چاہتا ہے تو پھر سراپا نیاز، یعنی معشوق کی مرضی میں فنا ہو جائے جس طرح ایاز، سلطان محمود، اپنے آقا کی مرضی میں فنا ہو گیا تھا۔

(۲) دنیا میں کمال حاصل کرنے کے لیئے، بادشاہ یا دولتمند ہونا ضروری نہیں ہے اگر ایک مفلس اور گمنام شخص کوشش کرے تو وہ بھی صاحب کمال بن سکتا ہے اسکی وجہ یہ ہے کہ کمال حاصل کرنے کے لیے دولت درکار نہیں ہے، بلکہ محبت بھرا دل درکار ہے۔ اور وہ ایک غریب آدمی کے سینہ میں بھی موجود ہے پس طالبِ کمال کو لازم ہے کہ اپنے دل کے آئینہ کو صیقل کر لے۔

(۳) دنیا میں پیکار اور کشمکش اس لیئے ہے کہ شخصیت انسانی، پیکار (جدوجہد پیہم) سے کمال حاصل کر سکتی ہے۔ اس لئے اے مسلمان! تو دنیا کی مشکلات سے پریشان مت ہو، بلکہ ہر حال میں اپنا فرض ادا کر۔

(۴) مسلمان کا فرض ہے کہ تھوڑی سی نیکی پر قناعت نہ کرے بلکہ ساری عمر نیکی (پھول) جمع کرتا رہے۔

(۵) اب وہ زمانہ نہیں کہ عاشق صحرا میں جا کر تنہائی میں زندگی بسر کرے موجودہ حالات کا تقاضا یہ ہے کہ قوم کی خدمت میں اپنی زندگی بسر کرو اور جس طرح شمع خود فنا ہو جاتی ہے، . . . . لیکن محفل کو منور کر دیتی ہے اسی طرح تم بھی اپنی زندگی قوم کو فائدہ پہنچانے میں بسر کر دو۔

(۶) یاد رکھو! افراد کا وجود مجازی ہے۔ قوم کا وجود حقیقی (اصلی) ہے یعنی افراد کی

ہستی اور عزت، قوم کی بقاء اور عزت پر منحصر ہے۔ اگر قوم ضعیف ہو گئی تو افراد کبھی طاقتور نہیں ہو سکتے۔ اسلئے ہر فرد کو لازم ہے کہ اپنی ہستی ملت میں فنا کر دے۔

(۷) اے اقبال! چونکہ کافر، مسلمانوں کو بُت پرستی کی طرف مائل کر رہے ہیں اور ان کی ہستی کو مٹا دینے پر تلے ہوئے ہیں، اس لئے کافر(ل) سے کسی نیکی کی امید مت رکھ ان سے قطع تعلق کر اور سرکار دو عالم صلعم کے عشق میں فنا ہو جا۔

فراق

حل لغات اور شرح مشکلات: عزلت۔ تنہائی شکستہ گیت۔ واضح ہو کہ جب کسی پہاڑی ندی کا پانی یکے بادیگرے پتھروں سے ٹکراتا ہے تو قدرتی طور پر وقفوں کے بعد آوازیں پیدا ہوتی ہیں۔ اس کو اقبال نے ٹوٹے ہوئے گیتوں سے تعبیر کیا ہے۔ دلبری، بمعنی دل کشی۔ دعائے طفلک گفتار آزما۔ اقبال نے شکستہ گیتوں کو اس بچہ کی دعا سے تشبیہہ دی ہے، جس نے ابھی بولنا سیکھا ہے اور اسلئے ٹوٹے پھوٹے الفاظ اس کے منہ سے نکلتے ہیں۔ تخت لعل شفق، یعنی شفق۔ جلوس اختر شام یعنی شام کے ستارے کا طلوع۔ بہشت دیدۂ بینا یعنی عقلمند آدمی کے لئے یہ منظر نہایت دل کش ہے۔ ناشکیبا بمعنی بیقرار۔ طفل صغیر چھوٹا بچہ۔ پیام شکیب، صبر کا پیغام۔

تبصرہ: اس نظم میں اقبال نے فراق کی کیفیت بیان کی ہے۔ اور یہ تخیل کی

بلندی کے ساتھ ساتھ، بلاغت اور فن شاعری کا کمال بھی نظر آتا ہے۔ کہتے ہیں کہ محبوب کی جدائی نے مجھے سرگرداں بنا دیا ہے۔ دنیا کی دلچسپیوں سے بیزار ہو کر، پہاڑ کے دامن میں گوشہ گیر ہو گیا ہوں۔ یہاں پہاڑی چشموں کی آوازوں میں جو وقفوں کے بعد پیدا ہوتی ہیں بڑی دل کشی پائی جاتی ہے۔ یہ معلوم ہوتا ہے کوئی بچہ اپنے ٹوٹے پھوٹے لفظوں میں دعا مانگ رہا ہے۔ شام کا وقت ہے شفق پھیلی ہوئی ہے۔ اور اختر شام اپنی چمک دکھا رہا ہے۔ یہ نظارہ نہایت دلفریب ہے۔ اس قدر دلفریب کہ کسی کی یاد دل میں اور بھی چٹکیاں لینے لگی۔

میری مثال اس چھوٹے بچہ کی سی ہے جو یا تکل تنہا ہو اور اندھیری رات میں گانا شروع کر دے۔ اور اپنی ناسمجھی کے باعث اپنی آواز کو غیر کی آواز سمجھے، اور اس طرح اپنے آپ کو اس فریب میں مبتلا کر دے کہ کوئی غمگسار موجود ہے، جو مجھے لوری دے رہا ہے یا میرا دل بہلا رہا ہے۔ اسی طرح میں بھی اپنے دل کو صبر کی تلقین کرتا ہوں، گویا اپنی شب فراق کو فریب دیتا ہوں۔

عبدالقادر کے نام

شرح مشکلات: افق خاور، مشرق مراد ہے۔ شعلہ نوائی۔ ایسا نغمہ جس سے سننے والوں کے دل پگھل جائیں۔ اجالا کر دیں، یعنی مشرقی اقوام کے دلوں کو گرما دیں۔ مانند سپند کے دانہ کی زندگی ایک لمحہ کی ہوتی ہے۔ وہ جب آگ میں ڈالا جاتا ہے تو چٹختا ہے اور ہمیشہ کے لئے خاموش ہو جاتا ہے۔ بساط کے لغوی معنی ہیں، وہ شئے جو بچھائی جائے مراد ہے ہستی صیقل بمعنی پالش۔ سنگِ امروز۔ آج کا پتھر، یعنی آج (کا دن)۔ آئینہ فردا۔ آنے والے کل کا آئینہ، یعنی یوم آئندہ۔ جلوہٴ یوسفِ گم گشتہ، یعنی مسلمانوں کی عظمتِ ماضی کی تفسیر تپش آمادہ تر یعنی زلیخا سے بھی زیادہ بیقرار۔ آئین نمو، یعنی بالیدگی کا قانون چمن سے مسلمان قوم مراد ہے۔ آئین نمو کا سبق یعنی جد وجہد کا درس (جو قرآنی تعلیمات

کی روح ہے ، قطرۂ شبنم بے مایہ سے مفلس اور کمزور مسلمان فرد مراد ہے ۔ بادۂ دیرینہ سے وہی اسلامی تعلیمات اور روایات مراد ہیں جن سے مسلمان بیگانہ ہو گئے ہیں ۔ داغ سے عشق رسول یا عشق اسلام مراد ہے ۔ وقف تماشا کر دیں یعنی مسلمانوں کو عشق رسول کا درس دیں ۔

تبصرہ : اقبال نے یہ بلیغ نظم ۱۹۰۸ء کے آغاز میں اپنے دوست اور ادب اردو کے محسن شیخ سر عبد القادر کے نام لکھی تھی ۔ جو ۱۹۰۷ء میں اُن کے ساتھ انگلستان ہی میں مقیم تھے شیخ صاحب مرحوم کا نام غایت شہرت کی بنا پر میرے تعارف کا محتاج نہیں ہے ۔ انہوں نے ۱۹۰۱ء میں اُردو زبان کی خدمت کا بیڑہ اٹھایا ۔ اور اپنی گوناگوں مصروفیات کے باوجود نصف صدی تک نہایت خلوص اور تندہی کے ساتھ اس کی ترویج و اشاعت میں کوشاں رہے ۔ ادب اُردو کے محسن کی حیثیت سے اُن کا نام ہماری قومی تاریخ میں ہمیشہ زندہ رہیگا شیخ صاحب میں بہت سی خوبیاں تھیں ، لیکن میں اُن کی دو خوبیوں سے ہمیشہ متاثر ہوا ۔ ایک تو یہ کہ وہ ہر شخص کی مدد کے لیے تیار رہتے تھے ۔ دوسری یہ کہ "اس زمانہ میں" اللہ پر اور اسکی مشیت پر ایمان رکھتے تھے ۔ جنوری ۱۹۵۰ء میں وفات پائی ۔ ع

حق مغفرت کرے عجب آزاد مرد تھا !

اس نظم میں اقبال نے اپنے دوست کو اپنے دلی ارادوں سے آگاہ کیا ہے اور اس نظم کی اہمیت جو کچھ ہے ، اسی بنا پر ہے کہ اس میں اقبال نے مسلمانوں کو اپنے مقصدِ حیات سے آگاہ کر دیا ، چنانچہ ان کی حیات ارضی کے باقی ماندہ تیس۳۰ سال اس بات پر شاہد ہیں کہ اُنہوں نے جو فیصلہ ۱۹۰۸ء میں کیا تھا مرتے دم تک اُس پر نہایت مضبوطی کے ساتھ قائم رہے ۔ واضح ہو کہ جو خیالات اقبال نے اس نظم میں ظاہر کئے ہیں ۔ اُن ہی کو وضاحت کے ساتھ خضر راہ اور طلوع اسلام میں پیش کیا ہے ۔

پہلا شعر : اپنے دوست کو مخاطب کر کے کہتے ہیں کہ ہمارے ملک ہندوستان

(یہ ۱۹۰۸ء کی نظم ہے) کہ مسلمانوں کی قومی حالت قابل اطمینان نہیں ہے۔ ان کا مستقبل تاریک نظر آتا ہے۔ اس لیے آؤ ہم تم مل کر اس تاریکی کو دور کر دیں، یعنی اپنی زندگی قوم کی خدمت میں بسر کرنے کا عزم کر لیں۔

دوسرا شعر: انسان کی زندگی بہت مختصر ہے۔ اور جدوجہد کا زمانہ چند سال سے زیادہ نہیں ہوتا۔ اس لئے ہمیں لازم ہے کہ اپنی زندگی قوم کو بیدار کرنے کے لئے وقف کر دیں اور اس کے لئے حتی المقدور کوشش کریں۔

تیسرا شعر: مسلمانوں کو عشقِ رسولؐ کا درس دیں، کیونکہ اس عشق کی بدولت ان میں یہ طاقت پیدا ہو جائے گی کہ وہ آئندہ زمانہ میں کامیاب ہو سکیں گے۔

چوتھا شعر: آؤ! ہم انہیں اُن کے بزرگوں کے کارنامے سنائیں تاکہ اُن کے اندر بھی انکے نقش قدم پر چلنے کی آرزو پیدا ہو۔

پانچواں شعر: آؤ! مسلمانوں کو جدوجہد کا سبق پڑھائیں اور اس حقیقت سے آگاہ کر دیں کہ دنیا میں جدوجہد کے بغیر کامیابی حاصل نہیں ہو سکتی۔ تاکہ وہ جو آج بے مایہ اور محکوم ہیں، آئندہ چل کر، سربلند اور کامیاب ہو سکیں۔

چھٹا شعر: آؤ! ہندوستان کے مسلمانوں کو غیر اسلامی (چینی) روایات تہذیب اور تمدن سے متنفر کر کے، عربی زبان، تہذیب اور روایات کا شیدا بنا دیں۔

ساتواں شعر: اس شعر میں تلمیح ہے اس بات کی طرف کہ ۱۹۰۸ء میں دمشق سے مدینہ منورہ تک ریل آگئی تھی، کہتے ہیں کہ دنیا میں ہر وقت انقلاب رونما ہوتا رہتا ہے چنانچہ دیکھ لو! مدینہ میں اونٹ بیکار ہو گئے۔ لہذا اب وقت آگیا ہے کہ مسلمان بھی اپنے اندر انقلاب پیدا کریں۔ یا کم از کم اس کے لئے تیاری کریں۔

آٹھواں شعر: ہمیں لازم ہے کہ مسلمانوں کو از سر نو حقائقِ اسلام (بادہ) سے روشناس کریں اور یہ کہ ان کے دلوں میں عشقِ رسولؐ کی آگ بھڑکائیں تاکہ وہ اپنا تن من اور دھن

سب اسلام کے نام پر قربان کر سکیں۔

نواں شعر: یورپ، بالخصوص انگلستان میں، جس عشق رسول صلعم نے ہم کو غیر اسلامی (کافرانہ) زندگی سے محفوظ رکھا، ہم کو لازم ہے کہ دنیا کو اس نعمت سے روشناس کر دیں یعنی تمام دنیا میں اسلام کا پیغام پہونچائیں۔

دسواں شعر: کاش ہم شمع سے سبق لے سکیں، اگرچہ وہ خود جل کر ختم ہو جاتی ہے لیکن دنیا والوں کو اپنے نور سے مستور کر دیتی ہے۔ اسی طرح ہم دوسرے دلوں کو اسلام کی نعمت سے مالامال کرنے کے لئے اپنی زندگی وقف کر دیں۔

گیارھواں شعر: شمع کے دل میں جو خیال بھی پیدا ہوتا ہے وہ اس کی زبان پر آجاتا ہے (آگیا میں) جلتا، خیال تو نہیں ہے جو دل میں پوشیدہ رہ سکے۔ مطلب یہ ہے کہ جس طرح شمع کا ظاہر و باطن یکساں ہوتا ہے۔ بایں معنی کہ جو اس کے اندر ہے وہ جل جل کر باہر آتا رہتا ہے حتیٰ کہ اس کا وجود ختم ہو جاتا ہے۔ اس طرح مسلمان کو چاہیئے کہ وہ اپنا ظاہر و باطن یکساں رکھے۔

صقلیہ

حل لغات اور شرح مشکلات: دیدۂ خونناب بار۔ خون کے آنسو برسانے والی آنکھ۔ تہذیب حجازی کا مزار۔ کنایہ ہے جزیرہ صقلیہ سے۔ کیونکہ اسے عربوں نے فتح کیا تھا۔ کھا گئی یعنی فنا کر دیا۔ عصر کہن سے قدیم ایرانی اور رومی سلطنت مراد ہے تیغ ناصبور۔ ایسی تلوار جو دشمنوں کو کاٹ کر ٹکڑے کر دینے کے لئے بیتاب ہو۔ —— قُم قُم کی آواز۔ قُم عربی لفظ ہے، امر کا صیغہ ہے، بمعنی اٹھ! مطلب یہ ہے کہ انھوں نے ملکوں اور قوموں کو اسلام کی بدولت زندہ کر دیا۔ توہم۔ یہاں اوہام پرستی اور شرک مراد ہے۔ جس میں دنیا کی اکثر اقوام ظہور اسلام کے وقت گرفتار تھیں۔ تیموں سے لائٹ ہاؤس

مراد ہیں، جو بندرگاہوں پر ملاحوں کی رہنمائی کے لئے نصب کئے جاتے ہیں۔ بحر پیما، یعنی ملاح۔ سبک سے مبارک مراد ہے۔ شیراز کا بلبل شیخ سعدی مراد ہیں جنہوں نے بغداد کی تباہی پر مرثیہ لکھا تھا۔ ابن بدرون، اندلس کا مشہور ادیب اور شاعر تھا جس نے غرناطہ کی تباہی پر مرثیہ لکھا تھا۔ آثار سے آثار قدیمہ یعنی پراتی عمارات مراد ہیں۔ ایام سلف۔ زمانہ گذشتہ۔

تبصرہ: یہ نظم اقبال نے جولائی ۱۹۰۸ء میں یورپ سے واپسی پر لکھی تھی اس کے مطالعہ سے ہمیں اس ذہنی انقلاب کا کچھ حال معلوم ہو سکتا ہے، جو سہ سالہ قیام یورپ کے دوران میں اُن کے اندر پیدا ہو چکا تھا۔ جزیرہ سسلی جسے عربی میں صقیلہ کہتے ہیں۔ اٹلی کے جنوب میں واقع ہے۔ اس کا رقبہ ۹۹۲۶ مربع میل ہے۔ آبادی ۴۰ لاکھ ہے۔ عربوں نے اس جزیرہ کو ۸۲۷ء میں فتح کیا تھا۔ اور ۱۰۷۲ء تک یہاں حکومت کی۔ تمام یورپین مورخین نے اعتراف کیا ہے کہ عربوں نے اپنے زمانہ حکومت میں اس جزیرہ کو تہذیب و تمدن اور علم و فضل اور صنعت و حرفت سے مالا مال کر دیا تھا۔ اقبال نے صقیلہ کو تہذیب حجازی کے مزار سے تعبیر کر کے، دو لفظوں میں عربوں کے عہد حکومت کی داستان قلمبند کر دی ہے۔

پہلا بند: کہتے ہیں کہ یہ جزیرہ مجھے اُس زمانہ کی یاد دلاتا ہے، جب یہاں عربوں کی حکومت تھی۔ وہ اپنے گرد و پیش کے تمام سمندروں پر قابض ہو گئے تھے دنیا کے تمام بادشاہ ان کے نام سے کانپتے تھے۔ انہوں نے دنیا کو اسلام کا پیغام دیا اور اس کی بدولت بنی آدم کو گمراہی اور اوہام پرستی کے غار سے باہر نکالا۔

<u>دوسرا بند</u>: اس بند میں اقبال نے جزیرہ سے خطاب کیا ہے کہ اے صقیلہ! تیری بدولت بحیرۂ روم کی عظمت کو چار چاند لگ گئے ہیں۔ تیرا وجود اس سمندر کے لیے باعث زینت ہے۔ میری دعا ہے کہ تیرا نظارہ ہر شخص کے لئے دلکشی کا

باعث ہو۔ اور تو اسی طرح اس سمندر کے وسط میں قائم رہے۔ چونکہ تو عربوں کی عظمتِ رفتہ کی ایک روشن یادگار ہے اس لئے میں تجھ سے محبت کرتا ہوں۔

تیسرے بند میں اقبالؔ نے یہ کہا ہے کہ جس طرح سعدی شیرازی نے زوالِ دولتِ عباسیہ پر، اور داغؔ نے زوال سلطنتِ مغلیہ پر اور ابنِ بدروں نے زوال دولت غرناطہ پر مرثئے لکھے اسی طرح میں تیری بربادی پر نوحہ خواں ہوں۔

نوٹ :۔ اردو زبان میں صقلیہ پر اقبالؔ کے علاوہ اور کسی شاعر نے کوئی نظم نہیں لکھی!!

چوتھے بند میں پھر جزیرہ سے خطاب کرتے ہیں کہ تیرے آثار قدیمہ میں عربوں کی داستان مندرج ہے۔ اور تیرا ساحل زبان حال سے کہہ رہا ہے کہ کبھی عرب فاتحین یہاں آکر خیمہ زن ہوئے تھے۔ اے صقلیہ! تو اپنے درد کی داستان مجھے سنا۔ کیونکہ میں تیرا ہمدرد ہوں۔ تو جس کارواں کی منزل رہ چکا ہے میں اسی کارواں کی گرد ہوں یعنی میں بھی اُن عربوں کا نام لیوا ہوں، جنہوں نے تجھے تہذیب و تمدن سے مالا مال کیا تھا میں چاہتا ہوں کہ تو مجھے اس زمانہ کی داستان سنائے جب عرب تجھ پر حکمراں تھے۔

اس نظم کے آخری بند میں اقبالؔ نے سوز و گداز کا ایسا رنگ بھر دیا ہے کہ لفظوں کے ذریعہ سے اس کا اظہار ناممکن ہے۔ ہر مصرع، اثر آفرینی کے لحاظ سے اپنی جگہ لائق ہزار تحسین ہے آخری شعر میں اقبالؔ نے جو بات کہی ہے اس کی صداقت پر کسی دلیل کی حاجت نہیں ہے۔ کون مسلمان ایسا ہوگا جو اس نظم کو پڑھے اور آبدیدہ نہ ہو جائے۔؟

غزلیات حصّہ دُوم

پہلی غزل

پہلا شعر: دم کے دو معنی ہیں (۱) دم بمعنی سانس (۲) دم بمعنی مختصر وقفہ مطلب یہ ہے کہ

انسان جس زندگی پر اس قدر ناز کرتا ہے، اس کی حقیقت دم سے سوا اور کچھ نہیں ہے اور یہ دم کیا ہے؟ صرف ہوا کی موج یعنی ہوا ہے۔ اور ہوا کو کبھی قرار نہیں ہوتا۔ رم، رمیدن سے ہے یعنی بھاگنا اس شعر میں اقبالؔ نے زندگی کی بے ثباتی کو بڑے دلکش انداز سے واضح کیا ہے

دوسرا شعر: گُل کے زاویۂ نگاہ سے زندگی تبسّم اور مسرّت کا نام ہے لیکن شمع کے نقطۂ نظر سے یہی زندگی گریۂ غم کے سوا اور کچھ نہیں ہے۔ مطلب یہ ہے کہ انسانی زندگی مسرّت اور رنج دونوں کے مجموعہ کا نام ہے۔

تیسرا شعر: محرم سے مراد ہے دانائے راز یعنی وہ شخص جو ہستی کی حقیقت سے آگاہ ہو۔ مطلب یہ ہے کہ جو شخص محرم راز نہیں ہے یعنی ہستی کی حقیقت سے واقف نہیں ہے، اس کے لئے یا اس کی نظر میں "ہستی" ایک راز ہے، لیکن جو شخص ہستی کی حقیقت سے آگاہ ہو جاتا ہے، وہ جانتا ہے کہ یہ ساری کائنات فانی ہے۔ صرف انسان کی روح باقی ہے یعنی محرم راز اس نکتہ سے آگاہ ہو جاتا ہے کہ میرے سوا کائنات میں اور کسی شئے کی کوئی حقیقت نہیں ہے۔

بال جبریل میں اسی نکتہ کو یوں بیان کیا ہے:۔

اک تو ہے کہ حق ہے اس جہاں میں　　باقی ہے نمودِ سیمیائی!

چوتھا شعر: اس شعر میں اقبالؔ نے اُن حاجیوں پر طنز کیا ہے جو مکہ معظمہ سے صرف آبِ زمزم یا کھجوریں، بطور تحفہ اپنے ساتھ لے کر واپس آتے ہیں حالانکہ انہیں وہاں سے اپنے اندر تقوی اور طہارت کا تحفہ لے کر آنا چاہیئے اور واپس پر ایسی زندگی بسر کرنی چاہیئے جس کو دیکھ کر دوسروں کے دلوں میں اسلام کی عظمت قائم ہو۔

دوسری غزل

پہلا شعر: خجستہ پے۔ اس شخص کو کہتے ہیں، جس کا آنا دوسروں کے لیئے باعث برکت ہو یعنی مبارک قدم۔ دیوانگی سے عشق رسولؐ مراد ہے سودائے بخیہ کاری، مراد ہے

دنیاوی معاملات کی درستی یا دنیا کے حصول کی کوشش ۔ مجھے سرپرپن نہیں ہے یعنی میں دنیا کا طالب نہیں ہوں مطلب یہ ہے کہ اے خدا! میرے اندر عشق رسول ؐ کا تھوڑا سا رنگ پیدا کر دے تاکہ میں اپنے مقصد میں کامیاب ہو جاؤں ۔ عقل تو مجھے دنیا حاصل کرنے کے طریقے سکھانا چاہتی ہے لیکن میں دنیا کا طالب نہیں ہوں ۔ یہ اقبال کا محبوب موضوع ہے یعنی عقل پر عشق کی برتری ۔

دوسرا شعر: مطلب اس لاجواب شعر کا یہ ہے کہ عاشق کی زندگی شمع مزار سے مشابہ ہے (ا) شمع کی طرح عاشق بھی ساری عمر جلتا رہتا ہے (ب) شمع مزار کی طرح عاشق بھی تنہائی میں زندگی بسر کر دیتا ہے ۔ کیوں کہ کوئی شخص، عاشق کا دکھ بانٹ نہیں سکتا ۔

تیسرا شعر: مطلب اس شعر کا یہ ہے کہ دنیا میں سچا دوست، جو کسی سے بے لوث محبت کرے، ناپید ہے ۔

چوتھا شعر: عرب کے معمار سے سرکار دو عالم صلعم کی طرف اشارہ ہے ۔ حصار ملت ۔ قوم کا قلعہ یعنی قوم ۔ معمار کی رعایت سے حصار کا لفظ لائے ہیں ۔ مطلب یہ ہے کہ اسلام نرالا دین ہے کیونکہ اس کی تعلیم یہ ہے کہ ملت یا قوم کی بنیاد وطن نہیں ہے، بلکہ عقیدۂ توحید و رسالت ہے ۔ مسلمانوں کے علاوہ دوسری قوموں کا اصول یہ ہے کہ قوم وطن سے بنتی ہے ۔ لیکن اسلام کی تعلیم یہ ہے کہ مسلمان، خواہ ہندی ہوں یا افغانی، ایرانی ہوں یا شامی، سب ایک قوم ہیں ۔

پانچواں شعر: عقبیٰ، عقب سے نکلا ہے جس کے معنی ہیں پیچھے یا بعد ۔ مراد ہے، موت کے بعد انسان کی حالت یا زندگی یا عالم آخرت ۔ اس شعر کا مطلب یہ ہے کہ عام طور سے لوگ یہ سمجھتے ہیں کہ ہم عالم ارواح سے دنیا میں آئے ہیں اور پھر مرنے کے بعد، دوسرے جہان میں چلے جائیں گے ۔ لیکن یہ ان کی غلط فہمی ہے، یہ آنا اور یہ جانا، سب اعتباری ہے ۔ اور دنیا اور عقبیٰ میں جو امتیاز کیا جاتا ہے یہ سب دھوکہ ہے ۔ حقیقت یہ ہے کہ ساری کائنات

ہماری خادم ہے انسان اشرف المخلوقات ہے۔ یہ ساری دنیا اس کے لئے بنائی گئی ہے۔ اس لئے یہ ساری دنیا اس کا وطن ہے۔ اسکا وطن کسی خاص خطہ میں محدود نہیں ہے۔

چھٹا شعر | مدیر مخزن سے شیخ عبد القادر مرحوم کی طرف اشارہ ہے جنہوں نے ۱۹۰۱ء میں لاہور سے مشہور ماہانہ رسالہ مخزن جاری کیا تھا۔ اس شعر کا مطلب یہ ہے کہ دنیا میں جو قومیں آج سربلند ہیں۔ ان کے افراد اپنا قیمتی وقت شعروشاعری میں صرف نہیں کرتے بلکہ ترقی کے لیے جدوجہد کرتے رہتے ہیں

اس شعر میں اس واقعہ کی طرف اشارہ ہے جس کا ذکر خود شیخ صاحب مرحوم نے بانگ درا کے دیباچہ میں کیا ہے کہ یورپ کے دوران قیام میں ایک دن اقبال نے مجھ سے کہا کہ میں نے فیصلہ کر لیا ہے کہ شاعری ترک کر دوں۔ (دیکھو دیباچہ)

تیسری غزل

پہلا شعر | مطلب یہ ہے کہ فی الحال میں خاموش ہوں لیکن اس سے کوئی یہ نہ سمجھے کہ میرے دل میں گفتگو کرنے (قوم کو زندگی کا پیغام دینے) کی آرزو نہیں ہے اور بہت شدید ہے۔ چنانچہ جب میں اپنی قوم کو زندگی کا پیغام دوں گا تو اس شدومد کے ساتھ دوں گا کہ دنیا حیران رہ جائے گی۔ (خدا نے اقبال کی آرزو پوری کر دی)

دوسرا شعر | مطلب یہ ہے کہ اس دنیا میں ہر شخص کی حالت مختلف ہے ایک کی طرز حیات ——— دوسرے کے لئے مناسب نہیں ہے مثلاً موج کی زندگی حرکت اور سفر پر موقوف ہے۔ اور موتی کی آب و تاب (زندگی) سکون اور قرار پر منحصر ہے۔

تیسرا شعر | یہ شعر بہت غور طلب ہے، کیونکہ اس میں اقبال نے انسانی فطرت کو شاعری کے لباس میں پیش کیا ہے مطلب یہ ہے کہ جن لوگوں کی طبیعت میں اچھائی یا نیکی قبول کرنے کی صلاحیت (قابلیت) نہیں ہے۔ آپ لاکھ ان کی اصلاح کیجئے، آپ کی

ساری کوشش بیکار چلی جائیں گی مثلاً سرو کے درخت کا جو عکس پانی میں نظر آتا ہے اس میں سرسبز ہونے کی صلاحیت (قابلیت) نہیں ہے، لہٰذا دن رات پانی میں رہنے کے باوجود سرسبز نہیں ہو سکتا۔ اس شعر میں تین لفظ غور طلب ہیں:۔

(۱) قابل، بمعنی اصلاح قبول کرنے والا۔ (۲) طبیعت، ذاتی خصوصیات کا وہ مجموعہ جو ہر انسان اپنی ماں کے پیٹ سے لے کر آتا ہے۔ (۳) تربیت، اُستاد یا ماحول کا کسی شخص کے اندر اصلاح کرنا۔

چوتھا شعر | مطلب یہ ہے کہ دنیا میں کوئی شخص ایسا نہیں ہے جس کے دل میں ہزاروں تمنائیں اور آرزوئیں ہر وقت چٹکیاں نہ لیتی رہتی ہوں۔ لہذا یہ دنیا دراصل آرزو اور تمنا کا مرقع ہے۔

پانچواں شعر | اس شعر کا مطلب بھی وہی ہے جو پہلے کا ہے یعنی مرتے وقت انسان پر یہ حقیقت واضح ہوتی ہے کہ میں دنیا میں ساری عمر آرزوؤں ہی میں بتلا رہا۔ اس لئے یہ کہنا غلط نہیں ہے کہ انسان کا جسم یعنی اس کی جسمانی زندگی صدہا آرزوؤں کا مجموعہ ہے، اور کچھ نہیں ہے۔

چھٹا شعر | یہ شعر بھی بہت غور طلب ہے مطلب یہ ہے کہ انسان کے اندر حُسن مطلق کی تلاش کا جذبہ کارفرما ہے۔ حالانکہ اُس نے اس کو کہیں دیکھا نہیں ہے پس اس کا اَن دیکھی چیز کی جستجو کرنا، دراصل خدا کی ہستی پر وجدانی دلیل ہے۔ کیونکہ اگر خدا فی الحقیقت موجود نہیں ہے تو پھر انسان میں اس کی تلاش کا یہ جذبہ کہاں سے پیدا ہو گیا؟ انسان کی نگاہ کسی (خدا) کے جمال کی تمنائی ہے، اس سے کوئی انکار نہیں کر سکتا، پس معلوم ہوا کہ کوئی حسین ضرور موجود ہے اگرچہ پنہاں ہے

ساتواں شعر | یہ شعر مضمون آفرینی کی بڑی عمدہ مثال ہے غنچہ جب کھلتا ہے اور پھول کی شکل اختیار کرتا ہے تو اُسے شعراء غنچہ کے تبسم سے تعبیر کرتے ہیں۔ غنچہ کہتا ہے

کہ انسان بھی کس قدر ظالم اور بیدرد ہے کہ جب میں فنا ہوجاتا ہوں (جب میرا سبُو ٹوٹ جاتا ہے) تو اُسے میرے تبسم سے تعبیر کرتا ہے۔ سبُو بمعنی گھڑا یا شیشۂ شراب واضح ہو کہ غنچہ کی شکل بڑی حد تک سبو سے مشابہ ہوتی ہے۔ مطلب یہ ہے کہ دنیا کا دستور یہ ہے کہ یہاں ایک کی بربادی دوسرے کی آبادی کا باعث ہے۔ مثلاً جب ریشم کا کیڑا کوئے کے اندر مرجاتا ہے تو انسان کے لئے ریشمی لباس تیار ہوتا ہے۔

آٹھواں شعر | مطلب یہ ہے کہ اس دنیا کا نظام محبت پر قائم ہے۔ مثلاً گلاب کی ہستی رنگ اور خوشبو کے باہمی پیمان محبت پر موقوف ہے۔ اگر رنگ اور بو باہم نہ ملتے تو گلاب کبھی عالم وجود میں نہ آتا۔ اور ملنا، محبت کی دلیل ہے۔

نواں شعر | مطلب یہ ہے کہ مجھ میں، یا میرے کلام میں کوئی ایسی خوبی موجود نہیں ہے جو مجھ سے پہلے دوسرے شعرا کے کلام میں نہ پائی جاتی ہو۔ اگر میرا عیب جو (نکتہ چیں) میرے کلام میں کوئی خوبی پاتا ہے تو چونکہ وہ خوبی میری پیدا کردہ نہیں ہے۔ اس لئے اسکا، اُس خوبی کو میری ذات سے منسوب کرنا، اس کا ہنر نہیں ہے' بلکہ سچ پوچھو تو عیب ہے واضح ہو کہ اس شعر کی خوبی اس کے انداز بیان میں پوشیدہ ہے۔

دسواں شعر | اس شعر میں بھی اقبالؔ نے بڑا دلکش انداز بیان اختیار کیا ہے مطلب یہ ہے کہ خدا نے انسان کو "دل" جیسی بیش بہا شئے عطا فرمائی ہے' بظاہر یہ اس کا بہت بڑا کرم ہے لیکن شاعر کہتا ہے کہ اگر گستاخی نہو تو میں عرض کروں کہ یہ کرم نہیں ہے بلکہ درپردہ وہ بہت بڑا ستم ہے۔ کیونکہ دل میں ہزاروں تمنائیں ہر وقت مچلتی رہتی ہیں۔ اور انسان اس دل کے کہنے میں آکر ساری عمر ان کی پرستش کرتا رہتا ہے جس کا لازمی نتیجہ یہ نکلتا ہے کہ وہ مقصد حیات سے غافل ہوجاتا ہے۔

گیارھواں شعر | مطلب اس فلسفیانہ شعر کا یہ ہے کہ یہ ساری کائنات ایک مستقل وحدت ہے۔ اور وحدت کا اصول ہر شئے میں کارفرما ہے۔ بظاہر دنیا میں ہزاروں چیزیں نظر

آتی ہیں جو باہمد گر مختلف بلکہ متضاد ہیں، لیکن اس اختلاف کے باوجود ساری کائنات ایک واحد شئے ہے۔ یہ امتیاز محض فریب نظر ہے بالفاظ دگر رگِ گل اور انسان کا خون در اصل ایک ہی حقیقت کے مختلف مظاہر ہیں۔ اس کی وحدت کا سبب یہ ہے کہ تصوّف کی رو سے یہ ساری کائینات اور اس کے مختلف مظاہر، اللہ کی صفتِ خالقیت کا عکس ہے۔ اس لئے ہر شئے کی اصل واحد ہے اس عقیدہ کو تصوّف کی اصطلاح میں وحدۃ الوجود کہتے ہیں۔

بارھواں شعر تقلید کے لغوی معنی ہیں کسی حیوان کے گلے میں پٹہ ڈالنا۔ مراد ہے دوسروں کی پیروی کرنا بغیر سوچے سمجھے۔ مجاز۔ یہ حقیقت کی ضد ہے۔ مثلاً جب ہم کسی بہادر آدمی کو شیر کہتے ہیں تو یہاں شیر کے حقیقی معنی کے بجائے مجازی معنی مراد لیتے ہیں تو یہاں شیر بمعنی بہادر نہ کہ وہ حیوان جو پھاڑ کھاتا ہے۔ رختِ سفر اٹھائے یعنی سفر پر روانہ ہو جائے، مراد یہ ہے کہ تقلید کی طرح مجاز کا دور بھی ختم ہو چکا ہے۔ مطلب شعر کا یہ ہے کہ جب کسی انسان پر "حقیقت" نمایاں ہو جاتی ہے۔ اور حقیقت یہ ہے کہ اللہ کے سوا، اور کسی شئے کا وجود حقیقی نہیں ہے۔ تو نہ وہ شخص کسی فلسفی کی تقلید کرتا ہے اور نہ مجاز کے رنگ میں گفتگو کرتا ہے۔ بلکہ صاف لفظوں میں یہ کہہ دیتا ہے کہ اللہ کے سوا اور کوئی ہستی موجود نہیں ہے۔ وجہ یہ ہے کہ جب حقیقت نمایاں ہو جاتی ہے تو پھر مجاز کی گنجائش ہی کہاں باقی رہتی ہے؟ اقبال کہتے ہیں کہ فلسفی اسی وقت تک آپس میں فلسفیانہ مسائل پر مثلاً خدا کیا ہے۔؟ کائنات کیا ہے۔ گفتگو کرتے رہتے ہیں یا کر سکتے ہیں جب تک حقیقت اُن کی نگاہوں سے پوشیدہ ہے اگر وہ حقیقت سے آگاہ ہو جائیں یعنی اگر انہیں یہ معلوم ہو جائے کہ اللہ کے سوا اور کوئی ہستی موجود نہیں ہے تو گفتگو ختم ہو جائے گی۔

تیرھواں شعر | مطلب اس کا یہ ہے کہ اگر میں وطن سے دور رہوں تو میرے دوستوں کو میری جدائی سے رنجیدہ ہونا مناسب نہیں ہے، کیونکہ دنیا کا دستور یہ ہے کہ جب تک کوئی شخص ترک وطن نہیں کرتا، آبرو حاصل نہیں کر سکتا۔ دیکھ لو! جب موتی اپنے وطن (قعر دریا) سے دور ہو جاتا ہے، اُس وقت کسی شہزادی کے گلے یا کان کی زینت بنتا ہے۔

چوتھی غزل

پہلا اور دوسرا شعر | مطلب یہ ہے کہ کائنات کی ہر شئے میں خدا کا جلوہ نظر آتا ہے۔ بجلی آگ، چنگاری، چاند سورج اور ستاروں میں جو چمک پائی جاتی ہے، یہ دراصل اُسی کی قدرت کا ظہور ہے، آسمان کی بلندی، زمین کی پستی پانی کی روانی اور ساحل کی افتادگی (سکون) غرضکہ ہر شئے میں اُسی کی جلوہ گری ہے۔

یہ تو ان شعروں کا ظاہری مطلب ہے۔ لیکن دراصل اقبالؔ ہمیں وحدۃ الوجود کی تعلیم دے رہے ہیں یعنی تمام مظاہر کائنات کی حقیقت ایک ہی ہے۔ اور وہی موجود ہے اس کے علاوہ کسی شئے کا وجود حقیقی نہیں ہے۔ بجلی کی نہ کوئی حقیقت ہے نہ اصلیت، دراصل وہی ذات واحد بجلی میں چمک رہی ہے۔ اسی طرح آگ، چنگاری، چاند سورج ستارے سب اشیاء میں اُسی کا ظہور ہو رہا ہے خدا کے علاوہ اور کوئی شئے موجود نہیں ہے۔

تیسرا شعر | استعارہ، یہ علم بیان کی مشہور اصطلاح ہے۔ اس کی تعریف یہ ہے کہ جب ہم کسی لفظ کو مجازی معنی میں استعمال کرتے ہیں تو حقیقی اور مجازی معنی میں کسی نہ کسی علاقہ (رابطہ) کا پایا جانا ضروری ہے ورنہ کلام مہمل ہو جائے گا مثلاً ہم نے اپنے خادم سے کہا کہ پانی لاؤ، جب وہ پانی لایا تو ہم نے کہا کہ ہماری مراد گھوڑے سے

تھی تو خادم یہ کہہ سکتا ہے کہ جناب پانی اور گھوڑے میں تو کوئی علاقہ ہی نہیں، بس میرا ذہن گھوڑے کی طرف کیسے منتقل ہوتا۔

الغرض پانی بول کر گھوڑا اور کتاب بول کر لڈو مراد نہیں لے سکتے۔ لہذا ثابت ہوا کہ حقیقی اور مجازی معنی میں کسی علاقہ کا پایا جانا ضروری ہے۔ اگر وہ علاقہ تشبیہ کا ہو تو اسے استعارہ کہتے ہیں۔ مثلاً کل رات میں اپنے چاند سے ملا۔ یہاں چاند سے معشوقہ مراد ہے کیوں کہ اس کا چہرہ بھی چاند کی مانند ہے۔ (اگر نہ ہو تو عاشق کے زاویۂ نگاہ سے دیکھو)

شعر کا مطلب یہ ہے کہ اگر میں صاف لفظوں میں یہ کہہ دوں کہ "ہمہ اوست" یعنی ہر شئے خدا کا مظہر ہے (یہی وحدت الوجود ہے) تو ممکن ہے شریعت میرا گریبان پکڑ لے یعنی علماء مجھ پر کفر کا فتویٰ لگا دیں گے۔ اس لئے میں اپنے دل کا مطلب پردے (استعارہ) میں بیان کر دیتا ہوں یعنی میں نے یہ نہیں کہا کہ بجلی، آگ، شرارہ، چاند سورج، تارہ، زمین آسمان، دریا۔ غرضکہ ہر شئے میں تو ہی تو ہے بلکہ یہ کہہ دیا کہ ان میں تیری ہی چمک پائی جاتی ہے۔

چوتھا شعر یہ شعر بھی وحدت الوجود کے رنگ میں ہے۔ مطلب یہ ہے کہ ساری کائنات کی اصل یا بنیاد ایک ہی ہے یعنی حیات۔ یہ حیات، عالم جمادات یعنی شجر پھول، پتھر اور ستاروں میں، اپنی ابتدائی حالت میں ہے یعنی شعور سے محروم ہے قانون ارتقا کے بموجب جب یہ حیات، جمادات سے ترقی کر کے نباتات میں آتی ہے تو اس میں حرکت (شان نمو) پیدا ہو جاتی ہے۔ اور جب عالم حیوان میں آتی ہے تو اس میں شعور اور احساس ظاہر ہوتا ہے اور جب انسان میں آتی ہے تو بیدار ہو جاتی ہے یعنی شعور ذات پیدا ہو جاتا ہے۔

پانچواں شعر اس شعر میں انداز بیان اور مضمون آفرینی، دونوں خوبیاں پائی

جاتی ہیں۔ مطلب یہ ہے کہ بظاہر آنسو پانی ہے، لیکن محبت نے اس کے اندر بھی اس قدر سوز پیدا کر دیا کہ صرف ایک آنسو نے مجھے جلا کر راکھ کر دیا۔ مقصود اس سے یہ ہے کہ شاعر ہمارے دل میں سوز محبت کی شدت کا احساس پیدا کرنا چاہتا ہے۔

چھٹا شعر مطلب یہ ہے کہ میں عاشق ہوں۔ اور عاشق جنت کی خواہش، یا دوزخ کے خوف سے، خدا سے محبت نہیں کرتا، بلکہ اس کی محبت خلوص پر مبنی ہے وہ خدا سے اس لئے محبت کرتا ہے کہ خدا، منبع حُسن و جمال ہے مصدرِ فضل و کمال ہے اس کی ذات اسی لائق ہے کہ اس سے محبت کی جائے۔

ساتواں شعر پارے کی ہستی کا تقاضا یہی ہے کہ وہ ہر وقت متحرک (مضطرب) اور سکون سے دور رہے، شاعر نے اس کے اضطراب کو دیکھ کر یہ نتیجہ نکالا کہ ہو نہ ہو اس میں کسی عاشق کے دل کی تڑپ پوشیدہ ہے اس شعر میں جو شاعرانہ خوبی پائی جاتی ہے۔ اُسے اصطلاح میں "حسن تعلیل" کہتے ہیں۔ یعنی شاعر نے پارے کے اضطراب کی علت (وجہ) بیان کی ہے۔

آٹھواں شعر مطلب یہ ہے کہ حضرت موسیٰؑ نے جب کلمہ "لن ترانی" سنا (لن ترانی سے مراد ہے کہ اے موسیٰؑ تو مجھے ہرگز نہ دیکھ سکے گا) تو وہ چُپ نہیں ہوئے، بلکہ اُنہوں نے دوبارہ خدا سے عرض کی کہ تو ضرور اپنا جلوہ مجھے دکھا دے لیکن میں اس لئے چپ ہوں (اصرار نہیں کرتا) کہ میں فرقت زدہ ہوں، مجھ میں بار بار تقاضہ کرنے کی طاقت نہیں ہے۔

شعر میں کوئی خاص بات نہیں ہے مضمون بھی نیا نہیں ہے، لیکن اقبال نے اپنے انداز بیان سے اس میں دل کشی ضرور پیدا کر دی ہے۔ طاقتِ تقاضہ نہ ہونے سے اس شعر میں بلا کا سوز و گداز پیدا ہو گیا ہے۔ اس کے علاوہ اس میں در پردہ، عاشقی کا کمال بھی پوشیدہ ہے کہ عاشق اب اس منزل میں ہے کہ تقاضا بھی نہیں کر سکتا یقیناً یہ ضعف کی آخری یعنی بلند ترین منزل ہے۔

پانچویں غزل

پہلا شعر مطلب یہ ہے کہ دنیا کے ہنگامے یوں تو بہت دلکش ہیں، لیکن اُن کا افسوسناک پہلو یہ ہے کہ ان تمام ہنگاموں کا نتیجہ یا یوسی، رنج اور افسردگی کے سوا اور کچھ نہیں ہوتا انسان ساری عمر ان میں مصروف رہتا ہے۔ مرتے وقت یہ احساس ہوتا ہے کہ:۔

ع خواب تھا جو کچھ کہ دیکھا جو سُنا افسانہ تھا

دوسرا شعر مطلب یہ ہے کہ فلسفہ اور حکمت سے انسان کے دل کو اطمینان حاصل نہیں ہو سکتا۔ آسودگی اور اطمینان قلب صرف اللہ کی محبت سے حاصل ہو سکتا ہے۔

تیسرا شعر پہلا مطلب جو لفظوں سے ظاہر ہوتا ہے وہ یہ ہے کہ شراب پردہ میں رہنا پسند کرتی ہے۔ کشید گی سے پہلے انگور کے پردے میں تھی، کشید کے بعد بوتلوں میں پوشیدہ ہو گئی یہ مطلب مضمون آفرینی کی بہت عمدہ مثال ہے۔ اگر مے سے محبت مراد لی جائے تو دوسرا مطلب یہ ہو گا کہ محبت کی خاصیت یہ ہے کہ وہ پردہ میں رہتی ہے۔ پہلے ذاتِ خداوندی میں پوشیدہ تھی۔ جب خدا نے اسے ظاہر فرمایا تو عاشقوں کے دل میں پوشیدہ ہو گئی۔

چوتھا شعر مطلب یہ ہے کہ حُسن میں وہ تاثیر ہے کہ عقلمند آدمی بھی اس سے مغلوب ہو جاتا ہے حُسن، دانا کو نادان بنا دیتا ہے۔ دوسرا مصرع، حسن بیان کی بڑی عمدہ مثال ہے

پانچواں شعر مطلب یہ ہے کہ یورپ کے حسینوں میں شرم و حیا کا مادہ نہیں پایا جاتا اور اقبال کی رائے میں حسن کے لئے شرم و حیا بہت ضروری ہے۔ وجہ یہ ہے کہ شرم و حیا سے حُسن کو چار چاند لگ جاتے ہیں۔

چھٹی غزل

پہلا شعر مطلب یہ ہے کہ ہم اُسی طرح جام شراب کا طواف کرتے رہتے ہیں جسطرح

شراب کا عکس یعنی جام میں ہر وقت شراب کا عکس نظر آتا ہے اور ہم ہر وقت پیتے رہتے ہیں
مے نوشی ہماری نماز ہے اور یہ نماز ہم صبح و شام ادا کرتے رہتے ہیں۔

دوسرا شعر:- مطلب یہ ہے کہ درخت اور پتھر، بلکہ تمام کائنات زبان حال سے خدا کی تسبیح کرتی رہتی ہے۔ اقبال نے اس تسبیح کو خدا سے کلام کرنے سے تعبیر کیا ہے اور یہ تشبیہ بہت عمدہ مضمون باندھا ہے۔

تیسرا شعر:- مطلب یہ ہے کہ اس دنیا کی ساخت کچھ اس قسم کی ہے کہ یہاں بہت ہی کم لوگ ایسے ہیں جن کی تمنائیں بر آتی ہیں۔ ورنہ عام دستور یہی ہے کہ کارکنان قضا و قدر لوگوں کو ناکام اور نامراد ہی رکھتے ہیں۔ داغ نے کیا خوب کہا ہے ؎

ہزاروں خواہشیں ایسی کہ ہر خواہش پہ دم نکلے!
بہت نکلے مرے ارماں، لیکن پھر بھی کم نکلے!

ستم کش تپش ناتمام سے وہ شخص مراد ہے جو تپش نام کی اذیت میں مبتلا ہو۔ تپش ناتمام سے وہ کوشش مراد ہے جس کا کوئی نتیجہ برآمد نہ ہو یعنی ناکامی۔ عموماً لوگ جب اس دنیا سے جاتے ہیں تو ہزاروں آرزوئیں ساتھ ہی لے جاتے ہیں۔

چوتھا شعر:- لفظوں سے جو مطلب واضح ہوتا ہے، وہ یہ ہے کہ انسان کو خاموش ہی رہنا بہتر ہے دیکھ لو! باغ میں جس قدر پرندے خوش آواز ہیں، مثلاً بلبل، طوطی، مینا، ان کی آواز، ان کے حق میں بلائے جان بن جاتی ہے۔ لوگ انہیں پنجروں میں قید کر کے لطف زندگی سے محروم کر دیتے ہیں۔

دوسرا مطلب یہ ہے کہ یہ دنیا بھی عجب مقام ہے! یہاں جو شخص سچی بات کہتا ہے، دنیا والے اسے مبتلائے آلام کر دیتے ہیں۔ اگر کسی کو شک ہو تو وہ رئیس الاحرار مولانا محمد علی مرحوم، رئیس الاحرار مولانا حسرت موہانی، اور امام الاحرار مولانا عبید اللہ سندھی مرحوم کی زندگی کا مطالعہ کر لے۔ اس صورت میں خوش نوائی سے حق گوئی مراد لینی ہوگی۔ پابند دام کرتے ہیں یعنی جیل خانہ میں بھیج دیتے ہیں۔

پانچواں شعر۔ مطلب یہ ہے کہ جو لوگ نشاط حاصل کرنے کے لئے شراب پیتے ہیں وہ شراب کا غلط استعمال کرتے ہیں۔ غالب نے اس مضمون کو یوں ادا کیا ہے ؎

مئے سے غرض نشاط ہے کس رو سیاہ کو
اک گونہ بیخودی مجھے دن رات چاہیئے

یعنی اقبال کی رائے میں شراب کا صحیح استعمال یہ ہے کہ اُسے "بے خودی" کے لئے پیا جائے۔ واضح ہو کہ یہ شاعرانہ انداز بیان ہے۔ ورنہ در اصل اقبال کا مطلب یہ نہیں ہے کہ شراب حلال ہے۔ وہ شاعری کر رہے ہیں، فقہ کا مسئلہ بیان نہیں کر رہے ہیں بالفاظ دگر انہوں نے اس شعر میں ایک مضمون پیدا کیا ہے۔ اس کے علاوہ اور کچھ نہیں ہے۔ اگر شراب سے شراب معرفت مراد لیں تو دوسرا مطلب یہ ہو سکتا ہے کہ معرفت کی شراب، حلال ہے بشرطیکہ انسان اسکو اس غرض سے پئے کہ بے خودی یعنی غیر اللہ سے بیگانگی ہو جائے لیکن اگر کوئی شخص شراب معرفت اس لئے پیتا ہے کہ لوگ اس کی بزرگی کے معتقد ہو جائیں اور اس کی عزت کرنے لگیں جس کا نتیجہ نشاط دنیوی ہوگا، تو پھر یہ شراب یعنی ایسی محبت، ناجائز بلکہ از روئے شریعت حرام ہے۔

چھٹا شعر:۔ اس شعر میں اقبال نے واعظ سے اپنے اختلاف کی وجہ بیان کی ہے کہ میں ساری دنیا کو محبت کا پیغام دیتا ہوں لیکن واعظ اس نعمت یا عطیہ الٰہی کو صرف اپنے ہم عقیدہ لوگوں تک محدود رکھتا ہے۔ اس لئے میرا اس کا نباہ نہیں ہو سکتا۔

ساتواں شعر:۔ اس شعر میں اقبال نے اولیاء اللہ اور بزرگان دین کی روحانی طاقت کا اثبات کیا ہے کہ اللہ کے بندوں میں یا ان کی نگاہ میں یہ تاثیر ہوتی ہے کہ وہ ایک نظر سے، انسانوں کو اپنا گرویدہ بنا لیتے ہیں ع

الٰہی کیا چھپا ہوتا ہے اہلِ دل کے سینوں میں!

ساتواں شعر:۔ مطلب یہ ہے کہ جو لوگ اپنی خاندانی عزت اور شرافت اور ذاتی شرافت کو برباد کر کے دادِ عیش دیتے ہیں، ان کا انجام ہمیشہ خراب ہوتا ہے، وہ بظاہر عیش و عشرت

کرتے ہیں لیکن دراصل اپنی زندگی تباہ کر لیتے ہیں۔

آٹھواں شعر | وطنِ مازنی سے اٹلی (اطالیہ) مراد ہے۔ مازنی، دراصل اس کا تلفظ مزینی ہے۔ ضرورت شعری کی وجہ سے مازنی باندھا ہے۔ (مزینی) (MAZZINI) اٹلی کا مشہور محب وطن، اور جمہوریت نواز تھا۔ ۱۸۰۵ء میں پیدا ہوا ۱۸۷۲ء میں وفات پائی۔ اُس نے اپنے ملک اور اپنی قوم کی خاطر ساری عمر سختیاں جھیلیں۔ آخری مرتبہ ۱۸۷۰ء میں حکومت نے اُسے گرفتار کیا اور ۱۸۷۲ء میں جیلخانہ ہی میں اس کا انتقال ہو گیا۔ اقبال چونکہ خود ملوکیت کے دشمن اور حریت کے علمبردار تھے۔ اس لئے اُنہوں نے اس شعر میں اس عظیم الشان انسان کی خدمت میں خراج تحسین پیش کیا ہے۔ دوسرا مصرع یہ بتاتا ہے کہ اقبال نے یہ غزل اُس وقت لکھی تھی جب وہ ۱۹۰۸ء میں یورپ سے واپس ہو رہے تھے

نواں شعر | اس میں کوئی خاص بات نہیں ہے۔ مشرقی شعرا کی تقلید میں اقبال نے بڑے دلکش انداز میں اپنے گناہوں کا اعتراف کیا ہے۔ لفظ "دیر" بمعنی بتخانہ سے اس شعر میں غضب کی شوخی پیدا ہو گئی ہے۔

نظم (مارچ ۱۹۰۷ء)

تبصرہ | بظاہر یہ ایک طویل غزل ہے کیونکہ اس میں مطلع بھی ہے۔ اور مقطع بھی لیکن دراصل یہ ایک نظم ہے اور اہم نظم ہے۔ وجہ یہ ہے کہ اس میں نہ تغزل ہے نہ واردات عاشقی کا ذکر ہے بلکہ اس کے ذریعے سے اقبال نے قوم کو اپنے آئندہ پروگرام سے آگاہ کیا ہے۔

یہ نظم اس انقلاب کا پتہ دے رہی ہے جو قیام یورپ کی بدولت اُن کی ذہنیت میں پیدا ہو گیا تھا، ڈگریاں، حاصل کرنے کے ساتھ ساتھ انہوں نے یورپ کی تہذیب کا مطالعہ بھی جاری رکھا، چنانچہ دو سال کے بعد وہ اس نتیجہ پر پہونچ گئے کہ "تمہاری تہذیب اپنے خنجر سے آپ ہی خودکشی کرے گی۔" اور اس کی وجہ یہ ہے کہ ہر وہ تہذیب جس کی بنیاد

مادہ پرستی پر ہو انسانیت کے حق میں پیامِ موت ہے چنانچہ ہم نے اپنی آنکھوں سے اس شعر کی صداقت دیکھ لی۔

اس نظم سے اقبالؔ کی شاعری کا دوسرا دور ختم ہو جاتا ہے۔ اور ۱۹۰۸ء سے وہ ایک مفکرِ ملت یا حکیمِ اُمت کی حیثیت سے ہمارے سامنے آتے ہیں چنانچہ انہوں نے قرآن اور حدیث کو سامنے رکھ کر مسلمانوں کے لئے ایک عمل پروگرام مرتب کیا تاکہ مسلمانوں کا سفینہ، طوفان سے محفوظ رہ کر بصحیح سلامت منزلِ مقصود تک پہونچ جائے۔

دل تو یہ چاہتا تھا کہ اس نظم پر بحیثیت مجموعی تبصرہ کیا جائے۔ لیکن اقبالؔ نے اس نظم کے ہر شعر میں رمز و ایما سے کام لیا ہے۔ اس لئے ناظرین کی سہولت کی خاطر تبصرہ کے بجائے ہر شعر کا جداگانہ مطلب ذیل میں درج کرتا ہوں:۔

(۱) چونکہ یورپ کا سرمایہ دارانہ اور مادہ پرستانہ نظامِ حیات باطل ہو چکا ہے اس لئے اب دین اسلام کی تبلیغ و اشاعت اور کامیابی کا زمانہ آگیا ہے۔ لہٰذا اسلام کے پاکیزہ اصولوں کی اشاعت ہر مسلمان پر فرض ہے۔ تاکہ ساری دنیا اس کے نور سے منور ہو سکے۔ اسلام کے حقائق اب تک پردوں میں پوشیدہ تھے اور مسلمان تبلیغ سے غافل تھے۔ لیکن اب وقت آگیا ہے کہ ان حقائق کو منظرِ عام پر لایا جائے۔

(۲) وہ دور گزر گیا جب انگریزوں کے خوف سے مسلمان علماء حجروں میں چھپ کر اسلام کے حقائق بیان کرتے تھے۔ اب انشاء اللہ مسلمان علانیہ، اسلام کی حقانیت، یورپ کے شہروں میں تقریر اور تحریر کے ذریعہ سے بیان کریں گے۔ اور ساری دنیا کو اسلامی اصولوں سے روشناس کر دیں گے۔

نوٹ:۔ اگرچہ اقبالؔ کی قوم نے ابھی تک اقبالؔ کی اس دیرینہ آرزو کی تکمیل کا کوئی انتظام نہیں کیا ہے۔ لیکن میں اللہ کی رحمت سے نا اُمید نہیں ہوں کیا عجب ہے کہ اس بے نیاز نے یہ سعادت موجودہ نسل کے لئے مقدر کر دی ہو۔

(۳) جو لوگ تبلیغ اسلام کی تڑپ رکھتے تھے لیکن قوم اور ماحول اور حالات سے مایوس ہو کر گوشۂ گمنامی میں چلے گئے تھے، انشاء اللہ اب دوبارہ میدان عمل میں آجائیں گے۔ ان کی جدوجہد (برہنہ پائی) کا عالم تو وہی رہے گا، لیکن محاذ جنگ بدل جائے گا یعنی جہاد کا طریقہ (خارزار) بدل جائے گا۔ مثلاً تلوار کے بجائے زبان اور قلم سے کام لیں گے۔

(۴) مجھے آثار ایسے نظر آرہے ہیں کہ رحمت الٰہی کا پھر نزول ہوگا، اور آج سے تیرہ سو سال پہلے اللہ نے جو کرم عربوں (صحرایوں) پر کیا تھا، وہی کرم اب دوبارہ ملت اسلامیہ پر نازل ہوگا۔

(۵) میں نے فرشتوں سے یہ سنا ہے۔ (یہ شاعرانہ انداز بیان ہے جس کا مطلب یہ ہے کہ مجھے یقین ہے) کہ جس مسلمان قوم نے کسی زمانہ میں قیصر (روم) اور کسریٰ (ایران) کے تخت الٹ دیئے تھے، وہ قوم اب پھر بیدار ہونے والی ہے۔

(۶) جب قوم کے لیڈروں نے، قومی کارکنوں کے جلسوں میں میرا تذکرہ کیا کہ اقبال بھی خدمت قوم کے لئے آمادہ ہے تو بزرگانِ ملت (جن کو دنیا کا خوب تجربہ ہو چکا ہے) یہ بات سن کر کہنے لگے کہ اقبال چونکہ شمشیر برہنہ ہے سچ بولتا ہے، اور ہر شخص کو کھری کھری سناتا ہے (مونہ پھٹ ہے) اس لئے عوام اور خواص دونوں کی نظروں میں ذلیل رہے گا۔ اپنے بھی خفا رہیں گے اور بیگانے بھی ناخوش رہیں گے یعنی قوم بھی ناراض رہے گی اور حکومت بھی ناراض رہے گی۔

(۷) اے اہلِ مغرب! یہ دنیا بہر حال دُنیا ہے۔ اور اس میں اللہ کی مخلوق آباد ہے یہ کوئی دکان یا تجارتی ادارہ نہیں ہے جس پر تمہارا قبضہ ہو سکے، یا جس پر تمہارا حکم نافذ ہو سکے۔ آگاہ ہو جاؤ کہ جس تہذیب کو تم دنیا والوں کے حق میں مفید قرار دے رہے ہو، وہ عنقریب ان کے لئے وبالِ جان بن جائے گی۔ زرِ کم عیار بمعنی کھوٹا سونا۔

(۸) اور مجھے تو یہ نظر آرہا ہے کہ تمہاری یہ تہذیب جس پر تمہیں اس قدر ناز ہے عنقریب تباہ ہو جائے گی۔ اور اس کے ساتھ تم بھی فنا ہو جاؤ گے۔ بات صاف ہے جو طائر اپنا آشیانہ کسی کمزور شاخ پر بناتا ہے، وہ شاخ یقیناً اس کے بوجھ سے ٹوٹ جائے گی اور شاخ کے

ساتھ آشیانہ بھی برباد ہو جائے گا۔

(۹) مورِ ناتواں سے مسلمان قوم مراد ہے۔ موجوں سے مصائب اور مشکلات مراد ہیں۔ انشاء اللہ مسلمان قوم اگرچہ کمزور ہے۔ (مور بمعنی چیونٹی) لیکن وہ گلاب کی پتی کی کشتی بنا لے گی اور اگرچہ اس کی راہیں صدہا مشکلات آئیں گی، لیکن وہ ان سب پر غالب آجائے گی۔ سفینہ برگِ گل سے بہت ادنیٰ درجہ کی زندگی اور ساز و سامان ظاہری کی کمی مراد ہے۔

(۱۰) آج کل کیفیت یہ ہے کہ قوم کے واعظین ہر مجلس میں اپنا وقار قائم کرنے کے لئے لوگوں کو اپنی ملت دوستی اور قوم پروری کے جذبات کی داستانیں سناتے رہتے ہیں۔ وہ یہ سمجھتے ہیں، اس طرح محض زبانی جمع خرچ سے قومی خادموں میں شمار ہو جائے گا۔

(۱۱) دینِ اسلام ایک تھا اور ایک ہی ہے، لیکن افسوس کہ مسلمانوں نے اس کی مختلف تعبیرات کر کے اپنے آپ کو صدہا فرقوں میں منقسم کر لیا۔ نتیجہ یہ نکلا کہ آج دنیا میں اتنی بڑی قوم کا کوئی اعتبار نہیں ہے۔ وجہ یہ ہے کہ فرقہ بندی قوم کے حق میں سب سے بڑی لعنت ہے جس سے اس کا وقار ختم ہو جاتا ہے۔

دوسرا اور دقیق مطلب یہ ہے کہ در اصل ساری کائنات ایک مستقل وحدت یا اکائی ہے لیکن انسانی آنکھ چونکہ قدم قدم پر ٹھوکریں کھاتی ہے اور مبتلائے فریب ہو جاتی ہے۔ اس لئے اُسنے اس وحدت کو کثرت میں تبدیل کر دیا یعنی انسان اپنی نادانی اور غلط فہمی کی بنا پر اشیائے کائنات میں امتیاز کرتا ہے۔ وہ گل و خار، چاند اور سورج، حیوان اور انسان، جمادات اور نباتات میں امتیاز کرتا ہے۔ حالانکہ یہ تمام اشیاء اُسی ذاتِ واحد کے مظاہر ہیں اور در اصل ان کی اپنی کوئی حقیقت نہیں ہے۔

(۱۲) میں نے ایک دن قوم کے ایک ہمدرد (قمری) سے یہ کہا کہ ہماری قوم میں جو لوگ اپنے کو آزاد کہتے ہیں در اصل وہ بھی حکومت کے غلام ہیں، تو میری قوم کے نوجوان یہ سن کر بول اُٹھے کہ ہو نہ ہو یہ اقبال تو حکومت کے سارے رازوں سے واقف معلوم ہوتا ہے اس نے یہ کیسی پتہ کی بات کہی ہے!

دوسرا مطلب یہ ہے کہ شعراء "سرو" اور شمشاد اور صنوبر "تینوں کو "آزاد" باندھتے ہیں
آزاد، بایں معنی کہ یہ تینوں درخت بہار اور خزاں کی قید سے آزاد ہیں چنانچہ اقبال خود کہتے ہیں:-

صنوبر باغ میں آزاد بھی ہے پا بگل بھی ہے

لیکن سب جانتے ہیں کہ صنوبر اس نام نہاد آزادی کے باوجود، پابگل یعنی گرفتار ہے۔ بایں معنی کہ (۱) وہ اپنی جگہ سے حرکت نہیں کر سکتا (۲) قانون نمو کا بہر حال پابند ہے (۳) ہوا روشنی پانی اور مٹی کا بہر حال محتاج ہے۔ جب میں نے اس حقیقت کا اظہار قمری سے کیا (جو صنوبر کو بہت پسند کرتی ہے) تو غنچے یہ کہنے لگے واقعی یہ شخص چمن کا راز دار معلوم ہوتا ہے۔ یعنی یہ شخص اس تلخ حقیقت سے واقف ہے کہ دنیا کی تخلیق اس نہج پر ہوئی ہے یہاں جو بظاہر آزاد ہے بباطن وہ بھی گرفتار ہے۔

(۱۳) اس شعر میں اقبال نے بہت بڑا نکتہ بیان کیا ہے مطلب یہ ہے کہ خدا کا اصلی عاشق وہ شخص ہے جو خدا کے بندوں کے ساتھ ہمدردی کرے اور انہیں راہ راست پر لائے۔

(۱۴) مطلب یہ ہے کہ جو لوگ خدمت قوم کے آرزومند ہوں اُن کو اس حقیقت کو ہمیشہ مد نظر رکھنا چاہیئے۔ کہ خدمت قوم، پھولوں کی سیج نہیں ہے۔ اس راہ میں بہت دشواریاں لاحق حال ہوتی ہیں۔ اور خادم قوم کو لازم ہے کہ وہ زبان سے اُف تک نہ کرے (جنبش نظر بھی گناہ ہے) جو لوگ ضعف ایمانی کی بنا پر حرف شکایت زبان پہ لاتے ہیں، قوم میں ان کی کوئی عزت باقی نہیں رہتی (رہے گی کیا آبرو ہماری -)

(۱۵) یہ شعر بہت اہم، اور اقبال کے عزائم قلبی کا آئینہ دار ہے، بلکہ ساری نظم کی جان ہے مطلب یہ ہے کہ اگرچہ حالات میرے مخالف ہیں اور مشکلات میری راہ میں حائل ہیں (ظلمت شب)، لیکن میں ضرور اپنی قوم کو بیدار کردوں گا۔ اور ترقی کی راہ پہ چلاؤں گا۔ اور میں اس مقصد کے لیئے، اپنی قوم کے اندر عشق رسولؐ کی آگ بھڑکاؤں گا۔ اور جوش دلانے والی نظموں سے اس کی رگوں میں خون دوڑاؤں گا۔ میری آہ انگارے برسائے گی، اور میری سانس سے

شعلے نکلیں گے۔

(۱۶) اے مسلمان اگر تو نے اپنی زندگی کا مقصد صرف یہ قرار دیا ہے کہ کچھ عرصہ دنیا میں زندہ رہے اور پھر مر جائے (اسی کو نمود کہتے ہیں) تو یقین رکھ کہ تو ہمیشہ کے لیے مٹ جائے گا جو شئے انسان کو حیاتِ ابدی عطا کر سکتی ہے وہ عشقِ رسولؐ ہے محض نمود یعنی حیاتِ چند روزہ یہ تو حیوانات کی زندگی کا مقصد ہے۔ انسان تو اشرف المخلوقات ہے۔ اور پھر مسلمان تو خلیفۃ اللہ ہے۔

(۱۷) مقطع میں خالص تغزل کا رنگ ہے۔ کوئی خاص بات نہیں ہے۔ ستم کش انتظار ہوگا یعنی انتظارِ یار کی زحمت اٹھا رہا ہوگا۔

حصّہ سوم

بلادِ اسلامیہ

حلِّ لغات | بلاد جمع ہے، بلد کی، بلد بمعنی شہر۔ مسجودِ دلِ غمدیدہ یعنی مسلمانوں کے غمگین دلوں کو بہت محبوب ہے۔ لغوی معنی ہیں "غمگین دل (ذلی کو) سجدہ کرتا ہے"۔ اسلاف کا لہو خوابیدہ ہے ہمارے آباؤ اجداد کا خون اس کے ذرّے ذرّے میں ملا ہوا ہے مثلاً ۱۸۵۷ء میں جب انگریزوں نے دلی فتح کی تو صرف چیلوں کے کوچہ اور خانم کے بازار، دو محلوں میں ہندرہ ہزار کے لگ بھگ مسلمانوں کو تلوار کے گھاٹ اتار دیا۔ خیر الاُمم۔ اُمم جمع ہے امت کی۔ امت بمعنی قوم یا جماعت۔ خیر بمعنی بہترین۔ بہترین قوم سے مراد مسلمان قوم ہے کیونکہ قرآن مجید نے اس قوم کو بہترین قوم فرمایا ہے۔ حاصل بمعنی خرمن، کھلیان، پیداوار۔ جہان آباد سے دلّی مراد ہے۔ کرامت بمعنی بزرگی۔ یا عظمت۔ ہمدوشِ ارم۔ اِرم وہ حسین شہر جسے شداد نے بسایا تھا۔ اور جس میں اُس نے جنتِ عرضی بنائی تھی۔ مطلب یہ ہے کہ بغداد بھی ارم کی طرح حسین شہر تھا جانشینانِ پیمبرؐ سے سلاطین عباسیہ مراد ہیں، جو اپنے آپ کو آنحضرت صلعم کا جانشین سمجھتے تھے۔ اور تاریخ میں بھی "خلفا" کے لقب سے مشہور ہیں چمن سامان سے مراد یہ ہے کہ ہر غنچہ اپنی جگہ ایک چمن تھا۔ کانپتا تھا جن سے رومہ" اشارہ ہے مشرقی سلطنتِ روم (قسطنطنیہ) کے عیسائی فرمانرواؤں کی طرف جو سلاطین عباسیہ (علی الخصوص، ہارون، مامون، متوکل) کی سطوت سے کانپتے رہتے تھے۔ بزمِ ملتِ بیضا سے مسلمان قوم مراد ہے۔ لغوی معنی ہیں سفید یا روشن قوم کی محفل۔ دِیا، ہندی میں چراغ کو کہتے ہیں۔ فروزاں بمعنی روشن تاک بمعنی انگور کی بیل۔ دیار بمعنی شہر۔ مہدیٔ اُمت۔ ایک ضعیف حدیث میں سلطان محمد الملقب بہ فاتح کو جس نے

۱۴۵۳ء میں قسطنطنیہ فتح کیا تھا، اس اُمت کا مہدی قرار دیا گیا ہے بسطوت بمعنی شوکت و شان آستانِ مسند آرائے شہ لولاک "شہ لولاک" ۔ یہ آنحضرت صلعم کا لقب ہے۔ "لولاک" ایک حدیث قدسی کا ابتدائی حصہ ہے۔ پوری حدیث یوں ہے۔ لَوْلَاکَ لَمَا خَلَقْتُ الْاَفْلَاکَ، یعنی اللہ نے حضور انور سے فرمایا کہ اے میرے پیارے! اگر میں تجھے نہ پیدا کرتا تو آسمانوں (یعنی اس کائنات) کو (بھی) پیدا نہ کرتا یعنی یہ کائنات حضور اقدس صلعم کی ذات پاک کی بدولت پیدا ہوئی ہے۔ ترکیب مذکور کا مطلب یہ ہے کہ قسطنطنیہ حضور اکرم کے جانشینوں یا خلفاء (عثمانی) کا آستانہ (باب الحکومت یا دار الخلافہ ہے۔ نگہت بمعنی خوشبو + حضرت ایوب انصاری رضہ سرکار دو عالم صلعم کے مشہور صحابہ میں سے ہیں۔ اور اُن خوش نصیب افراد میں سے ہیں جن کو حضور سرور کائنات صلعم کی میزبانی کا شرف حاصل ہوا۔ ۴۹ھ میں جب امیر معاویہ نے قسطنطنیہ فتح کرنے کے لئے دوسرا لشکر بھیجا، تو اس میں حضرت ابوایوب انصاریؓ بھی شریک ہوئے۔ اور دادِ شجاعت دی لیکن دوران محاصرہ میں وفات پا گئے۔ اُن کی وصیت کے مطابق اُن کو قسطنطنیہ کی دیوار کے نیچے دفن کیا گیا + گشت و خوں کا حاصل۔ جنگ و جدل کا نتیجہ + خوابگاہِ مصطفےٰ ؐ سے مدینہ طیبہ کی سرزمین مراد ہے۔ حاتم ہستی یعنی کائنات + تابان چمکدار + یثرب، مدینہ منورہ کا اصلی نام ہے۔ ماوی جائے پناہ + نقطۂ جاذب اثر تجھ سے محبت کی شعاعیں پھوٹ کر نکلتی ہیں، یا تو، تمام دنیا کے مسلمانوں کی محبت کا مرکز ہے۔ یا تیری طرف مسلمانوں کے دل کھنچے چلے جاتے ہیں۔

تبصرہ:۔ یہ نظم از اوّل تا آخر تاثیر میں ڈوبی ہوئی ہے۔ اقبال نے اس قسم کی نظمیں اس لئے لکھی ہیں کہ مسلمانوں کو اپنے اسلاف کے کارناموں سے کچھ تو آگاہی حاصل ہو۔ شاید اس طریقہ سے ان کے اندر، اپنے اسلاف کے نقش قدم پر چلنے اور دوبارہ سربلندی حاصل کرنے کا جذبہ بیدار ہو جائے۔ یہی وجہ ہے کہ انہوں نے اس نظم کے ہر شعر میں اپنی اثر آفرینی کا کمال دکھایا ہے اس نظم میں اقبال نے دنیائے اسلام کے پانچ مشہور ترین شہروں کا نہایت جامعیت

کے ساتھ تذکرہ کیا ہے۔ دلّی، بغداد، قرطبہ، قسطنطنیہ اور مدینہ طیبہ اگر ان پانچ شہروں کی تاریخ لکھی جائے تو بلا مبالغہ ملت اسلامیہ کی تیرہ سو ۱۳ سال کی تاریخ مرتب ہو جائے گی ذیل کی ۲ دو تاریخیں اس پر شاہد ہیں۔

قیامِ خلافت بہ مقام مدینہ منورہ ۶۳۲ء / ۱۱ھ۔ زوالِ خلافت قسطنطنیہ ۱۹۲۴ء / ۱۳۴۳ھ ان پانچوں شہروں کی تاریخ تو خارج از بحث ہے عام شائقین کی آگاہی کے لئے ان کا تعارف بطور ذیل میں کیئے دیتا ہوں۔

(۱) دہلی، مسلمان کی آمد سے پہلے، مہابھارت کے زمانہ میں اس کا نام ہستنا پور تھا، بعد ازاں اندرپرستھ ہوا۔ مسلمانوں کے عہد حکومت میں کئی دفعہ اجڑی اور کئی مرتبہ آباد ہوئی۔ آخر میں شاہجہاں نے بسایا۔ اور ۱۶۳۷ء میں پایہ تخت بنایا۔ ۱۹۱۱ء میں انگریزوں نے اس کو اپنا دارالحکومت بنایا تھا اور اس کے پہلو میں "نئی دلی" کے نام سے سرکاری دفاتر تعمیر کیئے یہ قدیم تاریخی شہر، جو بڑے بڑے دینی اور دنیاوی سلاطین کا مدفن ہے، جو صدیوں تک مسلمانوں کی تہذیب کا مرکز رہا ہے دریائے جمنا کے دائیں کنارے پر آباد ہے تقسیم سے پہلے اس کی آبادی دس لاکھ کے قریب تھی۔

(۲) بغداد۔ یہ قدیم تاریخی شہر جو کسی زمانہ میں، دنیائے اسلام کا مرکز تھا، دریائے دجلہ کے کنارے آباد ہے، اس کو ابوجعفر منصور نے جو خاندان عباسیہ کا دوسرا فرمانروا تھا ۷۶۲ء میں آباد کیا تھا۔ ہارون الرشید کے عہد میں اس کی عظمت اپنے انتہائی عروج کو پہونچ گئی اس زمانہ میں اس کی آبادی پندرہ لاکھ سے زیادہ تھی۔ اس کا لقب دارالسلام تھا۔ ۱۲۵۸ء میں ہلاکو نے دریائے دجلہ کا پانی مسلمانوں کے خون سے سرخ کر دیا۔ ۱۳۹۳ء میں تیمور نے اس کو فتح کیا ۱۶۳۸ء میں سلطان مراد عثمانی نے اس کو سلطنت عثمانیہ میں شامل کیا۔ ۱۹۱۷ء میں انگریزوں نے اس کو فتح کیا۔ اس وقت اس کی آبادی چار لاکھ کے قریب ہے۔

(۳) قرطبہ۔ اندلس کا مشہور شہر جسے عربوں نے ۷۵۶ء میں فتح اندلس کے بعد اپنا پایہ تخت

بنایا۔ اور ۱۲۳۶ء تک یہ شہر ہر اعتبار سے دمشق اور بغداد کا ہمسر رہا۔ اس کی جامع مسجد جو دنیا کی سب سے بڑی مسجد تھی آج گرجا بنی ہوئی کسی مرد مومن کا انتظار کر رہی ہے۔ اس وقت اس کی آبادی دو لاکھ کے قریب ہے یہ شہر وادی الکبیر کے کنارے واقع ہے۔

(۴) قسطنطنیہ۔ اس تاریخی شہر کا اصلی نام بائی زنطیم تھا جسے اہل میگارا نے ۶۵۶ قم میں آباد کیا تھا۔ ۳۲۸ء میں قسطنطین اعظم نے اس کو سلطنت روما کا پایہ تخت بنایا۔ اور اس کا نام اپنے نام پر کونسٹینٹینوپل رکھا۔ ۱۴۵۳ء میں سلطان محمد خاں فاتح نے اس کو فتح کیا۔ اور یہ شہر ۱۹۲۳ء تک سلطنت ترکی کا پایہ تخت اور مسلمانوں کا سیاسی مرکز رہا۔ یہ شہر آبنائے باسفورس کے کنارے آباد ہے۔ اس وقت اس کی آبادی دس لاکھ کے قریب ہے آج کل اس کا سرکاری نام استنبول ہے۔

(۵) مدینہ منورہ۔ اس مبارک شہر کا قدیمی نام یثرب ہے۔ جب ۶۲۲ء میں سرکار دو عالم صلعم مکہ مکرمہ سے ہجرت فرماکر یہاں تشریف لائے تو اس کا نام مدینۃ النبی ہوگیا۔ یہ شہر مکہ مکرمہ کے شمال میں ۲۵۰ میل کے فاصلہ پر واقع ہے۔ اس کی آبادی تیس ہزار ہے۔ مسجد نبوی تمام مسلمانان عالم کی محبت کا مرکز ہے۔ مکہ کی عظمت مسلّم ہے، لیکن مدینہ بلاشبہ دنیا میں مسلمانوں کا محبوب ترین شہر ہے۔ اقبال لکھتے ہیں۔

خاک یثرب از دو عالم خوشتر است
اے خنک شہرے کہ آنجا دلبر است

پہلا بند۔ بلاد اسلامیہ میں سے پہلا شہر دلّی (دہلی) ہے کہتے ہیں کہ دلّی کی سرزمین مسلمانوں کو بہت محبوب ہے۔ کیونکہ اس کے ذرّے ذرّے میں اُن کے بزرگوں کا خون شامل ہو چکا ہے۔ اس سرزمین سے مسلمانوں کی عظمتِ ماضیہ وابستہ ہے۔ اور اس کی خاک میں وہ مسلمان سلاطین آرام کر رہے ہیں (مثلاً التمش فیروز تغلق، سکندر لودی، شاہجہاں اور حضرت عالمگیرؒ) جن کی حکومت پر اس دنیا کے انتظام کا دار و مدار تھا ان بادشاہوں کی فتوحات اور شان و شوکت

کی یاد ابھی تک میرے دل کو تڑپاتی ہے۔ یہ سچ ہے کہ حکومت جا چکی ہے (ڈیڑھ سو سال سے یعنی ۱۸۰۳ء سے لال قلعہ پر اغیار کا علم لہرا رہا ہے) لیکن اس حکومت کی یاد ابھی تک دل و دماغ میں محفوظ ہے۔

دوسرا بند: دلی کی عظمت میں بغداد بھی برابر کا شریک ہے۔ یہ شہر وہ ہے کہ تہذیب حجازی (لالۂ صحرا) اس کے لئے سامانِ ناز اور باعثِ افتخار تھی۔ اس شہر کی خاک بلا شبہ باغ ارم کی ہم مرتبہ ہے۔ کیونکہ اس میں آنحضرت صلعم کے جانشین (سلاطین عباسیہ) اقامت گزیں تھے ان سلاطین کی شان و شوکت کا یہ عالم تھا کہ قسطنطنیہ کے عیسائی حکمران اُن کے نام سے کانپتے رہتے تھے۔

تیسرا بند: شہر قرطبہ بھی مسلمانوں کی آنکھوں کا نور ہے۔ کیونکہ اس شہر نے مغرب کی اندھیری رات میں تہذیب و تمدن اسلامی کا چراغ روشن کیا، جب یورپ کے تمام شہر جہالت کے سمندر میں غرق تھے اسوقت قرطبہ علم و فن کا مرکز بنا ہوا تھا اور انگلستان، فرانس، جرمنی اور اٹلی کے عیسائی طلبہ اس کے مدرسوں میں علوم و فنون کی تحصیل کرتے تھے۔ یہ سچ ہے کہ جب قرطبہ کے عیسائیوں نے فتح کیا تھا تو انھوں نے اس عظیم الشان شہر کو تباہ کر دیا، اور کتب خانوں کو جلا دیا۔ اور مدرسوں کو بند کر دیا لیکن علوم و فنون کا جو چرچا، اس شہر کی بدولت، یورپ کے مختلف شہروں میں ہو چکا تھا۔ اس کی بناء پر ہم کہہ سکتے ہیں کہ آج یورپ میں جس قدر علوم و فنون ہمیں نظر آ رہے ہیں، یہ سب قرطبہ کے مسلمان علماء، حکماء اور سائنسدانوں کا صدقۂ جاریہ ہے اگر وہ یورپ کو قدیم دنیا کے تمام علوم و فنون سے روشناس نہ کرتے، تو آج یورپ میں نہ کوئی شخص فلسفہ کا نام جانتا، نہ سائنس کا۔ قرطبہ اُس تہذیب کا مدفن ہے جس کی بدولت یورپ کے علمی باغوں کی بیلیں سر سبز ہو رہی ہیں یعنی یورپ میں علوم و فنون کا چرچا ہے۔

چوتھا بند: شہر قسطنطنیہ قیصر قسطنطین (CONSTANTINE) متوفی ۳۳۷ء کا پایہ تخت تھا یہ شہر سلطان محمد الملقب بہ فاتح کی (جس نے اس شہر کو ۱۴۵۳ء میں فتح کیا تھا) عظمت

اور شجاعت کا مستقل ثبوت اور پائیدار نشان ہے۔ یہ سرزمین بھی دلی اور بغداد، اور قرطبہ کی طرح مسلمانوں کی نظروں میں محترم ہے۔ کیوں کہ ایک تو یہ شہر سلاطین عثمانیہ کا پایہ تخت رہ چکا ہے ...... جنہوں نے کم و بیش پانچ سو سال تک اسلام کی عظمت قائم رکھنے کے لئے اپنا خون پانی کی طرح بہایا اور تنِ تنہا (جبکہ اسمٰعیل اور طہماسپ صفوی ایران میں اور جہانگیر بےنوش ہندوستان میں دادِ عیش دے رہے تھے) بیت المقدس کی حفاظت کے لئے سارے یورپ کا مقابلہ کیا۔ اور جب تک عربوں نے ان کے ساتھ غداری نہ کی، انگریزوں کو اپنے ناپاک مقاصد میں کامیابی نہ ہو سکی۔ دوسرے یہ کہ اس شہر میں حضرت ابوایوب انصاریؓ کا مزار ہے

اس شہر کی ہوا، میری رائے میں تو گلاب کی خوشبو کی طرح پاکیزہ ہے کیوں کہ یہاں حضرت ابوایوب انصاریؓ مدفون ہیں جن کی قبر سے ابھی تک یہ آواز آرہی ہے کہ اے مسلمانوں! یہ شہر ملت اسلام کا "دل" ہے۔ کیونکہ مسلمانوں نے اس کو صدیوں کی جنگ و جدل کے بعد فتح کیا ہے۔ واضح ہو کہ مسلمانوں نے قسطنطنیہ پر پہلا حملہ ۴۸ھ میں کیا تھا اور ۴۹ھ میں دوسرا لشکر روانہ کیا گیا تھا۔ اور آخری حملہ ۱۴۵۳ء میں کیا تھا۔ گویا کم و بیش آٹھ سو سال تک مسلمان اس شہر کو فتح کرنے کی کوشش کرتے رہے۔ اس لئے اقبالؔ نے بالکل سچ لکھا ہے کہ

سیکڑوں صدیوں کی کشت و خوں کا حاصل ہے یہ شہر

پانچواں شعر:۔ اقبالؔ کا کمالِ فن دیکھیئے کہ جس شہر کا ذکر بلحاظ تقدس سب سے پہلے کرنا چاہیئے تھا، اس کا تذکرہ بغرض اثر آفرینی سب سے آخر میں کیا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ اس مصرع میں بلا کا زور اور غضب کی تاثیر پیدا ہو گئی ہے۔ ع

وہ زمیں ہے تو مگر اے خوابگاہِ مصطفےٰؐ

اے مدینہ کی پاک زمین! کیا ٹھکانا ہے تیرے مرتبہ کا! انسان درکنار، خود خانۂ کعبہ۔ بیت اللہ شریف تیرے دیدار کو، اپنے حق میں "حج اکبر" سے بڑھ کر سمجھتا ہے تو دنیا میں اس طرح چمک رہی ہے، جیسے انگوٹھی میں نگینہ جس طرح مکہ، اسلام کی ولادت گاہ ہے

اسی طرح تو مسلمانوں کی عظمت و شوکت کی ولادت گاہ ہے۔ اسلامی حکومت کا آغاز سنہ ۲ھ میں مدینہ ہی سے تو ہوا تھا۔ پھر سب سے بڑھ کر یہ کہ تو نے اس شہنشاہ معظم کو اپنے دل میں جگہ دی جس نے ساری دنیا کو اپنے دامن میں پناہ دی۔ وہ شہنشاہ، جس کے غلام، دنیا کے شاہنشاہ ہوئے قیصر کے جانشین ہوئے (سلطان محمد فاتح) اور تخت جمشید کے وارث ہوئے (فاروق اعظمؓ) اول تو اسلام کی قومیت پابند مقام ہے نہیں لیکن اگر مصلحتاً اُسے کسی سرزمین سے وابستہ کیا جائے تو وہ سرزمین تو ہے مسلمان نہ ہندی ہے نہ ایرانی نہ شامی، لیکن وہ یثربی (مدنی) ضرور ہے۔ اور اس نسبت پر فخر کر سکتا ہے بلاشبہ اے یثرب! تو ساری دنیا کے مسلمانوں کا روحانی وطن (مرکز) ہے بلکہ ملجا اور ماوی ہے تو مسلمانوں کے دلوں کو اپنی طرف کھینچنے کی طاقت رکھتا ہے کون مسلمان ہے جو تیرے تصور سے از خود رفتہ نہیں ہو جاتا؟ کون مسلمان ہے، جس کے دل میں تیرے دیدار کی خواہش نہیں ہے؟ اور کون مسلمان ہے، جو تیری خاک میں مدفون ہونا نہیں چاہتا؟

آخری شعر میں اقبال نے اپنا دل کاغذ پر نکال کر رکھدیا ہے۔ یہ شعر نہیں ہے، بلکہ ان کی شاعری کے ترکش کا آخری تیر ہے۔ کہتے ہیں کہ اے مدینہ منورہ! جب تک تو دنیا میں باقی ہے (اور یہ شہر ہمیشہ قائم رہے گا) تیرے صدقہ میں ہم (مسلمان) بھی اس دنیا میں باقی رہیں گے۔ اگر دنیا میں صبح کا وجود ہے، تو اس کے ساتھ شبنم بھی ضرور موجود ہوگی جس طرح شبنم کو صبح سے جدا نہیں کیا جا سکتا، اسی طرح ملت اسلامیہ کو مدینہ سے جدا نہیں کر سکتے۔ کیونکہ یہ ناممکن ہے کہ اس مقدس شہر کا فیضان بند ہو جائے۔

ستارہ

حل لغات | مآل حسن حسن کا نتیجہ یا انجام + ہراسِ فنا + مٹ جانے کا خوف متاع نور روشنی کی پونجی + قبائے زر یعنی چمکیلا لباس + اوج بمعنی بلندی + ولادتِ مہر۔ طلوع آفتاب + وداعِ غنچہ، کلی کا رخصت ہونا + رازِ آفرینشِ گل، پھول کی پیدائش کا بھید + عدم، عدم ہے الخ یعنی

عدم دراصل ہستی کا باعث ہے مثلاً جب کلی معدوم ہو جاتی ہے، تو اس کے عدم سے پھول کی ہستی نمودار ہو جاتی ہے یعنی دنیا میں ایک کی موت دوسرے کی زندگی کا سبب ہے + ثبات، بمعنی دوام یا ہمیشگی یا پائیداری

مطلب اقبالؔ ستارہ سے کہتے ہیں کہ تو اس قدر خوفزدہ کیوں رہتا ہے؟ کیا تجھے یہ خوف ہے کہ چاند طلوع ہو گیا یا صبح ہو گئی تو میں فنا ہو جاؤں گا؟ کیا تجھے یہ معلوم ہو گیا ہے کہ "حسن" کا انجام فنا ہے یعنی حسین ہے حقیقت زوال ہے جس کی، کیا تجھے یہ ڈر ہے کہ کوئی میری روشنی چھین کر لے جائیگا؟ کیا تو یہ سمجھتا ہے کہ چنگاری کی طرح میری عمر بھی بہت مختصر ہے؟۔

اس کے بعد اقبالؔ نے یہ نکتہ بیان کیا ہے کہ اس دنیا کا نظام یہ ہے کہ یہاں ایک کی بلندی دوسرے کی پستی، اور ایک کی زندگی دوسرے کی فنا کا سبب بن جاتی ہے مثلاً جب آفتاب طلوع ہوتا ہے تو لاکھوں ستارے فنا ہو جاتے ہیں۔ جو چیز ان ستاروں کے حق میں فنا کی نیند ہے وہ آفتاب کے حق میں زندگی کی مستی بن جاتی ہے۔ جب غنچہ فنا ہو جاتا ہے تو اس کی فنا سے پھول کی پیدائش ہو جاتی ہے۔ لہٰذا ثابت ہوا کہ ایک کا عدم، دوسرے کی ہستی کا سبب ہے۔

اس نظم سے اقبالؔ ہمیں یہ سبق دیتے ہیں کہ اس کائنات میں سکون ناممکن ہے۔ یہاں ہر گھڑی، انقلاب اور تغیّر رونما ہوتا رہتا ہے۔ اگر اس کائنات میں کسی چیز کو دوام اور پائیداری ہے تو وہ یہی قانون تغیّر ہے پس جب تغیر اور انقلاب اس دنیا کا قانون ہے تو کسی انسان کو اُس تغیّر یا انقلاب سے خوفزدہ یا غمگین نہ ہونا چاہیئے۔ جو اس کی زندگی میں پیدا ہو۔ کیونکہ تغیّر اور انقلاب سے کوئی شخص محفوظ نہیں رہ سکتا۔

دو ستارے

حلّ لغات | قِران۔ علم نجوم کی اصطلاح ہے کسی بُرج میں دو ستاروں کے جمع ہو جانے کو "قران" کہتے ہیں۔ اگر کسی شخص کی پیدائش کے وقت، بُرج طالع میں زہرہ اور مشتری جمع ہو جائیں تو اس

شخص کو نجوم کی اصطلاح میں "صاحبقران" کہتے ہیں مثلاً شاہ جہاں اور تیمور دونوں صاحب قران گذرے ہیں + انجام حرام یعنی اگر ہمارا یہ وصل، ہماری گردش کا انجام بن جائے۔ اور ہم دونوں ہمیشہ ایک ہی برج میں رہیں + مقدر بمعنی قانونِ قدرت + ثبات آشنائی خواب ہے یعنی آشنائی یا اجتماع، عارضی یا چندروزہ ہے۔

اس نظم کا مطلب شاعر نے خود ہی آخری مصرع میں بیان کر دیا ہے یعنی اس دنیا کا قانون یہ ہے کہ کوئی شئے جاندار ہو، یا بیجان، دوسری شئے کے ساتھ ہمیشہ وابستہ نہیں رہ سکتی۔ اس نکتہ کو اقبال نے تاروں کے قران باہمی سے واضح کیا ہے جس طرح دو ستارے ہمیشہ ایک برج میں نہیں رہ سکتے۔ اسی طرح انسان ہمیشہ ایک دوسرے کیساتھ نہیں رہ سکتے۔ ایک نہ ایک دن ان دونوں میں جدائی ضرور ہوجائیگی۔

گورستان شاہی

حلِ لغات اور شرح مشکلات | خرقۂ دیرینہ۔ پرانا لبادہ۔ بادلوں کو خرقۂ دیرینہ سے اس لئے تعبیر کیا کہ جب سے آسمان ہے، بادل بھی اسی وقت سے اس پر چھائے ہوئے ہیں مکدر بمعنی دھندلا یا غبار آلود + جبین ماہ کا آئینہ یعنی چاند کا چہرہ + بربط قدرت یعنی ندرت لو کی رعایت سے قدرت کو بربط سے تعبیر کیا ہے۔ خاموشی کو قدرت کی آواز قرار دینا یہ شاعر کا دلکش انداز بیان ہے۔ جولانگاہ عالمگیر سے گولکنڈہ کا مشہور تاریخی قلعہ مراد ہے، جسے حضرت عالمگیرؒ نے ۱۶۸۷ء میں فتح کیا تھا۔ سکانِ کہن یعنی قدیمی باشندے۔ دلدادہ۔ محبت کرنے والا گل بدامن یعنی معمور۔ خراجِ اشک ادا کر، یعنی آنسو ٹپکا۔ گردوں پایہ یعنی بہت بلند، مراد ہے محترم سے۔ برگشتہ قسمت قوم سے مسلمان قوم مراد ہے۔ حذر بمعنی پرہیز۔ آرزوئے ناصبور ایسی آرزو جو انسان کو بیقرار کر دے۔ آفتابوں سے بادشاہ مراد ہیں جبیں گستر، لغوی معنی ہیں پیشانی بچھانے والا مراد ہے آسمان کی اطاعت سے فغفوری؛ فغفور "چین کے قدیم شہنشاہوں کا لقب ہے۔ قیصر، روم کے شہنشاہوں کا لقب ہے + یورش، بمعنی حملہ کیشتِ

عمر: عمر کی کھیتی یعنی عمر + جادۂ عظمت۔ بزرگی کی سڑک یعنی عظمت + عود۔ ایک ایرانی ساز کا نام ہے۔ عود کی تقریر سے، نغمہ و سرود مراد ہے + نالۂ شبگیر، رات کے وقت عاشق کی آہ و فریاد + عرصۂ پیکار۔ میدان جنگ + سینہ ویراں یعنی مردہ انسان + زحمت کشِ بیداد، یعنی روح جسم کے تکلیف اٹھاتی رہتی ہے۔ کوچہ گردِ نے الخ یعنی جب سانس بانسری میں جاتی ہے تو فریاد کی شکل میں باہر نکلتی ہے + موجیں کنایہ ہے بنی آدم سے + خسِ آتش سوار، لغوی معنی وہ تنکا جو آگ پر سوار ہو۔ مطلب یہ ہے کہ اس کا فنا ہو جانا یقینی ہے + رنگہائے رفتہ سے مراد ہے وہ شے جو فنا ہو چکی ہو + زیاں خانہ، نقصان کا گھر یعنی دنیا + ملت گردوں وقار، یعنی نامور قوم + جدت بمعنی نئی بات + مادرِ گیتی مراد دنیا + آبستن بمعنی کسی عورت کا حاملہ ہونا قافلوں سے قومیں مراد ہیں۔ رہگذر سے دنیا مراد ہے + کوہِ نور وہ مشہور ہیرا جو آج کل ملکۂ انگلستان کے تاج میں لگا ہوا ہے۔ اس کا وزن ۱۰۶ قیراط ہے + بابل۔ جنابِ مسیحؑ سے ۴ ہزار سال پہلے اس ملک کا دار الحکومت تھا، جسے اب عراق کہتے ہیں۔ اس کی عظمت کا اندازہ اس بات سے ہو سکتا ہے کہ اس شہر کا طول ۱۵ میل تھا، اور شہر پناہ کے ۲۵۰ دروازے تھے۔ مہرِ ایران سے ملک ایران مراد ہے۔ یہ بڑی دلکش ترکیب ہے کیونکہ ایران میں آفتاب (مہر) پرستی ہوتی تھی۔ ابر آذاری۔ آذار، قدیم کالدی یا سریانی زبان میں اس مہینہ کا نام ہے۔ جو مارچ سے مطابقت رکھتا ہے، مراد ہے موسم بہار کا بادل + جوئبار بمعنی دریا عزلت خانہ گوشۂ تنہائی + مطرب۔ گانے والا۔ رنگین نوا خوش آواز + اڑتی ہوئی تصویر سے بلبل مراد ہے۔ شاعر نے بلبل کو اڑتی ہوئی تصویر سے تشبیہ دی ہے۔ شوخ تحریر سے بھی بلبل ہی مراد ہے یعنی بلبل قدرت کی بہت دلکش مخلوق ہے۔ گلستاں زادوں سے باغ کے طائر مراد ہیں۔ شباں زادہ۔ چرواہے کا لڑکا۔ خاکداں، دنیا۔ مستور پوشیدہ۔ اشکباری کے بہانے یعنی رونے کا سبب + بینا بمعنی روشن۔ گذرے ہوئے طوفان سے مسلمان قوم مراد ہے + ابر کی آغوش سے ملت اسلامیہ مراد ہے گہر یا گوہر سے مسلمان افراد مراد ہیں، جو آئندہ پیدا ہوں گے + شانِ جلالی۔ خدا کی صفات دو قسم کی ہیں جلالی اور جمالی، یعنی وہ شان جس میں جلال (عظمت و شوکت) کا رنگ پایا جائے۔

تبصرہ: یہ نظم سب سے پہلے رسالہ مخزن بابت ماہ جون ۱۹۰۱ء میں شائع ہوئی تھی۔ اقبال

نے اس کی تمہید میں لکھا تھا کہ "حیدر آباد (دکن) کے مختصر قیام کے دنوں میں میرے عنایت فرما جناب نذر علی حیدری، معتمد محکمہ فنانس، مجھے ایک شب، اُن شاندار مگر حسرت ناک گنبدوں کی زیارت کے لئے لے گئے، جن میں سلاطین قطب شاہیہ سو رہے ہیں۔ رات کی خاموشی نے بادلوں میں سے چھَن چھَن کے آتی ہوئی اُس پُرحسرت منظر کیساتھ ملکر میرے دل پر ایسا اثر کیا جو کبھی فراموش نہ ہوگا۔ ذیل کی نظم ان ہی بے شمار تاثرات کا ایک اظہار ہے۔

بلاشبہ یہ نظم بڑی اثر آفریں ہے اور معنوی خوبیوں کے علاوہ اس میں صنائع لفظی اور محاسن شعری بھی بکثرت موجود ہیں تفصیل تو دشوار ہے۔ چند اشاروں پر قناعت کرتا ہوں:۔

(۱) اس نظم میں اقبالؔ نے منظر کشی اور مرقع نگاری کا کمال دکھایا ہے۔

(۲) یہ نظم تشبیہات اور استعارات، رمز و ایما، اور کنایات سے معمور ہے۔

(۳) بعض مصرعے صنعت تضاد کے حامل ہیں۔ مثلاً۔

ع بربط قدرت کی دھیمی سی نوا ہے خاموشی

یا ع اس ستمگر کا ستم انصاف کی تصویر ہے

واضح ہو کہ نوا، خاموشی کی، اور ستم، انصاف کی ضد ہے۔

(۴) بعض مصرعوں میں صنعت ایجاز پائی جاتی ہے یعنی طویل داستان چند لفظوں میں بیان کردی ہے۔ مثلاً۔

ع شاخ پر بیٹھا کوئی دم، چہچہایا، اُڑ گیا

یا ع زندگی کی شاخ سے پھوٹے، کھلے، مرجھا گئے

(۵) اس نظم میں اقبالؔ نے زندگی کی بے ثباتی کو بڑے مؤثر طریقے سے واضح کیا ہے۔

(۶) ساری نظم اول سے آخر تک سوز و گداز میں ڈوبی ہوئی ہے۔

(۷) اس نظم میں، فلسفہ اور شاعری کا خوشگوار امتزاج پایا جاتا ہے۔

(۸) چونکہ یہ نظم اقبالؔ نے ایک خاص جذبہ کے تحت لکھی تھی اس لئے اس کے اکثر اشعار

میں جوشِ بیان کی بہت عمدہ مثالیں ملتی ہیں۔ مثلاً!

ع جادۂ عظمت کی گویا آخری منزل ہے گور

پہلا بند:۔ رات کا وقت ہے۔ آسمان پر بادل چھائے ہوئے ہیں، جن کی وجہ سے چاند دھندلا نظر آ رہا ہے۔ ابھی صبح ہونے میں بہت دیر ہے سارے درختوں پر خاموشی کا عالم طاری ہے۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ اس وقت خاموشی ہی قدرت کی آواز ہے۔ ایسا کیوں ہے؟ شاید اسلئے کہ اس دنیا کا ہر ذرہ (ہر شیئے، ہر فرد) رنج و غم میں ڈوبا ہوا ہے۔ کون ہے جسے اس دنیا میں کسی نہ کسی رنج یا مصیبت سے سابقہ نہیں پڑا؟ ساری ہستی (کائنات) غم اور الم میں غرق ہے زندگی نام ہی رنج و کلفت کا ہے۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ ہستی اس خاموشی کے پردہ میں آہیں بھر رہی ہے

دوسرا بند:۔ اس وقت میں گولکنڈہ کے اس عظیم الشان تاریخی قلعہ کے سامنے کھڑا ہوں جسے حضرت عالمگیرؒ نے ۱۶۸۷ء میں فتح کیا تھا۔

جولانگاہ: لغوی معنی وہ جگہ جہاں گھوڑے دوڑائے جائیں۔ اس ایک لفظ میں اقبال نے گولکنڈہ کے محاصرہ کی تاریخ بند کر دی ہے۔ حق یہ ہے کہ انھیں موزوں الفاظ کے انتخاب میں ید طولیٰ حاصل تھا۔ دنیا کے ہر قادر الکلام شاعر میں یہ وصف پایا جاتا ہے۔

گولکنڈہ، جو کسی زمانہ میں بڑا شاندار شہر تھا۔ حیدر آباد (دکن) سے مغرب کی جانب سات میل کے فاصلہ پر واقع ہے۔ چونکہ اس ریاست کا آخری فرمانروا ابوالحسن مسلمان ہونے کے باوجود دشمنوں سے ساز باز رکھتا تھا اور اس نے قوم فروشی کو شعار زندگی بنا لیا۔ اس لئے حضرت عالمگیرؒ نے ۱۶۸۷ء میں اس غدار کا خاتمہ کر دیا۔

یہ قلعہ ایک پہاڑی پر بنا ہوا ہے۔ اور ہندوستان کے ان چند قلعوں میں سے ہے جو ناقابل تسخیر خیال کیے جاتے تھے۔ یہ قلعہ بہت پرانا ہے۔ اور کسی زمانہ میں اس کے اندر ہر جگہ زندگی کے آثار نظر آتے تھے لیکن اب بالکل ویران ہے۔ یہ قلعہ اپنے قدیمی باشندوں کی خاک کا عاشق ہے یعنی ان کی قبریں اس کے اندر بنی ہوئی ہیں (اشارہ ہے بادشاہوں کے گنبدوں کی طرف)

اور پہاڑ کی چوٹی پر اس طرح کھڑا ہے جیسے کوئی سنتری نگہبانی کر رہا ہو۔

تیسرا بند: نیلے آسمان پر ثریا (نجم آسماں) جلوہ گر ہے اور ابر کے روزن سے دنیا کے انقلابات کا تماشا دیکھ رہا ہے۔ اس نے سیکڑوں نامور افراد اور اقوام کے عروج و زوال کا تماشا دیکھا ہے اس لیے اس نے بنی آدم کی ناکامی کی داستان حفظ یاد ہے اگرچہ ستاروں کو کسی جگہ مستقل قیام کی اجازت نہیں ہے لیکن یہ ستارہ تھوڑی دیر کے لیے فاتحہ خوانی کے لئے ٹھہر گیا ہے۔ حق یہ ہے کہ یہ دنیا زندگی کی دلفریبیوں سے معمور ہے اور اب تک سیکڑوں قومیں اور تہذیبیں بر سر عروج آچکی ہیں اور ختم ہو چکی ہیں مثلاً مصری، کالدی، بابلی وغیرہ۔

چوتھا بند: یہ قلعہ قطب شاہی خاندان کے بادشاہوں کا مدفن ہے۔ ان بادشاہوں کی بے کسی پر آنسو بہانے کو دل چاہتا ہے۔ بیشک یہ ایک قبرستان ہے لیکن ہے بہت بلند مرتبہ کیونکہ یہاں ایک بدقسمت قوم کا امیر بادشاہ سو رہے ہیں۔ ان مقبروں کی شان اس قدر حیرت آفریں ہے کہ پلک مارنے کی بھی تاب نہیں ہے۔ اور ان مقبروں میں انسان کی ناکامی کی ایسی تصویر نظر آتی ہے جس کا بیان لفظوں کے ذریعہ سے ناممکن ہے۔

پانچواں بند: یہاں ان مقبروں میں وہ بادشاہ سو رہے ہیں، جو اپنی زندگی میں بڑی بڑی آرزوئیں رکھتے تھے۔ اور وہ آرزوئیں ان کو ہر وقت بے چین اور مصروف کار رکھتی تھیں۔ آج وہ آفتاب (بادشاہ) قبروں کی تاریکی میں پوشیدہ ہیں۔ جن کے دروازہ پر آسمان بھی دست بستہ کھڑا رہتا تھا۔

یہ حسرتناک منظر دیکھ کر شاعر دریائے عبرت میں ڈوب جاتا ہے۔ اور بے اختیار پکار اٹھتا ہے:۔

کیا یہی ہے اُن شہنشاہوں کی عظمت کا مآل؟

کیا زندگی کا انجام یہی ہے کہ انسان، کچھ عرصہ تک اس دنیا میں ہنگامہ برپا کر کے اسکے بعد قبر کی آغوش میں چلا جائے؟ سچ یہ ہے کہ دنیا کا بڑے سے بڑا بادشاہ، فغفور چین ہو یا قیصر روم، موت کے حملہ کی تاب نہیں لا سکتا۔ بڑے بڑے بادشاہوں کی زندگی کا انجام بھی قبر ہی ہے

انسانی عظمت کو اگر ایک سڑک قرار دیا جائے تو اس کی آخری منزل "قبر" ہے۔

چھٹا بند: یہ موت اس قدر یقینی ہے کہ دنیا کا کوئی انسان اس سے بچ نہیں سکتا۔ اور جب موت آجاتی ہے اور انسان مرجاتا ہے تو پھر رقص و سرود کی محفلیں غمخواروں کی آہ و فریاد، ہنگامہ جدال، و قتال اور نعرہ تکبیر مختصر یہ کہ کوئی آواز، مردوں کو زندہ نہیں کر سکتی جو شخص ایک دفعہ مر گیا۔ پھر زندہ نہیں ہو سکتا۔

ساتواں بند: غور سے دیکھو تو اس دنیا میں جو شخص بھی ہے، وہ مصیبت میں مبتلا ہے جس طرح سانس، بانسری میں داخل ہو کر فریاد بن جاتی ہے اسی طرح روح جسم میں داخل ہو کر مبتلائے آلام ہو جاتی ہے۔ انسان کی زندگی نہایت مختصر ہے، بس یوں سمجھو، انسان اس دنیا میں اس طرح آتا ہے جیسے کوئی پرندہ اڑتا اڑتا آیا، کسی شاخ پر بیٹھا، کوئی دم چہچہایا اور اُڑ گیا، بس انسان کی دنیاوی زندگی کی بھی یہی کیفیت ہے۔

اب شاعر حیات انسانی کی بے ثباتی پر تبصرہ کرتا ہے، اور کہتا ہے، کہ افسوس! ہم لوگ اس دنیا میں چند روزہ کے لئے آئے ہیں۔ ہماری زندگی ایسی ہے، جیسے آج کسی شاخ سے کلی برآمد ہوئی، کل پھول بنی، پرسوں مرجھا گئی موت ہر شاہ گدا کی زندگی کا انجام ہے۔ یہ موت ہے تو ستمگر، (لطف زندگی کا خاتمہ کر دیتی ہے) لیکن اس کے ستم میں بھی انصاف کا پہلو پوشیدہ ہے وہ یہ کہ یہ کسی کے ساتھ رعایت نہیں کرتی۔ اس کی حکومت میں شیر اور بکری سب ایک گھاٹ پانی پیتے ہیں یعنی ہر شئے فانی ہے۔

آٹھواں بند: اگر ہستی کو ایک دریا، یا غیر محدود فرض کیا جائے تو اس سمندر میں لاکھوں موجیں اٹھتی رہتی ہیں، یعنی بے گنتی لوگ پیدا ہوتے رہتے ہیں۔ اور مرتے رہتے ہیں۔ ہم خوب جانتے ہیں کہ زندگی کا انجام ملتا ہے، اس کے باوجود ہر شخص کو جینے کی ہوس ہے۔ سچ تو یہ ہے کہ زندگی کا نہ کوئی اعتبار ہے نہ اس کی کوئی حقیقت ہے بس ایسا سمجھو جیسے چنگاری کہ ادھر چمکی اُدھر بجھ کر ختم ہو گئی۔ یا گھاس کا تنکا جو ادھر آگ میں پڑا، اُدھر ختم ہو گیا۔ مثلاً چاند کو دیکھو، یہ کیسی قدر حسین ہے! اور اس کا

وجود، قدرت خداوندی کی دلیل ہے کہ زمین سورج کے گرد گردش کر رہی ہے، اور یہ زمین کے گرد گردش کر رہا ہے اس کے باوجود کبھی کسی جرم فلکی سے متصادم نہیں ہوتا۔ اس کے باوجود جب صبح ہوتی ہے تو یہ بے نور ہو جاتا ہے۔

نواں بند: جس طرح فرد اور افراد کی زندگی بے اعتبار ہے، اسی طرح قوموں کی زندگی بھی بے ثبات ہے۔ ان کا عروج، دراصل، گذشتہ اقوام کے عروج کی تصدیق ہے۔ یعنی جس طرح گذشتہ قومیں فنا ہو گئیں، اسی طرح موجودہ قومیں بھی فنا ہو جائیں گی۔ حقیقت یہ ہے کہ دنیا میں کوئی قوم ہمیشہ کیلئے برسر اقتدار نہیں رہ سکتی چنانچہ دنیا، قوموں کی بربادی کی اس قدر عادی ہو گئی ہے کہ اب وہ کسی قوم کی بربادی سے مطلق متاثر نہیں ہوتی۔ اس دنیا میں ہر وقت انقلاب رونما ہوتا رہتا ہے۔ دنیا کی ترکیب ہی اس طرح ہوئی ہے کہ اس میں ہر وقت نئی باتیں ظاہر ہوتی رہتی ہیں۔ نت نئے حادثات رونما ہوتے رہتے ہیں۔ اس عالم میں ہمیشہ ملے نئے آدمی برسر عروج آتے رہتے ہیں مثلاً ہینی بال، سکندر، چنگیز، تیمور، نپولین، اور ہٹلر اور یہ سلسلہ اسی طرح چلتا رہے گا۔ کیا خوب کہا ہے شیخ سعدی نے: ہر کہ آمد عمارتِ نو ساخت ؂ رفت و منزل بدیگرے پرداخت

چونکہ شاعر نے گیتی کو مادر قرار دیا ہے۔ اس لئے آبستن کا لفظ نہایت موزوں ہے۔ یعنی دنیا وہ عورت ہے جس کے رحم میں ہمیشہ نئی نئی قومیں پلتی رہتی ہیں۔

دسواں بند: دنیا میں آج تک ہزاروں قومیں برسر عروج آ چکی ہیں اور اپنی اپنی پنج روزہ نوبت بجا کر عدم کی آغوش میں چلی گئیں۔ آج کوئی شخص ان کا نام بھی نہیں جانتا صرف تاریخوں میں ان کی داستانیں باقی رہ گئی ہیں مثلاً مصر، بابل، ایران، اور روۃ الکبریٰ۔ ان اقوام کے تذکرہ کے بعد شاعر اپنی قوم کا ذکر کرتا ہے۔ اور جب اس کے زوال کا تصور کرتا ہے تو اس کے نازک دل پر ایک چوٹ سی لگتی ہے۔ اور وہ بے اختیار کہہ اٹھتا ہے۔

آہ! مسلم بھی زمانہ سے یونہی رخصت ہوا۔

ارباب نظر اور اصحاب علم جانتے ہیں کہ اس دو حرفی لفظ "آہ" کے اندر مسلمانوں کی

عظمت کی ساری داستان پوشیدہ ہے۔ کیا آج کوئی شخص یورپین ہو یا ایشیائی۔ یہ یقین کر سکتا ہے کہ سولھویں صدی عیسوی تک ترکوں کی سطوت کا یہ عالم تھا کہ قسطنطنیہ سے دو ہزار میل دور جزیرۂ انگلستان کی عورتیں اپنے ضدی بچوں کو سلانے کے لئے یہ لوری دیا کرتی تھیں۔

"سو جا منّے سو جا ترک آرہے ہیں!"

HUSH! BABY HUSH! THE TURKS ARE COMING!

کیا آج کوئی شخص، یہ باور کر سکتا ہے کہ ہارون الرشید نے قیصر روم کے گستاخانہ خط کا جواب بایں الفاظ دیا تھا:۔

"مسلمانوں کے امیر ہارون کی طرف سے، رومی کُتّے کے نام!"

بات یہ ہے کہ اگر ہمارے اندر ابن علقمی، حسین علی، عماد الملک، شجاع الدولہ مرزا نجف خاں میر جعفر، میر صادق، اور نواب الٰہی بخش معروف جیسے بزرگ پیدا نہ ہوتے تو شاید ہماری حالت اتنی زبوں نہ ہو گئی ہوتی۔

گیارھواں بند:۔ اس بند میں شاعر نے نفس مضمون سے گریز کر کے، زندگی کی گوناگوں دلچسپیوں کی تصویر کھینچی ہے۔ اس بند کا انداز بیان بہت دلکش ہے۔ شاعر نے تشبیہ، استعارہ اور کنایہ کا انبار لگا دیا ہے۔ رگ گل کو موتی کی لڑی باندھا ہے، سورج کی کرنوں کو شبنم کے جال میں الجھایا ہے، دریا کے سینے کو شعاعِ مہر کا گہوارہ بنایا ہے، صنوبر کو محوِ زینت اور بادِ بہار کو آئینہ قرار دیا ہے، کوئل اور بلبل باغ میں زمزمہ سنجی کر رہی ہیں ان کے دم سے باغ میں زندگی نظر آتی ہے۔ غرضیکہ گلشن اور کوہسار، ہر جگہ زندگی اپنے جلوے دکھا رہی ہے اور عجیب بات یہ ہے کہ ان ہی زندگی کے ہنگاموں میں موت بھی صیاد کی طرح گھات میں بیٹھی ہوئی ہے۔ اگر ایک طرف باغ میں کوئل گا رہی ہے اور بلبل گلاب سے پیمانِ وفا باندھ رہی ہے تو دوسری طرف، ان ہی پھولوں کی پتیاں، مرجھا کر اس طرح زمین پر گر رہی ہیں، جس طرح سوتے بچے کے ہاتھ سے . . . . رنگین کھلونے زمین پر گر پڑیں۔ داد طلب بات یہ ہے کہ ایسا دلخراش مضمون باندھتے وقت بھی اقبال کی شاعرانہ طبیعت، اپنے فرض

سے غافل نہیں ہوئی یعنی پھولوں کی مرجھائی ہوئی پتیوں کے گوندنے کو، دستِ طفلِ خفتہ کے ہاتھوں سے کھلونے کے گرنے سے تشبیہ دینا، بلاشبہ اقبالؔ کے کمالِ فن کی دلیل ہے۔

اس دنیا میں اگرچہ ہر قسم کی عیش و عشرت کا سامان موجود ہے لیکن اقبالؔ کہتے ہیں کہ یہ بے اندازہ عیش، میرے دل سے ملتِ اسلامیہ کی بربادی کے غم کو دور نہیں کر سکتا۔

بارھواں بند: اگرچہ اقبالؔ نے صراحت نہیں کی لیکن میرا ظن غالب یہ ہے کہ "اپنے شاہوں" سے ان کی مراد صرف وہ بادشاہ ہیں جنہوں نے اسلام اور مسلمانوں کی سربلندی کے لئے حکومت کی۔ مثلاً سلطان صلاح الدین ایوبی، سلطان نور الدین زنگی، سلطان محمود غزنوی، سلطان عالمگیرؒ اور سلطان ٹیپو شہیدؒ۔

اقبالؔ کہتے ہیں کہ ہمارے دلوں میں اپنی قوم کی عظمت کی داستان ہنوز تازہ ہے اور ہم اپنے نامور اور عادل بادشاہوں کو کبھی فراموش نہیں کریں گے یہ آثار قدیمہ ہمارے لئے عبرت کے سامان مہیا کرتے ہیں۔ اور جب ہم اپنی قوم کی بربادی پر آنسو بہاتے ہیں تو ہماری آنکھ بینا ہو جاتی ہے یعنی ہمارے اندر اصلاح کا جذبہ پیدا ہوتا ہے۔ یہ ہمارے آنسو نہیں ہیں بلکہ موتی ہیں جو ہم دنیا کے سامنے پیش کرتے ہیں۔ ہم عظیم الشان ملتِ اسلامیہ کے نام لیوا ہیں۔ اور اگرچہ نہایت زبوں حال ہیں لیکن گئی گذری حالت میں بھی ہمارے اندر اتنی صلاحیت باقی ہے کہ ہم دنیا میں دوبارہ انقلاب برپا کر سکتے ہیں۔ ہمارے اندر ابھی اسقدر خوبیاں باقی ہیں کہ ہم خاکِ صحرا (اس دنیا کو جو ہمارے اُجڑ جانے سے اُجڑ گئی ہے) کو دادیِ گل (نہایت دلکش مقام) بنا سکتے ہیں۔ دہقان (اقوامِ عالم) کھیتی کی طرف سے ناامید ہو چکا ہے، یعنی لوگ یہ سمجھتے ہیں کہ شاید مسلمان اب دوبارہ سربلند نہ ہو سکیں۔ لیکن ہمارے اندر اب بھی اس قدر طاقت باقی ہے کہ ہم دنیا کو پھر عدل و انصاف سے معمور کر سکتے ہیں۔

آخری شعر میں شاعر نے اپنی اس رجائیت (امیدِ ترقی کے اثبات) کی وجہ بیان کی ہے وہ کہتا ہے کہ امتِ اسلامیہ کے لئے دنیا میں سربلندی کے دو زمانے (دَور) مقدر ہیں پہلے دور میں مسلمانوں نے شانِ جلال دکھائی یعنی تلوار کے زور سے دنیا کو فتح کیا۔

اب دوسرے دور میں شانِ جمال دکھائینگے یعنی دلائل عقلیہ کے زور سے دنیا کو فتح کرینگے۔

بخوفِ طوالت جلال اور جمال کی تفصیل تو درج نہیں کر سکتا۔ صرف اسقدر لکھتا ہوں کہ چونکہ آنحضرت صلعم کی زندگی میں یہ دونوں شانیں پائی جاتی ہیں مکی زندگی شانِ جمال کی اور مدنی زندگی شانِ جلال کی مظہر ہے۔ اس لئے آپ کی امت میں بھی ان دونوں شانوں کا پایا جانا ضروری ہے

نمودِ صبح

حل لغات | زیرِ دامانِ اُفق: اُفق کے دامن کے نیچے سے + دخترِ دوشیزۂ لیل و نہار: دن اور رات کو والدین فرض کر کے، صبح کو ان کی کنواری بیٹی باندھا ہے + درود: درون بمعنی کاٹنا کا حاصل مصدر ہے فصل (کھیتی) کی رعایت سے "درود" لائے ہیں + آئینہ کار: مراد ہے جلوہ گر + کشتِ خاور: سے مشرق مراد ہے ۔ محمل پرواز شب: محمل، جس میں پردہ نشین عورتیں (پُرانے زمانے میں سفر کیا کرتی تھیں۔ عموماً اونٹ کی پشت پر باندھا کرتے ہیں ڈولی کی طرح ہوتا ہے۔ چاروں طرف پردے پڑے ہوتے ہیں۔ لغوی معنی رات کی روانگی کا محمل، مراد ہے رات۔ باندھا سر دوشِ غبار: یعنی غبار کے کاندھوں پر رات کو روانہ کر دیا۔ جب آفتاب کے طلوع ہونے کا وقت آتا ہے تو اس سے کچھ عرصہ پہلے تاریکی، غبار، یا دھندلکے میں تبدیل ہو جاتی ہے ۔ | آسمان نے رات کے محمل کو دھندلکے ہی میں روانہ کر دیا۔ کتنا دلکش اندازِ بیان ہے! اسی طرح تاروں کے شراروں کو "بونے" سے تعبیر کرنا، کتنا انوکھا اور دلکش اسلوب ہے + نجم سحر: سے وہ خاص ، ستارہ مراد ہے جو طلوعِ آفتاب سے پہلے پچھلی رات کے وقت طلوع ہوتا ہے ، اسے (LUCIFER) کہتے ہیں + نجم سحر کو۔ عابد شب زندہ دار سے تشبیہہ دی ہے یعنی وہ عابد جو ساری رات عبادت میں گذارے۔ کیا سماں ہے" یعنی طلوع آفتاب کا سماں ایسا ہے جیسے کوئی شخص آہستہ آہستہ نیام سے چمکتی ہوئی تلوار نکالے۔ طلوعِ آفتاب کو اس تیغِ آبدار سے تشبیہہ دی ہے، جو نیام سے بتدریج باہر نکلے مطلع خورشید: اس کے دو معنی ہیں (۱) مطلع بمعنی غزل کا پہلا شعر۔ اگر "مضمون صبح" کی ترکیب کو مدِ نظر رکھا جائے تو یہ معنی لے سکتے ہیں (۲) مطلع بمعنی جائے طلوع اگر "خورشید" کو مدِ نظر رکھیں تو یہ معنی

لے سکتے ہیں۔ خورشید کے مطلع میں صبح کا مضمون اس طرح پوشیدہ ہے جیسے بوتل میں شراب ہے
نۂ دامانِ بادِ اختلاط انگیز صبح "صبح کی محبت پیدا کرنے والی ہوا کے دامن کے نیچے یعنی صبح کے وقت
شورشِ ناقوس یعنی سنکھ کا شور۔ ناقوس مندروں میں بجایا جاتا ہے۔ آوازِ اذاں سے ہمکنار ہے
یعنی صبح کے وقت ناقوس اور مؤذن دونوں کی آوازیں بیک وقت بلند ہوتی ہیں۔ طائران
نغمہ سنج گانے والے پرندے۔ ترنم ریز موسیقی یا نغمہ برسانے والا۔ قانون کے دو معنیٰ ہیں
(۱) آئین (۲) ایک باجہ کا نام ہے یہاں قانون سے دوسرے معنیٰ مراد ہیں کیوں کہ آگے لفظ "تار
تار" موجود ہے یعنی صبح کا باجہ (قانون) کے ہر تار سے نغمہ نکل رہا ہے۔

تبصرہ یہ نظم اقبال نے ۱۹۱۱ء کے آخر میں لکھی تھی۔ درحقیقت بڑی مرصع نظم ہے شاعری
کی تمام خوبیاں مثلاً تشبیہ، استعارہ، کنایہ، بندش کی چستی الفاظ کی شوکت، تراکیب کی جدت
خیالات کی بلندی اور منظر کشی بدرجۂ اتم اس نظم میں موجود ہیں۔ فارسی ترکیبوں، اور صنائع و بدائع
لفظی و معنوی کی بدولت اقبال نے ایسا طلسم باندھا ہے کہ پڑھنے والا مبہوت ہو جاتا ہے
چونکہ اس نظم میں کسی فلسفیانہ نکتہ کی توضیح کے بجائے طلوع سحر کا منظر دکھایا ہے۔ اس لیے
لفظوں کا پردہ ہٹا دیا جائے تو مطلب سمجھنا چنداں مشکل نہیں ہے؛ مثلاً

(۱) افق کے دامن سے صبح نمودار ہو رہی ہے۔

(۲) آسمان پر جسقدر ستارے تھے سب غائب ہو گئے۔ کیونکہ مشرق میں آفتاب طلوع ہو گیا۔

(۳) جب آفتاب طلوع ہو گیا تو رات غائب ہو گئی۔

(۴) رات کے وقت آسمان نے تاروں کی کھیتی بوئی تھی، آفتاب اس کا حاصل ہے۔

(۵) سب ستارے غائب ہو چکے ہیں، صرف ایک نجم سحر رہ گیا ہے لیکن اس کی روشنی بھی بتدریج ماند پڑتی جاتی ہے

(۶) آفتاب اس طرح افق کے پردہ سے نکل رہا ہے، جس طرح کوئی شخص نیام سے

تلوار کھینچ رہا ہو۔

(۷) آفتاب کے ظہور میں صبح کا وجود اس طرح پوشیدہ ہوتا ہے جس طرح شراب بوتل میں۔

(۸) صبح کے وقت۔ ناقوس اور اذان کی آوازیں ایک ساتھ بلند ہوتی ہیں۔

(۹) کوئل کی آواز سن کر سب گانے والے پرندے بیدار ہو گئے۔ قانونِ قدرت یہی ہے کہ صبح کو طائرانِ خوش الحان نغمہ سنجی کرتے ہیں۔

تضمین بر شعر انیسی شاملو

حلِ لغات اور شرحِ مشکلات | منزل بمعنی قیام + جادہ پیمائی بمعنی صحرانوردی دیار پیر سجزمع۔ سیدی و مولائی سلطان الہند خواجہ غریب نواز حضرت معین الدین حسن کا شہر یعنی اجمیر سوانح نگاروں نے حضرت کو سنجری لکھا ہے۔ یہ دراصل کتابت کی غلطی ہے صحیح لفظ سجزی ہے کیوں کہ آپ سجزستان میں (سیستان) پیدا ہوئے تھے۔ اور سجستان کو سجز بھی کہتے ہیں۔ سجزی کا سجری ہو گیا۔ حضرت اقدس نے ۵۶۲ھ میں اجمیر کو اپنے قدموں کی برکت سے مالا مال کیا۔ اور ۶۳۲ھ میں رحلت فرمائی۔ زندگی کے ستر سال تبلیغ و اشاعت اسلام میں بسر کئے۔ اور بلا شبہ آپ نے اور آپ کے خلفاء نے سارے ہندوستان کو اسلام کے نور سے منور کر دیا۔ اسی لئے آپ کا لقب "وارث النبی فی الہند" ہے۔ درمانِ دردِ ناشکیبائی یعنی اجمیر میں حضرت کا آستانہ مبارک، عاشقوں کے لئے موجب تسکین ہے۔ وہاں جملہ روحانی امراض کا علاج (درماں) ہو سکتا ہے۔ ناآشنائے لب تقاضا یعنی ابھی آرزو لب تک نہیں آئی تھی۔ منت پذیر تاب گویائی یعنی زبان بولنے کی طاقت کا احسان اٹھانے والی تھی۔ شعر کا مطلب یہ ہے کہ میں ابھی کچھ عرض نہیں کرنے پایا تھا حرم کے رہنے والوں کو یعنی اسلام کے سچے عاشقوں کو جو اس کی اشاعت کے آرزومند ہیں۔ تارکِ آئینِ آبائی۔ لئے وہ شخص جس نے اپنے بزرگوں کے طریقہ کو چھوڑ دیا ہے یعنی تبلیغ و اشاعت اسلام سے غافل ہو گیا ہے قبیں سے

مسلمان مراد ہے لیلیٰ سے اسلام مراد ہے۔ انداز لیلائی یعنی دلکشی لیکن یہاں اس سے حقانیت اسلام مراد ہے۔ نہ نجم لا الہ تیری زمین شور سے پھوٹا یعنی تو نے توحید کا پیغام دنیا کو نہیں سنایا (حالانکہ یہ ہر مسلمان کا اولین فریضہ ہے) زمانے بھر میں رسوا ہے تری فطرت کی نازائی نازائی کے لغوی معنی ہیں بانجھ پن۔ پیدا کرنے کی صلاحیت کا نہ ہونا: : : : : : دنیا کی دوسری قومیں کسی نہ کسی حد تک کسی نہ کسی رنگ میں، اپنا فرض ادا کر رہی ہیں۔ لیکن مسلمان قوم اپنے مقصدِ حیات سے بالکل غافل ہے۔ آج مسلمانانِ عالم، دنیا کے سامنے اپنا کوئی کارنامہ پیش نہیں کر سکتے۔ محض اس لئے کہ وہ اس کام سے کنارہ کش ہو چکے ہیں، جس کے لئے اللہ نے اُن کو پیدا کیا تھا۔ کنشتی ساز لغوی معنی ہیں وہ باجہ (ارغنوں) جو گرجوں میں بجایا جاتا ہے معمور نوا ہائے کلیسائی جو کلیسا کی آوازوں سے بھرپور ہو۔ مطلب یہ ہے کہ آج مسلمان کی زندگی یہ ہے کہ وہ از سر تا پا کفر کے سانچہ میں ڈھل چکا ہے۔ اس کے خیالات اور عقائد سب کلیسائی یعنی غیر اسلامی ہو گئے ہیں۔ اقبال نے مسلمان کو اس مصرع میں اس باجہ سے تشبیہ دی ہے جو گرجوں میں بجایا جاتا ہے۔ آغوش بیت اللہ یعنی مسلمان کی تربیت اگرچہ اللہ کے گھر یعنی اسلامی ماحول میں ہوئی ہے، اس کے باوجود اس کا دل شوریدہ، بتخانے کا شیدائی ہے۔ بالفاظ دگر مسلمان کی حالت یہ ہے کہ پیدا مسلمان کے گھر میں ہوا ہے لیکن اعمال کافروں کے سے ہیں۔ وفا آموختی از ما بکار دیگراں کردی الخ انیسی کے اس شعر کا ترجمہ یہ ہے کہ تجھے وفا کا سبق تو ہم نے پڑھایا، لیکن تو نے ہمارے بجائے دوسروں کے ساتھ وفا کی گویا جو موتی تو نے ہم سے حاصل کئے وہ دوسروں پر نثار کئے۔

<u>تبصرہ</u> اقبال نے اس لاجواب نظم میں انیسی شاملو کے ایک شعر پر تضمین کی ہے۔ اس شاعر کا نام مرزا یولقلی بیگ تھا۔ اگرچہ ترکی الاصل تھا۔ لیکن ایران میں پیدا ہوا تھا اس لئے فارسی زبان میں طبع آزمائی کی۔ جوانی میں دوسرے ایرانی شعرا کی طرح قسمت آزمائی کی غرض سے ہندستان آیا۔ اور نظیری کی وساطت سے، عبدالرحیم خانخاناں، صوبہ دار گجرات کی سرکار میں ملازم ہو گیا۔ خان مذکور نے اس کی بڑی قدر دانی کی۔ اور محمود و ایاز کی داستان نظم کرنے پر مامور کیا چنانچہ

اس نے مثنوی لکھنی شروع کی لیکن موت نے تکمیل کی مہلت نہ دی ۱۱۳۳ھ میں بمقام برہانپور (وسط ہند) وفات پائی۔ اس کے کلام میں صائب اور غنی کا رنگ پایا جاتا ہے۔ ایک شعر ملاحظہ ہو

یادگار از ما دریں عالم غم بسیار ماند
رفت اگر آتش، نشانِ دود بر دیوار ماند

اقبال نے انیسی کے جس شعر پر تضمین کی ہے، اس کا انتخاب اس لئے کیا کہ اس کا مضمون موجودہ مسلمانوں پر ہو بہو صادق آتا ہے۔ اور جو پیغام مسلمانوں کو دیا ہے اُسے خواجہ غریب نوازؒ کی زبان سے یوں ادا کیا ہے کہ حضرت موصوف ہندوستان کے مبلغین اسلام کے سرتاج ہیں۔ اس لئے مسلمانوں کو سرزنش کرنے کا حق، اُن سے بڑھ کر اور کس کو حاصل ہو سکتا ہے؟ اس تضمین سے اقبال کا مقصد یہ ہے کہ مسلمانوں کو اس حقیقت سے آگاہ کریں کہ ان کی ذلت کا سبب یہ ہے کہ انہوں نے تبلیغ و اشاعت اسلام کو ترک کر دیا ہے۔

نظم کا مطلب (۱) چونکہ محبت کا خاصہ یہ ہے کہ عاشق ایک جگہ قیام نہیں کر سکتا اسلئے میں بادِ سحر کی طرح آوارہ رہتا ہوں۔ (۲) چنانچہ اسی جادہ پیمائی کے سلسلہ میں اجمیر جا نکلا یہ وہ شہر ہے جہاں عاشقوں کو روحانی تسکین نصیب ہوتی ہے۔ اور بیقراری کا علاج میسر آسکتا ہے۔ (۳) میں حضرت اقدسؒ کے مزار مبارک پر حاضر ہوا کہ حالِ دل عرض کروں لیکن ابھی میں کچھ کہنے نہیں پایا تھا کہ (۴) مرقد مبارک سے یہ صدا آئی "اے وہ شخص کہ تو نے اپنے بزرگوں (باپ دادا) کے طریقہ کو چھوڑ دیا ہے یعنی تیرے بزرگ تو تبلیغ و اشاعت اسلام کیا کرتے تھے لیکن تیرے اندر محبت کی آگ بالکل سرد ہو چکی ہے۔ تعجب ہے کہ اسلام میں تو وہی دلکشی موجود ہے، جو پہلے تھی لیکن تجھ میں اس کی محبت کا کوئی اثر نظر نہیں آتا۔ (۶) کس قدر افسوس کا مقام ہے کہ کبھی تیرے دل میں، تبلیغ اسلام کا جذبہ پیدا نہیں ہوتا۔ (زمین شور اُس زمین کو کہتے ہیں جس میں پیداوار نہ ہو سکے) اس کا نتیجہ یہ ہے کہ آج ساری قومیں تجھے نفرت کی نظر سے دیکھتی ہیں۔ اور یہ کہتی ہیں

کہ مسلمان کا وجود دنیا کے لیے کسی رنگ میں بھی مفید نہیں ہے۔ (۷) اے مسلمان! تو نے کبھی غور کیا کہ تیری زندگی کیسی ہے؟ مجھ سے سن! تو اُس باجہ کی طرح ہے، جس کے پردوں سے کفر کے نغمے نکل رہے ہوں کس قدر افسوس کا مقام ہے کہ تو مسلمان ہو کر کفر کی خدمت کر رہا ہے۔ (۸) تو پیدا تو ہوا مسلمانوں کے گھر میں لیکن تیری ہمدردی ہے، بتخانہ کے ساتھ۔ (۹) شاید تیرے ہی لیے نظیری نے یہ شعر لکھا تھا کہ :۔

وفا آموختی از ما، بکار دیگراں کردی!
ربودی گوہرے از ما نثار دیگراں کردی

فلسفہ غم

حلّ لغات اور شرح مشکلات | کیفِ عشرت۔ راحت کی کیفیت۔ سحاب، بادل + الم کا سورہ، رنج کا باب۔ یہ بہت بلیغ مصرع ہے۔ "ہے الم کا سورہ بھی جزوِ کتاب زندگی" اس میں صنعت ابہام پائی جاتی ہے۔ اور۔ اگر اس لفظ کو الم پڑھا جائے تو رنج کے معنی ہوں گے لیکن اس کی صورت "الف لام میم" سے مشابہ ہے۔ اور سورہ بقرہ ان ہی حرفوں سے شروع ہوتی ہے۔ اسی لیے اقبال نے الم کے ساتھ سورہ کا لفظ استعمال کیا ہے۔ تاکہ 'ابہام' کا رنگ پیدا ہو سکے۔

الم، سورہ جزو اور کتاب ان الفاظ میں صنعت مراعاۃ النظیر پائی جاتی ہے۔ لفظ کتاب میں بھی ابہام ہے۔ کیونکہ قرآن مجید کو بھی کتاب یا الکتاب، کہتے ہیں۔ اور اس کے پاروں کو اجزاء کہتے ہیں۔ مطلب اس بے نظیر مصرع کا یہ ہے کہ رنج والم بھی انسانی زندگی کا ایک لازمی جزو ہے

غیر از فغاں۔ آہ و فغاں کے بغیر + دیدۂ بینا میں یعنی، عقلمند آدمی کی نظر میں مضراب سے غم اور ساز سے حوادث مراد ہے۔ شہپر، اگلے دو بڑے پَر، جو نسبتاً بڑے ہوتے ہیں۔ چنانچہ ان ہی کی مدد سے پرندہ اُڑتا ہے۔ انکشاف راز۔ بھید کی تشریح ہمدرد یعنی نغمہ + ہم آغوش ہمنشیں متحد۔ شام جس کی آشنائے "نالہ یارب" نہیں، یعنی جو شخص رات کی تنہائی میں آہ و فریاد نہیں کرتا "یارب" کنایہ ہے

آہ و فریاد ہے۔ اشک کے کوکب آنسوؤں کے ستارے نظم دہر، دنیا کا انتظام + ادراک یعنی علم۔ ہے ابدک کے نسخہ، دیرینہ کی تمہید یعنی عشق انسان کو حیات ابدی عطا کر دیتا ہے۔ زندگانی ہے علاج ناآشنا الخ یعنی عشق، معشوق کو بھی زندۂ جاوید بنا دیتا ہے۔ جبینِ کوہ۔ پہاڑ کی چوٹی یا بلندی آئینہ روشن ہے اس کا الخ یعنی اس کی سطح آب، حور کے رخسار کی طرح شفاف ہے۔ رفعت۔ بمعنی بلندی محصور ہو۔ گھیر جائے۔ رزم گاہ خیر و شر نیکی اور بدی کی جنگ کا میدان خفر ہمت ہو گیا الخ یعنی ہمت پست ہو گئی ہو۔

تبصرہ: جیسا کہ اس کے عنوان سے ظاہر ہے۔ اقبال نے اس نظم میں غم کا فلسفہ بیان کیا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ یہ نظم لفظاً اور معنی دونوں کے لحاظ سے بہت مشکل ہے یہ نظم انھوں نے "میاں فضل حسین صاحب بیرسٹرایٹ لا کے نام" لکھی تھی۔ جو اُس زمانہ میں لاہور میں پریکٹس کرتے تھے۔ میاں صاحب ۱۸۷۷ء میں پیدا ہوئے تھے۔ اور انہوں نے ۱۹۳۶ء میں وفات پائی۔

اکبر الہ آبادی کا یہ شعر ان پر پورے طور سے صادق آتا ہے۔

تھے معزز شخص، لیکن ان کی لائف کیا لکھوں
گفتنی درجِ گزٹ، باقی جو ہے ناگفتنی

پہلا بند: اگرچہ انسانی زندگی میں آسائش و مسرت بڑی اہمیت رکھتی ہے اور ہر شخص اس کا طالب نظر آتا ہے لیکن آنسو (رنج و غم) بھی اس کے لئے بہت ضروری ہے۔ بلکہ غور سے دیکھا جائے تو زندگی کی بنیاد ہی غم پر ہے اسی لئے الم بھی انسان کے لئے اتنا ہی ضروری ہے جس قدر عشرت اور راحت۔ گلاب کے پھول میں سے اگر ایک پتی بھی کم ہو جائے تو اُسے گلاب نہیں کہہ سکتے۔ اسی طرح زندگی میں سے ایک پہلو یا جزو بھی کم ہو جائے تو زندگی مکمل نہیں ہو سکتی۔ ایسی بلبل آج تک نہیں پیدا ہوئی جس نے خزاں کی مصیبت نہ اٹھائی ہو اسی طرح دنیا میں کوئی انسان ایسا نہیں ہے جس نے رنج و غم کا ذائقہ نہیں چکھا۔ باغ کے لئے خزاں ضروری ہے۔ تو انسان کے لئے غم بھی ضروری ہے۔

دوسرا بند: ہر انسان کے دل میں آرزوئیں مچلتی رہتی ہیں۔ اور چونکہ کسی شخص کی بھی ساری آرزوئیں

پوری نہیں ہو سکتیں اس لئے ہر شخص کبھی نہ کبھی غمگین ہو ہی جاتا ہے۔ لہذا ہم کہہ سکتے ہیں کہ رنج و غم کے بغیر انسانیت کمال میں نہیں ہو سکتی جو آدمی عقلمند ہے وہ داغ غم کو اپنے سینہ کا چراغ تصور کرتا ہے اور آہ و نالہ کو اپنی روحانی ترقی کا ذریعہ سمجھتا ہے غم سے انسانی فطرت اپنے مرتبہ کمال کو پہونچتی ہے اور رنج و ملال سے دل کے آئینہ پر صیقل ہو جاتی ہے۔ اگر جوانی میں کسی پر غم مسلط ہو جائے تو وہ خواب غفلت سے بیدار ہو جاتا ہے، اور زندگی (کائنات) کی حقیقت پر غور کرنا شروع کر دیتا ہے یہ غور و فکر اس کے اصلاح باطن کا ذریعہ بن جاتی ہے۔ دل کی ترقی کے لئے غم "شہپر" کا کام دیتا ہے۔ اور اسی غم کی بدولت، انسان اپنے دل کی پوشیدہ طاقتوں سے آگاہ ہو جاتا ہے۔ غور سے دیکھو تو لوگ جسے غم کہتے ہیں وہ ہماری روح کا ایک نغمہ ہے، جو زندگی کے نغمہ سے متحد اور وابستہ ہے۔ یعنی غم زندگی کا جزو لازمی ہے۔

تیسرا بند:۔ جو شخص رات کو آہ و نالہ نہیں کرتا، یا رات کی تنہائی میں کبھی آنسو نہیں بہاتا جس کے دل میں کبھی غم کا احساس پیدا نہیں ہوتا۔ جو شخص ہمیشہ عیش و عشرت میں مشغول رہتا ہے جس گلچیں کے ہاتھ میں کبھی کانٹا نہیں لگا جس شخص نے کبھی ہجر کے صدمے نہیں اٹھائے، جو شخص، رنج و غم سے ناآشنا ہے وہ دراصل زندگی کی حقیقت سے ناآشنا ہے۔ آخری شعر میں اقبال اپنے دوست سے خطاب کرتے ہیں کہ تجھے چونکہ نظام کائنات سے آگاہی ہے، اس لئے میں گمان کرتا ہوں کہ تو اس رنج و غم کو جو مشیت ایزدی کے مطابق تجھ پر وارد ہوا ہے، بڑے صبر و سکون کے ساتھ برداشت کرے گا۔

چوتھا بند:۔ واضح ہو کہ عشق اس کائنات میں وہ طاقت یا جوہر ہے جو اپنی ذات کے لحاظ سے زندہ جاوید ہے یعنی ابدی ہے اسے کبھی فنا نہیں ہے۔ ہاں عقل انسانی انسان کی طرح بیشک فانی ہے عشق کے سامنے موت بالکل عاجز ہے۔ عشق چونکہ زندگی کا منبع ہے اس لئے ابدی ہے۔

اب اقبال اس حقیقت کو مثالوں کے ذریعہ سے واضح کرتے ہیں۔ کہتے ہیں کہ محبوب کے مرنے کا مطلب، اگر یہ ہو کہ وہ فنا ہو گیا تو محبت (عشق) کا جذبہ اور الفت کا جوش بھی عاشق کے دل سے فنا ہو جاتا۔

لیکن ایسا نہیں ہوتا اس سے یہ ثابت ہے کہ محبوب کبھی فنا نہیں ہوتا، بلکہ صرف عارضی طور پر کچھ عرصہ کے لیے ہم سے جدا ہو گیا ہے۔ سب جانتے ہیں کہ عشق کچھ محبوب کے مرنے سے مر جاتا نہیں بلکہ روح میں غم بن کر رہتا ہے مگر جاتا نہیں وہ تو غم کیا۔ ہے یہ دراصل عشق ہی کی ایک شکل ہے۔ محبوب کی زندگی میں جسے عشق کہتے ہیں، اس کے مرنے کے بعد وہی جذبہ غم کی صورت میں تبدیل ہو جاتا ہے۔ بلکہ میں تو یہ کہتا ہوں کہ وہ تبدیل نہیں ہوتا صرف اس کا نام تبدیل ہو جاتا ہے۔ قصہ مختصر اگر عشق باقی ہے تو محبوب بھی باقی ہے یعنی محبوب پر کبھی عدم کی کیفیت طاری نہیں ہوتی۔

پانچواں بند:۔ اب دوسری یعنی ندی کی مثال پر غور کرو، ندی پہاڑ کی چوٹی سے شور کرتی ہوئی آتی ہے۔ اس کا پانی نہایت شفاف ہوتا ہے۔ وادی کی چٹانوں سے ٹکرا کر اس کا پانی، لاکھوں بوندوں کی شکل میں نمایاں ہو جاتا ہے۔ اور چاروں طرف پھیل جاتا ہے لیکن کچھ دور جا کر وہ پانی پھر ندی کی شکل اختیار کر لیتا ہے بس یہی زندگی (کی نہر) کا حال ہے۔ وہ بھی لاکھوں انسانوں کی صورت اختیار کر لیتی ہے۔ دنیا میں ہم ایک دوسرے سے جدا ہو جاتے ہیں دوسری دنیا میں (آگے چل کر) پھر سب جمع ہو جائیں گے۔ لیکن ہم اپنی کوتاہی کے سبب سے عارضی فرقت کو دائمی سمجھ کر غمگین ہو جاتے ہیں۔

چھٹا بند:۔ حقیقت یہ ہے کہ جو لوگ مر جاتے ہیں، وہ ہم سے عارضی طور پر جدا تو بیشک ہو جاتے ہیں لیکن فنا نہیں ہوتے۔ جس وقت عقل انسانی دنیا کی آفتوں میں گھر جاتی ہے یا جوانی کے جذبات سے مغلوب ہو جاتی ہے، یا جس وقت انسان، اچھائی اور برائی میں تمیز نہ کر سکے اور اپنے لئے کوئی راہ معین نہ کر سکے، یا جس وقت وہ ہمت ہار جائے۔ اور اس کی عقل (فکر) عاجز ہو جائے اور کوئی صحیح فیصلہ نہ کر سکے، اور اس کا ضمیر بھی رہنمائی سے قاصر ہو اور کوئی ناصح اور ہمدرد بھی نہ ہو۔ جو اسے صلاح دے سکے اور امید کی کوئی جھلک بھی اسے نظر نہ آئے، ہر طرف مایوسی ہو اس وقت انسان ان لوگوں کی زندگیوں سے ہدایت حاصل کر سکتا ہے جو اس دنیا سے رخصت ہو چکے ہیں ان کی زندگیاں ہمارے لئے سبق آموز ہیں۔ مثلاً اگر ہمیں کسی کوشش میں ناکامیابی ہو تو ہم بابر

کی زندگی سے سبق حاصل کرسکتے ہیں۔ اگر ہماری راہ میں دشواریاں حائل ہوں، تو ہم مصطفےٰ کمال کی زندگی کو اپنے لئے نمونہ بنا سکتے ہیں۔

پھول کا تحفہ عطا ہونے پر

حل لغات مستِ ناز: محبوبہ مراد ہے۔ رقیب سے یہاں دوسرے پھول مراد ہیں (جن کو اس محبوبہ نے نہیں توڑا) کنول سے شاعر (عاشق) کا دل مراد ہے ہم آغوش مدعا، یعنی کامیاب۔ کسی کے دامن سے محبوبہ کا دامن مراد ہے۔ فسردہ بمعنی رنجیدہ۔

مطلب یہ ایک چھوٹی سی رومانی نظم ہے۔ شاعر کو اس کی محبوبہ نے چند پھول تحفہ کے طور پر عطا کیے۔ اس کی اس نگاہِ کرم نے شاعر کے دل میں جو جذبات پیدا کیے، ان کا اظہار اس نظم میں کیا ہے کہتا ہے کہ جب کبھی میری محبوبہ باغ میں جانکلتی ہے تو ہر کلی زبان سے یہی دعا کرتی ہے کہ خدا کرے وہ مجھے اپنے لئے منتخب کرلے، تاکہ میں اس کے ہاتھ میں پہونچکر رشک آفتاب بن جاؤں اس کے بعد شاعر اس کلی سے خطاب کرتا ہے کہ تو بڑی خوش نصیب ہے کہ محبوبہ نے تجھے توڑا اور دوسری کلیاں اس عزت سے محروم رہگئیں۔ جب اس نے تجھے توڑا تو تیری جدائی کا زمانہ ختم ہوگیا۔ کیوں کہ تجھے وصال نصیب ہوگیا۔ اور میری رائے میں تو اپنے مقصدِ حیات کو پاگئی۔ اس کے بعد شاعر اپنے دل کی حالت زار بیان کرتا ہے کہ میرا دل جس پر اہل نظر (قدر شناس) تصدق ہیں، جس پر میرے شباب کو فخر ہے افسوس ہے کہ ابھی تک اپنے مقصد میں کامیاب نہیں ہوا۔ اس پھول (کنول) کی ابھی تک اپنی محبوبہ کے دامن تک رسائی نہیں ہوسکی چونکہ محبوبہ (گلچیں) کا انتظار۔ اس کو ہمیشہ غمگین رکھتا ہے اس لئے موسم بہار اس کو شگفتہ نہیں کرسکتا۔ مطلب یہ ہے کہ محبوبہ نے پھول توڑ کر ان کو اپنی قربت کی عزت عطا کردی۔ لیکن میں ابھی تک اس کے وصال سے محروم ہوں۔ اس لیے دنیا کی کوئی مسرت (بہار) میرے دل کی کلی کو شگفتہ نہیں کرسکتی۔

ترانۂ ملّی

حلّ لغات | توحید کی امانت ہے توحید الٰہی کا عقیدہ مراد ہے جو اسلام کا طغرائے امتیاز ہے پہلا گھر، خانہ کعبہ مراد ہے۔ قرآن مجید فرماتا ہے کہ کعبہ جسے حضرت ابراہیمؑ اور حضرت اسمٰعیلؑ نے مل کر بنایا تھا، دنیا میں خدائے واحد کی عبادت کا پہلا گھر ہے۔ مغرب کی وادیوں سے مراد اسپین۔ سیل رواں۔ بڑھتا ہوا سیلاب۔ باطل۔ اسلام کے علاوہ یا قرآن مجید کے علاوہ جسقدر مذاہب اور کتب ہیں، بقول قرآن حکیم سب باطل ہیں۔ ملاحظہ ہو آیت "وَ قُلْ جَآءَ الْحَقُّ وَ زَهَقَ الْبَاطِلُ" اے رسول آپ کہہ دیجئے کہ حق آگیا اور باطل مٹ گیا۔ اندلس عربی میں اسپین کا نام ہے۔ دجلہ۔ عراق میں مشہور دریا ہے جس کے ساحل پر بغداد واقع ہے۔ ارض پاک سے حجاز کی مقدس سرزمین مراد ہے جس میں مکہ مکرمہ اور مدینہ منورہ واقع ہیں۔ میر حجاز سے سرکار دو عالم صلعم مراد ہیں۔

تبصرہ | جب اقبال نے وطنیت (نیشلزم) کے عقیدہ کو ترک کیا۔ اور اس کے بجائے قرآن حکیم کی تعلیم کے مطابق اسلام کو مسلمانوں کی قومیت کی بنیاد قرار دیا، تو انھوں نے یہ ترانہ ملّی لکھا جو آج ملک کے بچہ بچہ کی زبان پر ہے۔ یہ ترانہ اقبال کی در اصل . . . . حق پرستی اور صداقت پسندی پر شاہد عادل ہے کہ جب ان پر حقیقت منکشف ہو گئی تو انہوں نے صاف لفظوں میں اس کا اعلان کر دیا اور اسبات کی مطلق پرواہ نہ کی کہ میری شہرت یا ہر دلعزیزی کو نقصان پہنچ جائے گا

بیشک ۱۹۰۸ء سے پہلے وہ یہی سمجھتے تھے کہ مسلمان دوسری قوموں کے ساتھ مل کر متحدہ قومیت بنا سکتے ہیں، یا کافر اور مسلم دونوں ملکر۔ ایک قوم بن سکتے ہیں لیکن انھوں نے قرآن حکیم کا بنظر غائر مطالعہ کیا تو ان پر یہ صداقت واضح ہو گئی کہ مسلمانوں کی قومیت کا بنیاد وطن نہیں ہے۔ بلکہ عقیدۂ توحید ہے چنانچہ انہوں نے ۱۹۱۰ء سے لے کر تادم وفات اسی صداقت

کی تبلیغ کی۔

وائے بر عشقے کہ نارِ او فسرد!
در حرم زائید و در بتخانہ مرد!

نظم کا مطلب (۱) ہم مسلمان ہیں، اور مسلمان کی تعلیم یہ ہے کہ تمام مسلمان خواہ وہ دنیا کے کسی حصہ میں رہتے ہوں، ایک مستقل قوم ہیں۔ کیونکہ ان کی قومیت کی بنیاد، وطن پر نہیں ہے، بلکہ عقیدۂ توحید پر ہے۔ اس لیے کوئی خاص ملک ہمارا وطن نہیں ہے، بلکہ ساری دنیا ہمارا وطن ہے۔ یہ مصرع "مسلم ہیں ہم، وطن ہے سارا جہاں ہمارا" مسلمانوں کی ادبیاتِ عالیہ میں ضرب المثل کی حیثیت اختیار کر چکا ہے۔

(۲) چونکہ ہم عقیدۂ توحیدِ الٰہی کے حامل، اور اس کے امین ہیں، اور یہ عقیدہ ایک حقیقت ابدی ہے۔ دنیا کی کوئی طاقت اس عقیدہ کو نہیں مٹا سکتی اس لئے ہم بھی نہیں مٹ سکتے

(۳) کعبہ، دنیا میں خدائے واحد کی عبادت کا پہلا گھر ہے۔ ہم اس کے نگہبان ہیں اور وہ ہمارا نگہبان ہے جب تک کعبہ موجود ہے، مسلمان موجود رہیں گے۔ اور جب تک مسلمان زندہ ہیں کعبہ بھی برقرار رہے گا۔ یہ دونوں لازم اور ملزوم ہیں۔

(۴) مسلمانوں نے اپنے دین کی عظمت قائم رکھنے کے لئے ہمیشہ جہاد کیا ہے اس لئے ہم بجا طور پر کہہ سکتے ہیں کہ ہم نے تلواروں کے سایہ میں پرورش پائی ہے۔ چنانچہ ہمارا قومی

نشان بھی ہلال ہے جو تلوار سے مشابہ ہے۔

(۵) ہم نے مغرب میں مراقش اور اندلس تک فتوحات کی ہیں اور تاریخ شاہد ہے کہ جب ہم تسخیر ممالک کے لیے نکلے تو دنیا کی کوئی طاقت ہمارے سیلاب کو نہ روک سکی۔

(۶) اے دنیا والو! یاد رکھو ہم مسلمان، باطل سے مرعوب نہیں ہو سکتے۔ باطل بارہا ہمارے مقابلہ میں آچکا ہے لیکن ہمیں مغلوب نہیں کر سکا۔

(۷، ۸) تاریخ گواہ ہے کہ ہم نے اندلس اور بغداد میں عظیم الشان حکومتیں قائم کیں اور دنیا کو علوم وفنون اور تہذیب وتمدن کی دولت سے مالا مال کر دیا۔

(۹) اور دنیا سے یہ حقیقت بھی پوشیدہ نہیں ہے کہ ہم نے حجاز کی عزت قائم رکھنے کے لئے اپنا خون پانی کی طرح بہایا۔ حجاز کا ذرہ ذرہ اس صداقت پر گواہی دے سکتا ہے حرمین کو ہم اپنی جان سے بھی زیادہ عزیز رکھتے ہیں۔

(۱۰) سرکار دو عالم صلی اللہ علیہ وسلم ہمارے آقا اور پیشوا ہیں اور حضور اقدس کا نام پاک، ہر مسلمان کے حق میں باعث آرام جاں ہے۔

(۱۱) اقبال کا یہ ترانہ، مسلمانوں کے لیے گویا "بانگ درا" ہے یعنی سربلندی اور برتری کے حصول کا پیغام ہے اور خدا کے فضل وکرم سے ہم ضرور کامیاب ہوں گے۔

وطنیت

حل لغات | وطنیت۔ اس لفظ کے دو معنی ہیں (۱) اپنے وطن سے محبت کا جذبہ یا وطن پروری، اقبال کی رائے میں یہ جذبہ (چونکہ قدرتی ہے اس لئے) بالکل صحیح ہے اور اس میں کوئی برائی نہیں ہے۔ یہی وجہ ہے کہ اس پر انہیں کوئی اعتراض بھی نہیں ہے وہ کہتے ہیں کہ دنیا میں ہر شخص کو اپنے وطن سے قدرتی لگاؤ ہوتا ہے۔

(۲) یہ لفظ موجودہ زمانہ میں ایک سیاسی اصطلاح بھی ہے، جیسا کہ خود انھوں نے اس

لفظ کے نیچے بطور تشریح لکھا ہے۔ وطنیت کا ایک سیاسی تصور بھی ہے۔ اس تصور کی رو سے اس کا مفہوم پہلے مفہوم سے بالکل مختلف ہے اس کی تشریح یہ ہے:۔

(ا) وطن، انسان کی تمام وفاداریوں کا مرکز ہے۔

(ب) جب دین اور وطن میں موازنہ ہو یا آویزش ہو تو ہر انسان کا فرض یہ ہے کہ وہ وطن کو دین و ایمان پر ترجیح دے۔ مثلاً مسلمان کے دین کا تقاضا یہ ہے کہ وہ کسی مسلمان ملک پر حملہ نہ کرے لیکن اگر وطن کا فائدہ اس بات میں ہے کہ اس وقت پاکستان کا مسلمان، عربوں پر حملہ کرے تو اسے دین کو بالائے طاق رکھ کر، بلا تامل حملہ کر دینا چاہیئے۔ چنانچہ ۱۹۱۶ء میں عربوں نے اسی اصول وطنیت کی بنا پر، کافروں کے ساتھ مل کر ترکوں کے خلاف اعلانِ جنگ کیا تھا۔ (جس کی سزا وہ ۱۹۱۸ء سے اب تک بھگت رہے ہیں)

(ج) وطن، مذہب سے بلند تر ہے مثلاً اگر کوئی پوچھے کہ تم کون ہو؟ تو وطنیت کا تقاضا یہ ہے کہ ہم یہ جواب دیں کہ ہم ہندوستانی ہیں۔ حالانکہ دین کی رو سے اس سوال کا جواب یہ ہے کہ مسلمان ہیں مولانا محمد علی جنت آشیانی سے (جو بیت المقدس میں حضرات انبیائے کرام کے قدموں میں آرام کر رہے ہیں)۔ ایک غیر مسلم نے پوچھا کہ آپ پہلے کیا ہیں؟ ہندوستانی یا مسلمان؟ تو اس مردِ مومن نے یہ جواب دیا کہ میں پہلے بھی مسلمان ہوں، بیچ میں بھی مسلمان ہوں، اور آخر میں بھی مسلمان ہوں۔ اسلام اس طرح میری رگ و پے میں سما گیا ہے کہ اب کسی اور تصور کی گنجائش ہی نہیں ہے بس یہی بات اقبال نے اس نظم میں بیان کی ہے۔

(د) مذہب اور سیاست جداگانہ ہیں۔ حالانکہ، اسلام کی تعلیم یہ ہے کہ

جدا ہو دیں سیاست سے تو رہ جاتی ہے چنگیزی

(ہ) مذہب انسان کا پرائیوٹ (نجی) معاملہ ہے۔ اُسے سیاست یا اُمورِ مملکت سے کوئی تعلق نہیں ہے۔ حالانکہ اسلام کی تعلیم یہ ہے کہ دین اسلام ایک مکمل ضابطۂ حیات ہے اور سیاست اس کا ایک شعبہ (محکمہ) ہے یعنی دین سیاست پر بھی حاکم ہے۔

(و) انسان کا فرض ہے کہ وطن کے لئے جیئے اور اُسی کے لئے مرے یعنی اپنی پوری زندگی وطن کی نذر کر دے۔ حالانکہ اسلام کی تعلیم یہ ہے کہ مسلمان صرف اللہ کے لئے جیتا ہے اور اسی کے لئے مرتا ہے آیت ملاحظہ ہو۔

قُلْ إِنَّ صَلَاتِي وَنُسُكِي وَمَحْيَايَ وَمَمَاتِي لِلَّهِ رَبِّ الْعَالَمِينَ،

اے رسولؐ آپ اعلان کر دیجئے کہ میری نماز اور تمام دینی رسوم اور میرا جینا اور میرا مرنا سب کچھ (ساری زندگی) صرف اس اللہ کے لئے ہے جو رب العالمین ہے۔ وطنیت کے اس مفہوم کو مدنظر رکھ کر ہر مسلمان خود فیصلہ کر سکتا ہے کہ لفظ وطن جب بطور ایک سیاسی تصور کے استعمال ہوتا ہے تو وہ اسلام سے متصادم ہو جاتا ہے یعنی ایک مسلمان، وطنیت کے سیاسی مفہوم کی رو سے، ہرگز ہرگز نیشنلسٹ یا قوم پرست نہیں ہو سکتا۔ کیونکہ اگر وہ مسلک وطنیت (نیشنلزم) اختیار کریگا تو اُسے لامحالہ اسلام سے دستبردار ہونا پڑے گا۔ بلاشبہ وطنیت، اسلام کی ضد ہے اور یہ دونوں کسی طرح ایک جگہ جمع نہیں ہو سکتے جسطرح ایک مسلمان اشتراکی نہیں ہو سکتا اُسی طرح وہ قوم پرست بھی نہیں ہو سکتا۔

یہی وجہ ہے کہ جب جنوری ۱۹۳۸ء میں مولانا حسین احمد صاحب دیوبندی نے دہلی کے جلسہ میں یہ کہا تھا کہ موجودہ زمانہ میں قومیں اوطان (وطن کی جمع ہے) سے بنتی ہیں۔ تو اقبال نے ان کے اس غیر اسلامی ارشاد کے خلاف صدائے احتجاج بلند کی تھی۔

میں نے یہ تشریح اس لئے کر دی ہے کہ نظم کا مطلب سمجھنے میں آسانی ہو جائے۔ بنا کی یعنی قائم کی۔ روش بمعنی طریقہ۔ تہذیب کے آذر نے یعنی تہذیب نے تہذیب سے تہذیب مغرب مراد ہے۔ پیرہن سے تعلیمات یا اُصول مراد ہیں۔ کفن سے نفی یا تردید مراد ہے۔ نومی بمعنی جدلیہ بُت سے مسلک وطنیت مراد ہے۔ تراشیدہ تہذیب نوی یعنی مغربی تہذیب کی ایجاد۔ بُت کی رعایت سے تراشیدہ کا لفظ لائے ہیں۔ کیونکہ عموماً بت پتھر کے ہوتے ہیں اور انہیں تراشا جاتا ہے

قید مقامی یعنی کسی مقام کی قید یا پابندی. صورتِ ماہی یعنی مچھلی کی طرح۔ سنّت. فقہ کی اصطلاح میں آنحضرت صلعم کے طریق زندگی کو سنّت کہتے ہیں۔ خدا کے حکم پر عمل کرنا فرض ہے۔ اور حضور کے حکم پر عمل کرنا سنت ہے۔ مثلاً جب ہم یہ کہتے ہیں کہ فجر کی نماز میں فرضوں سے پہلے دو رکعت پڑھنا سنت ہے۔ تو اس کا مطلب یہ ہے کہ ہر مسلمان پر لازم ہے کہ وہ فرضوں سے پہلے دو رکعت نماز پڑھے یہی وجہ ہے کہ مسلمانوں کا عربی نام "اہل سنت والجماعت" ہے یعنی وہ لوگ جو سنت نبویؐ پر عمل کرتے ہیں۔ محبوبِ الٰہی سے ذات رسالتمآب صلعم مراد ہے۔ تسخیر یعنی دوسرے ملکوں کو فتح کرنا۔ رقابت یعنی دشمنی۔ کمزوروں سے کمزور اقوام مراد ہیں۔ جڑ کٹتی ہے یعنی اس کی نفی ہو جاتی ہے۔

پہلا بند:۔ موجودہ زمانہ میں سیاست اور حکومت کے طور طریقے بالکل بدل گئے ہیں۔ ارباب حکومت نے بھی لوگوں پر مہربانی اور ستم کے طریقے بدل دئیے ہیں اس تبدیلی سے متاثر ہو کر اکثر مسلمان ملکوں اور حکومتوں نے بھی نئے طور طریقے اختیار کر لئے ہیں۔ موجودہ مغربی تہذیب نے انسانوں کی پرستش کے لئے جو نئے نئے معبود (صنم) یعنی مسلک ایجاد کئے ہیں۔ ان نئے معبودوں میں وطن سب سے بڑا معبود ہے۔ جو آج اللہ کا مدمقابل بنا ہوا ہے۔ اور اس نئے خدا کے پیش کردہ اصول اس قسم کے ہیں کہ اُن کے اختیار کرنے سے دین (اسلام) فنا ہو جاتا ہے۔

دوسرا بند:۔ وطن کا یہ بُت جسے مغربی تہذیب نے بنایا ہے دین نبوی کا دشمن ہے۔ اے مسلمان! چونکہ تو موحد ہے، اور توحید نے تیرے اندر کافی طاقت پیدا کر دی ہے، اس لئے تو اس کے مقابلہ کیلئے تیار ہو جا۔ تیرا وطن نہ مشرق ہے نہ مغرب، بلکہ اسلام ہے۔ اور اسلام، زمان و مکان کی قیود سے بالاتر ہے تو نہ ایرانی ہے نہ عراقی، نہ ہندی نہ پاکستانی، بلکہ مصطفوی یعنی آنحضرت صلعم کا غلام ہے تیرا روحانی تعلق کسی ملک سے نہیں، بلکہ سرکار دو عالم کی ذات پاک سے ہے بس تو اُٹھ اور اس بت کو پاش پاش کر کے، بت شکنی کا وہی پرانا نظارہ دنیا کو دکھا دے جو کبھی تیرے اسلاف نے دنیا کو دکھایا تھا۔

تیسرا بند:۔ اگر تو اپنے آپ کو کسی خاص ملک سے وابستہ کرلے گا تو اس کا نتیجہ بربادی کے علاوہ اور کچھ نہیں ہے یعنی مسلمان کی حیثیت سے تو ختم ہو جائے گا تو دنیا میں مچھلی کی طرح رہ کہ وہ سارے سمندر کو اپنا وطن سمجھتی ہے۔ تو بھی ساری دنیا کو اپنا وطن سمجھ یعنی ساری دنیا میں اسلام کا عَلم بلند کر اور اگر ضرورت پڑے تو ترکِ وطن کردے۔ جس طرح تیرے آقا اور مولیٰ سرکار دوعالم صلعم نے کیا تھا کہ جب مکہ مکرمہ میں اسلامی زندگی بسر کرنی دشوار ہو گئی تو آپ نے یثرب کی طرف ہجرت فرمائی اسطرح ہجرت سنت نبوی قرار پائی۔ پس اگر تو دیکھے کہ اپنا وطن میں اسلامی زندگی بسر کرنی دشوار ہے تو وطن کو ترک کردے اور پردیس کو اپنا وطن بنالے۔ تو جس ملک میں چلا جائے گا، وہی تیرا وطن بن جائے گا کیونکہ مسلم ہیں ہم وطن ہے سارا جہاں ہمارا۔

یاد رکھ کہ سیاست کی اصطلاح میں وطن کا مفہوم، بالکل مختلف ہے اس مفہوم سے جو اسلام پیش کرتا ہے، بلکہ یہ دونوں ایک دوسرے کی ضد ہیں۔ (جیسا کہ میں وطنیت کی تشریح میں واضح کرچکا ہوں، سیاست میں وطن کا مفہوم یہ ہے کہ ہر شخص جس ملک میں پیدا ہوا ہے، وہ ملک اس کا دائمی وطن ہے اور اس کا فرض یہ ہے کہ اپنے وطن کے لئے جئے، اور وطن کیلئے مرے اسلام میں وطن کا مفہوم یہ ہے کہ وطن سے محبت کرو، اور اس کی حفاظت کرو لیکن اگر تم اپنے وطن میں اللہ کا کلمہ بلند نہیں کرسکتے۔ تو پھر ترکِ وطن کردو۔ کیونکہ مقصدِ حیات وطن نہیں ہے، بلکہ اللہ ہے مسلمان وہ ہے، جو اللہ کے لئے جیتا ہے اور اسی کے لئے مرتا ہے۔ یہ دونوں مفہوم ایک دوسرے کی ضد ہیں اس لئے ایک مسلمان، سیاسی اصطلاح میں وطن پرست ہرگز نہیں ہو سکتا کیونکہ وطن پرستی اور خدا پرستی، یہ دونوں باتیں ایک جگہ جمع نہیں ہو سکتیں۔

چوتھا بند:۔ آج دنیا کی مختلف اقوام اسی وطنیت کی بدولت، ایک دوسرے کی دشمن ہو گئی ہیں روسی اپنے وطن کو دنیا میں سربلند کرنا چاہتے ہیں، امریکن اپنے وطن کو، انگریز اپنے وطن کو، جرمن اپنے وطن کو یعنی ان میں سے ہر ایک اپنے وطن کو اپنا معبود سمجھتا ہے لیکن مسلمان کا راستہ سب سے

جدا ہے۔ وہ نہ اس ملک کی سربلندی کا خواہاں ہے، نہ اُس کی۔ وہ تو اللہ کے نام کو دنیا میں سربلند کرنا چاہتا ہے۔

بہر حال وطنیت کے مفاسد (عیوب) بہت ہیں۔ ان میں سے چند یہ ہیں کہ اس کی وجہ سے اقوام عالم میں دشمنی پیدا ہوتی ہے۔ اور تجارت سے ان اقوام کا مقصد تجارت نہیں، بلکہ اُس ملک کو فتح کرنا ہوتا ہے، جس میں یہ اپنی تجارت کا جال بچھاتی ہیں۔ یورپین اقوام جس ملک میں تجارت کا سلسلہ شروع کرتی ہیں، رفتہ رفتہ اُسے اپنا غلام بنا لیتی ہیں۔ تیسرا عیب یہ ہے کہ اس نظریۂ وطنیت کی رو سے سیاست میں ہر قسم کا مکر و فریب جائز ہے۔ چنانچہ اس کو سیاسی اصطلاح میں ڈپلومیسی (DIPLOMACY) کہتے ہیں

مقصد یہ ہے کہ عیاری اور فریب کاری سے کمزور اقوام کو اپنا غلام بنایا جائے۔ چوتھا عیب (اعتراض) یہ ہے کہ اس نظریہ کی رو سے، اللہ کی مخلوق، مختلف قوموں میں منقسم ہو جاتی ہے اور وہ قومیں ایک دوسرے کی دشمن بن جاتی ہیں یعنی بنی آدم، جو سب اللہ کے بندے ہیں، وہ ایک دوسرے کے دشمن بن جاتے ہیں۔ اور اللہ کے بجائے اپنے اپنے وطن کی عبادت کرتے ہیں اس کا نتیجہ یہ نکلتا ہے کہ "اسلامی قومیت" جو قرآن حکیم کا مقصود ہے۔ دنیا میں کبھی قائم نہیں ہو سکتی یعنی اسلام تو یہ چاہتا ہے کہ ساری دنیا کے مسلمان ایک قوم بن جائیں۔ ؏ نیل کے ساحل سے لے کر تا بخاکِ کاشغر، لیکن نظریہ وطنیت یہ سکھاتا ہے کہ ہم پاکستانی جداگانہ قوم ہیں، افغانی جداگانہ، ایرانی جداگانہ عراقی جداگانہ، مصری جداگانہ، یعنی:

قومیت اسلام کی جڑ کٹتی ہے اس سے

نوٹ:۔ یہی وجہ ہے کہ اقبالؒ نے ساری عمر اپنی پوری قوت کے ساتھ وطنیت کے اس غیر اسلامی نظریہ کی تردید کی۔ اور بانگ درا سے لے کر ارمغان حجاز تک ہر کتاب میں اس کے مفاسد واضح کئے ۱۲

ایک حاجی مدینے کے راستے میں

حلِّ لغات | بیاباں سے، مکہ اور مدینہ کا درمیانی ریگستان مراد ہے۔ دشنہ بمعنی خنجر۔ بخاری بخارا (ترکستان) کا باشندہ۔ زہراب، وہ پانی جس میں زہر ملا ہوا ہو۔ بیباکانہ نڈر ہوکر، زیارت سے یہاں روضۂ رسول صلعم کی زیارت مراد ہے۔ ہجرتِ مدفونِ یثرب سے حضورِ اقدس کی ہجرت مراد ہے۔ سلامت بمعنی سلامتی یا حفاظت۔ محمل شامی سے وہ محمل مراد ہے، جو دمشق (ملک شام) سے ہر سال حج کے موقع پر مکہ مکرمہ آتی تھی، جس میں خانہ کعبہ کے لئے غلاف ہوتا تھا محمل اُس ڈولی کو کہتے ہیں جو اونٹ پر باندھی جاتی ہے اور اس میں عموماً پردہ نشیں عورتیں سفر کرتی ہیں جا نکاہی سخت محنت برداشت کرنا عقل زیاں اندیش۔ شاعر نے عقل کو نقصان سوچنے والی اس لئے قرار دیا ہے کہ وہ انسان کو ایثار اور قربانی اور جان دینے سے باز رکھتی ہے۔ حالانکہ فرد اور قوم دونوں کی ترقی ان ہی باتوں پر منحصر ہے۔ جو قوم مرنے سے ڈرتی ہے وہ کبھی ترقی نہیں کر سکتی۔ ناشم سے یہاں عشق مراد ہے جو انسان کو بے باکی سکھاتا ہے۔

مطلب | اس جذباتی نظم میں، اقبال نے اُس حاجی کے قلبی تاثرات قلمبند کئے ہیں جس کا قافلہ مدینہ کے راستہ میں لٹ گیا تھا۔ کچھ لوگ رہزنوں کے ہاتھوں مارے گئے۔ باقی ماندہ مایوسی اور بیدلی کے عالم میں مکہ مکرمہ واپس چلے گئے۔ اب وہ حاجی اپنے دل سے یوں گفتگو کرتا ہے کہ کیا میں بھی واپس چلا جاؤں؟ یکایک اُس کی نگاہ اُس بخاری نوجوان پر پڑتی ہے۔ جس نے رہزن کے خنجر کو ہلالِ عید تصور کیا اور کلمۂ شہادت پڑھ کر اپنی جان خوشی خوشی دیدی۔ یہ منظر دیکھ کر وہ کہتا ہے کہ عقل مجھ سے یہ کہتی ہے کہ یثرب کی طرف تنہا سفر کرنا مناسب نہیں لیکن عشق یہ کہتا ہے کہ اگر تو مسلمان ہے تو ضرور سفر کر۔ کیونکہ اگر تو حضور اکرم صلعم کے روضۂ مبارک کی زیارت کئے بغیر واپس چلا گیا تو قیامت کے دن تو حضور اکرم صلعم کے عاشقوں کو کیا مونہہ دکھائے گا؟ حضور انور صلعم کی ہجرت ہر مسلمان کو یہ سبق دیتی ہے کہ مسلمان کو مرنے سے ہرگز نہیں ڈرنا چاہیئے۔ یہ سچ ہے کہ اگر میں

شامی محمل کے ساتھ سفر کروں تو پھر مجھے کوئی خطرہ لاحق نہیں ہوگا لیکن عاشقوں کو تو اسی بات میں لذت محسوس ہوتی ہے کہ وہ محبوب کے لئے اپنی جان کو خطرہ میں ڈالیں۔

اس کے بعد اقبال اس حاجی کے خیالات سے یہ نتیجہ نکالتے ہیں کہ عقل، انسان کو چالاکی اور عیاری سکھاتی ہے۔ اس کے مقابلہ میں عشق، انسان کے اندر جرأتِ رندانہ پیدا کرتا ہے۔ اور مقصدِ حیات میں وہی شخص کامیاب ہو سکتا ہے، جس کے اندر یہ صفت موجود ہو ع

کچھ ہاتھ نہیں آتا بے جرأتِ رندانہ

قطعہ

حل لغات | شوریدہ بمعنی عاشق۔ خوابگاہ نبیؐ حضورؐ کا روضۂ مبارک بنائے ملت دین اسلام کے اصول یا اس کی بنیادی تعلیمات۔ زائران حریم مغرب یورپ کے مقدس مقامات کی زیارت کرنے والے۔ مراد ہے ان لوگوں سے جو "اعلیٰ تعلیم" حاصل کرنے کے لیے یورپ کی مشہور درسگاہوں میں جاتے ہیں۔ ہزار رہبر۔ ہزار سے شدت اور مبالغہ مراد ہے، یعنی رہبری کا کتنا ہی دعوےٰ کیوں نہ کریں۔ "تجھ" سے حضورؐ اور آپ کی تعلیمات مراد ہیں۔ "مرشد از خود بیں" اقبال نے اس ترکیب کو دو نا قدوں کے درمیان اس لئے لکھا ہے کہ کہنے والا (عاشق) ان کو مرشد نہیں سمجھتا۔ وہ لوگ خود اپنے آپ کو قوم کا مصلح اور ہادی قرار دیتے ہیں، خود بیں بمعنی متکبر مغرور۔ اس لفظ سے ان کی نقلی رہنماؤں پر طنز کرنا مقصود ہے۔ ان کو یعنی ان باتوں کو نئے زمانہ سے موجودہ پر فریب زمانہ مراد ہے، جس میں ہر برائی، بھلائی ہے اور ہر بھلائی برائی، بلکہ رجعت پسندی ہے۔ پرانی باتیں یعنی سچائی اور نیکی کے اصول جن کی اس زمانہ میں کوئی قدر نہیں ہے۔

مطلب | یہ نظم نہیں ہے، بلکہ وہ آہیں ہیں جو ایک دردمند مسلمان کے جلے ہوئے دل سے آخر شب کی تنہائی میں نکلی ہیں۔ جب اقبال کا ملی ترانہ شعور بیدار ہوا تو انہوں نے دیکھا کہ جو لوگ مسلمانوں کے رہنما بنے ہوئے ہیں، وہ دراصل ان کے دشمن ہیں، کیونکہ حکومت کے آلہ کار ہیں اور قوم فروشی کرکے

دنیاوی عزت (مثلاً خطابات، عہدے، جاگیریں) حاصل کر رہے ہیں۔ یہ دیکھ کر اقبال نے عالم خیال میں، سرکار دو عالم کے روضۂ مبارک پر حاضر ہو کر یوں عرض کیا (۱) کہ اے میرے آقا! مصر اور ہندوستان کے سربرآوردہ مسلم، خود اپنے ہی ہاتھوں سے اسلام کی بنیادیں کھود رہے ہیں، اور عوام کو یہ دھوکہ دے رہے ہیں کہ ہم دین اور ملت کی اصلاح کر رہے ہیں۔

(۲) یہ مغرب زدہ لوگ لاکھ ہماری رہنمائی کا دعویٰ کریں، لیکن ہمیں ان سے کوئی واسطہ نہیں ہے کیونکہ یہ لوگ، آپ کی سنت سے بالکل ناآشنا ہیں۔ یہ لوگ علم دین حاصل کرنے کے بجائے عہدے اور خطابات حاصل کرتے ہیں۔ مسجد کے بجائے کلب میں جاتے ہیں، اور اللہ کے بجائے انگریز کو سجدہ کرتے ہیں۔

(۳) یہ نام نہاد "لیڈرانِ قوم" اور مصلحین امت دراصل آفت کے پرکالے ہیں۔ اللہ آپ کی قوم کو ان کے شر سے محفوظ رکھے۔ ان کے کرتوتوں کا خلاصہ یہ ہے کہ انگریز کی نگاہ میں محترم بننے کے لئے یہ لوگ آپ کی امت کو بلا تامل قربان کر دیتے ہیں۔

(۴) آخری شعر میں شاعر اپنے آپ سے خطاب کرتا ہے کہ اے اقبال! مانا کہ جو کچھ تو کہتا ہے وہ بالکل سچ ہے۔ لیکن سوال یہ ہے کہ تیری ان سچی باتوں کو سنے گا کون؟ قوم کی ذہنیت تو بالکل بدل چکی ہے۔ جو شخص تیری ان باتوں کو سنے گا وہ یقیناً یہی کہے گا کہ ؏

نئے زمانہ میں آپ ہم کو پرانی باتیں سنا رہے ہیں

شکوہ

حل لغات | زیاں کار۔ وہ شخص جو اپنے نقصان کے درپے ہو۔ سود فراموش وہ شخص جو اپنے فائدے سے غافل ہو۔ ہمہ تن گوش۔ یعنی پوری طرح متوجہ ہمنوا لفظی معنی ساتھ گانے والا، یہاں مراد ہے دوست۔ جرأت آموز حوصلہ بڑھانے والی۔ تابِ سخن۔ شاعری کی لیاقت۔ خاکم بدہن یہ محاورہ ہے لفظی معنی ہیں میرے مونہہ میں خاک، مراد یہ ہے کہ میں اپنی گستاخی کا اقرار کرتا ہوں

شیوۂ تسلیم۔ اطاعت کا طریقہ یا فرماں برداری کی عادت۔ خوگرِ حمد وہ شخص جو خدا کی تعریف کرنے کا عادی ہو۔ ذاتِ قدیم "قدیم" علم کلام کی اصطلاح ہیں اُس ذات کو کہتے ہیں جس کی ابتدا نہ ہو، یعنی ازلی۔ یہ حادث کی ضد ہے۔ اسلام کی رو سے صرف اللہ قدیم ہے، اور باقی سب کچھ حادث ہے پھول تھا زیبِ چمن الخ یعنی خدا تو موجود تھا لیکن اس کی صفات کا اظہار نہیں ہوا تھا صاحبِ الطافِ عمیم۔ وہ خدا جس کی مہربانی عام ہو۔ بوئے گل پھیلتی کس طرح الخ اگر مسلمان نہ ہوتے تو ذات و صفاتِ الٰہیہ کا چرچا کیسے ہوتا مطلب یہ ہے کہ اللہ کے نام اور اس کی صفات کو تو مسلمان ہی نے دنیا میں شائع کیا۔ جمعیتِ خاطر۔ باعثِ تسکینِ قلب ہم کو جمعیتِ خاطر یہ پریشانی تھی یعنی اگرچہ ہم نے تیرے نام کو دنیا میں پھیلایا، اور اس کے لیے ہمیں دنیا میں منتشر ہونا پڑا تو یہ پریشانی اور انتشار ہمارے لیے جمعیتِ خاطر کا موجب بن گیا جمعیت اور پریشانی میں صنعتِ تضاد ہے، کیوں کہ یہ دونوں لفظ آپس میں ضد ہیں۔ مسجود یعنی معبود۔ وہ شئے جسے پوجا جائے۔ خوگرِ پیکر محسوس یعنی انسان مادی اور محسوس اشیا کی عبادت کا عادی ہو گیا تھا۔ کیا کام ترا یعنی تیرے نام کو دنیا میں بلند کیا۔ دنیا کو تیرے نام سے روشناس کیا۔ سلجوق ترکوں کے ایک مشہور قبیلہ کا نام ہے۔ تورانی ترکستان کے باشندوں کا لقب۔ ساسانی، قدیم ایران کا حکمراں خاندان۔ معمورہ یعنی دنیا۔ بگڑی ہوئی بات کس نے بنائی؟ یعنی توحید کو کس نے دنیا میں قائم کیا؟ معرکہ آرا۔ میدانِ جنگ کو زینت دینے والا یعنی مردِ مجاہد۔ کلمہ۔ اس کا تلفظ ک۔ ل۔ مہ ہے۔ یہ مسلمانوں کی دینی اصطلاح ہے۔ اور اس سے مراد ہے کلمہ توحید و رسالت یعنی لَآ اِلٰہَ اِلَّا اللّٰہُ مُحَمَّدٌ رَّسُوْلُ اللّٰہِ، یا کلمہ شہادت یعنی اَشْھَدُ اَنْ لَّآ اِلٰہَ اِلَّا اللّٰہُ وَاَشْھَدُ اَنَّ مُحَمَّدًا عَبْدُہٗ وَرَسُوْلُہٗ سر بکف۔ یہ محاورہ ہے یعنی مرنے کے لیے تیار۔ بت شکنی کیوں کرتی؟ یہ اشارہ ہے سلطان محمود غزنوی کی جانب جس نے سومناتھ کے پجاریوں سے یہ کہا تھا کہ میں تاریخ میں بت فروش مشہور ہونا نہیں چاہتا ہم توپ سے لڑ جاتے تھے اس میں اشارہ ہے ترکانِ عثمانی کی طرف جو اکثر میدانِ جنگ میں دشمنوں سے اس طرح توپیں چھین لیتے تھے کہ وہ دیکھتے رہ جاتے تھے۔ تاریخ شاہد ہے کہ ترکوں کے علاوہ، دنیا کی

کسی قوم نے اس بےجگری کا مظاہرہ نہیں کیا۔ زیرِ خنجر بھی یہ پیغام سنایا الخ اس میں اشارہ ہے صحابہ کرامؓ کی طرف جنہوں نے اسلام کی اشاعت میں اپنی جانیں قربان کر دیں۔ اکھاڑا در خیبر کس نے؟ اشارہ ہے حضرت علیؓ کی طرف جنہوں نے ایمان کی طاقت سے، قلعہ خیبر کا دروازہ اکھیڑ کر پھینک دیا تھا۔ مخلوقِ خداوندوں کے پیکر یعنی بت۔ زحمت کش پیکار۔ جنگ کی تکلیف اُٹھانے والی جہاندار بمعنی حکمراں، زمیں بوسی سے سجدہ کرنا مراد ہے۔ محمود و ایاز سے آقا اور غلام مراد ہے۔ بندہ بمعنی غلام بندہ نواز بمعنی آقا۔ محفل کون و مکاں، یعنی دنیا۔ مئے توحید سے مراد ہے عقیدۂ توحید۔ بحر ظلمات میں دوڑا دیئے بحرِ ظلمات سے بحر اٹلانٹک مراد ہے، جو افریقہ اور امریکہ کے درمیان واقع ہے۔ سمندر میں گھوڑے دوڑانے سے استعارہ یا مبالغہ مراد نہیں ہے، بلکہ اس واقعہ کی طرف اشارہ مقصود ہے، جب عقبہ بن نافع نے مراقش فتح کرنے کے بعد اپنا گھوڑا سمندر میں ڈال دیا اور کہا اے خدا! مجھے افسوس ہے کہ تیری زمین ختم ہو گئی ورنہ میں اسی طرح فتوحات کرتا چلا جاتا۔ باطل سے غیر اسلامی یا مشرکانہ تعلیم مراد ہے۔ نوعِ انساں کو غلامی سے چھڑایا ہم نے یعنی اسلام کی تعلیم یہ ہے کہ دنیا میں کوئی انسان، کسی دوسرے انسان پر حکومت نہیں کر سکتا۔ حکومت کا حق صرف اللہ کو حاصل ہے۔ اور مسلمان اس معنی میں حکومت کر سکتا ہے کہ وہ دنیا میں اللہ کے قانون (قرآن) کو نافذ کریگا۔ یہی وجہ تھی ایک معمولی آدمی نے حضرت فاروق اعظمؓ سے بھری مجلس میں یہ دریافت کر لیا تھا کہ آپ کو کپڑا تو دو گز ملا تھا۔ آپ نے اپنا کرتہ کیسے بنا لیا؟۔ تیرے کعبہ کو جبینوں سے بسایا الخ یعنی ہم نے ہر سال فریضۂ حج ادا کیا، اور تیرے گھر کی رونق کو برقرار رکھا۔ مستِ مئے پندار۔ غرور کی شراب میں مست ہیں یعنی مغرور ہیں۔ برق گرتی ہے یعنی اگر مصیبت آتی ہے تو مسلمانوں پر۔ بُت سے یہاں بت پرست مراد ہیں۔ حدی خواناں، حدی وہ نغمہ ہے، جس کو سُن کر اونٹ بہت خوش ہوتا ہے، حدی خواں سے عرب مراد ہیں۔ قصور، قصر کی جمع ہے بمعنی محلات۔ اُٹھے سینۂ صحرا سے حباب، یعنی تجھ میں وہ قدرت ہے کہ ریگستان میں چشمہ جاری ہو جائے حباب پانی کے بلبلہ کو کہتے ہیں۔ رہروِ دشت ہو سیلی زدۂ موج سراب یعنی تو اگر چاہے تو ریگستان کا سراب، فی الحقیقت پانی میں تبدیل ہو جائے اور صحرا کے مسافر اس کی موجوں کے تھپیڑے کھانے

لگیں۔ رہرو۔ مسافر دشت جنگل صحرا اسیلی۔ بتھر مٹ۔ موج سراب۔ سراب کی موج سراب کا مطلب یہ ہے کہ جب ریگستان میں ریت پر سورج چمکتا ہے تو دور سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ پانی موجیں مار رہا ہے اس لئے سراب سے دھوکہ یا فریب مراد لیتے ہیں۔ اس مصرع کا مطلب یہ ہے کہ خدا اگر چاہے تو سراب (ریگستان) دراصل پانی بن جائے۔ اور اس میں موجیں اٹھنے لگیں۔ نداری۔ مفلسی طعن اغیار۔ دشمنوں کے طعنے۔ عوض یعنی صلہ یا بدلہ۔ اوروں نے سنبھالی یعنی دنیا پر دوسروں کی حکومت قائم ہوگئی۔ مثلاً روس امریکہ انگلستان اور یہ سب مسلمانوں کے دشمن ہیں۔ ساقی نہ رہے جام رہے۔ یعنی یہ ممکن نہیں کہ مسلمان تو فنا ہو جائیں لیکن اسلام باقی رہے۔ اسلام تو مسلمانوں ہی کے دم سے ہے۔ محفل سے مسلمان حکومتیں مراد ہیں جو ختم ہوگئیں۔ موجودہ مسلمان حکومتیں سب کسی نہ کسی رنگ میں اغیار کے زیر اثر ہیں جس کی تفصیل اس شرح میں مناسب نہیں ہے چاہنے والے بھی گئے یعنی اب دنیا میں نہ کوئی ہارون الرشید ہے نہ نور الدین زنگی ہیں، نہ کوئی الپ ارسلاں ہے، نہ صلاح الدین ایوبی ہے، نہ محی الدین عالمگیرؒ ہے نہ کوئی فتح علی خاں المعروف بہ ٹیپو شہیدؒ ہے شب کی آہیں بھی گئیں یعنی اب نہ کوئی علی ہجویریؒ ہے نہ معین الدین اجمیریؒ ہے نہ بہاء الدین زکریا ملتانیؒ ہے، نہ فرید الدین گنج شکرؒ ہے، نہ میاں میرؒ ہے دل تجھے دے بھی گئے یعنی تیری محبت میں اپنے کو فنا کر دیا۔ صلے بھی گئے یعنی تو نے انہیں زندہ جاوید بنا دیا۔ آج بھی لوگ ان کے دروازہ کی خاک کو آنکھوں سے لگاتے ہیں۔

نوٹ:۔ اس موقع پر مجھے اس زمانہ کے عاشقوں کے سردار حضرت حاجی سید وارث علی شاہ صاحب قبلہؒ کا قول یاد آتا ہے کہ دنیا کی کوئی طاقت عاشق کو فنا نہیں کر سکتی، کیونکہ عاشق کی فنا سے خود معشوق کی فنا لازم آتی ہے اور معشوق فنا ہو نہیں سکتا، اس کی ذات فنا سے پاک ہے وہ تو الحی القیوم ہے۔ اب انھیں ڈھونڈ چراغِ رخِ زیبا لے کر، یہ مصرع داغ کے اس شعر سے ماخوذ ہے۔

ہم سا جانباز زمانہ میں نہ پاؤ گے کہیں
لاکھ ڈھونڈو گے چراغِ رخِ زیبا لیکر

"چراغ لے کر ڈھونڈنا" محاورہ ہے۔ اس کے معنی ہیں بہت کوشش کے ساتھ تلاش کرنا

دردِ لیلی سے، لیلیٰ کی یاد یا اس کی محبت مراد ہے۔ قیس کے پہلو سے مسلمان کا دل مراد ہے جس میں حضور (لیلیٰ) کی محبت پوشیدہ ہے۔ نجد۔ حجاز اور یمن کے درمیانی حصہ کو نجد کہتے ہیں۔ عربی ادب میں اس کا تذکرہ بکثرت موجود ہے۔ اس کی ایک وجہ یہ بھی ہے کہ لیلیٰ اسی علاقہ کی رہنے والی تھی۔ رمِ آہو کے لغوی معنی ہیں ہرن کا بھاگنا، مراد ہے عاشقوں کی صحرانوردی۔ حُسن کے جادو سے اسلام کی دلکشی مراد ہے۔ مرسل بمعنی بھیجا گیا، یعنی رسول۔ آشفتہ سری پریشانی یا اضطراب، جو ایک عاشق کی سب سے بڑی پہچان ہے۔ رسمِ سلمانؓ سے شیوہ عاشقی مراد ہے۔ جادہ پیمائی تسلیم و رضا یعنی اطاعت کی زندگی۔ فاران، مکہ مکرمہ کے نزدیک ایک پہاڑی کا نام ہے۔ اسلامی ادبیات میں اس لفظ سے دینِ اسلام مراد لی جاتی ہے۔ آتش اندوز کیا، یعنی آگ میں جلا دیا۔ شورِ سلاسل لفظی معنی قیدیوں کی زنجیروں کا شور، مراد ہے عشاق کے مجمع سے۔ نفس سے مسلمان مراد ہے۔ اے خوش آں روز الخ اس شعر کا مطلب یہ ہے کہ وہ دن کتنا مبارک ہوگا، جب تو بڑے ناز و انداز کے ساتھ عاشقوں کی محفل میں واپس آئے گا۔ بادہ کش، بمعنی شراب نوش۔ غیر سے یہاں غیر مسلم اقوام مراد ہیں۔ جو دنیا میں عیش کر رہی ہیں لبِ جو، نہر کے کنارے۔ جام بکف، ہاتھ میں شراب کا پیالہ لیے ہوئے۔ نغمۂ کوکو، کوئل کا نغمہ۔ تیرے دیوانے، یعنی مسلمان منتظر ہُو۔ بہت بلیغ ترکیب ہے۔ ہُو کے لغوی معنی ہیں "وہ" اس سے مراد ہے ذاتِ خداوندی۔ لیکن یہاں ہو سے عشق کی وہ باطنی تحریک مراد ہے جو اللہ کی عنایت کی بدولت مسلمان کے دل میں پیدا ہوتی ہے ہُو کے منتظر ہیں، یعنی تائیدِ ایزدی اور فضلِ ربی کے منتظر ہیں۔ ہو کے معنی اشارہ کے بھی آتے ہیں، اور یہ معنی اس صورت میں پیدا ہوتے ہیں، جب "ہو" کو لاالٰہ کا مخفف قرار دیا جائے۔ یعنی تیرے دیوانے اس بات کے منتظر ہیں کہ کوئی اللہ کا بندہ لا الٰہ الا ھو کا نعرہ بلند کر کے ان کے دلوں میں تیری محبت کی آگ بھڑکا دے۔ غرضکہ "ہو" سے یہاں اشارہ غیبی یا تائید ایزدی مراد ہے۔ جیسا کہ اگلے شعر سے واضح ہے۔

اپنے دیوانوں کو پھر ذوقِ خود افروزی دے

یعنی تیرے عاشق اس بات کے منتظر ہیں کہ تو نے اپنا کرم نازل فرمائے، اذان کو آتش

عشق میں جلنے کی طاقت عطا فرما گئے، تاکہ وہ اپنے آپ کو روشن کر سکیں یعنی عاشقی کی دنیا میں نام پیدا کر سکیں، تجھ پر اپنی جان قربان کر سکیں۔ برقِ دیرینہ سے وہی عشق الٰہی کی آگ مراد ہے، جو ٹھنڈی پڑ چکی ہے۔ قوم آوارہ سے مسلمان قوم مراد ہے۔ جو اپنی جہالت کی وجہ سے غلط راستہ پر جا رہی تھی۔ عناں تاب یعنی اُس نے اپنے گھوڑوں کی باگ موڑ لی ہے یعنی اب وہ صحیح راستہ پر آ گئی ہے اور وہ صحیح راستہ کون سا ہے، وہی جو حجاز کو جاتا ہے۔ تشنۂ مضراب ہے یعنی مسلمان تیرے نام پر سر کٹانے کے لئے پھر تیار ہیں بس تیری ایک نگاہِ کرم درکار ہے۔ مورِ بے مایہ، کمزور چیونٹی یعنی مسلمان قوم، ہمدوشِ سلیمان، سلیمان کی ہم پایہ۔ حضرت سلیمان مشہور پیغمبر ہیں، جن کو اللہ نے نبوت اور حکومت دونوں عطا فرمائی تھیں۔ ہند کے دیر نشینوں سے وہ مسلمان مراد ہیں جو اسلام کی روح یعنی عشق رسولؐ سے بیگانہ ہو چکے ہیں۔ غماز بمعنی چغلخور۔ ایک بلبل ہے اس سے ذات شاعر مراد ہے۔ کاشِ گلشن ہیں الخ گلشن سے قوم مراد ہے۔ خونِ جگر سے قوم کی غفلت شعاری پر نوحہ خوانی مراد ہے۔ جوہر سے جذباتِ قلبی مراد ہیں آئینہ سے دل مراد ہے بلبلِ تنہا سے اقبال نے اپنی ذات مراد لی ہے۔ نوا سے شاعری مراد ہے بادۂ دیرینہ پرانی شراب یعنی عشق رسول عجمی خم۔ عرب کے لوگ اپنے علاوہ دوسری قوموں کو عجمی کہتے تھے خم بمعنی مٹکا شراب کا۔ مراد ہے اردو شاعری حجازی مے سے اسلامی تعلیم مراد ہے۔ لَے سے خیالات مراد ہیں۔

تبصرہ | علامہ اقبال نے یہ نظم انجمن حمایت اسلام کے سالانہ جلسہ میں سُنائی تھی، جو اپریل ۱۹۱۱ء میں منعقد ہوا تھا۔ شفاء الملک حکیم محمد حسن صاحب قرشی جو اس جلسہ میں شریک تھے، لکھتے ہیں کہ "جب ڈاکٹر صاحب نے اپنی سحر انگیز لے میں، ندرتِ تخیل کے اس شاہکار کو پڑھنا شروع کیا تو سارا مجمع مسحور نظر آتا تھا۔" پروفیسر عبد القادر سروری قمطراز ہیں کہ "شکوہ، جواب شکوہ، شمع اور شاعر، خضر راہ اور طلوع اسلام میں سے کسی نظم کا جواب اردو میں نہیں ہے۔ شکوہ میں جس شاعرانہ انداز سے مسلمانوں کی پستی کا گلہ، خدا سے کیا ہے، اور جواب شکوہ میں اُبھرنے کی جو ترکیب بتائی ہے، اس میں الہامِ ربانی کی شان نظر آتی ہے۔"

اگر اس شرح کے صفحات اجازت نہ دیتے تو میں اس نظم پر مفصل تبصرہ لکھتا اب مجبوراً چند سطور پر اکتفا کرتا ہوں۔ واضح ہو کہ شکوہ اپنی نوعیت کے لحاظ سے اردو ادب میں ایک انوکھی چیز ہے۔ ندرتِ تخیل کے علاوہ اس میں حقیقت نگاری اور شاعرانہ مصوری کی شان بھی بدرجہ اتم موجود ہے اس نظم میں اقبال نے لفظوں کے ذریعہ سے مسلمانوں کی تاریخ کی تصویر کھینچی ہے اور تخیل کے موقلم سے اس میں ایسی رنگ آمیزی کی ہے کہ حقیقت مجسم ہو کر سامنے آجاتی ہے۔ ان سب خوبیوں کے ساتھ ساتھ شکوہ کی زبان اس قدر دلکش ہے اور اشعار کی سلاست اور روانی کا یہ عالم ہے کہ پڑھنے والے پر محویت کا عالم طاری ہو جاتا ہے۔ استعارہ تشبیہ اور رمز و کنایہ کا تذکرہ چنداں ضروری نہیں ہے کیونکہ یہ تو وہ خصوصیات ہیں جو بانگ درا کی تمام نظموں میں پائی جاتی ہیں۔ اب مطلب بیان کرتا ہوں:۔

<u>پہلا بند</u>:۔ پہلے بند میں شاعر نے تمہید اٹھائی ہے کہ آخر میں کب تک یوں خاموش بیٹھا ہوا اپنی بربادی کا تماشا دیکھتا رہوں۔ کب تک اپنے مستقبل سے غافل رہوں۔ جب تک مجھے گویائی کی قوت حاصل ہے تو پھر میں اللہ کو اپنی روداد غم کیوں نہ سناؤں؟

<u>دوسرا بند</u>:۔ اے خدا! یہ سچ ہے کہ تسلیم و رضا ایک مسلمان کا شیوہ ہے لیکن میرے دل میں اس قدر شدید درد ہے کہ میں ضبط نہیں کر سکتا، اس لئے اگر میں تیری بارگاہ میں اپنے درد کا قصہ بیان کرتا ہوں تو مجھے معذور سمجھ کر معاف کر دے، اور اپنے عاجز بندہ سے جو حمد و ثنا کا عادی ہے تھوڑا سا گلہ بھی سن لے

<u>تیسرا بند</u>:۔ یہ سچ ہے کہ تو اپنی ذات کے اعتبار سے قدیم ہے یعنی ایک زمانہ ایسا بھی تھا جب تو موجود تھا مگر تیری صفات کی جلوہ گری نہیں ہوئی تھی یعنی یہ کائنات موجود نہ تھی۔ اب تو خود انصاف کر لے کہ اگر مسلمان نہ ہوتے تو تیری صفات (جلوہ گل) کا علم، دنیا والوں کو کیسے ہوتا بس ہم مسلمانوں نے دنیا والوں کو تیرے نام سے اور تیری صفات سے آگاہ کیا ہم نے ساری دنیا میں تیرے نام کو بلند کیا۔ اور اس سلسلہ میں ہم نے جس قدر کوشش کی یہ ہمارے لئے راحتِ خاطر کا باعث تھی ورنہ تیرے محبوب کی امت دیوانی تو نہیں تھی کہ اس نے بلا وجہ ساری دنیا کو اپنا دشمن بنا لیا۔

نوٹ:۔ واضح ہو کہ توحید اسلام دراصل تمام دنیائے کفر کے خلاف اعلانِ جنگ ہے اس لئے جب مسلمانوں نے توحید کا علم بلند کیا تو ساری دنیا ان کی دشمن ہو گئی۔ چنانچہ سلطان نورالدین زنگی اور سلطان صلاح الدین ایوبی کی زندگی میرے دعوے پر شاہد عادل ہے ۱۲۔

چوتھا بند:۔ اب شاعر خود اپنے دعوے پر دلیل پیش کرتا ہے اور کہتا ہے کہ اے خدا! ہم (اسلام سے پہلے تیرے بندوں کی یہ حالت تھی کہ وہ پتھروں اور درختوں کو خدا الیقین کرتے تھے۔ چونکہ انسان پیکر محسوس کی پرستش کا عادی ہو چکا تھا اس لئے وہ تجھ کو، کہ تو آنکھ سے نظر نہیں آتا، کیسے اپنا معبود بنا سکتا تھا تجھے خوب معلوم ہے کہ ہمارے وجود سے پہلے چین سے لے کر مراکو تک کوئی شخص تیرا نام نہیں لیتا تھا مسلمانوں نے اپنی جان ہتھیلی پر رکھ کر تیرے نام کو دنیا میں بلند کیا یعنی بنی آدم کو توحید سے روشناس کیا۔

پانچواں بند:۔ ہم سے پہلے تیری دنیا میں صدہا قومیں آباد تھیں سلجوقی، ایرانی، چینی، یونانی، ہندی، مجوسی نصرانی لیکن ان میں سے کسی نے بھی تیرے نام کو بلند کرنے کے لئے اپنی جان قربان نہیں کی۔ مسلمانوں ہی نے توحید کو دنیا میں قائم کیا۔

چھٹا بند:۔ وہ مسلمان ہی تھے جنہوں نے تیری عظمت دنیا میں قائم کرنے کے لئے ساری دنیا سے لڑائی مول لی خشکی میں بھی لڑے اور تری میں بھی کبھی یورپ سے برسرپیکار ہوئے کبھی افریقہ سے۔ ہم نے دنیا کے تمام بادشاہوں کا مقابلہ کیا، اور ان کو زیر کر کے توحید کا علم بلند کیا۔

ساتواں بند:۔ ہم اگر جیتے تھے تو تیری راہ میں جہاد کرنے کے لئے اور مرتے تھے تو تیرے نام کو دنیا میں بلند کرنے کے لئے۔ ہم نے کبھی مال و دولت یا حکومت کے لئے جہاد نہیں کیا۔ اگر مسلمان مال و دولت کے تمنائی ہوتے تو بت شکنی کے بجائے بت فروشی کرتے لیکن تاریخ گواہ ہے کہ محمود غزنوی بت شکن تھا، بت فروش نہ تھا۔

آٹھواں بند:۔ ہم جب میدان جنگ میں سر سے کفن باندھ کر آتے تھے تو دنیا کی کوئی طاقت ہمیں مغلوب یا مرعوب نہیں کر سکتی تھی۔ کیا یہ تاریخی واقعہ نہیں ہے کہ جنگ موتہ میں تین ہزار مسلمانوں نے

ایک لاکھ رومیوں کا مقابلہ کیا تھا ہم ہر اُس قوم سے لڑنے کے لئے سر بکف رہتے تھے، جو تجھ سے سرکشی کرتی تھی۔ زیرِ خنجر بھی ہم نے توحید کا پیغام دنیا کو سنایا۔

نواں بند:۔ وہ مسلمان ہی تو تھے جنھوں نے خیبر کا دروازہ اُکھاڑ پھینکا قسطنطنیہ کو فتح کیا بتخانوں کی اینٹ سے اینٹ بجادی، اور کفار کے لشکر کاٹ کر رکھ دیئے۔ ایران کے آتش کدہ کو ٹھنڈا کر دیا۔ اور تیرے نام کو زندہ کر دیا۔

دسواں بند:۔ مسلمانوں کے علاوہ اور کس قوم نے تجھ سے محبت کی؟ کس قوم نے تیرے اور تیرے رسول کی عزت کے لئے اپنا خون پانی کی طرح بہایا؟ کس قوم کی تکبیروں سے دنیا میں توحید کا نور پھیلا بتوں کے پوجنے والے، کس قوم کی ہیبت سے لرزہ بر اندام رہتے تھے؟

گیارھواں بند:۔ عین جنگ کی حالت میں بھی جس وقت نماز کا وقت آجاتا تھا تو ہم قبلہ رو ہو کر تیری درگاہ میں حاضر ہو جاتے تھے اور ہماری مساوات کا یہ عالم تھا کہ اس وقت محمود اور ایاز، آقا اور غلام سب ایک ہی صف میں کھڑے ہوتے تھے۔

بارھواں بند:۔ ہم نے اس دنیا میں مشرق سے لے کر مغرب تک تیرے نام کا ڈنکا بجادیا ہم نے ساری دنیا کو تیرا پیغام سنایا۔ اور تو جانتا ہے کہ ہم کو اس مقصد میں کبھی ناکامی نہیں ہوئی۔ ہم کسی قوم سے مرعوب نہیں ہوئے خشکی کا تو ذکر ہی کیا ہے ہم نے تو سمندر عبور کر کے تیرا پیغام دنیا کو سنایا اور ہم عرب سے جو نکلے تو بحر ظلمات تک توحید کا پرچم اُڑاتے چلے گئے۔

تیرھواں بند:۔ ہم نے دنیا سے کفر کو مٹادیا۔ اور بنی آدم کو ہر قسم کی غلامی سے آزادی عطا کی ہم نے تیرے کعبہ کی حفاظت کی۔ اُسے آباد کیا اور تیرے پاک کلام کو ہمیشہ سینہ سے لگایا اس کے باوجود تو ہم سے ناراض ہے اور تجھے ہم سے یہ شکایت ہے کہ ہم بیوفا ہیں!

چودھواں بند:۔ ہمارے علاوہ اس دنیا میں دوسری قومیں بھی آباد ہیں۔ ان میں نیک بھی ہیں اور بد بھی ہیں۔ بے عمل بھی ہیں، باعمل بھی ہیں۔ اور بہت سے لوگ تیرے منکر بھی ہیں اس کے باوجود تو ان پر مہربان ہے لیکن مسلمان تیری نگاہِ کرم سے محروم ہیں۔

پندرھواں بند :۔ آج مسلمانوں کی پستی کی یہ حالت ہے کہ بت خانوں میں بُت پرست خوشی کے لہجہ میں یہ کہتے ہیں کہ مسلمان بہت جلد صفحہ ہستی سے مٹ جائیں گے۔ اور ان کے بعد دنیا میں کوئی شخص نہ مکّہ جائے گا نہ مدینہ اور نہ دنیا میں کوئی قرآن کا نام لے گا اے خدا! آج کافر ہم پر طنز کے تیر برسا رہے ہیں اور اسلام کی ہنسی اڑا رہے ہیں کیا تجھے اپنی توحید کی بقا کا اب کوئی خیال نہیں ہے کیا تو یہ پسند کرے گا کہ کفر اسلام پر غالب آجائے۔

سولھواں بند :۔ مجھے یہ شکایت نہیں کہ غیر مسلم دولتمند کیوں ہیں ؟ افسوس صرف یہ ہے کہ ان کو ساری نعمتیں حاصل ہیں اور مسلمان سے صرف یہ وعدہ ہے کہ مرنے کے بعد جنت ملے گی۔ یہ بات کیا ہے کہ اب تو ہم پر زمانۂ سابق کی طرح مہربان نہیں ہے ؟

سترھواں بند :۔ آج مسلمان سب قوموں سے زیادہ مفلس اور نادار ہیں حالانکہ تو قادر مطلق ہے اور تیرے خزانہ میں کسی چیز کی کمی نہیں، اگر تو چاہے تو ریگستان کو سمندر میں تبدیل کر سکتا ہے۔ آج ہم غیروں کے طعنے سُن رہے ہیں، رسوا ہیں، نادار ہیں۔ اے خدا! کیا مسلمان ہونے کا صلہ یہ ہے کہ ہم دنیا کی نظروں میں ذلیل ہو جائیں۔

اٹھارھواں بند :۔ اے خدا! اس وقت حالت یہ ہے کہ دنیا اور اس کی دولت تو اغیار کے قبضہ میں ہے، مسلمان صرف خیالی دنیا میں رہتے تھے۔ تیری دنیا پر انہیں کوئی اقتدار حاصل نہیں ہے اے خدا ہم تو اس لئے دنیا میں زندہ رہنا چاہتے ہیں۔ کہ توحید قائم رہے اور تیرا نام زندہ رہے کیونکہ یہ تو ناممکن ہے کہ مسلمانوں کے فنا ہو جانے کے بعد تیرا نام باقی رہے۔

نوٹ :۔ اس میں اشارہ ہے حضور انور صلعم کے اُن الفاظ کی طرف جو جنگ بدر کے موقع پر آپ کی زبان مبارک سے نکلے تھے کہ "اے خدا! اگر یہ مٹھی بھر جماعت آج فنا ہوگئی تو پھر تو قیامت تک نہ پوجا جا سکے گا۔"

انیسواں بند :۔ اے خدا! آج یہ کیفیت ہے کہ مسلمان ہر جگہ ذلیل و خوار ہیں۔ اور جو لوگ تیرے نام پر سر کٹانے کے لئے تیار رہتے تھے، رفتہ رفتہ ختم ہو رہے ہیں انھوں نے اگر تجھ سے محبت کی

تو اس کا صلہ بھی انھیں مل گیا، انھوں نے تیرے نام پر سر کٹا یا تو نے ان سے جنت کا وعدہ کیا۔ اور وہ ہنستے ہوئے رخصت ہو گئے۔ لیکن اب ان لوگوں سے تیری محفل خالی ہو چکی ہے۔

بائیسواں بند:۔ اے خدا! اسلام کی خوبیاں بدستور موجود ہیں مسلمانوں کی اسلام سے محبت بھی برقرار ہے۔ حج کعبہ کا سلسلہ بھی اسی طرح جاری ہے مسلمانوں کے جذبات عاشقی اسی طرح زندہ ہیں۔ اسلام کی دلکشی بھی بدستور قائم ہے۔ ہم بھی وہی ہیں، جو تھے، اور تو بھی وہی ہے جو تھا پھر اس ناراضگی کا سبب کیا ہے؟۔

اکیسواں بند:۔ اے خدا! تو ہی بتا، آخر ہم نے کیا قصور کیا ہے؟ تجھ کو بھلا دیا یا تیرے رسولؐ کو فراموش کر دیا؟ بت پرستی اختیار کر لی؟ سرکار دو عالمؐ سے محبت ترک کر دی؟ حضرت سلمانؓ اور حضرت اویسؓ کی تقلید ترک کر دی؟ حقیقت یہ ہے کہ ہم اب بھی توحید کی آگ اپنے سینوں میں پوشیدہ رکھتے ہیں۔ اور بلالؓ کی طرح تیرے نام پر سختیاں جھیلنے کے لیے تیار ہیں۔

بائیسواں بند:۔ یہ مانا کہ ہم عشق و محبت میں اسلاف (اگلوں) کا مقابلہ نہیں کر سکتے۔ اور ہمارے اندر تسلیم رضا (اطاعت) کا وہ رنگ بھی نہیں ہے جو ان بزرگوں میں پایا جاتا تھا۔ اور ہم اس حد تک اسلام کے پابند اور شریعت کے وفادار بھی نہیں ہیں۔ لیکن گستاخی معاف ہو "کبھی ہم سے کبھی غیروں سے شناسائی ہے"۔ یہ بات ہماری سمجھ میں تو آتی نہیں۔

تیئیسواں بند:۔ یہ حقیقت ہے کہ اسلام کا آفتاب کوہ فاراں کی چوٹیوں سے طلوع ہوا، اور تو نے اس دین کو کامل کر دیا چنانچہ ہزاروں، لاکھوں، آدمی، اسلام کی خوبیوں کو دیکھ کر حضور انور کی غلامی میں داخل ہو گئے اور حضور اقدسؐ نے ان کے دل میں تیری محبت کی آگ روشن کر دی چنانچہ ان بزرگوں نے اس آگ کی بدولت ایک دنیا کو اسلام کا گرویدہ بنا دیا۔ لیکن ہم بھی تو ان ہی مسلمانوں کی اولاد ہیں پھر ہمارے اندر آگ کیوں سرد ہو گئی ہے؟

چوبیسواں بند:۔ اب مسلمانوں میں عشق رسولؐ کا وہ جذبہ نظر نہیں آتا۔ اب مسلمان، اسلام پر دیوانہ وار نثار نہیں ہوتے۔ اب مسلمانوں کو اسلام سے وہ محبت باقی نہیں رہی۔ حقیقت تو یہ ہے کہ اب ہمارے اندر

اٹھائیسواں بند :۔ اب شاعر اپنے دل سے باتیں کرتا ہے کہ افسوس! مسلمانوں نے خود غیروں کو، قوم کی کمزوریوں سے آگاہ کر دیا۔ میر جعفر اور میر صادق نے مسلمان ہو کر اسلام کو ضعف پہونچایا۔ ان غداروں اور منافقوں کی بدولت، چمن برباد ہو گیا، سلطنت ختم ہو گئی۔ قوم غلام بن گئی۔ اور اسلام کے شیدائی (۱۸۵۷ء میں) ایک ایک کر کے قوم پر نثار ہو گئے۔ (زمزمہ پردازانِ چمن ڈالیوں سے اڑ گئے) بس سارے باغ میں ایک بلبل (اقبال کی ذات) رہ گئی ہے جو نغمہ پردازی کر رہی ہے (قوم کو ابھار رہی ہے) اور اس کے سینہ میں ابھی تک جذبات کی شدت موجود ہے۔

نوٹ :۔ واضح ہو کہ یوں تو ساری نظم میں رمز اور کنایہ کی فراوانی ہے لیکن ان آخری چار بندوں میں تو ساری گفتگو رمز اور کنایہ ہی کے پردہ میں کی ہے۔ طلبہ کو واضح ہو کہ آئندہ اشعار میں کسی لفظ کے لغوی معنی مراد نہیں ہیں۔

انتیسواں بند :۔ اگرچہ قوم کے اکثر رہنماؤں نے خدمت قوم کے بجائے "خدمت سرکار" کو اپنا شعار بنا لیا۔ (قمریاں شاخِ صنوبر سے گریزاں ہو گئیں) اور لیڈروں کی اس خود غرضی اور ضمیر فروشی کا نتیجہ یہ نکلا کہ قوم کے افراد تباہ ہو گئے۔ (پھول کی پتیاں جھڑ کر پریشان ہو گئیں) مسلمانوں کی تہذیب اور معاشرت سب ختم ہو گئی۔ (باغ کی پرانی روشیں ویران ہو گئیں)

نوٹ :۔ واضح ہو کہ لفظ "روش" کے دو معنی ہیں (۱) وہ خوبصورت مگر تنگ راستہ جو باغ میں گلگشت کیلئے بنایا جاتا ہے اور اس کے کنارے کنارے حسین پھول اگائے جاتے ہیں (۲) روش بمعنی طور، طریقہ، انداز، جو کسی قوم کی خصوصیات کو واضح کرے۔ یہ لفظ یہاں بہت موزوں ہے ہیں شائقین کلام اقبال سے معذرت خواہ ہوں کہ بخوف طوالت اس انداز سے پوری کتاب کی شرح نہیں لکھ سکتا ۱۲

بازآمدم برسر مطلب۔ مسلمانوں کے شعائر ملّی سب ختم ہو گئے۔ اور رفتہ رفتہ مسلمان علوم و فنون سے بے بہرہ ہو گئے۔ (ڈالیاں، پیرہن سے عریاں ہو گئیں) اس کے باوجود اقبال نے اپنی روش نہیں بدلی۔ وہ برابر قوم کو ترقی کا پیغام دیتا رہا۔ کاش قوم اس کے کلام کا مطالعہ کرتی، اور اس کے

کلام کو سمجھتی!

ع کاش گلشن میں سمجھتا کوئی فریاد اُس کی!

تیسواں بند:۔ چونکہ قوم مردہ ہو چکی ہے یعنی احساس ملی سے عاری ہو چکی ہے اس لئے نہ جینے میں لطف ہے، نہ مرنے میں کوئی مزہ ہے بس دن رات خونِ جگر پیتا ہوں۔ اور قوم کی بے حسی پر نوحہ خوانی کرتا رہتا ہوں۔ میرے سینہ میں سیکڑوں جذبات اور صدہا خیالات ہیں، جو ظہور کے لئے بیتاب ہیں لیکن افسوس! قوم میں ان کے قدرداں ہی موجود نہیں۔ اگر قوم کے دل میں ملت کا درد ہوتا، تو وہ کسی دردمند کے جذبات کو سمجھ سکتی تھی۔

ع قدرِ گوہر شاہ داند یا بداند گوہری۔

اکتیسواں بند:۔ اے خدا! میں تجھ سے دعا کرتا ہوں کہ میرے کلام میں ایسی تاثیر پیدا کر دے کہ مسلمانوں کے قلوب اس کے مطالعہ سے متاثر ہو سکیں۔ اور ان کے اندر احساس زیاں پیدا ہو جائے تاکہ وہ تجھ سے دوبارہ پیمانِ وفا باندھ سکیں۔ اور پھر اسلام اور قرآن کی محبت ان کے دلوں میں موجزن ہو جائے! آمین۔

اگر میں نے اپنا پیغام شعر کی صورت میں پیش کیا ہے تو کیا مضائقہ ہے۔ پیغام کی روح تو قرآن سے ماخوذ ہے۔ (عجمی خم ہے تو کیا، مے تو حجازی ہے مری) اگر میں نے اردو زبان میں شاعری کی ہے تو کیا ہوا، مضامین اور خیالات تو اسلامی ہیں۔

ع (نغمہ ہندی ہے تو کیا، لَے تو حجازی ہے مری)

چاند

حلِ لغات: طوف۔ طواف کرنا، گردش کرنا کسی کے چاروں طرف گھومنا۔ حریم خاکی۔ کرۂ ارض دنیا۔ غوغا۔ شور و غل۔ ہنگامہ۔ استادہ کھڑا ہوا۔ نغمہ زن گانے والا۔

تبصرہ: یہ فلسفیانہ نظم، اقبال کی رمزیہ شاعری کی بہترین مثال ہے۔ اس نظم کا بنیادی تصور

یہ ہے کہ خدا کا جلوہ ہر شے میں پوشیدہ ہے لیکن اقبال نے خدا کا لفظ کہیں استعمال نہیں کیا۔

مطلب | اے چاند! فطرت نے تجھ سے زیادہ حسین کوئی شئے پیدا نہیں کی۔ دنیا کے گرد گھومنا تیری پرانی عادت ہے۔ اس کے بعد تخیل کی کارفرمائی شروع ہوتی ہے۔ شاعر کہتا ہے کہ تیرے سینہ میں جو داغ سا نظر آتا ہے، اس کو دیکھ کر میں یہ خیال کرتا ہوں کہ شاید میری طرح تو بھی کسی کا عاشق ہے بالفاظِ دگر، ہم دونوں عاشق ہیں، اور ہمارا محبوب ایک ہی ہے۔ اور دونوں کی منزلِ مقصود بھی ایک ہی ہے۔ دونوں خدا ہی کے طالب ہیں۔

دوسرا بند:۔ اے چاند! تو خدا کو تاروں کی خاموشی میں تلاش کر رہا ہے لیکن وہ زندگی کے ہنگاموں میں پوشیدہ ہے، سرو، سبزہ، بلبل، کلی، دریا، شبنم، صحرا، کوہسار، ہر جگہ اُسی کی قدرت کا جلوہ ہے اُسی نے سرو کو باغ میں قامت عطا کی، سبزے کو زمین پر پھیلایا، بلبل کو آواز عطا کی، اور پانی کو روانی بخشی۔ ہر جگہ اور ہر شئے میں اُسی کی صفات کا ظہور ہو رہا ہے۔ مجھ میں بھی وہی ہے اور تجھ میں بھی وہی ہے یہ ساری کائنات اس کی ہستی پر گواہی دے رہی ہے۔ اگر وہ نہ ہوتا، تو کچھ بھی نہ ہوتا۔

رات اور شاعر

حل لغات | پریشاں۔ اس کے دو معنی ہیں۔ لغوی معنی منتشر یا پھیلا ہوا۔ مجازی معنی وہ شخص جسے اطمینان حاصل نہ ہو۔ شعرا خوشبو کو پریشان، اس لئے باندھتے ہیں کہ خوشبو کا قاعدہ ہے کہ وہ ادھر اُدھر پھیل جاتی ہے۔ خاموش ہو گیا ہے تار رباب الخ یعنی اس وقت سب لوگ سو رہے ہیں۔ ہے میرے آئینہ میں ہستی کے سونے کی تصویر نظر آتی ہے یعنی رات کے وقت سب جاندار سو جاتے ہیں چشمِ گرداب یعنی بھنور کی آنکھ، مراد ہے بھنور۔ موج بیتاب سو گئی ہے یعنی رات کے وقت سمندر بھی ساکن ہو جاتا ہے یا ہو گیا ہے۔ آزاد رہ گیا تو الخ یعنی کیا وجہ ہے کہ تو نہیں سویا۔ افسوں یعنی جادو۔ چونکہ پہلے زمانہ میں جادوگر لوگوں پر جادو کر کے انہیں مدہوش کر دیا کرتے تھے۔ یا سُلا دیتے تھے، اس لئے شاعر نے رات کو جادوگر فرض کر کے اس کے لئے "افسوں" ثابت کیا ہے۔ چاند کی کھیتی ہیں، یعنی چاندنی نہیں۔ گہر

بوتا ہوں یعنی آنسو ٹپکاتا ہوں۔ مانندِ سحر روتا ہوں۔ کنایہ ہے شبنم سے۔ شاعر نے شبنم کو سحر کا گریہ قرار دیا ہے۔ عزلت یعنی تنہائی۔ برقِ ایمن۔ ایمن سے مراد ہے۔ وادئ ایمن جہاں حضرت موسیٰؑ نے خدا کی تجلی دیکھی تھی۔ برقِ ایمن سے مراد ہے تجلیاتِ انوارِ الٰہیہ۔ میرے سینہ پہ پڑی روتی ہے۔ یعنی میرے دل پر اس وقت (رات کی تنہائی میں) برکاتِ خداوندی کا نزول ہو رہا ہے۔ روتی ہے کنایہ ہے انسان کی ناقدری یا غفلت سے۔ مطلب یہ ہے کہ رات کے وقت فیضانِ الٰہی کا نزول ہوتا ہے لیکن انسان اس وقت محوِ خواب ہوتا ہے۔ اس لئے میں انسانوں کی غفلت پر روتا ہوں چنانچہ اگلے شعر میں شاعر نے خود اس نکتہ کی صراحت کر دی ہے۔ کہ میری محفل یعنی قوم مردہ ہے بصفتِ شمعِ لحد۔ قبر پر جو شمع جلتی ہے، کوئی اس کو دیکھنے والا نہیں ہوتا۔ بڑی دور ہے منزل میری یعنی میں اپنی قوم کو بیدار کرنا چاہتا ہوں لیکن اس مقصد میں کامیابی بڑی دور ہے۔ عہدِ حاضر سے اقبال کی مراد یہ ہے کہ اس زمانہ میں لوگوں کے دل روحانیت سے محروم ہو چکے ہیں۔ موجودہ زمانہ چونکہ مادہ پرستی کا زمانہ ہے، اس لئے یہ عہد میری قوم کے مزاج کے مطابق نہیں ہے۔

تبصرہ:- یہ بھی فلسفیانہ نظم ہے۔ اور اس میں بھی اقبال نے رمز و کنایہ سے کام لیا ہے۔ بنیادی تصور یہ ہے کہ رات کا وقت ہے۔ ساری دنیا سو رہی ہے لیکن میں جاگ رہا ہوں۔ کیوں؟ اس لئے کہ رات کا وقت ہے۔ برکاتِ خداوندی کا نزول ہوتا ہے۔ لیکن افسوس کہ میری قوم کے افراد اس وقت سو رہے ہیں اور فیضانِ سعادت سے محروم ہیں۔

مطلب:- رات نے شاعر سے دریافت کیا کہ تو اس وقت، جبکہ ساری دنیا سو رہی ہے گل کی طرح خاموش اور خوشبو کی طرح پریشان کیوں پھر رہا ہے؟ شاید تو تاروں کے حسن سے لطف اندوز ہونا چاہتا ہے، یا چاند سے مسرت حاصل کرنے کا آرزو مند ہے، یا تو کوئی آسمانی مخلوق ہے، اور کسی وجہ سے آسمان کو چھوڑ کر دنیا میں آگیا ہے۔ مطلب یہ ہے کہ تو دنیا کا باشندہ تو معلوم نہیں ہوتا، کیونکہ دنیا کے لوگ تو اس وقت سب سو رہے ہیں۔ بلکہ انسانوں کا تو ذکر ہی کیا ہے، اس وقت تو دریا بھی ساکن ہے۔ بلکہ ساری کائنات ساکن ہے لیکن تو سکون سے ناآشنا ہے، کیا بات ہے کہ میرا جادو تجھ پر نہ چل سکا؟

شاعر جواب دیتا ہے کہ اے رات! بہر حال تو رات ہے، تو میرے دردِ دل کو کیا سمجھ سکتی ہے؟ آہ! اس وسیع دنیا میں کوئی میرا ہمدم، یا ہمراز نہیں۔ میں اپنا دکھڑا کسے سناؤں؟ اور اپنی سوزشِ قلبی کا نظارہ کسے دکھاؤں؟ اس وقت آسمانی برکات کا نزول ہو رہا ہے لیکن قوم تو سو رہی ہے، بلکہ یوں کہنا چاہیئے کہ مردہ ہے۔ چونکہ عہدِ حاضر نے انسانوں کو مادہ پرستی سکھا دی ہے۔ اور میری قوم بھی اس مرض میں مبتلا ہے، اس لئے وہ اپنے نقصان کا احساس نہیں کر سکتی۔ میں اپنی قوم کو عشقِ رسول کا پیغام دے رہا ہوں لیکن وہ اس طرف متوجہ ہی نہیں ہوتی، چونکہ میں اس پیغامِ محبت کو اپنے سینہ میں ضبط نہیں کر سکتا اس لئے جب بیتاب ہوتا ہوں تو مجبور ہو کر رات کی تنہائی میں گھر سے باہر نکل جاتا ہوں، تاکہ اپنا دردِ دل، تیرے چمکتے ہوئے ستاروں ہی کو سنا دوں۔

نوٹ:۔ بظاہر یہ ایک نظم ہے، لیکن درا صل اقبال نے قوم کی بیحسی کا مرثیہ لکھا ہے ۱۲

بزمِ انجم

حلِّ لغات:۔ شامِ سیہ قبا۔ چونکہ شام کے وقت سیاہی چھا جاتی ہے۔ اس لئے شاعر نے شام کو سیہ قبا پہنائی ہے۔ لالے کے پھول مارے یعنی سورج نے افق کو سرخ کر دیا۔ کنایہ ہے شفق سے جو غروبِ آفتاب کے وقت نظر آتی ہے۔ معنے کا زیور کنایہ ہے سرخی سے۔ محل میں خامشی کے الخ رات کی لیلیٰ خاموشی کے محل میں بیٹھ کر آئی یعنی رات ہو گئی اور خاموشی چھا گئی۔ چمکے عروسِ شب کے الخ یعنی تارے چمکنے لگے۔ محوِ فلک فروزی الخ یعنی تارے آسمان کو چمکانے میں مصروف تھے۔ جاگ اٹھیں سونے والے یعنی انسان خوابِ غفلت سے بیدار ہو جائے۔ آئینے قسمتوں کے الخ بہت بلیغ مصرع ہے اس میں اس بات کی طرف اشارہ ہے کہ دنیا والے چونکہ یہ سمجھتے ہیں کہ ہماری قسمت ستاروں سے وابستہ ہے یا ستارے ہماری قسمت پر اثر انداز ہوتے ہیں۔ اس لئے امید واثق ہے کہ وہ تمہارے پیغام (مہر دم) کو بڑے غور سے سنیں گے۔ وسعت تھی آسماں کی معمور الخ، یعنی فرشتوں نے یہ گیت جو تیسرے بند میں

درج ہے اگانا شروع کیا۔ حسنِ ازل خدا کی قدرت کا جلوہ شبنم کی آرسی چونکہ شبنم کے قطرہ میں گلاب کا عکس نظر آتا ہے، اس لئے شاعر نے قطرۂ شبنم کی آرسی باندھا ہے۔ آئینِ نو۔ نیا قانون۔ آئینِ نو سے ڈرنا۔ اپنی قومی زندگی میں تبدیلی سے ڈرنا۔ طرزِ کہن سے مراد ہے۔ اجتماعی زندگی کا پرانا طریقہ۔ اڑنا یعنی قائم رہنا۔ تیز گام یعنی تیز چلنے والا۔ رواداری یعنی ہنگامہ، انقلاب یا حرکت۔ جذبِ باہمی سے بظاہر کشش کا قانون مراد ہے لیکن دراصل اس سے مراد ہے باہمی الفت۔

تبصرہ:۔ اس دلکش تمثیلی نظم میں، اقبال نے تاروں کی زبان سے قومی زندگی کا راز فاش کیا ہے۔ یعنی یہ حقیقت واضح کی ہے کہ مسلمان اگر بحیثیت قوم، ترقی کرنا چاہتے ہیں تو تاروں کی زندگی سے سبق حاصل کریں۔ ان کا نظام جذبِ باہمی سے قائم ہے۔ اسی طرح مسلمان بھی الفتِ باہمی کی بدولت ترقی کر سکتے ہیں۔

مطلب:۔ پہلا بند:۔ جب سورج غروب ہو گیا تو رات ہو گئی اور آسمان پر تارے نکل آئے۔ ایک فرشتے نے تاروں سے کہا:۔

دوسرا بند:۔ اے تارو! تم سب گردوں نشیں (معزز) ہو! اس وقت کوئی ایسا نغمہ چھیڑو کہ زمین کے باشندے بیدار ہو جائیں۔ چونکہ وہ لوگ یہ سمجھتے ہیں کہ تم ان کی قسمتوں پر اثر انداز ہو، اس لئے مجھے توقع ہے کہ وہ ضرور تمہارے پیغام (نغمہ) کو سنیں گے۔ فرشتہ کی یہ بات سن کر، ستاروں نے یہ نغمہ شروع کیا۔

تیسرا بند:۔ تاروں کی چمک دمک میں خدا کی قدرت کا جلوہ نظر آتا ہے۔ بلکہ "خدا کا عکس" تاروں میں اسی طرح نظر آتا ہے، جس طرح گلاب کا عکس، شبنم کی آرسی میں۔ جو قوم لکیر کی فقیر بنی رہتی ہے اور حالاتِ حاضرہ سے مطابقت نہیں کرتی۔ وقت کے تقاضوں کو نہیں پہچانتی، وہ ترقی نہیں کر سکتی "زمانہ" ہر وقت آگے بڑھتا رہتا ہے جو قومیں زمانہ کا ساتھ نہیں دیتیں اور اپنی جگہ بیٹھی پڑی رہتی ہیں ان کے اس جمود کا نتیجہ اس کے سوا اور کچھ نہیں نکلتا کہ دوسری قومیں ان کو کچلتی ہوئی آگے بڑھ جاتی ہیں۔

جو ستارے اس وقت ہماری نظروں سے اوجھل ہیں، ہم ان کو بھی اپنی برادری (جماعت) میں شامل سمجھتے ہیں۔ افسوس اس نکتہ کو زمین والے اب تک نہیں سمجھے مطلب اس کا یہ ہے کہ مسلمانوں کو لازم ہے کہ صرف ان ہی مسلمانوں کو اپنا بھائی نہ سمجھیں جو ان کی نظروں کے سامنے ہیں (ان کے شہر میں

رہتے ہیں) بلکہ تمام دنیا کے مسلمانوں کو اپنا بھائی سمجھیں (جو دوسرے ملکوں میں رہتے ہیں) مسلمانوں کا قومی نظام صرف اس صورت میں قائم رہ سکتا ہے کہ "جذب باہمی" کے اصول پر عمل کریں یعنی آپس میں سب مسلمان (از ہندوستان تا مراکش) ایک دوسرے سے محبت کریں اور ہر مسلمان دوسرے مسلمان کو اپنا بھائی سمجھے. خلاصۂ کلام یہ کہ اس نظم میں اقبال نے مسلمانوں کو تنظیم اور ربط و ضبط باہمی کا پیغام دیا ہے۔

سیرِ فلک

حلّ لغات: تخیل۔ اس کے لغوی معنی ہیں خیال میں آنا. منطقی اصطلاح میں اس کی تعریف یہ ہے کہ جب نفس مدرکہ ان صور جزئیہ کا ادراک کرتا ہے، جو بذریعہ حواس خمسہ ظاہری، خزانۂ خیال میں جمع ہو جاتی ہیں تو اس کیفیت ادراکیہ کو تخیل کہتے ہیں۔ یہاں اس شعر میں تخیّل سے اس کے عرفی معنی مراد ہیں یعنی قوت متخیلہ جس کی بدولت ایک شخص گھر بیٹھے "عالم خیال" میں ساری دنیا کی سیر کر سکتا ہے بلکہ بقول اقبال، آسمان پر بھی جا سکتا ہے. مثلاً ایک شخص لاہور میں بیٹھ کر یہ تصور کر سکتا ہے کہ اس وقت مدینہ میں حضور انور صلعم کے مواجہہ شریف میں بیٹھا ہوا حالِ دل بیان کر رہا ہوں، یا اسکیں اسٹا ہین کے ساتھ چائے پی رہا ہوں۔

حلقۂ صبح و شام سے نکلا یعنی اس دنیا کی حدود و قیود سے آزاد ہو گیا۔ اور جنت میں پہنچ گیا۔ ارم سے یہاں جنت مراد ہے۔ خاتم آرزوئے دیدہ و گوش. کان اور آنکھ جس قدر آرزوئیں کر سکتے ہیں سب کی ختم کرنے والی خاتم کو دو طرح پڑھ سکتے ہیں (۱) خاتم بمعنی ختم کرنے والا (۲) خاتم بمعنی انگوٹھی یا مہر. مصرع کا مطلب یہ ہے کہ انسان جسقدر آرزوئیں کر سکتا ہے ان سب کی تکمیل کا سامان جنت میں موجود ہے. طوبیٰ۔ جنت میں ایک درخت ہے جلوہ فروش یعنی حوریں، آزادی کے ساتھ اپنا حسن دجمال دکھا رہی تھیں. ساقیان جمیل یعنی خوبصورت لڑکے جو جنت میں شراب پلائیں گے. جن کو اصطلاح میں "غلمان" کہتے ہیں۔ ایک تاریک خانہ. کنایہ ہے جہنم سے

طائع قیس وگیسوئے لیلی یعنی وہ جگہ قیس (مجنوں) کے نصیبہ یا قسمت کی طرح اور لیلی کی زلفوں کی طرح سیاہ تھی۔ دوش بدوش۔ کاندھے سے کاندھا ملائے ہوئے یعنی مدّمقابل کرۂ زمہریر سے وہ کرہ مراد ہے جو کرۂ ہوا کے وسط میں واقع ہے۔ اس لفظ کے لغوی معنی ہیں سرمائے شدید یا سخت سردی۔ سروش بمعنی فرشتہ تہی آغوش بمعنی خالی مستعار۔ عاریت سے نکلا ہے۔ مانگی ہوئی چیز لرزاں کانپنے والا عبرت کوش نصیحت حاصل کرنے والا۔ انگار۔ اگر اس کو پنجابی زبان کا لفظ مانا جائے تو مراد ہے انگارے یعنی دہکتے ہوئے کوئلے اور اگر فارسی لفظ قرار دیا جائے تو اس کے معنی ہیں خیالات، تصورات یا پندار۔

تبصرہ:۔ بڑی دلکش اور موثر نظم ہے۔ بنیادی تصور یہ ہے کہ جہنم دراصل تاریک اور خاموش اور سرد ہے۔ اس کی گرمی یا اس کے شعلے ذاتی نہیں ہیں بلکہ جو لوگ اپنی بداعمالیوں (شہوت ستانی خیانت، بلیک مارکیٹ نفع اندوزی ذخیرہ سازی) کی بنا پر یہاں آتے ہیں وہ اپنی بداعمالیاں اپنے ساتھ لاتے ہیں یعنی انسان اپنی دوزخ خود اپنے ہاتھوں سے بناتا ہے مثلاً جو زمیندار یا جاگیردار غریب کاشتکاروں کا خون چوس چوس کر اپنی تجوریاں بھرتا ہے۔ تو دوزخ میں یہی دولت، اس کے حق میں وبالِ جان بن جائے گی۔ چنانچہ اللہ تعالےٰ قرآن مجید میں فرماتا ہے۔

"قیامت کے دن اُن لوگوں کی جنہوں نے دنیا میں سونا، چاندی جمع کیا اور اسے اللہ کے راستہ میں خرچ نہیں کیا پیشانیوں، پہلوؤں اور پشتوں کو، اسی سونے چاندی سے (جس کو گرم کر لیا جائے گا) داغا جائے گا اور فرشتے سرمایہ داروں سے کہیں گے کہ "فَذُوقُوا مَا كُنتُمْ تَكْنِزُونَ"۔ یعنی مزہ چکھو اُس دولت کا جسے تم نے جمع کیا تھا۔

(دیکھو سورہ توبہ آیت ۳۴)

مطلب:۔ شاعر کہتا ہے کہ ایک دن میں نے عالم خیال میں آسمان کی طرف پرواز شروع کی۔ وہاں کوئی شخص میرا واقف نہیں تھا تارے مجھے بڑے تعجب سے دیکھتے تھے کہ یہ شخص کہاں جا رہا ہے۔ لیکن میرا سفر ایک راز تھا جس سے وہ آگاہ نہیں تھے یعنی میں جہنم کی ماہیت دریافت کرنے جا رہا تھا'

پہلے میں جنت میں گیا۔ وہاں درختوں پر پرندے گا نا گا رہے تھے، اور حوریں آزادی کے ساتھ باغوں کی سیر کر رہی تھیں، جنتی لوگ شراب طہور پی رہے تھے، دوزخ میں نے ایک نہایت سیاہ مکان دیکھا لیلیٰ کی زلفوں سے بھی زیادہ سیاہ۔ سیاہی اور تاریکی کے علاوہ وہاں سردی اس قدر شدید تھی کہ اس کے سامنے کرۂ زمہریر کی بھی کوئی حقیقت نہیں تھی میں نے فرشتوں سے پوچھا کہ یہ کیا جگہ ہے؛

انھوں نے کہا کہ یہ جہنم ہے آگ اور روشنی دونوں سے محروم ہے اس کے شعلے ذاتی نہیں ہیں بلکہ جہنمی لوگ اپنے شعلے (انگارے) دنیا ہی سے اپنے ساتھ لاتے ہیں۔ مثلاً ان دولتمند لوگوں کے حق میں (جو اپنی دولت راہِ خدا میں خرچ نہیں کرتے) ان کی وہ دولت ہی عذاب بن جائے گی۔ (جیسا کہ قرآنی آیت سے واضح ہے)۔

اگر انگارے سے خیالات مراد لی جائے تو یہ معنی ہوں گے کہ دوزخی لوگ اپنے خیالات اور اعمال بد ساتھ لاتے ہیں اور یہ خیالات ہی ان کے حق میں عذاب (آگ) کے شعلے بن جاتے ہیں خلاصہ کلام یہ کہ جہنم کے شعلے ذاتی نہیں بلکہ مستعار ہوتے ہیں۔ اور یہی ہے وہ بنیادی تصور جسے اقبال ہمارے ذہن نشین کرنا چاہتے ہیں۔

نصیحت

حلّ لغات:- عامل دو معنی ہیں (۱) عمل کرنے والا یا پابند (۲) گونر یا حاکم یہاں پہلے معنی مراد ہیں ارباب ریا یعنی منافق لوگ جو دکھانے کے لیے نیک کام کرتے ہیں مصلحت آمیز جس میں کوئی فائدہ پوشیدہ ہو۔ تعلق خوشامد۔ سراپا اعجاز۔ بہت عجیب۔ مدحت سرکار۔ انگریزوں کی تعریف و توصیف۔ فکرِ روشن۔ ذہنِ رسا یا قوت مدرکہ۔ اقبال نے فکر کو مذکر باندھا ہے۔ موجد آئین نیاز یعنی تیری عقل نے غلامی کا طریقہ یا شیوہ ایجاد کیا ہے۔ (علی گڑھ، لاہور اور پشاور کے اسلامیہ کالجوں کے انگریز پرنسپلوں نے جن کو اقبال نے خشتِ کلیسا سے تعبیر کیا ہے مسلمان نوجوانوں کو

خوئے غلامی میں "پختہ تر" کر دیا) درِ حکام سرکاری افسران اعلیٰ کی کوٹھیاں، جن کا طواف مسلمان سرمایہ دار اور خطاب یافتہ یا خطاب کے امیدوار مسلمان بڑے خلوص کے ساتھ کیا کرتے تھے۔ مقامِ محمود۔ یہ ترکیب قرآن مجید کی اس آیت سے ماخوذ ہے۔

عَسٰٓی اَنْ یَّبْعَثَکَ رَبُّکَ مَقَامًا مَّحْمُوْدًا ۔ یقین ہے کہ آپ کا رب آپ کو مقامِ محمود عطا فرمائے گا مقامِ محمود سے مراد ہے نہایت بلند اور محترم درجہ یا قربِ خداوندی

اقبال نے بظاہر اس ترکیب کے لغوی معنی مراد لیے ہیں یعنی مسلمان حکام کے دروازوں کو اپنے حق میں بہت مفید (قابلِ تحسین مقام) سمجھتے ہیں لیکن دوسرے معنی بھی مراد ہو سکتے ہیں یعنی یہ کہ دنیا پرست مسلمان انگریزوں کی چوکھٹ کو اپنے لیے "قربِ خداوندی" سے کم نہیں سمجھتے۔ پالیسی انگریزی زبان کا لفظ ہے (Policy) بمعنی طریق کار یا دنیا میں ترقی حاصل کرنے کا طریقہ واضح ہو کہ پالیسی موجودہ سیاسات کی اصطلاح ہے اور اس میں عیاری اور فریب کا مفہوم پوشیدہ ہے چنانچہ آج کل ووٹوں کے امیدوار کو خواہ وہ "صالح" ہو یا غیر صالح، بڑی پالیسی سے کام لینا پڑتا ہے ورنہ کامیابی حاصل ہونی دشوار ہے پیچیدہ تر از زلفِ ایاز۔ بڑا بلیغ مصرع ہے۔ زلف کی خوبی یا حسن اس کی پیچیدگی پر منحصر ہے، اس لیے ایاز کا لفظ لائے ہیں جس سے اس جگہ وہ شخص مراد نہیں ہے جو سلطان محمود کا غلام تھا۔ بلکہ معشوق مراد ہے یعنی آج کل کے لیڈروں کی پالیسی، معشوقوں کی زلفوں سے بھی زیادہ پیچیدہ ہوتی ہے۔ پیچیدگی سے وہی منافقت مراد ہے کہ ظاہر کچھ باطن کچھ۔

لہ اس میں کیا شک ہے کہ محکم ہے یہ ابلیسی نظام۔ پختہ تر جس سے ہوئے خوئے غلامی میں غلام پردۂ خدمتِ دیں میں ہوسِ جاہ کا راز یعنی بعض لوگ ایسے ہوتے ہیں کہ وہ ظاہر تو یہ کہتے ہیں کہ ہم اسلام یا مسلمانوں کی خدمت کر رہے ہیں لیکن دراصل وہ اپنی ترقی کے لیے سارے جتن کرتے ہیں چنانچہ آج کل پاکستان میں ایک جماعت ہے جس کے ارکان ظاہر تو یہ کرتے ہیں کہ ہم اس ملک میں اسلامی حکومت قائم کرنی چاہتے ہیں لیکن دراصل اپنی حکومت کے آرزومند ہیں۔ چنانچہ

آج کل یہ جماعت ووٹوں کی دھن میں پھرکی بنی ہوئی ہے۔ دست پرور یعنی تو اخباروں کے مالکوں کو بھی
بھاری رقمیں دیتا رہتا ہے۔ تاکہ وہ تیرا پروپیگنڈہ کرتے رہیں تشہیر کا ساز چھیڑنا یعنی پبلسٹی کرنا
شراب شیراز یعنی تیرے کلام میں حافظ شیرازی کی سی دلکشی پائی جاتی ہے۔
تیری مینائے سخن میں الخ یعنی تیری شاعری کی بوتل میں شیراز کی شراب بھری ہوئی ہے
تیز گام و تاز یعنی لیڈری کے لئے دوڑ دھوپ کر۔ غم نیاز نہیں یعنی حکومت کی خفگی یا عتاب
کا اندیشہ نہیں (کیونکہ تو در حکام کو مقام محمود سمجھتا ہے) پر دار بھی ہیں یعنی لیڈر کے اوصاف موجود
ہیں۔ داغ پرواز۔ دنیاوی ترقی کی آرزو۔ عاقبت منزل ما وادی خاموشاں است الخ۔ چونکہ انسانی
زندگی کا انجام بہر صورت قبرستان ہے تو پھر انسان کیوں اس چند روزہ زندگی کا بہترین طریق پر
استعمال نہ کرے۔ (بار بار تو آنا نہیں ہے) پس لازم ہے کہ اٹھ اور ساری دنیا میں اپنے نام کا ڈنکا
بجادے۔
تبصرہ:۔ دراصل اس دلکش نظم میں اقبال نے اپنے زمانے کے لیڈروں کی اصلی تصویر دکھائی ہے
یہ نظم طنزیہ شاعری کی بہترین مثال ہے۔
مطلب:۔ کہتے ہیں کہ ایک دن میں نے اقبال سے یہ کہا کہ لیڈری کے لئے جن صفات کا پایا جانا
ضروری ہے وہ سب تجھ میں موجود ہیں۔ پھر تو اس نعمت عظمیٰ کے لئے جدوجہد کیوں نہیں کرتا! اب
شاعر ان صفات کی صراحت کرتا ہے۔
(۱) پہلی خوبی تجھ میں یہ ہے کہ تجھے شریعت اسلامیہ سے کوئی سروکار نہیں ہے۔
(۲) تو بھی دوسرے لیڈروں کی طرح ریاکار ہے بلکہ اس فن لطیف میں کامل ہے۔ مثلاً
تیرے دل میں انگریز کی محبت بھی پوشیدہ ہے لیکن تو زبان سے عشق رسول کا اظہار کرتا ہے۔
(۳) تیسری خوبی یہ ہے کہ تو ہمیشہ "دروغ مصلحت آمیز" پر عمل کرتا ہے یعنی صوفی صدی جھوٹ
بولتا ہے لیکن جب قوم اس کی وجہ دریافت کرتی ہے تو اس کی پوشیدہ مصلحتیں بیان کر دیتا ہے
مثلاً یہ کہ اگر میں سچ بولتا تو لاٹ صاحب ناراض ہو جاتے۔ کالج کی گرانٹ بند ہو جاتی۔ روزانہ

کسی اجلاس میں شریک نہ ہوتے کسی مسلمان کو ڈسٹرکٹ بورڈ میں نامزد نہ فرماتے وغیرہ وغیرہ۔

(۴) چوتھی خوبی یہ ہے کہ تو خوشامد اور چاپلوسی کے فن میں طاق ہے بلکہ تیرے ایجاد کردہ طریق خوشامد میں تو معجزہ کا رنگ پایا جاتا ہے۔ کوئی شخص اس فن میں تیرا مقابلہ نہیں کر سکتا۔

(۵) ہمیشہ تو اپنی تقریر کو سرکار (برطانیہ) کی مدحت وستائش پر ختم کرتا ہے، بلکہ بعض اوقات جب تجھے جنرل نکلسن کے ساتھ آبائی تعلقات کا خیال آجاتا ہے تو بھری مجلس میں تو پکار اٹھتا ہے کہ "انگریزوں سے غداری" اللہ اور اُس کے رسول سے غداری کے مترادف ہے۔ ع۔

"پھرے جو اس سے تو مجھ سے مرا خدا پھر جائے"

(۶) تو حکام کی کوٹھیوں کے طواف کو اپنے لئے باعث سعادت اُخروی سمجھتا ہے، اور تیری حکمت عملی بھی ایسی پیچیدہ ہے کہ کسی کی سمجھ میں نہیں آتی کہ دراصل تیرا کیا مقصد ہے ع۔

باغباں بھی خوش رہے راضی رہے صیاد بھی

(۷) ساتویں خوبی تجھ میں یہ ہے کہ تو زہرہ کی طرح، اوّل درجہ کا مکار ہے۔ اور پبلک کو فریب دینے کے فن میں ماہر ہے یعنی تو دنیا حاصل کرنے کے لئے مذہب فروشی کر سکتا ہے، اور دین کی خدمت کے پردے میں دنیاوی عزت حاصل کرنے کے ارادوں اور خواہشوں کو پوشیدہ کر سکتا ہے۔

(۸) آٹھویں خوبی تجھ میں یہ ہے کہ تو عید، بقر عید کو شاہی مسجد میں نماز پڑھنے بھی چلا جاتا ہے۔ اور اپنے ذاتی رسوخ کی بنا پر پہلی صف میں جگہ بھی حاصل کر لیتا ہے۔ نیز یہ کہ جب تو وعظ سنتا ہے تو تیرا رومال بھی اشکوں سے تر ہو جاتا ہے۔

(۹) نویں خوبی یہ ہے کہ تو ملک کے تمام مقتدر اخباروں کی بھی خدمت کرتا ہے، اور وہ بھی اپنے کالموں میں تیرا "ذکر خیر" کرتے رہتے ہیں۔

(۱۰) دسویں اور سب سے بڑی خوبی یہ ہے کہ تو شاعر بھی ہے اور تیرے کلام میں حافظ کی طرح بڑی دلکشی ہے۔

خلاصۂ کلام یہ کہ گرفتاری کا تجھے خوف نہیں (ملاحظہ ہو خوبی ۵) اور معاش کی تجھے فکر نہیں۔ (دیکھو خوبی ۲) پھر کیا وجہ ہے کہ تو لیڈری کے لیے کوشش نہیں کرتا۔ اٹھ اور ان صفاتِ عالیہ سے فائدہ حاصل کر۔ کیا تو نے اس نکتہ پر غور نہیں کیا کہ جب زندگی کا انجام فنا ہے تو لازم ہے کہ انسان اس چند روزہ زندگی کو حتی المقدور "عزت" اور "راحت" کے ساتھ بسر کرے۔ مرنے کے بعد تو گوشۂ گمنامی میں چلا ہی جانا ہے۔ کم از کم اس زندگی میں تو کوئی ہنگامہ برپا کر لے۔

رام

حل لغات:- شرابِ حقیقت سے حقیقت مراد ہے۔ حقیقت کے تین معنی ہیں (۱) عرفی معنی سچی بات مثلاً حقیقت یہ ہے کہ انسان فانی ہے (۲) اصطلاحی معنی (جب کہ اسے فلسفہ کی اصطلاح قرار دیا جاتا ہے) اصل کائنات (خدا پرستوں کے نزدیک خدا، اور مادہ پرستوں کے نزدیک مادہ) واضح ہو کہ فلسفہ میں حقیقت ہی سے بحث کی جاتی ہے اور تمام بحثیں اسی اصل اصول سے نکلتی ہیں جن کی تفصیل اس شرح میں کرنا ناممکن ہے۔ (۳) لغوی معنی، وہ شے جو ہمیشہ قائم رہے، اس لحاظ سے باطل کی ضد ہے۔

ہندوستان کا جام، حقیقت کی شراب سے لبریز ہے۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ ہندوستان کے حکمار نے "حقیقت" کی تحقیق میں بڑی معرکۃ الآرا بحثیں کی ہیں۔

خطۂ مغرب سے یورپ مراد ہے۔ واضح ہو کہ یورپ کے حکمار نے ہندوستان کے فلسفہ کے مختلف مدارس سے جن کو اصطلاح میں "درشن" کہتے ہیں، بہت کچھ استفادہ کیا ہے اور یہاں کے قدیم حکمار کی منطقی موشگافیوں کا اعتراف کیا ہے میرے خیال میں حقیقت سے متعلق بحثوں میں ہندی حکمار نے بڑی بالغ نظری کا ثبوت دیا ہے۔ چنانچہ یورپ کے حکمار نے ابھی تک کوئی ایسا فلسفیانہ نظریہ پیش نہیں کیا جسے ہندی حکمار . . . نے کسی نہ کسی رنگ میں قبل ازیں پیش نہ کر دیا ہو۔ یہی وجہ ہے کہ علامہ اقبال نے، جو خود بھی ایک بلند پایہ فلسفی تھے اور بقول ڈاکٹر آرنلڈ، مشرق اور مغرب کے تمام فلسفیانہ مدارس

فکر پر عمیق نظر رکھتے تھے، ہندی فلسفہ کی عظمت کا اس شعر میں اعتراف کیا ہے۔ رام ہند۔ رام میں صنعت ایہام ہے۔ کیونکہ اس کے دو معنی ہیں (۱) رام کو سنسکرت کا لفظ قرار دیا جائے تو یہ ایک شخص کا نام ہے (۲) رام کو فارسی لفظ قرار دیا جائے تو اس کے معنی ہیں مطیع، فرمانبردار یعنی یورپ کے سارے حکماء ہندی فلسفہ کے مداح ہیں۔ فکر فلک رس۔ آسمان تک پہنچنے والی قوت مفکرہ واضح ہو کہ "فکر" وہ قوت ہے جس کی بدولت انسان فلسفیانہ اور منطقی مسائل میں غور وخوض کر سکتا ہے ملک سرشت۔ ایسے نیک لوگ جو فرشتوں کی طرح پاکیزہ عادات رکھتے تھے۔ اہل نظر۔ ارباب عقل اعجاز۔ معجزہ۔ رام کو اقبال نے چراغ ہدایت اس لئے کہا ہے کہ انہوں نے اہل ہند کو خدا پرستی سکھائی۔ دھنی تھا یعنی شمشیر زنی میں ماہر تھا۔ فرد۔ یعنی یکتا۔

تبصرہ:۔ اقبال نے اس نظم میں شری رام چندر جی کی خدمت میں خراج تحسین پیش کیا ہے جن کو تمام سناتن دھرمی ہندو، خدا کا اوتار، اور شری کرشن جی سے بھی زیادہ واجب الاحترام سمجھتے ہیں اسی لئے اقبال نے یہ لکھا ہے کہ رام کے وجود پر ہندوستان کو ناز ہے۔ ان کی شخصیت میں بہت سی خوبیاں جمع تھیں مثلاً وہ بہت بہادر تھے۔ پاک طینت تھے اور اپنے باپ کے بہت فرمانبردار تھے، چنانچہ انھوں نے اپنے باپ کے کہنے سے چودہ سال کے لئے بن باس اختیار کیا۔ تمام تکالیف کو بخوشی برداشت کیا۔ اور دنیا کے سامنے اطاعتِ والدین کا قابل قدر نمونہ پیش کیا۔

موٹر

حل لغات:۔ پتہ کی بات ایسی بات جس میں کوئی نکتہ پوشیدہ ہو۔ ہنگامہ آفریں نہیں الخ یعنی جب چلتی ہے تو شور نہیں کرتی۔ پاشکستہ لغوی معنی وہ جس کا پاؤں ٹوٹ گیا ہو۔ مراد ہے ایک جگہ قائم یا ساکن۔ نکہت بمعنی خوشبو۔ مینا بمعنی بوتل۔ شورش قلقل۔ جب بوتل سے شراب یا عرق انڈیلتے ہیں تو آواز پیدا ہوتی ہے جسے قلقل کہتے ہیں۔ جام خرام آشنا۔ جام کو خرام آشنا اس لئے باندھا کہ وہ مدام گردش میں رہتا ہے یعنی دورِ شراب جلتا رہتا ہے۔ شاعر کے

فکر کو الخ یعنی شاعر چونکہ خاموش رہتا ہے۔ اس لئے اس کی فکر بہت تیزی کے ساتھ پرواز کرتی ہے۔ سرمایہ دارِ گرمیِ آوازِ خاموشی، یہ بہت بلیغ مصرعہ ہے اور اقبال کے مخصوص اسلوبِ بیان کا حامل ہے۔ مطلب یہ ہے کہ شاعر کی خاموشی میں وہی تاثیر پائی جاتی ہے جو دوسروں کی آواز (گویائی) میں ہوتی ہے۔ لفظ "سرمایہ دار" مجازی معنی میں مستعمل ہے۔ مراد یہ ہے کہ شاعر کی خاموشی، گویائی کی دولت سے مالا مال ہوتی ہے یعنی اپنے اندر گویائی سے بڑھ کر طاقت رکھتی ہے۔

تبصرہ:۔ یہ نظم اقبال کی قوتِ تخیل کی عمدہ مثال ہے جس کی بدولت وہ معمولی واقعات سے بھی فلسفیانہ نکات، پیدا کر لیا کرتے تھے۔ اس نظم کا قصہ یہ ہے کہ ایک مرتبہ اقبال اپنے دوست نواب سر ذوالفقار علی خاں صاحب مرحوم کی موٹر میں سر جوگندر سنگھ اور مرزا جلال الدین صاحب بیرسٹر کے ساتھ سیر کو گئے تھے۔ اس زمانہ میں موٹریں عام طور سے چلنے میں بہت شور کرتی تھیں لیکن نواب صاحب کی موٹر چونکہ بہت قیمتی تھی، اس لیے اس میں یہ نقص نہیں تھا۔ (یہ موٹر جس کا نام TALBOT تھا۔ نواب صاحب نے ۱۹۱۱ء میں منگوائی تھی) چنانچہ سر جوگندر سنگھ نے متعجب ہو کر علامہ اقبال سے یہ بات کہی کہ "نواب صاحب کی یہ موٹر کس قدر خاموش ہے"۔ یہ فقرہ سن کر اقبال کا ذہن رسا، فوراً اس طرف منتقل ہو گیا کہ اس موٹر پر کیا منحصر ہے، بلکہ خیالات میں ہر تیز پا خاموش ہے چنانچہ دوسرے دن اقبال نے معمولی سی بات پر یہ نظم سپردِ قلم کر دی۔

نواب سر ذوالفقار علی صاحب مرحوم کا آبائی وطن "مالیر کوٹلہ" تھا اور وہاں کے حکمران خاندان سے تعلق تھا۔ ۱۸۷۵ء میں پیدا ہوئے ۱۸۹۳ء میں گورنمنٹ کالج سے بی اے پاس کیا ۱۸۹۶ء سے ۱۸۹۹ء تک کیمبرج اور پیرس میں رہے۔ ۱۹۱۱ء میں سی۔ ایس آئی ۱۹۱۹ء میں سر کا خطاب ملا۔ ۱۹۲۰ء میں کونسل آف سٹیٹ کے رکن منتخب ہوئے۔ اور ۱۹۲۶ء میں مشرقی پنجاب . . . . سے مرکزی اسمبلی کے رکن منتخب ہوئے۔ ۲۶ مئی ۱۹۳۳ء کو بمقام ڈیرہ دون وفات پائی۔

نواب صاحب مسلمانوں کے سچے ہمدرد اور علم و ادب کے شیدائی تھے۔ جب علامہ

اقبال مرحوم ۱۹۰۸ء میں یورپ سے واپس آئے تو شیخ سر عبدالقادر مرحوم نے ان کو نواب صاحب سے متعارف کیا۔ چونکہ نواب صاحب علم دوست تھے اس لیے بہت جلد دونوں میں دوستانہ تعلقات قائم ہوگئے۔ جب ۱۹۱۰ء میں نواب صاحب نے کوئینز روڈ پر اپنی عالیشان کوٹھی تعمیر کی تو اس کا نام "زرافشان" اقبال ہی نے تجویز کیا تھا۔ ۱۹۲۱ء میں نواب صاحب نے اقبال کی شاعری پر انگریزی میں سب سے پہلی کتاب لکھی جس کا نام تھا "مشرق سے ایک آواز"۔ نواب صاحب ہی کی کوشش سے اقبال کو ۲۳ء میں سر کا خطاب ملا تھا۔ اور اس میں کوئی شک نہیں کہ اقبال کو علمی دنیا سے روشناس کرنے میں نواب صاحب کا بڑا حصہ ہے چونکہ وہ اقبال کے محسن تھے۔ اس لیے میں نے مناسب سمجھا کہ ان کے احسانات کا تذکرہ کر دوں۔

سر جوگندر سنگھ دراصل نواب صاحب کے دوست تھے اور اس زمانہ میں امرتسر میں رہتے تھے لیکن وہ بھی نواب صاحب کی طرح علم و ادب کے دلدادہ تھے اس لیے اکثر ان سے ملنے کے لیے لاہور آتے رہتے تھے۔ ان سے اقبال کی ملاقات نواب صاحب ہی کے یہاں ہوئی تھی۔ سکھوں میں صرف دو آدمی ایسے گزرے ہیں جو اقبال کے کلام کے شیدائی تھے۔ ایک تو یہی جوگندر سنگھ، دوسرے امراؤ سنگھ گل جو زیادہ تر فرانس میں رہا کرتے تھے۔ اور انھوں نے وہیں شادی بھی کر لی تھی۔ جوگندر سنگھ چونکہ انگریزی اور فارسی دونوں زبانوں میں مہارت رکھتے تھے۔ اس لیے انھوں نے "اسرارِ خودی" پر انگریزی میں کچھ قابل قدر مضامین بھی لکھے تھے۔

مطلب:۔ جوگندر سنگھ نے جب یہ کہا کہ نواب صاحب کا موٹر کس قدر خاموش ہے تو یہ سن کر میں نے کہا کہ موٹر پر ہی کیا منحصر ہے۔ زندگی کے سفر میں تیز رفتاری دکھاتے ہیں جو خاموش ہیں مثلاً گھنٹہ شور کرتا ہے اس لیے ساکن ہے۔ خوشبو خاموش ہے اس لیے بہت جلد پھیل جاتی ہے۔ بوتل شور کرتی ہے اس لیے ساکن ہے۔ جام خاموش ہے اس لیے گردش کرتا رہتا ہے۔ یہی حال شاعر کی فکر کا ہے وہ خاموش ہے۔ اس لیے آسمان تک پہنچ جاتی ہے۔

واضح ہو کہ یہ سب حسنِ تعلیل کی مثالیں ہیں، شاعر نے اپنی قوتِ تخیل کی بدولت یہ شاعرانہ نکتے پیدا کئے ہیں۔

انسان

حل لغات:۔ محرومِ عمل نرگس اپنی جگہ سے حرکت نہیں کرسکتی اس لئے اسے عمل سے محروم باندھا ہے مجبورِ تماشا ہے یعنی باغ کا منظر دیکھنے پر مجبور ہے خواہ وہ منظر اسے پسند ہو یا نہ ہو۔ محرومِ تمنا ہے یعنی صنوبر کی فطرت ہی اس قسم کی ہے کہ وہ کسی قسم کی آرزو نہیں کرسکتا تسلیم بمعنی اطاعت۔ خوگر بمعنی عادی سرگرمِ تقاضا ہے یعنی انسان اپنی خواہشات کی تکمیل کے لئے کوشش کرتا رہتا ہے۔ ذرّہ کنایہ ہے انسان سے۔ وسعت کی ہوس یعنی ترقی کی آرزو۔ ہیئت بمعنی شکل صورت

مطلب:۔ اقبال نے اس نظم میں انسان کی وہ خصوصیت بیان کی ہے جس کی بدولت وہ کائنات کی تمام اشیاء (جمادات، نباتات اور حیوانات) سے ممتاز ہے۔ وہ خصوصیت یہ ہے کہ کائنات میں ہر شئی مجبورِ محض ہے۔ لیکن انسان کو محدود دائرے میں اختیار بھی حاصل ہے انسان چونکہ دانا بینا اور توانا ہے۔ اس لئے اگر وہ چاہے تو اس چمنستان (دنیا) میں انقلاب پیدا کرسکتا ہے۔ اقبال نے یہ تین لفظ بہت موزوں استعمال کئے ہیں۔ اس کی تفصیل یہ ہے

(۱) انسان دانا ہے یعنی عقل رکھتا ہے،

(۲) بینا ہے یعنی حواسِ خمسہ ظاہری سے علم حاصل کرسکتا ہے۔

(۳) توانا ہے یعنی اپنی خواہشات کی تکمیل کرسکتا ہے

خطاب بہ جوانانِ اسلام

حل لغات:۔ تدبّر کسی امر میں غور و خوض کرنا کسی بات کے سمجھنے پر اپنی تمام ذہنی قوتوں کو مبذول کرنا۔ گردوں سے قوم مراد ہے۔ ٹوٹا ہوا تارا۔ اس سے وہ فرد مراد ہے جو قوم سے جدا

ہو گیا ہو۔ دارا قدیم ایران کا مشہور بادشاہ جسے سکندر نے ۳۲۵ ق م میں شکست دی
تاج سرِ دارا سے مملکت ایران مراد ہے۔ جسے مسلمانوں نے فاروق اعظمؓ کے عہدِ خلافت
میں فتح کیا تھا۔ تمدن آفریں۔ عربوں نے دنیا کو ایک اعلیٰ درجے کے تمدن (تہذیب و معاشرت)
سے روشناس کیا۔ خلاق۔ لغوی معنی بہت پیدا کرنے والا۔ آئین جہانداری حکمرانی کے قوانین
سماں نقشہ یا منظر۔ الفقر فخری یہ حضور کا ارشاد ہے کہ شانِ فقر میرے لئے باعث فخر ہے یہی
وجہ ہے کہ اقبال نے اپنی تمام تصانیف میں مسلمانوں کو اپنے اندر شان فقر پیدا کرنے کی
تلقین کی ہے۔

افسوس ہے کہ میں دریا کو کوزہ میں بند نہیں کر سکتا۔ اس موضوع پر مستقل کتاب لکھوں گا

شانِ امارت۔ حکومت کی شان دو بآبِ رنگ و خال و خط چہ حاجت روئے زیبا را
یہ حافظ شیرازی کی مشہور غزل کا مصرع ہے جس کا مطلب یہ ہے کہ جو عورت، فطری
طور پر خوبصورت اور دلکش ہوتی ہے۔ اسے لپ سٹک پوڈر، کریم، ربسلیں اور کیوٹیکس کی کوئی
ضرورت نہیں ہوتی۔ شعر کا مطلب یہ ہے کہ جس طرح ایک حسین عورت آرائش ظاہری سے
بے نیاز ہوتی ہے سی طرح ہمارے خلفاء ظاہری شان و شوکت سے مستغنی تھے اشارہ ہے
فاروق اعظمؓ کی طرف، جن سے بڑا حاکم، مدبر، منتظم سیاست دان اور جامع حیثیات انسان ابھی
تک دنیائے اسلام میں پیدا نہیں ہوا۔ اپنوں کا تو ذکر ہی کیا ہے قیصر اور کسریٰ ان کے نام سے
کانپتے تھے لیکن ان خوبیوں کے باوجود ان کی سادگی اور درویشی کا یہ عالم تھا کہ ان کے کرتے میں
پیوند لگے ہوئے تھے اور زمین پر سوتے تھے۔ غیور یعنی غیرت دار۔ غیرت بھی مروت کی طرح وسیع
المعانی لفظ ہے۔ مراد ہے، انسان کا ہر بری اور ذلیل حرکت سے اجتناب کرنا یعنی ہمارے
اسلاف دشمنی کی حالت میں بھی کوئی بات شرافت کے اصول کے خلاف نہیں کرتے تھے
منعم بمعنی دولتمند۔ گدا کے ڈر سے۔ یعنی مسلمان اس قدر غیرت دار تھے کہ مفلسی میں بھی کسی کے

ٹکڑے۔ اس شعر میں دوسرے معنی مراد ہیں یعنی جب ہم اپنے اسلاف کی کتابیں یورپ کے کتب خانوں میں دیکھتے ہیں تو دل کے (تیس) ٹکڑے ہو جاتے ہیں۔ (بہت رنج ہوتا ہے) واضح ہو کہ اقبال نے اس مصرع میں بلاغت کا کمال دکھایا ہے۔ الفاظ سے تو اس قدر ظاہر ہوتا ہے کہ مسلمانوں کی بربادی کی تاریخ بھی تو پوشیدہ ہے۔ مثلاً اگر نامور سلطان ٹیپو شہید کو شکست نہ ہوئی تو اس مرد مومن کا نادر الوجود کتب خانہ، انڈیا آفس لائبریری اور برٹش میوزیم کی زینت کیسے بنتا؟

غنی روز سیاہ پیر کنعاں را تماشا کن الخ۔ اے غنی! حضرت یعقوب کی بد قسمتی تو دیکھو کہ خود تو بیٹے کے فراق میں رو رو کے اندھے ہو گئے لیکن ان کی آنکھوں کی روشنی (بیٹے) نے زلیخا کی آنکھوں کو روشن کر دیا۔ اس شعر میں "نور دیدہ" کی ترکیب بہت بلیغ ہے۔ مطلب یہ ہے کہ حقدار یا مستحق تو محروم رہا، اور اغیار یا غیر مستحق لوگ فیضیاب ہو گئے۔

تبصرہ:۔ بڑی دلکش، دلپذیر اور اثر آفریں نظم ہے۔ اقبال کے جذبات و احساسات ملی کی آئینہ دار ہے۔ مقصد یہ ہے کہ قوم کے نوجوانوں کے اندر اپنی حالت کا، اپنے آبا و اجداد کی حالت سے موازنہ کرنے کا خیال پیدا ہو۔ یہ مصرع "تجھے آبا سے اپنے کوئی نسبت ہو نہیں سکتی" اس نظم کی جان ہے۔

نوٹ:۔ مجھے افسوس ہے کہ آج کل قوم کے نوجوانوں کو کالجوں میں مخلوط تعلیم حاصل کرنے کی وجہ سے اتنی فرصت ہی نہیں کہ وہ موازنہ کا ناخوشگوار فریضہ انجام دے سکیں۔ انسان ایک وقت میں ایک ہی کام کر سکتا ہے، اور موازنہ سے مشاہدہ بہر کیف زیادہ دلچسپ اور دلپذیر ہے۔

مطلب:۔ اے نوجوان! کبھی تو نے اس بات پر بھی غور کیا کہ تو جس قوم کا فرد ہے، وہ کسی زمانہ میں کس قدر عظیم الشان تھی؟ سن! تو اس قوم کا فرد ہے۔ (نام لیوا ہے) جس نے قیصر کا تخت الٹ دیا تھا اور کسریٰ کے تاج کو پامال کر دیا تھا تیرے اسلاف اگرچہ عرب کے صحرا سے نکلے تھے لیکن انھوں نے دنیا میں نئے تمدن کی بنیاد رکھ دی اور علوم و فنون کے دریا بہا دیئے اور

حکمرانی کا نیا طریقہ دنیا کو سکھایا یعنی ان کی بادشاہت میں بھی زردیشی (فقر) کا رنگ جھلکتا تھا۔ اور وہ اس قدر غیرت مند تھے کہ مفلسی میں بھی کسی کے آگے ہاتھ نہیں پھیلاتے۔ تھے سچ تو یہ ہے کہ تجھے اپنے بزرگوں سے کوئی نسبت نہیں ہے۔ وہ میدان جنگ میں اپنی تلوار کے جوہر دکھاتے تھے، تو ہوٹلوں میں بیٹھ کر سگرٹ کے دھوئیں میں چار پیتا ہے۔ حکومت تو خیر ایک عارضی چیز ہے اس کے جانے کا تو مجھے اتنا غم نہیں ہے جتنا رنج اس بات سے ہوتا ہے کہ آج ہمارا سارا علمی سرمایہ اغیار کے قبضہ میں ہے۔

نوٹ:۔ غنی کاشمیری کا نام ملاّ محمد طاہر تھا کلیم اور صائب کا دوست اور ہمعصر تھا۔ فارسی شاعری میں ایک خاص طرز کا موجد تھا جس کی تفصیل کا یہ موقع نہیں ہے۔ تصنع، پیچیدگیاں، دشواری اور مشکل پسندی یہ اس کے کلام کی نمایاں خصوصیات ہیں۔ صائب کی طرح یہ بھی مثال نگاری میں بہت بلند درجہ رکھتا ہے۔ چالیس سال کی عمر میں ۱۶۶۱ء میں وفات پائی غنی کی سیرت کا بہترین پہلو یہ ہے کہ اس نے ساری عمر کسی کے سامنے دستِ سوال دراز نہیں کیا۔

غرّہ شوال

حل لغات: غرہ۔ کثیر المعانی لفظ ہے (۱) سفیدی (۲) روشنی (۳) چمک (۴) گھوڑے کی پیشانی پر سفید داغ (۵) چاند رات، یا چاند کی پہلی تاریخ (۶) فاقہ یا روزہ۔ اس جگہ جیسا کہ ذیلی عنوان سے واضح ہے غرہ شوال سے مراد ہے ہلال عید یعنی چاند رات شوال۔ قمری سال کا دسواں مہینہ جس میں ہر مسلمان فضول خرچی کو باعثِ سعادتِ دارین یقین کرتا ہے اور اس قدر کھاتا ہے کہ رمضان کی ساری کسر پوری کر لیتا ہے۔ بلکہ اس سے بھی کچھ زیادہ۔ نورِ نگاہ روزہ دار یعنی روزہ دار کی آنکھوں میں تیرا وجود باعثِ مسرت ہے۔ تجھے دیکھ کر اس کی آنکھوں میں روشنی پیدا ہو جاتی ہے عید عود سے ماخوذ ہے جس کے لغوی معنی ہیں واپس آنا، لوٹنا، چونکہ عید بھی ہر سال آتی ہے اس لئے اسے عید کہنے لگے۔ تمہید بمعنی آغاز یا ابتدا۔ سرگذشتِ ملتِ بیضا۔ روشن (مسلمان)

قوم کی داستان۔ دیرینہ۔ پرانی۔ قدیم۔ رنگین قبا کنایہ ہے سرخیٔ خون اعداء سے تیری قسمت ہیں ہم آغوشی الخ یعنی تو اسی عَلَم (جھنڈے) سے ہم آغوش ہے۔ واضح ہو کہ مسلمانوں کے قومی علم کے پھریرے پر ہلال کا نشان بنا ہوتا ہے۔ آشنا پرور۔ دوست نواز یعنی وفادار۔ وفا آئین ترا تو بھی وفادار ہے۔ پیرہنِ سیمیں۔ چاندی کا لباس یعنی سفید رنگ۔ اوج۔ بلندی قافلے۔ مراد ہے دیگر اقوام عالم۔ برق رفتاری سے اُن قوموں کی روز افزوں ترقی مراد ہے۔ رہرو درماندہ۔ تھکے ہوئے مسافر سے مسلمان قوم مراد ہے۔ "منزل سے بیزاری" ساری نظم میں اس سے زیادہ بلیغ ترکیب نہیں ہے اس کی شرح لکھوں تو مستقل کتاب مرتب ہو جائے گی۔ مسلمان قوم ہی دنیا میں وہ نرالی قوم ہے جو اپنی منزل مقصود سے بیزار ہے۔ اور اگر کوئی اللہ کا بندہ اس قوم کو اس منزل کی طرف لے جانا چاہے تو اُسے "کافر" قرار دے دیتی ہے۔ مختصر یہ کہ زبان سے تو اس قوم کا ہر فرد یہ کہتا ہے کہ منزل مقصود کعبہ ہے لیکن رُخ ہر ایک کا لندن، کی طرف ہے۔ اور وہ دن دور نہیں جب ماسکو کی طرف ہو جائے گا۔

تہی ساغر۔ اے وہ شخص جس کا پیالہ خالی ہے یا جو مفلس ہے۔ اقبال نے ہلال کو "تہی ساغر" باندھا ہے کیونکہ ہلال کی شکل خالی پیالہ کی طرح ہوتی ہے۔ زنجیروں سے مراد لعنت ہے۔ اقبال کی رائے میں فرقہ بندی سے بڑھ کر کوئی لعنت نہیں ہے شکستِ رشتہ تسبیح شیخ۔ لفظی معنی ہیں شیخ صاحب کی تسبیح کے تاگے کا ٹوٹ جانا۔ مرادی معنی ہیں قوم کے شیرازے کا منتشر ہو جانا یا قوم کا صدہا فرقوں میں منقسم ہو کر ضعیف اور ذلیل ہو جانا۔ برہمن کی پختہ زناری۔ برہمن کا جنیو روز بروز مضبوط ہوتا جاتا ہے یعنی غیر مسلم اقوام روز بروز طاقتور ہوتی جاتی ہیں۔ کافروں کی مسلم آئینی سے مراد یہ ہے کہ غیر مسلم اپنی دانائی کی بدولت، اسلامی اصولِ زندگی اختیار کرتے جاتے ہیں مثلاً توحید، مساوات، جمہوریت، حریت ضمیر مطالعہ فطرت، سیر فی الارض تحقیق و تلاش طلب علم و فن، تجارت، سیاحت نکاح بیوگان وغیرہ۔ یہ وہ امور ہیں جن کی تعلیم قرآن نے

صاف لفظوں میں دی ہے لیکن

ع ہم تو اے بنا ہیں رہے اغیار بنالے ہو گئے

مسلمانوں کی مسلم آزاری کاش! اقبال آج زندہ ہوتے اور مسلمان کے طرزِ عمل کو اپنی آنکھوں سے نہ دیکھتے۔ بیشک ان کی زندگی میں بھی مسلمان، مسلمان کو ستاتا تھا لیکن اب تو اور ہی عالم ہے۔ بارشِ سنگِ حوادث مصیبتوں کا نزول، بڑی شدت کے ساتھ جس طرح بارش ہوتی ہے آئینہ دیواری سے جمود اور بے حسی مراد ہے۔ تملق پیشگی خوشامد کو اپنا پیشہ بنا لینا۔ آبرو والوں سے مسلمان مراد ہیں۔ جو بے آبرو تھے یعنی صدیوں سے غلامی کی زندگی بسر کر رہے تھے جسکو ہم نے آشنا لطف الخ یعنی جسے ہم نے بولنا سکھایا۔ اشارہ ہے اُس قوم کی طرف جسے مسلمانوں نے پتوں کے بجائے برتنوں میں کھانا اور دھوتی کے بجائے پائجامہ اور انگرکھا پہننا سکھایا۔ حریف یعنی رقیب یا مدِ مقابل۔ اور ایران میں ذرا الخ واضح ہو کہ جب تک ایران کی موجودہ دور (۱۸۹۶ء تا ۱۹۱۲ء) کی تاریخ مدِ نظر نہ ہو اس مصرع کا مطلب سمجھ میں نہیں آسکتا لیکن اس شرح میں اس تفصیل کی گنجائش نہیں ہے۔ مختصر طور پر یوں سمجھ لیجئے کہ اقبال نے جس زمانے میں یہ نظم لکھی تھی اس زمانہ میں یعنی ۱۹۱۱ء میں ایران پر بہت برا وقت پڑا ہوا تھا۔

(۱) انگریزوں اور روسیوں نے ایک خفیہ معاہدے کی رو سے ۱۹۰۷ء میں ایران کو آپس میں تقسیم کر لیا تھا۔

(۲) اس لئے یہ دونوں قومیں ملک میں ہر قسم کی بدنظمی پھیلا رہی تھیں۔

(۳) محمد علی شاہ، جسے قوم نے ۱۹۰۹ء میں معزول کر دیا تھا، دوبارہ تخت حاصل کرنے کی فکر میں تھا۔ چنانچہ ۱۹۱۱ء میں اُس نے ایران پر حملہ کیا لیکن شکست کھائی۔

(۴) ناکام ہو کر اُس نے اپنے چھوٹے بھائی سالار الدولہ کو حملہ کرنے کی ترغیب دی چنانچہ اس نے خانہ جنگی کا سلسلہ شروع کر دیا لیکن ۱۹۱۲ء میں شکست کھا کر کردستان بھاگ گیا۔

(۵) مسلسل بدنظمی اور خانہ جنگی کی وجہ سے ایران کا دیوالہ نکل گیا۔ حکومت نے امریکہ سے امداد طلب کی لیکن روس نے سخت مزاحمت کی۔

ان تمام واقعات کو سامنے رکھ کر مصرع پڑھیئے۔ تو اس کی صداقت آشکارا ہو جائے گی۔

چاک کر دی ترکِ ناداں نے خلافت کی قبا

یہ مصرع بھی تشریح طلب ہے اور اس کے سمجھنے میں دو مختلف قسم کی دشواریاں حائل ہیں پہلی دشواری یہ ہے کہ ترکوں نے "خلافت کی قبا" ۱۹۲۴ء میں چاک کی لیکن اقبال نے یہ نظم ۱۹۱۲ء کے آغاز میں لکھی تھی۔ لہٰذا ہر شخص یہ سوال کرے گا کہ اقبال نے بارہ برس پہلے اس واقعہ کا ذکر کیسے کر دیا؟ اس کا جواب یہ ہے کہ مصرع اقبال کی سیاسی بصیرت کی دلیل ہے انھوں نے ترکی کے داخلی حالات کا مطالعہ کر کے یہ پیش گوئی کی تھی جو ۱۹۲۴ء میں پوری ہو گئی

دوسری دشواری یہ ہے کہ اقبال نے کیا دیکھ کر یہ پیش گوئی کی تھی؟ اس کا جواب بھی واقعی بہت تفصیل طلب ہے جبتک ترکی کی موجودہ دور (۱۸۹۷ء تا ۱۹۱۲ء) کی تاریخ پیشِ نظر نہ ہو۔ عام آدمی نہیں سمجھ سکتا کہ اقبال نے یہ مصرع کیوں لکھا۔ مختصر طور پر یوں سمجھ لیجیے کہ اقوام یورپ کے دماغ میں یہ خیال جاگزیں ہو گیا تھا کہ جب تک سلطان روم کے نام کے ساتھ خلیفۃ المسلمین کا لقب وابستہ ہے اس کی مرکزی حیثیت ختم نہیں ہو سکتی اس لیے یہ قومیں ترکی کے خلاف رات دن ریشہ دوانیوں میں مصروف رہتی تھیں ان ہی دشمنان ملت کے ایما پر ۱۸۹۷ء میں یونان نے ترکوں کے خلاف اعلان جنگ کر دیا اور جب مارشل اُدہم پاشا نے یونان کو مسلسل شکستیں دے کر اتھینز (یونان کا دار السلطنت ہے) کا محاصرہ کیا تو روس فرانس اور انگلستان تینوں نے مل کر ترکی کو الٹی میٹم دے دیا کہ یونان خالی کر دو، ورنہ ہم سے لڑنے کے لئے تیار ہو جاؤ۔ اس واقعہ سے ناظرین ودل یورپ کے طرزِ عمل کا اندازہ کر سکتے ہیں۔ اس لئے ترکوں میں ایک جماعت ایسی پیدا ہو چکی تھی جو یہ چاہتی تھی کہ ترکی خلافت سے دست بردار ہو جائے، نہ بانس ہوگا نہ بانسری بجے گی

اگرچہ سلطان عبدالحمید ثانی نے ۱۹۰۸ء میں دستوری حکومت کا اعلان کر دیا تھا مگر محمد علی شاہ والی ایران کی طرح وہ بھی در پردہ دستوری حکومت کے خلاف تھے اس لئے ۱۹۰۹ء میں ترکوں نے انہیں معزول کر دیا۔ اور انجمن اتحاد و ترقی کے ارکان برسرِ اقتدار آ گئے ان میں اور شاہ پسند جماعت میں خانہ جنگی شروع ہو گئی۔ اس سے فائدہ اٹھا کر ۱۹۱۱ء میں اٹلی نے طرابلس پر حملہ کر دیا۔ ۱۹۱۲ء میں بلغاریہ نے ترکوں سے جنگ کر دیا۔ غرض کہ ایران کی طرح ترکی بھی داخلی اور خارجی فتنوں کا شکار ہو چکا تھا۔ ان تمام باتوں کو دیکھ کر اقبالؔ نے پیش گوئی کی تھی کہ: ع

"چاک کر دی ترکِ ناداں نے خلافت کی قبا"

۱۹۱۱ء کا سال دنیائے اسلام کے لیے ایسا پُر آشوب تھا کہ اکبر الہ آبادی نے یہ شعر لکھا تھا۔

مرا فش جا چکا ایران گیا اب دیکھنا یہ ہے
کہ جیتا ہے یہ ترکی کا مریضِ نیم جاں کب تک

شورش امروز سے موجودہ (۱۹۱۱ء) ہنگامہ مراد ہے۔ یعنی مسلمانو! اللہ کے فضل و کرم پر نگاہ رکھو۔ شاید وہ بہتری کی کوئی صورت پیدا کر دے۔

تبصرہ۔ اقبالؔ نے یہ معرکۃ الآرا نظم اس زمانہ میں لکھی تھی جب دنیائے اسلام خصوصاً ترکی اور ایران پر چاروں طرف سے مصائب کی گھٹائیں چھا رہی تھیں۔ شاعر نے اس نظم میں ہلال عید کو مخاطب کر کے اپنے جلے ہوئے دل کے پھپھولے پھوڑے ہیں۔ اور اس میں کوئی شک نہیں کہ مسلمانوں کی زبوں حالی اور ان کی حکومتوں کے زوال پر اس سے زیادہ درد انگیز نظم بانگ درا میں مشکل ہی سے نکلے گی۔ اس نظم کی اہمیت کا اندازہ اس بات سے بھی ہو سکتا ہے کہ اکبر الہ آبادی مرحوم نے جب اس نظم کو پڑھا تو اقبالؔ کو تحسین آمیز خط لکھا اور اپنے خط میں ان دو شعروں کی بہت تعریف کی تھی۔

دیکھ مسجد میں شکستِ رشتۂ تسبیحِ شیخ الخ

کافروں کی مسلم آئینی کا بھی نظارہ کر الخ

بظاہر اقبال نے ہلال عید سے خطاب کیا ہے لیکن دراصل قوم کو مخاطب کیا ہے اس نظم کے دوسرے بند کے ہر مصرع میں نشتر پوشیدہ ہیں۔ نظم کا مطلب یہ ہے کہ اے مسلمانو! ہوش میں آؤ! آنکھیں کھولو! دیکھو آج زندگی کی بساط پر تم ہر خانہ میں مات کھا رہے ہو ہر جگہ ذلیل ہو رہے ہو! اس کے بعد اپنی حالت کا موازنہ غیر مسلموں کے ساتھ کرو اور دیکھو وہ کس طرح زندگی کے ہر شعبہ میں ترقی کر رہے ہیں۔ تم فرقہ بندی کی لعنت میں گرفتار ہو۔ بلکہ تمہاری قوم میں آئے دن نئے نئے فرقے پیدا ہو رہے ہیں جو اپنے سوا سب کو کافر سمجھتے ہیں۔ لیکن دوسری قومیں فرقہ بندی کو مٹا رہی ہیں۔ دور کیوں جاؤ۔ اپنی ہمسایہ قوم سے سبق حاصل کرو۔ تم آپس میں برسر پیکار ہو لیکن وہ (مثلاً ہنود) "سنگٹھن" میں مصروف ہیں۔ غیر مسلم تو اسلامی اصول اختیار کر رہے ہیں۔ لیکن تم مسلمان ہو کر اسلام سے منحرف ہوتے جاتے ہو۔۔۔۔ جس قوم کو تم نے تہذیب سکھائی، وہ قوم آج ہر محفل میں گرمیٔ گفتار کا ثبوت دے رہی ہے[۱] لیکن تم صرف "سرکار" کی خوشامد کو اپنے درد کی دوا سمجھے بیٹھے ہو۔ یورپ کی اقوام عیش و طرب میں مصروف ہیں لیکن تم دن رات ماتم میں مشغول ہو۔ مثلاً آج مراکش کا ماتم ہے تو کل طرابلس کا۔

آخر میں شاعر اپنے غمزدہ دل کو یہ کہہ کر تسلی دیتا ہے کہ قوم کا مرض علاج کی حدود سے تجاوز کر چکا ہے، اب اس کے سوا کوئی چارہ نہیں کہ میں آئینہ کی طرح سب کچھ دیکھوں اور خاموش رہوں اور اللہ تعالےٰ سے دعا کروں کہ اپنے فضل و کرم سے مسلمانوں کی مصیبتوں کو دور کر دے۔

لہ ترجمان القوم حضرت مولانا ظفر علی خاں نے بھی اس شعر میں اسی تلخ حقیقت کو واضح کیا ہے۔

جب زباں نارنگ کی چلتی ہے قینچی کی طرح
پھر سکوتِ مرگ کیوں طاری ہوا ہے "ان" پر

شمع اور شاعر

حل لغات:۱۔ دوش۔ گزری ہوئی رات۔ شمع منزلِ ویرانِ خویش وہ شمع جو کل رات میرے ویران گھر میں جل رہی تھی نصیب بمعنی قسمت، یا حصہ۔ بال۔ ایک پر، یا کوئی پر۔ امید جان اہل فرسودہ۔ وہ زندگی جو آرزوؤں میں بسر ہو گئی ہو، کرمک بے مایہ۔ حقیر کیڑا مراد ہے پروانہ۔ سوز کلیم۔ حضرت موسیٰ کا سوز یعنی محبت کا وہ رنگ جو حضرت موسیٰ میں پایا جاتا تھا۔

نوا پیرا۔ لغوی معنی ہیں نغمہ و سرود کو آراستہ کرنے والا یعنی گانے والا مضمو پوشیدہ سوز عشق کی آگ۔ فروزاں بمعنی روشن یا جلتا ہوا گریہ ساماں یعنی رونے والا گل بدامن سے سرخی مراد ہے۔ سوز دروں محبت کی آگ۔ صہبا شراب۔ شعار طریقہ۔ زشت روئی۔ بدصورتی سودائی بت خانہ، بت پرستی کا دیوانہ، شوریدہ سر۔ بے اصول قیس سے عاشق مراد ہے۔ محفل سے قوم مراد ہے۔ تنگ ہے صحرا ترا یعنی جذبات عاشقی میں شدت نہیں ہے یا حوصلہ بلند نہیں ہے محمل ہے بے لیلیٰ ترا یعنی تیرے دل میں سرکار دوعالم صلعم کی محبت نہیں ہے۔ دُر تابندہ چمکتا ہوا موتی۔ مراد ہے مسلمان فرد۔ پروردۂ آغوش موج۔ جسے موج نے اپنے گود میں پالا ہے صدف کو شرار پروردۂ آغوشِ موج باندھتے ہیں۔ لذت طوفان سے عاشقی کی دشواریاں مراد ہیں۔ دریا سے قوم مراد ہے۔ نوا پیرا سے مراد ہے قوم کو پیغام دینے والا۔ گلشن سے قوم مراد ہے۔ ذوقِ تماشا معشوق کا جمال دیکھنے کی آرزو۔ شعلہ آشام سے شراب نوش مراد ہے۔ آتش بجام۔ پیالے میں شراب لے کر گلشن کی جمعیت۔ اتحاد قومی۔ بجھ گیا وہ شعلہ عشق رسول کی آگ ٹھنڈی ہو گئی۔ سوز تمام یعنی کامل محبت یا حقیقی عشق۔ پھول بے پرواہ ہیں، مسلمان بے حس ہیں۔ ان کے اندر نہ عشق رسول ہے نہ جذبۂ ملی۔ کارواں بے حس ہے۔ قوم غافل ہے، یا عمل سے بیزار ہے۔ آواز درا ہو یا نہ ہو عمل کا پیغام دو یا نہ دو، دونوں باتیں یکساں ہیں۔ تسبیح کے دانوں سے افراد قوم مراد ہیں شوق بے پروا وہ عشق جو انسان کو موت سے بے پروا بنا دیتا ہے۔ فکرِ فلک پیما۔ وہ عقل جو

آسمان سے تارے توڑ کر لاتی ہے۔

تیری محفل میں نہ دیوانے نہ فرزانے رہے

یعنی مسلمان قوم میں نہ دین کے عاشق باقی رہے۔ نہ علم کے، نہ کوئی ولی پیدا ہوتا ہے نہ منطقی۔ فائدہ پھر کیا جو گردِ شمع پروانے رہے جب عشقِ رسول ہی نہیں تو اسلام کے گرد رہنے یعنی اسلام کا نام لینے سے کیا فائدہ

ٹوٹی ہوئی مینا سے ذاتِ شاعر مراد ہے جو قوم کی زبوں حالی کا مرثیہ پڑھ رہی ہے۔ متاعِ کارواں جاتا رہا۔ قوم کے دل سے عشقِ رسول کا جذبہ سرد ہو گیا۔ کارواں، قوم سطوت، شوکت، موج کو آزادیاں سامانِ شیون ہو گئیں یعنی جب قوم آئینِ اسلام کی پابندیوں سے آزاد ہو گئی تو یہ آزادی (جو دراصل گمراہی ہے) قوم کے حق میں باعثِ ذلت و رسوائی ہو گئی۔ وہ نگاہیں ناامید نورِ امیں ہو گئیں یعنی مسلمان اپنے ضعفِ ایمان کی وجہ سے اللہ کی رحمت سے ناامید ہو گئے اڑتی پھرتی تھیں الخ مسلمان دنیا کے ہر گوشے میں اسلام کا علم بلند کرتے تھے۔ پابندِ نشیمن یعنی گوشہ نشین۔ مطلب یہ ہے کہ خدا جانے مسلمان کو اب کیا ہو گیا۔ کہ وہ اب پاؤں توڑ کر گھر میں بیٹھ گیا۔ بجلیاں آسودۂ دامانِ خرمن ہو گئیں یعنی مسلمان عمل سے بیگانہ ہو گئے۔ دیدۂ خونبار ہو منت کشِ گلزار کیوں یعنی میں پھولوں کا نظارہ کرنے کے لئے باغ میں کیوں جاؤں؟ جب کہ میرے سرخ آنسوؤں سے میرا دامن رشکِ گلزار بنا ہوا ہے

پیمانہ بردارِ خمستانِ حجاز سے سرکارِ دو عالم صلعم کے غلام (اسلام کے شیدائی) مراد ہیں یعنی وہ لوگ جو حضورؐ کے جانشین ہیں۔ (علمائے حق) یا سچے خادمانِ قوم جو مسلمان کی ترقی کے آرزومند ہیں۔ نقدِ خودداری یعنی خودداری یا عزتِ نفس۔ بہا یعنی قیمت۔ بادۂ اغیار غیروں کی عطا کردہ شراب یعنی خطابات اور سرکاری عہدے جن کے حصول کے لئے انسان کو اپنی عزتِ نفس سے ہاتھ دھونا لازمی ہے کیونکہ اس کے بغیر یہ ''لعنتیں'' حاصل نہیں ہو سکتیں لبریز صدائے نا و نوش۔ شراب پینے والوں کے شور و غل سے معمور ہے۔

مینابدوش۔ اپنے کندھے پر ضرارت کی بوتل رکھے ہوئے۔ حدیث یعنی بات ہمر وشا فرشتہ۔ رہزنِ ہمت کو زائل کر دیا۔ تن آسانی۔ آرام طلبی۔ جو یعنی نہر۔ اصلیت یعنی اسلام مراد ہے جمعیت یعنی قومی وحدت یا اتحاد۔ گل سے اسلام مراد ہے۔ گلدان پریشان ہو گیا۔ مسلمان منتشر ہو گئے۔ دل بیگانہ پہلو ہوا یعنی (اگر) فرد قوم سے بیگانہ ہو گیا تو زندہ رہنا محال ہے۔ مستور پوشیدہ۔ وادیٔ سینا۔ وہ وادی جہاں حضرت موسیٰ نے خدا کی تجلی دیکھی تھی۔ حرف تعمیر یعنی نئی دنیا پیدا کر یا ترقی کی نئی راہیں تلاش کر۔ خاکستر پروانہ سے وہ مسلمان مراد ہیں جنہوں نے حضور کے عشق میں یا اسلام کی خدمت میں اپنی زندگی قربان کر دی۔ منت کش ساقی یعنی غیروں کا احسان مت اٹھا۔ نیا ویرانہ پیدا کر۔ نئی دنیا پیدا کر۔ تو عصا افتادہ سے پیدا مثال دانہ کر۔ اس مصرع میں تعقید لفظی ہے۔ نثر یوں ہوگی، تو مثالِ دانہ، اپنی افتادہ سے، عصا پیدا کر۔ شاعر نے تخیل کی بدولت، پودے کے تنہ کو (جو شکل کے لحاظ سے عصا معلوم ہوتا ہے) عصا قرار دیا ہے شاخِ کہن سے اسلامی روایات مراد ہیں۔ اس چمن سے یعنی دنیا میں۔ تلمیذ یعنی شاگرد، خاشاک غیر اللہ سے وہ بنیادی تعلقات مراد ہیں خاشاک یعنی کوڑا کرکٹ۔ غیر اللہ تصوف کی اصطلاح میں دنیا کو کہتے ہیں۔ باطل حق کی ضد ہے۔ اسلام کی تعلیم یہ ہے کہ قرآن سے باہر حق نہیں ہے۔ قرآن مجید اپنے آپ کو الحق کہتا ہے باطل کے لغوی معنی ہیں، مٹ جانے والا مراد ہے کفر یا غیر اسلامی (قرآنی) تعلیمات۔

نوٹ:۔ اقبال اور جناب ابوالکلام آزاد میں بنیادی اختلاف یہ ہے کہ آزاد صاحب "حق" کو قرآن میں منحصر نہیں سمجھتے۔ ان کے نزدیک تمام مذاہب سچے ہیں۔

ملاحظہ ہو تفسیر سورہ فاتحہ مندرجہ ترجمان القرآن جلد اوّل صفحہ ۱۳۶ مطبوعہ دہلی سنہ ۱۳۵ھ

جوہر آئینہ ایام یعنی دنیا کی زینت اور بقا کا باعث۔ اس کے لفظی معنی ہیں کہ اگر زمانہ کو آئینہ قرار دیا جائے تو ملت اسلامیہ اس آئینہ کا جوہر (صیقل) ہے اور یہ سب جانتے ہیں کہ اگر صیقل نہ ہو تو آئینہ بیکار ہے۔ اسی طرح اگر مسلمان مٹ جائیں تو اس دنیا کا وجود

اور عدم دونوں یکساں ہو جائیں۔ بے پایاں۔ غیر محدود یا وہ سمندر جس کی تھاہ (گہرائی) نہ مل سکے گرفتار طلسم ہیچ مقداری احساسِ کمتری میں مبتلا۔ اس کے پیامِ ناز کا یعنی خدا تعالےٰ جو ظاہر بھی ہے پوشیدہ بھی ہے۔ وہ سامان کبھی ہے۔ سامان سے عشق رسول مراد ہے۔ تفنگ یعنی بندوق شاہد بمعنی گواہ۔ کوہ فاران کا سکوت فاران، مکہ مکرمہ کے قریب ایک پہاڑ ہے۔ سکوت سے عظمت مراد ہے۔ چند کلیوں سے وہ چند ممالک مراد ہیں جن کو مسلمانوں نے ابتدائی دور میں فتح کیا تھا۔ کسوتِ مینا یعنی بوتل کے لباس میں یعنی بوتل میں آتش نوائی سے عشقِ رسول کا پیغام مراد ہے۔ زندگانی کا یہی سامان بھی ہے یعنی میری زندگی کا پیغام مراد ہے۔ زندگانی کا یہی سامان بھی ہے یعنی میری زندگی کا مقصد یہی ہے کہ قوم کو عشقِ رسول کا پیغام دوں۔ آئینہ پوش یعنی منور۔ سیماب پا یعنی غائب سینہ چاکانِ چمن سے گل مراد ہیں۔ اس چمن کی ہر کلی یعنی ملت اسلامیہ کا ہر فرد۔ سطوتِ رفتارِ دریا سے دنیا کی مخالف طاقتوں کی شوکت مراد ہے۔ زنجیر پا سے گرفتاری یا قید مراد ہے۔ مآل یعنی نتیجہ۔ پیغامِ سجود سے شریعت اسلامیہ کی اتباع مراد ہے خاک حرم سے مسجد مراد ہے۔ خونِ گلچیں اور نالہ صیاد سے دشمنان اسلام کی آہ وزاری یا ذلت و خواری مراد ہے۔ دنیا کیا سے کیا ہو جائے گی یعنی اگر مسلمان عشق رسول اختیار کر لیں تو دنیا میں انقلاب عظیم رونما ہو جائے گا۔ شب گریزاں ہو گی یعنی کفر کی ظلمت مٹ جائے گی جلوہ خورشید سے اسلامی تعلیمات مراد ہیں۔ اقبال نے اسلام کو خورشید اور کفر کو شب سے تشبیہ دی ہے اس سے ثابت ہوا کہ "حق" اسلام سے باہر کہیں موجود نہیں ہے اور جناب آزاد کا قول غلط ہے۔ چمن سے دنیا مراد ہے۔

تبصرہ:۔ یہ نظم بانگ درا کی ان اہم نظموں میں سے ہے جن کا جواب جدید اردو ادب میں نہیں مل سکتا۔ بعض نقادانِ فن اس کو بانگ درا کی بہترین نظم قرار دیتے ہیں۔ ممکن ہے سب لوگ اس خیال سے اتفاق نہ کر سکیں۔ لیکن اس میں کوئی شک نہیں کہ اگر بانگ درا میں سے بہترین تین نظمیں منتخب کی جائیں تو یہ نظم اس انتخاب میں ضرور شامل ہو گی۔ اس کی خصوصیات

یہ ہیں۔

(۱) اس میں شاعری اور فلسفہ کا امتزاج ہے

(۲) ساری نظم رمزیہ انداز میں لکھی گئی ہے۔ الفاظ کچھ ہیں، لیکن ان سے مراد کچھ ہے

(۳) یہ اس دور کی نظم ہے جب اقبال کی اردو شاعری پر فارسی رنگ غالب آچکا تھا چنانچہ اس کا پہلا بند اردو کے بجائے فارسی میں ہے۔

(۴) چونکہ اس زمانہ (۱۹۱۲ء) میں اقبال مسلمان ملکوں کی تباہ حالی سے بہت متاثر تھے اس لیے اکثر اشعار میں سوز و گداز کی کیفیت نمایاں ہے۔ مثلاً یہ مصرع

"تھا جنہیں ذوقِ تماشا وہ تو رخصت ہو گئے"

اُن جذبات کا ترجمان ہے جو عالم اسلام پر مصائب کا نزول دیکھ کر ان کے دل میں موجزن تھے۔

(۵) چونکہ یہ نظم اُنھوں نے "شعر گفتن" کے لیے نہیں، بلکہ دردِ دل کا اظہار کرنے کے لیے لکھی تھی اس لیے اس کے اکثر اشعار میں جوشِ بیان کی صفت پائی جاتی ہے

(۶) چونکہ اس نظم میں اُنھوں نے قوم کو عشقِ رسول کا پیغام دیا ہے، اس لیے "شمع" کو واسطہ بنایا ہے، جو سوزِ دروں کا خارجی مظہر ہے واضح ہو کہ "لالہ" کی طرح "شمع" اقبال کی شاعری میں ایک نشان یا علامت [illegible] ہے جس طرح اکبر کی شاعری میں "شیخ" یا "سید صاحب"۔

(۷) اگرچہ قوم کی مجرمانہ غفلت کی داستان انتہائی دردناک انداز میں بیان کی ہے لیکن اس تلخابہ کے بعد تریاق بھی مہیا کیا ہے یعنی دوبارہ سربلندی کا طریقہ بھی بتایا ہے۔

(۸) اوّل سے آخر تک بندش بہت چست ہے، شوکتِ الفاظ اور زورِ بیان کی صفت تحسین سے بالاتر ہے۔ ہر مصرع شاعری کے سانچہ میں ڈھلا ہوا ہے، آورد کا شائبہ نظر نہیں آتا۔ پروفیسر سروری نے بالکل سچ لکھا ہے، کہ یہ نظم بانگ درا کا دل ہے۔

تجزیہ: چونکہ یہ نظم خاصی طویل ہے۔ اور اقبال نے اپنے خیالات کو ایک خاص ترتیب کے ساتھ پیش کیا ہے۔ اس لیے ذیل میں اس کا تجزیہ درج کرتا ہوں تاکہ طلبہ ہر بند کے بنیادی تصور سے آگاہ ہو کر پوری نظم کو بآسانی سمجھ سکیں۔

پہلے بند میں شاعر نے شمع سے یہ سوال کیا ہے کہ اگرچہ میں نے بھی تیری طرح اپنے آپ کو، مدتوں عشق کی آگ میں جلایا لیکن اس کا سبب کیا ہے کہ میرے شعلہ کا طواف کرنے کے لئے کوئی پروانہ نہیں آیا، یعنی کوئی شخص میرے جلووں کا تماشائی نہیں بنا؟

دوسرے بند میں شمع نے پہلے تو ذاتِ خویش اور ذات شاعر میں فرق بیان کیا ہے پھر سوال کا جواب دیا ہے کہ شاعر کے شعلہ کا طواف کوئی پروانہ کیوں نہیں کرتا پہلا سبب یہ ہے کہ قوم کے راہنما، نااہل ہیں۔

تیسرے بند میں دوسرا سبب بیان کیا ہے کہ سچے مسلمان یعنی عاشقانِ رسول ایک ایک کر کے رخصت ہو چکے ہیں۔ اور موجودہ مسلمانوں کے سینے اس جذبہ سے یکسر خالی ہیں یعنی قوم مردہ ہو چکی ہے۔

چوتھے بند میں دوسرے سبب کی مزید توضیح کی ہے یعنی تیسرے بند میں یہ کہا کہ "کارواں بے حس ہے" تو چوتھے بند میں یہ بتایا کہ کارواں کے دل سے احساس زیاں جاتا رہا گویا بے حسی کی تشریح کر دی۔

پانچویں بند میں قوم کی پستی اور زبوں حالی پر مرثیہ خوانی کی ہے۔ اگرچہ مضمون وہی ہے جو مسدس حالی میں نظم کیا گیا ہے لیکن انداز بیان جداگانہ ہے۔ دھن وہی ہے۔ مگر لے ذرا تیز ہو گئی ہے۔

چھٹے بند میں اس مایوسی کے اثر کو زائل کیا ہے جو پانچویں بند کے پڑھنے سے قدرتی طور پر دل میں پیدا ہو سکتا ہے۔ یعنی قوم کو امید کی جھلک دکھائی ہے اور رہنمایانِ قوم کو کامیابی کا مژدہ سنایا ہے

ساتویں بند میں مسلمانوں کو اُن کے انحطاط کے اسباب سے آگاہ کیا ہے اس بند میں چونکہ اجتماعیت کا فلسفہ بیان کیا ہے۔ اس لئے اس بند کو شاعری، اور فلسفہ کا مقام انفصال یا سنگم کہہ سکتے ہیں۔ اسی صفت نے اقبال کو ہندوستان کے شعرا کی صف سے بلند کر کے دنیا کے شعراء کی صف میں نمایاں جگہ عطا کر دی

آٹھویں بند میں قوم کو عروج کی ترکیب بتائی ہے یعنی محبت اور خودی، کا درس دیا ہے جو سربلندی اور کامیابی کے لئے شرط اولین ہے۔

نویں بند میں مسلمان کو اس کی "حقیقت" سے آشنا کیا ہے۔ جوشِ بیان کے علاوہ اس بند میں شاعری اور موسیقی دونوں بغلگیر ہو گئی ہیں۔

دسویں بند میں مسلمان کو اس کی "اصلیت" سے آگاہ کیا ہے۔ اور اس بند کا ہر مصرع بلامبالغہ "آبِ حیات" کا مصداق ہے۔ اور یہ مصرع تو سارے بند کی جان ہے "تو اگر سمجھے تو تیرے پاس وہ سامان بھی ہے"۔ اس مصرع میں لفظ "وہ" کی معنویت اور بلاغت، الفاظ کے ذریعہ سے واضح نہیں ہو سکتی صرف ذوق سلیم ہی اس سے لطف اندوز ہو سکتا ہے۔

گیارہویں بند میں، جو اس نظم کا آخری بند ہے۔ اس نکتہ کو واضح کیا ہے کہ اگر قوم مجوزہ نسخہ پر عمل کر لے یعنی اگر عشق رسول میں سرشار ہو کر، اتباع اسلام پر کمربستہ ہو جائے تو کیا ثمرات مرتب ہوں گے۔ یہ لکھنا تحصیل حاصل ہے کہ یہ بند اس ساری نظم کی جان ہے۔ کیوں کہ اقبال کی تمناؤں کی جیتی جاگتی تصویر ہے اس کے مطالعہ سے یہ بات واضح ہو سکتی ہے کہ اقبال اپنی قوم سے کیا توقع رکھتے تھے

نوٹ: بڑے افسوس کے ساتھ لکھنا پڑتا ہے کہ ۱۹۱۲ء سے لے کر اب تک قوم نے اقبال کی اس آرزو کی تکمیل کے لئے کوئی قدم نہیں اٹھایا۔ چنانچہ مرنے سے کچھ دنوں پہلے مرحوم کو خود بھی اس تلخ حقیقت کا احساس ہو گیا تھا جس کا ثبوت ان کے اس شعر سے مل سکتا ہے۔

لہ اے میرے آقا! میں حضور کی خدمت میں یہ فریاد لے کے آیا ہوں کہ میری قوم نے مجھے محض یک ۴۲

من اے میر اُمم! داد از تو خواہم!
مرا یاراں غزلخوانے شمردند!

پہلا :- (۱) کل رات میں نے اپنے اجڑے ہوئے گھر کی شمع سے یہ کہا کہ تیرے گرد تو ہر وقت پروانوں کا ہجوم رہتا ہے۔

(۲) لیکن میں اس دنیا میں لالۂ صحرا کی طرح تنہائی میں جل رہا ہوں۔ میرے نصیب میں نہ کوئی محفل ہے نہ کوئی مکان۔

(۳) اگرچہ میں بھی تیری مانند، مدتوں سے عشق کی آگ میں جل رہا ہوں، لیکن تعجب ہے کہ میرے گرد ایک پروانہ بھی طواف نہیں کرتا۔

(۴) میری روح سے سیکڑوں جلوے ظاہر ہوتے رہتے ہیں لیکن کوئی شخص ان کا تماشا نہیں دیکھتا۔ یعنی قوم میرے پیغام کی طرف متوجہ نہیں ہوتی!

(۵) اے شمع! تو نے یہ دنیا کو منور کرنے والی آگ کہاں سے حاصل کی؟ جس کی بدولت تو نے پروانوں کے اندر کلیم کا سوز پیدا کر دیا۔

دوسرا بند :- (۱) شمع نے جواب دیا کہ یہ تو سچ ہے کہ ہم دونوں قدرتِ خداوندی کے مظہر ہیں۔ جو موجِ نفس (سانس) میرے لئے پیغامِ موت ہے (پھونک مارنے سے شمع گل ہو جاتی ہے) وہی موجِ نفس تیرے لئے باعثِ زندگی ہے (آدمی کی زندگی سانس پر موقوف ہے) لیکن مجھ میں اور تجھ میں فرق بھی ہے۔

(۲) اس کی تفصیل یہ ہے کہ میں اس لئے جلتی ہوں کہ جلنا میری ذات کا تقاضا ہے (پروانے آئیں یا نہ آئیں) جس طرح بہنا (روانی) پانی کی ذات کا تقاضا ہے لیکن تو اس لئے جلتا ہے کہ تیرے گرد پروانوں کا ہجوم ہو جائے۔ (یعنی تو شہرت کا طالب ہے جلنا تیری ذات کا اقتضا نہیں ہے۔

۲؎ شاعر سمجھا اسی لئے مجھ سے "تاریخ وفات" لکھنے کی فرمایش کرتی رہی ۱۲۔

(۳) میں تو اس لیئے روتی ہوں کہ میرے دل میں آنسوؤں کا سیلاب اُمنڈ رہا ہے لیکن تو پھولوں پر شبنم اس لیئے برساتا ہے کہ باغ (قوم) میں تیری شہرت ہو جائے

(۴) میں اگر رات بھر جلتی ہوں تو صبح ہوتے اس کا ثمرہ بھی میری نگاہ کے سامنے موجود ہوتا ہے یعنی سینکڑوں پروانے میرے گرد سسکتے ہوتے ہیں میں اپنی کامیابی اپنی آنکھوں سے دیکھ لیتی ہوں (معشوق کے وجود کا مقصد ہی یہ ہے کہ عشاق اُس پر نثار ہو جائیں) لیکن تو اپنے مستقبل اور اس میں کامیابی سے بالکل بے خبر ہے بلکہ تیرے حال کو تیرے مستقبل سے کوئی ربط نہیں ہے

(۵) اگر چہ تو بھی میری طرح جل رہا ہے لیکن تیرا سینہ "سوز دروں" سے خالی ہے۔ اور دنیا میں اصلی چیز یہی سوز دروں ہے یعنی دل کے اندر آگ لگی ہو۔ اور یہ حالت اُس وقت پیدا ہو سکتی ہے جب انسان سراپا شمع بن جائے۔ بس یہی وجہ ہے کہ تیرا شعلہ، لالہ صحرا کی طرح ہے کہ چمک تو ہے لیکن جلن نہیں ہے۔

(۶) اے اقبال! تو خود غور کر! کیا رہنمائے قوم یا مصلح قوم کا لقب تجھ پر زیب دے سکتا ہے؟ جب کہ تیری قوم پیاس کے مارے مری جا رہی ہے لیکن تیرا پیمانہ بالکل خالی ہے یعنی جب تیرا سینہ خود عشق رسول سے خالی ہے تو تو اپنی قوم کو اس نعمت سے کیسے مالا مال کر سکتا ہے؟

(۷) اے اقبال! تیرا طریق کار، قوم کے طریق حیات سے بالکل مختلف ہے۔ تیری قوم تو عشق رسول میں سرشار ہو کر کامیاب ہو سکتی ہے، لیکن تو اس کو انگریزوں کی محبت کا سبق پڑھا رہا ہے یہی وجہ ہے کہ تیرا (یعنی قوم کے لیڈروں کا) چہرہ اس قدر بدنما ہو گیا ہے کہ آئینہ کو بھی اس کے دیکھنے سے شرم آتی ہے۔ بالفاظ دگر تیری بداعمالیوں سے تیری شخصیت (آئینہ) ساری دنیا میں ذلیل اور رسوا ہو گئی ہے۔

(۸) تیری زبان پر کعبہ کا نام ہے لیکن دل میں تبخانہ (لندن) کی آرزو ہے مجھے تو تیرے جذبۂ محبت (شوق) میں کوئی معقولیت نظر نہیں آتی۔ (شوریدہ سر یعنی دیوانہ)

(۹) جب کہ تیرے دل میں ترقی کی آرزو نہیں (واضح ہو کہ اقبال کے واسطہ سے شمع

مسلمانوں کے لیڈروں سے خطاب کہہ رہی ہے) اور تیرا دل عشق رسول کے جذبہ سے خالی ہے تو پھر قوم میں غیبس (عشاق یا پروانے) کیسے پیدا ہو سکتے ہیں؟

(۱۰) اے مسلمان! اے چمکنے والے موتی! اے وہ کہ جسے اسلام نے اپنی آغوش میں پالا ہے کس قدر افسوس کی بات ہے کہ تیرا دل، عشق رسول سے بالکل خالی ہے!

(۱۱) اے اقبال! تیری قوم تو اجڑ گئی! تیرا گلشن تو برباد ہو گیا، اب تیری فریاد کون سنے گا؟ تیرا نغمہ بے محل ہے بے موقع ہے، اور تیرا پیغام بے معنی ہے۔

تیسرا اندازہ:۔ (۱) اس کی وجہ یہ ہے کہ جو مسلمان اپنے سینوں میں عشق رسول کی آگ دبی رکھتے تھے، وہ تو ۱۸۵۷ء کے ہنگامہ میں ختم ہو گئے، اور جو باقی بچے تھے، انہیں انگریزوں نے ۱۸۶۵ء میں مقدمہ سازش پٹنہ میں ماخوذ کر کے "کالے پانی" بھیج دیا۔ اور جب تک اپنی دانست میں اس مہربان حکومت نے ایک ایک عاشق رسول کو چن چن کے ختم نہیں کر دیا، اُس وقت تک دار و گیر کا سلسلہ ختم نہیں ہوا۔

اے اقبال! دیدار یار کے تمنائی تو سب ختم ہو گئے، اب تو خطاب: انہ جاگیر کے تمنائی باقی رہ گئے ہیں۔ اندریں حالات اگر تو دیدار عام کا وعدہ لے کر بھی آیا ہے تو کیا فائدہ؟ کس کے لیے؟ اب کون اس کے دیدار کا تمنائی ہے؟ اب تو سب لاٹ صاحب کے دربار میں کرسی کے تمنائی ہیں۔

(۲) تیری قوم میں جو لوگ عشق رسول کے علمبردار تھے، وہ سب رخصت ہو گئے اب اس شراب کے پینے والے ہی نہیں تو اگر تو اب اپنی قوم کو عشق رسول کا درس دے تو سنے گا کون؟ قوم تو کالجوں میں درس غلامی سن رہی ہے۔

(۳) جب قوم کا شیرازہ ہی منتشر ہو چکا تو افراد (پھول) کو ترقی کا پیام کیا نفع دے سکتا ہے! جب قوم ہی مر گئی تو افراد کیسے زندہ رہ سکتے ہیں؟

(۴) اگر قوم کی خدمت منظور تھی تو ۱۸۵۷ء سے پہلے اس کا موقع تھا، جب قوم مر گئی تو اب

اس کو سرفروشی کا پیغام دینا بالکل بے سود ہے۔ اگر بسمل کا تماشا دیکھنا تھا تو رات کو کوٹھے پر آتے جب وہ تڑپ تڑپ کر صبح ہوتے ٹھنڈا ہو گیا تو آپ (بوقتِ صبح) بالائے بام آئے۔ اس سے کیا فائدہ؟ حقیقت یہ ہے کہ اس شعر کی معنویت تشریح سے بالاتر ہے۔ اگر میں صفحے سیاہ کر ڈالوں تو بھی اس سوز و گداز کی شرح نہیں کر سکتا، جو اس شعر میں پوشیدہ ہے۔

(۵) وہ جذبۂ عشقِ رسول (شعلہ) جو ہر مسلمان (پروانہ) کا مقصودِ حیات تھا، (کسی زمانہ میں) اب ختم ہو چکا ہے، لہٰذا اب اگر کوئی شخص قوم کو عشق کا پیغام دیتا ہے تو ریت میں سے تیل نکالنے کی کوشش کرتا ہے۔

(۶) مسلمان، اسلام سے بالکل بیگانہ ہو چکے ہیں، بلکہ بے حس ہو چکے ہیں، اس لئے تو آپ انھیں عشقِ رسول کا درس دے یا نہ دے، دونوں باتیں ان کی نظر میں یکساں ہیں۔ جب طلبہ اسٹرائیک کر چکے ہوں تو گھنٹہ بجے یا نہ بجے، استاد کلاس میں آئے یا نہ آئے، اُن کی نظر میں یہ دونوں باتیں یکساں ہیں۔

چوتھا بند: اے اقبال! تو قوم کا رہنما ہے (تیرے پاس) کافی دولت ہے، تجھے ہر قسم کی راحت نصیب ہے تیرا تو ذکر ہی کیا ہے تیرے کتے اور باز بھی عیش کی زندگی بسر کرتے ہیں لیکن جب تیرا سینہ عشقِ رسول سے خالی ہے تو پھر قدرتی بات ہے کہ تیری قوم بھی اس نعمت سے محروم رہتی پھر تعجب کیا ہے اگر مسلمان اس لذت سے بیگانہ ہیں؟

(۲) تو کافی اثر اور رسوخ رکھتا ہے۔ تو اپنی قوم کو درسِ اتحاد دے سکتا تھا، تو اُن غریبوں کو جو تیری کوٹھیوں کے زیرِ سایہ رہتے ہیں، محبت کا سبق پڑھا سکتا تھا، (یعنی اُن سے محبت کر سکتا تھا) لیکن جب تو نے اُن کو اپنا بھائی سمجھنے کے بجائے "کمین" سمجھا، تو وہ کیوں غیروں کی آغوش میں نہ چلے جاتے؟

(۳) سچ تو یہ ہے کہ تیری قوم کے رہنماؤں میں نہ قوتِ ذکر (عشق) باقی رہی نہ قوتِ فکر اس لئے قوم عاشقوں سے بھی محروم ہو گئی، اور حکما سے بھی۔ یعنی اب قوم میں نہ کوئی مجذوب

الہیؒ ہے نہ ابن رشد ہے ۔

(۴) جب رہنماؤں کے سینے عشقِ رسول کے جذبہ سے خالی ہیں تو اگر مسلمان ان کی صحبت میں بیٹھیں بھی، تو کیا فائدہ حاصل کر سکتے ہیں؟

(۵) اس پر مستزاد یہ ہے کہ اگر کوئی رہنما، واقعی مخلص اور ہمدردِ قوم ہو تو، نہ اب میکش باقی ہیں نہ میخانے یعنی قوم تو بے حس ہو چکی ہے۔ اب اگر کوئی اللہ کا بندہ، عشقِ رسول کا پیغام دے بھی، تو کس کو دے، عشقِ رسول کی شراب پینے والے ہی دنیا سے اُٹھ گئے۔

نوٹ:- برکاتِ سلطنتِ انگلشیہ میں سب سے بڑی برکت یہ ہے کہ، قوم عاشقانِ رسول کے وجود سے خالی ہو گئی۔

ع جو اُس پر بھی نہ سمجھے وہ تو اُس بُت کو خدا سمجھے

(۶) اسلام کے تمنائی اور رسول کے شیدائی دونوں اس دنیا سے رخصت ہو چکے۔ اب نہ علما باقی ہیں، نہ صوفیا یہی وجہ ہے کہ آج وہ خانقاہیں سنسان پڑی ہوئی ہیں، جہاں آج سے تقو، سوا سو سال پہلے عاشقانِ رسولؐ (لیلیٰ کے دیوانے) اشاعتِ اسلام کا عملی طریقہ (پریکٹیکل ٹریننگ) حاصل کیا کرتے تھے۔

دشتِ جنون پرور سے وہ خانقاہیں مراد ہیں جہاں جنوں (عشقِ رسولؐ) کا درس دیا جاتا تھا۔ اور رقص سے اشاعتِ اسلام کی مشق (ٹریننگ) مراد ہے۔ ۱۲

(۷) افسوس صد افسوس! قافلہ (مسلمانوں) نے اپنی ساری پونجی (جذبہ عشقِ رسولؐ)

ل انقلاب ۱۸۵۷ء سے کچھ عرصہ پہلے تک صرف دلی میں کئی خانقاہیں ایسی تھیں جو عاشقانِ رسول کو تبلیغ و اشاعتِ اسلام کے لئے تیار کرتی تھیں، ان کا تذکرہ سرسید مرحوم نے اپنی کتاب موسومہ آثار الصنادید میں کیا ہے، جو دلی سے ۱۸۴۷ء میں شائع ہوئی تھی۔

دھڑی دھڑی کرکے لٹوادی! اس پر مستزاد یہ ہے کہ قوم کے دل سے اس نقصانِ عظیم کا احساس بھی جاتا رہا۔ اگر احساس باقی رہتا، تو ممکن تھا کہ قوم اس نقصانِ عظیم کی تلافی پر کمربستہ ہو جاتی لیکن جس مریض کے دل سے مرض کا احساس نکل جائے، اس کی صحت کی توقع کیسے ہو سکتی ہے!

پانچواں بند (۱) جس قوم کے کارناموں سے دشت و صحرا گونجتے تھے، آج اُس قوم کے شہر ویرانوں میں تبدیل ہو چکے ہیں۔

(۲) جن مسلمانوں کے دم سے، ہندوستان میں، توحید کی سطوت (عظمت اور شوکت رعب، اور دبدبہ) قائم ہوئی تھی۔ افسوس ہے کہ اُن مسلمانوں کے نام لیواؤں نے مشرکانہ عقائد اختیار کر لئے ظاہر ہے کہ اگر مسلمان خود ہی بت پرستی کرنے لگے، خود ہی برہمن کے ہاتھ پر بیعت کر لے، اور اپنے خطبۂ صدارت میں مسلمانوں کو اُس کی رہنمائی پر اعتماد کرنے کی تلقین کرے تو پھر وہ مسلمان کسی برہمن کو اسلام کی تبلیغ کیسے کر سکتا ہے!

ہوئی نہ زاغ میں پیدا بلند پروازی
خراب کر گئی شاہیں بچہ کو صحبتِ زاغ

(۳) اگر کوئی قوم، دنیا میں عیشِ دوام (ابدی راحت) کی آرزومند ہے، تو اُسے قانون (فطرت) کی پابندی کرنی لازمی ہے۔ دیکھ لو! موج کو آزادی مل گئی اور اس نے اپنی حدود سے تجاوز کیا تو کیا نتیجہ نکلا؟ ساحل سے ٹکرا کر پاش پاش ہو گئی یعنی آزادی اس کے حق میں نالہ و فریاد کا سبب بن گئی (شعر میں حسنِ تعلیل ہے جس کی تشریح حلِ لغات میں کر چکا ہوں)

(۴) شمع کہتی ہے کہ اے اقبال! کس قدر افسوس کا مقام ہے کہ اللہ کی رحمت کی تجلی جن مسلمانوں کے دیدار کی خود مشتاق تھی، وہ مسلمان خود ہی، اللہ کی رحمت سے ناامید ہو گئے

ع ہم تو مائل بہ کرم ہیں کوئی سائل ہی نہیں۔

(۵) کل تک، یعنی گزشتہ صدی تک ہزاروں مسلمان ہندستان میں تبلیغ و اشاعت

اسلام پر کمر بستہ تھے اور غیر مسلموں کو قرآن کا پیغام سناتے تھے لیکن سخت حیرانی ہے کہ اب بیسویں صدی میں ساری قوم عمل سے بیگانہ اور اشاعت اسلام سے نفور ہو گئی ہے۔" دل میں کیا آئی کہ پابند نشیمن ہو گئیں" اس مصرع میں غالب کا انداز بیان جھلکتا ہے جس کی وجہ سے بڑی دلکشی پیدا ہو گئی ہے۔

(۶) ایک زمانہ وہ بھی تھا، جب مسلمان ساری دنیا پر چھائے ہوئے تھے لیکن آج یہ کیفیت ہے کہ ہندوستان سے مراقش تک "چناں خفتہ اند کہ تو گوئی مردہ اند" جو بجلی (قوم) کبھی ساری دنیا کو اپنی چمک دکھاتی تھی وہ آج اپنے خرمن کے گوشہ میں پڑی سو رہی ہے اُس نے چمکنا بالکل چھوڑ دیا (قوم نے سرفروشی چھوڑ دی۔)

(۷) اے اقبال! میں باغ کی سیر کے لئے کیوں جاؤں؛ میرا دامن تو مرغ آنسوؤں سے رشک گلزار بنا ہوا ہے۔

(۸) لیکن میری شامِ غم، صبح عید کی خبر دیتی ہے، کیوں کہ رات کی تاریکی میں مجھے امید کی ایک کرن نظر آرہی ہے، اس لئے میں سمجھتی ہوں کہ مسلمان قوم کی مصیبتوں کا زمانہ عنقریب ختم ہوا چاہتا ہے۔

چھٹا بند:۔ مرثیہ یا نوحہ خوانی کے بعد اقبال، کمال قادر الکلامی کے ساتھ، ڈرامائی انداز میں (تاکہ تاثیر پیدا ہو سکے) قوم کو امید کا پیغام دیتے ہیں کہتے ہیں کہ۔

(۱) اے حجاز کے میکدے سے جامِ شراب پینے والو! یعنی اے قوم کے سچے ہمدردو! تمھیں خوشخبری دیتا ہوں کہ سو سال کے بعد اب مسلمانوں کو اپنی زبوں حالت کا کچھ احساس ہونے لگا ہے۔

(۲) اس لئے وہ مسلمان جو اپنی غیرت کی دولت کافروں کی شراب (عقائد۔ رسوم و عادات) خریدنے میں صرف کر رہے تھے، اب پھر اسلام کی طرف مائل ہو رہے ہیں۔

(۳) اُن کے دلوں سے غیر اسلامی تصورات رفتہ رفتہ نکلتے جا رہے ہیں۔ اور وہ پھر اسلامی

اصول (سیلیمی) کی طرف راغب ہونے جاتے ہیں۔

(۴) شکر ہے کہ مسلمان پھر شراب خانہ ساز (ارشادات نبوی) کی طرف متوجہ ہو رہے ہیں اور صاف لفظوں میں اعلان کر رہے ہیں کہ مغربی تعلیم و تمدن نے ہمارے دل کو اسلام سے بیگانہ کر دیا ہے۔ اس لئے ہم اب اس مغربی تہذیب سے متنفر ہیں۔

(۵) بس اے ہمدردان قوم! اب میدان عمل میں آجاؤ، اور اپنی قوم کو عشق رسول کی شراب پلا کر متوالا بنادو۔ مایوسی کی رات گذر گئی۔ اور امید کی صبح طلوع ہو گئی۔

(۶) اب قوم کے غم میں اپنے آپ کو گھلا دو، اور دوسروں کو بھی گھلا دو۔ یعنی خود بھی قوم کو بیدار کرو، اور دوسروں کو بھی اسی کام کی ترغیب دو۔ میں نے تم سے ایک قیمتی بات کہدی ہے۔ اگر تم میں صلاحیت ہے، تو اُس کو سنو اور سمجھو۔

(۷) مشہور مقولہ ہے کہ شاعری بھی پیغمبری کا ایک شعبہ یا حصہ ہے۔ اس لئے میں قوم کو فرشتہ کا وہ پیغام جو اُس نے مجھے سنایا ہے، سنانا چاہتا ہوں۔

(۸) اور قوم کو یہ بتانا چاہتا ہوں کہ مجھ سے "کسی" نے دیدار دکھانے کا وعدہ کر لیا ہے اس لئے مسلمانوں کو چاہئیے کہ ہر وقت بیدار رہیں، خدا جانے کس وقت اُن کے دل میں آجائے اور وہ محمل کا پردہ اٹھا دیں۔ نیز میں افراد قوم کے دلوں کو، اپنی شاعری کے سوز سے زندہ کرنا چاہتا ہوں۔

ع اب جگر تھام کے بیٹھو مری باری آئی :-

ساتواں بند ۔ اس بند میں مسلمانوں کو ان کے زوال کے اسباب سے آگاہ کرتے ہیں۔ کہ اے مسلمان! تیرے اندر حکومت اور دولت، اور عشرت کی بنا پر تن آسانی کا مرض پیدا ہو گیا جب تک نجد میں صحرائی بدوی یا سپاہیانہ زندگی باقی رہی تو جہانگیری کرتا رہا۔ لیکن جب تو گلشن (لال قلعہ) میں آگیا تو گھٹ کر چھوٹی سی نہر رہ گیا۔

(۲) جب تک مسلمان اپنی اصلیت (اسلام) پر قائم تھا یعنی اسلامی تعلیمات پر عامل رہا تو اس میں اجتماعی شان (جو اسلام کا طغرائے امتیاز ہے) بھی موجود رہی لیکن جب اس نے

اسلامی اُصول ترک کر دیئے تو دنیا میں اسی طرح پریشان، منتشر اور آوارہ ہو گیا، جس طرح غنچہ سے خوشبو نکل کر پریشان ہو جاتی ہے۔

(۳) اے مسلمان! اگر تو رازِ حیات سے آگاہ ہونا چاہتا ہے، تو قطرہ کی زندگی کا مطالعہ کر لے قطرۂ آب تو ایک ہی ہے لیکن یہی پانی کا قطرہ کبھی گوہر (موتی) بن جاتا ہے، کبھی شبنم کبھی آنسو، یہ بات کیا ہے بصرف یہ کہ قطرہ اپنی اصل پر قائم رہ کر اپنے آپ کو مختلف صورتوں میں تبدیل کرتا رہتا ہے۔ اسی طرح اگر مسلمان اپنی اصل پر قائم رہے، اور ملت سے رابطہ استوار رکھے تو دنیا کی ہر جماعت میں جا کر کام کر سکتا ہے، اور ہر جگہ ظاہری حالت میں تبدیلی کے باوجود اپنے آپ کو زندہ رکھ سکتا ہے، اور دنیا کے لیے مفید مطلب بن سکتا ہے۔

(۴) اے مسلمان! ملت سے ربط و ضبط، فرد کے حق میں، اور اس کی انفرادی زندگی کی بقا کے لئے، اشد ضروری ہے (سب سے بڑی دولت ہے) اگر فرد اپنی قوم سے بیگانہ ہو جائے تو زندہ نہیں رہ سکتا۔

(۵) اے مسلمان! دنیا میں تیری جو کچھ آبرو باقی تھی، وہ محض اس بنا پر تھی کہ تیرے اندر ملت کا احساس موجود تھا، اور تجھ میں اجتماعی شان پائی جاتی تھی، لیکن جب تو نے "اپنی ڈفلی اپنا راگ" پر عمل کرنا شروع کر دیا، جب افراد ملت سے اور مفاد ملی سے بیگانہ ہو گئے تو، تو دنیا بھر میں رسوا ہو گیا۔

(۶) اے مسلمان! یاد رکھ کہ فرد کی زندگی ملت سے ربط قائم رکھنے پر موقوف ہے جس طرح شاخ کی زندگی تنہ سے وابستہ رہنے پر منحصر ہے یا جس طرح موج کا وجود اسی وقت تک باقی رہتا ہے، جب تک وہ دریا میں رہتی ہے۔ اگر موج اپنا تعلق دریا سے منقطع کر لے، تو ایک آن میں اس کا وجود فنا ہو جائے گا تو ملت سے جدا ہو کر کسی مسلمان فرد کا کوئی وجود باقی نہیں رہتا۔ ہاں یہ ضرور ہوتا ہے کہ غیر اقوام اپنے مقاصد کی تکمیل کے لئے اُس فرد کو تھوڑے دنوں کے لئے اونچے عہدے دے دیتی ہیں۔

آٹھواں بند:- (۱) اب اقبال، مسلمانوں کو دوبارہ سربلندی حاصل کرنے کی ترکیب بتاتے ہیں۔ کہتے ہیں کہ اے مسلمان! ابھی تیرے اندر عاشقی کا جذبہ پورے طور سے پیدا نہیں ہوا ہے اس لیے ابھی اس جذبہ کو آشکار مت کر، بلکہ خفیہ طریق پر اس کی نشوونما کر، شراب جس قدر زیادہ عرصہ تک مٹکے میں پڑی رہتی ہے۔ اسی قدر زیادہ تیز ہو جاتی ہے اور جب بوتل میں آجاتی ہے، تو سب پر ظاہر ہو جاتی ہے۔ لہٰذا فی الحال یہ کام کر کہ،

(۲) کلیم کی طرح وادی ایمن میں آکر ڈیرے ڈالدے اور خدا سے دیدار کی التجا کر، یعنی پہلے صحیح خطوط پر اپنی سیرت کی تشکیل کر۔ اپنے اندر اسلامی رنگ پیدا کر، اپنا تزکیہ نفس کر، مختصر یہ کہ اپنے کیریکٹر کی تکمیل کر جس کے بغیر کوئی انسان زندگی کے کسی شعبہ میں کامیاب نہیں ہو سکتا۔

شعلۂ تحقیق سے اپنے آپ کو جلا کر سیاہ کر دے یعنی قرآن اور حدیث کا صحیح علم حاصل کر، تقلید کورانہ، اور رسوم جاہلانہ سے اجتناب کر۔ جس بات کا تجھے علم حاصل نہ ہو اس کی پیروی مت کر[1]

(۳) جب تجھ میں باطل کا یعنی اپنے دشمنوں کا مقابلہ کرنے کی طاقت پیدا ہو جائے تو پھر میدان عمل میں آجا جن مسلمانوں کو دشمنوں نے اسلام کی سربلندی کی کوشش کے جرم میں تختۂ دار پر چڑھایا، یا کالے پانی بھیجا اُن سچے مسلمانوں کی زندگی (خاکستر پروانہ) سے سبق حاصل کر اور اپنی قوم کو اُن شمع حریت کے پروانوں کے نقش قدم پر چلنے کی تلقین کر تا کہ مسلمان اُن شہدا کی خاک (زیادہ صحیح خون) سے مسلمانوں کے لئے سربلندی اور سرداری کا نیا قصر تعمیر کر سکیں اور قوم کے

---

[1] اقبال نے اس مصرع میں قرآن مجید کی اس آیت کا ترجمہ کر دیا ہے۔
وَلَا تَقْفُ مَا لَيْسَ لَكَ بِهٖ عِلْمٌ (۱۷ : ۳۶) اور جس بات کا تجھ کو (صحیح) علم نہ ہو اس کی پیروی مت کر، یا اس کے پیچھے مت پڑ۔

دل میں ایسی آگ لگا دے کہ وہ سر بکف ہو کر دشمنوں کے مقابلہ میں آجائے تاکہ انھیں (شمع) بھی اپنی طرزِ ستم (ظالمانہ طریقِ حکومت) کا انجام معلوم ہو اور وہ اپنی اسلام دشمنی اور ملت کشی کا مزہ چکھ سکیں!

(۴) اے مسلمان سب سے پہلے خود داری کا سبق پڑھ! ساقی کا احسان مت اٹھا، بلکہ حباب سے سبق حاصل کر کہ وہ دریا میں رہتا ہے لیکن اُس سے ایک بوند بھی طلب نہیں کرتا۔

(۵) اب ماضی کی غفلت پر نوحہ خوانی سے کوئی فائدہ نہیں ہے۔ اگر طرابلس، ٹیونیشیا، مراکش یا صقلیہ ہاتھوں سے نکل گیا تو کوئی پرواہ نہیں ہے نئے ممالک فتح کرنے کا انتظام کر۔

(۶) اگر مقدر (تقدیر الٰہی) نے تجھ کو خاک میں ملا دیا ہے تو بھی کوئی پرواہ مت کر جس طرح دانہ خاک میں مل کر شگوفہ بن کر پھوٹتا ہے اور اس کا تنہ اس کے لئے عصا کا کام دیتا ہے جس کے سہارے سے وہ کھڑا ہو سکتا ہے اُس طرح تو بھی اپنی مخفی عملا حیتوں کو بروئے کار لا۔ اور نئی زندگی حاصل کر لے۔

(۷) اے مسلمان! دشمنوں کے آشیاں سے کنارہ کر کے اسلام کے دامن میں پناہ لے اور اُسی شاخِ کہن پر آشیاں بنا جس پر خالدؓ جانباز نے اپنا آشیانہ بنایا تھا۔ پہلے خود شریعت پر عمل کر، پھر قوم (اہل گلشن) کو اتباعِ رسول کا درس دے۔

(۸) اے مسلمان! یہ منافقانہ روش چھوڑ دے کہ جب "صاحب" سے ملنے گیا، تو اپنی گفتگو سے اپنے آپ کو میر جعفر، اور میر صادق کا صحیح جانشین ثابت کر دیا اور جب عید کے دن دو شاہی مسجد میں آیا تو قرآن سر پر رکھ کر اپنی جان، قوم کے لئے قربان کرنے کا اعلان کر دیا۔ اے مسلمان! یا تو مسلمان بن جا، یا علانیہ کفر اختیار کر لے۔ دو رنگی چھوڑ دے۔

(۹) اے مسلمان! تو کیوں خاموش ہے؟ تو کیوں قرآن کا پیغام لوگوں کو نہیں سناتا؟ (شبنم گرتی ہے تو آواز نہیں ہوتی یا اسی طرح مسلمان بھی کوئی ہنگامہ برپا نہیں کرتا) اے مسلمان تو میدانِ عمل میں آ تو سہی! زبان کھول تو سہی! تیرے پاس تو وہ نغمہ ہے کہ اگر تو اسے سنائے

تو ساری دنیا محو حیرت ہو جائے۔

نواں بند:- (۱) اب مسلمان کو اس کی حقیقت سے آشنا کرتے ہیں۔ "حقیقت" سے یہاں ذاتی خوبیاں یا اوصاف مراد ہیں۔ کہتے ہیں کہ اے مسلمان! تو ذرا اپنی حقیقت یعنی ان مخفی صلاحیتوں پر بھی تو غور کر جو اللہ نے تیرے اندر ودیعت فرمادی ہیں! تیرے اندر ترقی کی بے اندازہ صلاحیت پوشیدہ ہے تو ساری دنیا کی خوبیاں اپنے اندر رکھتا ہے تیری شخصیت تمام کمالات کا خزانہ ہے، تو دانہ بھی ہے، باران بھی ہے اور حاصل بھی ہے۔

(۲) تو کیوں دوسروں کی تقلید کا آرزو مند ہے؟ تو غیروں کا سہارا کیوں تلاش کرتا ہے! جبکہ تو خود راہرو ہے، خود راہبر ہے، اور خود ہی اپنی منزل ہے۔

(۳) تو طوفان (مصائب) کے اندیشہ سے کیوں خوفزدہ ہے! اے نادان! تو خود ہی ناخدا ہے، خود ہی بحر ہے، اور خود ہی کشتی ہے۔

(۴) تو کبھی تنہائی میں بیٹھ کر مراقبہ تو کر! تاکہ تجھے یہ معلوم ہو سکے کہ تو جس کی تلاش میں ہر گرداں ہے وہ خود تیرے دل میں پوشیدہ ہے۔

(۵) افسوس! تو کس قدر نادان ہے! تو اپنے آپ کو ساقی کا محتاج سمجھتا ہے، حالانکہ ساقی بھی تو ہی ہے، اور مینا بھی تو ہی ہے، اور محفل بھی تو ہی ہے۔

(۶) اے مسلمان عشق رسولؐ اختیار کر لے۔ پھر تو شعلہ بن جائے گا، اور تجھ میں اس قدر طاقت پیدا ہو جائے گی کہ تو کفر کا خاتمہ کر دے گا۔ تجھے باطل (دشمنان ملت) سے کیا خوف ہو سکتا ہے، جب کہ تو بذات خود، غارتگرِ باطل ہے۔ تجھے تو اللہ نے پیدا ہی اس لئے کیا ہے کہ تو ہر نقش باطل کو دنیا سے مٹا دے۔

(۷) اے بے خبر! (کس قدر برمحل خطاب ہے) اے غافل مسلمان: تو اس کائنات کے لیے باعثِ قیام ہے۔ اگر تو نہ ہو تو یہ دنیا بالکل مہمل اور بیکار ہے۔ کیوں؟ اس لئے کہ تو حامل قرآن ہے، اور قرآن، دنیا میں خدا کا آخری پیغام ہے۔ اس کے بعد اس دنیا کی اصلاح

کے لئے کوئی قانون نازل نہیں ہوگا۔ اگر تو مٹ جائے تو قرآن مٹ جائے گا، اور قرآن مٹ جائے گا، تو نظام عالم، تہ و بالا ہو جائے گا۔ اس لئے تیرا وجود اس دنیا کے لئے لازمی اور ضروری ہے۔

دسواں بند:۔ اے غافل! ذرا اپنی اصلیت سے تو آگاہی حاصل کر! تو دیکھنے میں قطرہ نظر آتا ہے لیکن تو سمندر کی طرح، بے پایاں بھی تو ہے۔ یعنی تجھ میں خلافتِ الٰہیہ کے مقام پر فائز ہونے کی صلاحیت بھی تو مخفی ہے۔ اس لئے تیری روحانی طاقتیں سمندر کی طرح بے پایاں ہیں۔

واضح ہو کہ مسلمان جب "مومن" بن جاتا ہے تو نیابتِ الٰہیہ کے مرتبہ پر فائز ہو جاتا ہے لیکن اقبال کا "مردِ مومن" بہت بلند مرتبہ ہے۔ اس کی نظیر آپ کو حضرت شیخ ہجویری، حضرت خواجہ اجمیری، حضرت محبوب الٰہی، حضرت مجدد الف ثانی یا حضرت میاں میر کی زندگی میں مل سکتی ہے۔ واضح ہو کہ اقبال کا مردِ مومن، زمان و مکان دونوں پر حکمراں ہوتا ہے۔ یہ اس کی خصوصیات میں سے پہلی خصوصیت ہے۔ علامہ اقبال نے ایک مرتبہ مجھ سے کہا تھا کہ "زمانہ کی حقیقت کو سمجھنا بہت مشکل ہے تو اس پر حکمراں ہونا کتنا مشکل ہے" ناظرین اس کا اندازہ خود کر سکتے ہیں، جب تک بقول اقبال ایک مسلمان فنافی الرسول نہ ہو جائے اُس وقت تک مومن (حقیقی معنی میں) نہیں بن سکتا۔ افسوس کہ میں اس شرح میں اس کی تفصیل نہیں کر سکتا۔

(۲) اے مسلمان! تو کیوں احساس کمتری کے مرض میں مبتلا ہو گیا ہے؟ تو اگر کسی مرشد کی صحبت میں بیٹھ کر دیکھنے کی طاقت پیدا کر لے تو تجھے صاف نظر آ جائے گا کہ تجھ میں تو انقلاب برپا کرنے کی صلاحیت موجود ہے۔

(۳) اے مسلمان! تو اس دنیا میں اللہ کے پاک کلام (قرآن حکیم) کا امین ہے وہ اللہ جو اس دنیا میں، آنکھ سے تو بیشک نظر نہیں آتا لیکن اس دنیا میں نظام اس کی ہستی پر گواہی

دے رہا ہے۔

(۴) اے مسلمان: اگر تو غور کرے تو تیرے پاس وہ سامان بھی ہے جس کی بدولت تو ساری دنیا کو بے تیغ و تفنگ فتح کر سکتا ہے۔ سامان سے مراد عشق رسول ہے یعنی اگر مسلمان تبلیغ و اشاعت اسلام پر کمربستہ ہو جائیں اور قرآن حکیم کی پاکیزہ تعلیمات کو دنیا میں پھیلانے کا تہیہ کر لیں تو ساری دنیا مسلمان ہو سکتی ہے۔ اور جب ساری اقوام مسلمان ہو جائے گی تو دوسرے لفظوں میں اس کا مطلب یہ ہے کہ مسلمان ساری دنیا کو فتح کر لیں گے۔

(۵) اے مسلمان! اس عہد کو یاد کر جو تیرے آباؤ اجداد (صحابہ کرامؓ) نے مسلمان ہونے کے وقت سرکار دو عالم صلعم سے کیا تھا کہ ہم ساری دنیا میں اسلام کی تبلیغ کریں گے۔ کوہ فاراں (ظہور اسلام کا مادی نشان) کی خاموشی آج تک اس عہد پر شہادت دے رہی ہے پس تو بھی اپنے بزرگوں کے نقش قدم پر چل کر ایفائے عہد کر۔

(۶) اے مسلمان! تو نے اپنی کم فہمی کی بنا پر دنیا کے چند ممالک میں تبلیغ اسلام کر کے یہ سمجھ لیا کہ فرض تبلیغ ادا ہو گیا۔ ورنہ حقیقت یہ ہے کہ اسلام تو عالمگیری ضابطۂ حیات ہے۔ اس میں تو یہ صلاحیت ہے کہ ساری دنیا کو اپنے نور سے منور کر سکتا ہے۔

(۷) جس طرح بوتل میں شراب اس لحاظ سے پوشیدہ ہے کہ اس کے اندر ہے لیکن اس اعتبار سے ظاہر ہے کہ اس مینا سے نظر آسکتی ہے اسی طرح میرے دل میں تبلیغ و اشاعت اسلام کا جذبہ پوشیدہ ہے۔ لیکن میری نظموں سے ظاہر ہو سکتا ہے۔

(۸) یہ سچ ہے کہ نوائے صبحگاہی نے میرا جگر خون کر دیا ہے۔ یہ سچ ہے کہ پہلے عشق رسول نے مجھے جلایا ہے پھر میں نے قوم کے دل میں آگ لگائی ہے لیکن اس صورت حال کو میں اس لئے گوارا کرتا ہوں کہ میری زندگی موقوف ہے، مسلمانوں کو عشق رسول کا پیغام دینے پر۔ اگر میں اس آگ کو ٹھنڈا کر دوں تو اس کے ساتھ خود بھی ٹھنڈا ہو جاؤں گا۔ اس شعر کی خوبی اس کے انداز بیان میں مضمر ہے۔

(۹) اگر تو یہ معلوم کرنا چاہتا ہے کہ میرے اشعار میں سوز و گداز کہاں سے پیدا ہو گیا تو میرے دل کی حالت کا معائنہ کر، میرا دل عشق رسول کی آگ میں فنا ہو چکا ہے۔ اور اگر تو اپنی تقدیر کا جلوہ دیکھنا چاہتا ہے، تو وہ بھی میرے دل کے آئینہ میں نظر آ سکتا ہے۔ یعنی تو بھی عشق رسولؐ اختیار کر لے، تجھے اپنی تقدیر کا علم حاصل ہو جائے گا۔ یہ بڑا بلیغ شعر ہے۔ ایسے اشعار کا مطلب چند سطور میں بیان نہیں ہو سکتا۔ مطلب یہ ہے کہ اگر مسلمان، نوشتہ تقدیر سے آگاہ ہونا چاہتے ہیں، اپنے مستقبل سے واقف ہونا چاہتے ہیں کہ ہماری تقدیر میں کیا ہے؛ تو وہ عشق رسول اختیار کر لیں۔ انھیں معلوم ہو جائے گا کہ کاتب تقدیر نے ان کی تقدیر میں کامیابی ہی کامیابی لکھی ہے۔

آخری بند:۔ اے مسلمان! اگر تو عشق رسول اختیار کر لے تو اس کا نتیجہ یہ نکلے گا کہ دنیا قرآن کے نور سے منور ہو جائے گی، اور کفر کی تاریکی مٹ جائے گی

(۲) اور دنیا میں اس قدر برکت راحت اور مسرت پیدا ہو جائے گی کہ بے زبان چیزیں بھی برکات اسلام پر زبان حال سے گواہی دینے لگیں گی۔

نوٹ:۔ اقبال نے یہ ساری نظم رمزیہ انداز میں لکھی ہے، اس لیے میں نے لفظی ترجمہ نہیں کیا، کیونکہ اس سے شاعر کا مفہوم ادا نہیں ہو سکتا۔ بلکہ مرادی معنی درج کیے ہیں۔ مثلاً اس مصرع کا اگر یہ ترجمہ لکھ دوں کہ "کلی میں جو خوشبو سو رہی ہے یا پوشیدہ ہے، وہ غنچہ کی آواز بن جائے گی"، تو مطلب واضح نہیں ہو سکتا۔

(۳) مسلمانوں کے اندر اتحاد اور اتفاق کا رنگ پیدا ہو جائے گا اور مخالف بھی دوست بن جائینگے

(۴) میرا کلام (پیغام) ایسا سوز و گداز پیدا کرے گا، کہ ملت کا ہر فرد، دوسروں کا ہمدرد اور غمگسار بن جائے گا۔

آج جو قومیں اسلام کی تخریب کے درپے ہیں، ان قوموں میں خود نمود زوال کے آثار

پیدا ہو جائیں گے۔ اور ان کی ریشہ دوانیاں، خود ان ہی کے حق میں وبال ہو جائیں گی

(۶) مسلمان پھر مساجد کو آباد کریں گے۔ اور غیر اللہ سے قطع تعلق کر کے، اللہ کے حضور میں سر نیاز خم کرنے لگیں گے۔ جس کی بدولت وہ فضل الٰہی کے مستحق ہو جائیں گے۔

(۷) جب دشمنان ملت (صیاد) اسلام کے حلقہ بگوش ہو جائیں گے تو مسلمانوں (طیور) کے قلوب، مسرت کے نغموں سے لبریز ہو جائیں گے۔ اور ان دشمنان ملت (گلچیں) کے مسلمان ہو جانے سے اسلام کو شان و شوکت نصیب ہو گی۔

(۸) مختصر یہ کہ اگر مسلمان، تبلیغ اسلام پر کمربستہ ہو جائیں، تو دنیا میں ایسا انقلاب رونما ہو جائے گا کہ میں اس کی تفصیل بیان نہیں کر سکتا۔ جس طرح عربوں نے اسلام کی اشاعت کی بدولت، نئی دنیا پیدا کر دی تھی، اسی طرح اسلام کی حیات ثانیہ کے بعد اس دنیا کا نقشہ بالکل بدل جائے گا۔

(۹) انشاء اللہ وہ دن ضرور آئے گا، جب اسلام کا آفتاب ساری دنیا پر چمکے گا، اور کفر کی تاریکی دنیا سے یکسر مٹ جائے گی۔ اور ساری دنیا توحید کی دولت سے مالا مال ہو جائے گی۔

نوٹ:۔ اقبال نے اس بند کا مضمون قرآن حکیم کی اس آیت سے اخذ کیا ہے:۔
هُوَ الَّذِي أَرْسَلَ رَسُولَهُ بِالْهُدَىٰ وَدِينِ الْحَقِّ لِيُظْهِرَهُ عَلَى الدِّينِ كُلِّهِ ۔ اللہ وہ ہے جس نے اپنے رسول کو ہدایت اور دین حق کے ساتھ بھیجا ہے۔ تاکہ وہ دین اسلام کو تمام ادیان عالم پر غالب کر دے۔ پس اقبال کا پیغام یہ ہے کہ مسلمان تبلیغ اسلام پر کمربستہ ہو جائیں تاکہ ساری دنیا توحید کے نور سے منور ہو جائے ۱۲۔

مسلم

حل لغات :۔ آہ میں مستور ہے یعنی تو ہر وقت آہ و نالہ کرتا رہتا ہے + لیلی سے اُمید مراد ہے + آوازِ سرودِ رفتہ، سے مسلمان کی عظمتِ ماضی کی داستان مراد ہے + ہنگامۂ حاضر سے حالات حاضرہ مراد ہیں ۔ ہم نوایانِ چمن سے مسلمان افراد مراد ہیں ۔ قصۂ گل سے مسلمانوں کی تاریخ ماضی مراد ہے ۔ پیغام کہن سے اسلام مراد ہے ۔ درا ئے کاروانِ خفتہ پا لفظی معنی اُس قافلہ کا گھنٹہ جو سو رہا ہے مراد ہے ذاتِ شاعر یعنی اقبال اُس قوم کا شاعر ہے جو خواب غفلت میں گرفتار ہے ۔ شمع سے روشن الخ یعنی تیرے کلام سے مسلمان بیدار نہیں ہو سکتے شب دوشینہ ۔ گذری ہوئی رات + توحید کا حامل یعنی توحید کا علمبردار ۔ شاہد عادل ۔ معتبر گواہ نبض موجودات، یعنی ساری کائنات ۔ حرارت یعنی زندگی ۔ تخیل یعنی خیالات یا ارادے ۔ جسارت ہمت، حوصلہ، دلیری ۔ صداقت سے توحید الٰہی مراد ہے ۔ ناموس عزت + پیرہن سے زیب و زینت مراد ہے + کوکب تابندہ چمکتا ہوا ستارہ افسون سحر سے صبح کی روشنی مراد ہے ۔ چشم بر عہد کہن یعنی پُرانے دور کی واپسی کا منتظر ۔ پرانے دور سے پرانا زمانہ مراد نہیں ہے، کیوں کہ وہ تو واپس نہیں آ سکتا، بلکہ اس سے مسلمانوں کا عروج مراد ہے، جیسا کہ پُرانے دور میں ان کو حاصل ہوا تھا ۔ اہل محفل، یعنی مسلمان قوم ۔ پُرانی داستان یعنی صدر اول کے مسلمانوں کے عروج کی داستان ۔ میری خاک کو اکسیر ہے یعنی یادِ عہدِ رفتہ مجھے زندگی بخشتی ہے ۔ میرے جذبات کو ابھارتی ہے ۔

تبصرہ :۔ یہ نظم اقبال نے ۱۹۱۲ء میں لکھی تھی، جبکہ وہ قرآن مجید کے مطالعہ میں منہمک تھے ان کے نزدیک رہنے والوں کا بیان ہے کہ اس زمانہ میں وہ تہجد کے وقت اُٹھ کر قرآن حکیم کی تلاوت کیا کرتے تھے ۔ یعنی اس کے سمندر سے حقائق و معارف کے موتی نکالتے تھے ۔ اور اکثر اوقات ان پر اس قدر رقت طاری ہوتی تھی کہ کلام پاک کے صفحات اُن کے موتیوں سے تر ہو جاتے تھے

قرآنِ حکیم ہیں اسی تدبر کا نتیجہ ۱۹۱۴ء میں اسرارِ خودی اور ۱۹۱۵ء میں رموزِ بیخودی کی شکل میں دنیا کے سامنے آیا۔ ان ہی دو کتابوں نے اقبال کو دنیا کے حکماء کی صف میں جگہ دی ان کا سارا فلسفہ ان ہی دو کتابوں میں مدوّن ہے۔ اور تمام تر قرآن حکیم سے ماخوذ ہے۔

قرآن عزیز ہی کے مطالعہ سے اُن پر یہ حقیقت منکشف ہوئی کہ "مسلم" کی صفت کیا ہے۔ اور اس نظم میں انھوں نے اسی لفظ کی وضاحت کی ہے اس نظم سے اُس انقلاب کا حال بھی معلوم ہو سکتا ہے' جو ان کی ذہنیت میں پیدا ہو چکا ہے۔ اب وہ ہمالہ اور دنیا شوالہ کے بجائے اسلام' اور مسلم' کی حقیقت پر غور کر رہے ہیں۔ اور مسلمانوں کو بیداری کا پیغام دے رہے ہیں

مطلب :- اقبال کے ایک دوست نے یہ اعتراض کیا کہ اے اقبال! تو ہر وقت نالہ و فریاد کرتا رہتا ہے۔ خود بھی روتا ہے' ہمیں بھی رُلاتا ہے' تو کبھی اُمید کا پیغام نہیں سُناتا معلوم ہوتا ہے کہ یہ جذبہ تیرے دل (محل) میں کبھی پیدا ہی نہیں ہوتا۔ تیرے کان ہمیشہ مسلمانوں کی عظمت ماضیہ کی داستان سُننے کے منتظر رہتے ہیں اور تو موجودہ زمانے کے واقعات سے بیخبر رہتا ہے۔ حالانکہ صورت حال یہ ہے کہ تیرے زمانہ کے مسلمان' پرانی داستانیں سُننا پسند نہیں کرتے۔ لہٰذا میں تجھے مشورہ دیتا ہوں کہ تو اپنے طریق کار میں تبدیلی پیدا کر یا خاموش ہو جا آخر قوم کو مسلمانوں کی گذشتہ تاریخ سُنانے سے کیا فائدہ؟ تیری شاعری بہت یاس انگیز ہے اسی لئے قوم اسے پسند نہیں کرتی۔ حقیقت حال یہ ہے کہ تیری قوم مردہ ہو چکی ہے۔ مسلمانوں کی عظمت کا دورِ گذشتہ اب واپس نہیں آ سکتا جس طرح شمع جلانے سے گذری ہوئی رات واپس نہیں آ سکتی۔

یہ اعتراض سُن کر اقبال نے جواب دیا کہ۔

(۱) اے دوست! میں مسلم ہوں' اور اللہ نے مسلم پر کچھ فرائض عائد کئے ہیں' جن کی تفصیل یہ ہے کہ۔

(۱) میں دنیا میں توحید الٰہی کا حامل، اور علمبردار، اور مبلغ اور محافظ ہوں اور میری زندگی کا مقصد اس کے سوا اور کچھ نہیں کہ میں توحید کی اشاعت اور حفاظت کروں۔

(ب) میں ابتدائے عالم سے توحید پر گواہی دے رہا ہوں (ہر نبی نے توحید ہی کی اشاعت کی تھی)

(۲) توحید کیا ہے؟ یہ روحانی زندگی کی اصل ہے۔ کائنات اسی کے دم سے زندہ ہے اور مسلمان کے ارادوں میں جسقدر بلندی پائی جاتی ہے، یہ سب اسی کا طفیل ہے۔

(۳) خدا نے اس دنیا کو اسی لیئے پیدا کیا ہے کہ اس میں توحید کی اشاعت ہو، اور مسلمان کا فرض منصبی (جس کے لیئے وہ پیدا ہوا ہے) بس یہی ہے کہ وہ دنیا میں توحید کی اشاعت کرے۔ اور جہاں یہ شمع روشن ہو جائے وہاں اس کی حفاظت کرے تاکہ یہ شمع بجھنے نہ پائے۔ آج اگر مسلمان ذلیل و خوار ہے تو اس کی وجہ صرف یہ ہے کہ اُس نے اپنے فرض منصبی کی ادائیگی میں کوتاہی کی۔ مثلاً وہ قاہرہ اور قسطنطنیہ میں حکومت کرتا رہا۔ اور اُس کی آنکھوں کے سامنے قرطبہ اور غرناطہ میں اسلام کی شمع بجھ گئی۔

(۴) میرا دوسرا فرض یہ ہے کہ دنیا سے کفر اور شرک کا خاتمہ کر دوں۔ اور بنی آدم کی عزت نفس کی حفاظت کر دوں۔ اور یہ اسی صورت میں ممکن ہے جب وہ توحید اختیار کر لیں۔ کیوں کہ کوئی مشرک، معزز نہیں ہو سکتا۔

(۵) مسلمان کا وجود، دنیا کی زینت کا باعث ہے۔ اگر دنیا مسلمان کے وجود سے خالی ہو جائے تو انسانیت ذلیل اور رسوا ہو جائے گی۔

(۶) مسلمان دنیا کی تقدیر کا روشن ستارہ ہے یعنی دنیا کا عروج، مسلمان کے عروج سے وابستہ ہے۔ یہ ستارہ صبح کی روشنی سے بھی زیادہ چمکیلا ہے۔

(۷) میں، مسلمان ہونے کی حیثیت سے، کائنات اور حیات دونوں کے اسرار و رموز سے آگاہ ہوں یعنی میں اپنی اور اس دنیا کی حقیقت سے آگاہ ہوں، اس لیئے میں کشمکش حیات

ہیں مسلمانوں کی کامیابی سے کبھی ناامید نہیں ہوسکتا۔

(۸) اگر آج کل مسلمان عارضی طور سے پستی میں ہیں یا غمگین ہیں تو ہیں اس سے بالکل ہراساں نہیں ہوسکتا کیوں کہ مجھے یقین ہے کہ ملت اسلامیہ مٹ جانے کے لئے پیدا نہیں ہوئی ہے اگر ملت اسلامیہ مٹ گئی تو اسلام کی حفاظت کون کرے گا؛ اور اسلام دنیا سے مٹ نہیں سکتا۔ لہذا مسلمان بھی نہیں مٹ سکتے۔

(۹) میرے دل میں ناامیدی کو کبھی جگہ نہیں مل سکتی میں یقین رکھتا ہوں کہ معرکۂ حیات میں مسلمان ضرور کامیاب ہوں گے۔

(۱۰) ہاں یہ سچ ہے کہ میں اس بات کا آرزومند ضرور ہوں کہ مسلمانوں کو پھر وہی شان و شوکت حاصل ہوجائے۔ جو کسی زمانہ میں (آج سے ۲۔ ۴ سو سال پہلے) تھی۔ اسی لئے میں مسلمانوں کو ان کے عہد عروج (ہارون الرشید، اور سلطان محمد فاتح) کی داستانیں سناتا رہتا ہوں: تاکہ ان کے اندر ترقی کرنے کا جذبہ پیدا ہو۔

(۱۱) اُس دور کی یاد میرے اندر عمل کی تحریک پیدا کرتی ہے اور میں سمجھتا ہوں بلکہ یقین کرتا ہوں کہ جو شوکت مسلمانوں کو ماضی میں حاصل تھی، وہ مستقبل میں بھی حاصل ہوگی۔

(۱۲) اسی لئے میں ہمیشہ مسلمانوں کے عروج کے زمانہ کو مدنظر رکھتا ہوں۔ اور گذشتہ کے آئینہ میں آئندہ کی تصویر دیکھتا ہوں یعنی مسلمانوں کو یہ پیغام دیتا ہوں کہ تم بھی وہی شان و شوکت حاصل کرو۔ جو تمہارے اسلاف کو حاصل تھی۔

حضور رسالت مآب

حل لغات: گرداں، بمعنی ناگوار یا تکلیف دہ۔ ہنگامۂ زمانہ سے وہ مصائب مراد ہیں، جو اس بیسویں صدی کے آغاز سے مسلمانوں پر نازل ہونے شروع ہوئے۔ رخت سفر سامان یا اسباب جو مسافر اپنے ساتھ رکھتا ہے۔ قیود شام و سحر یعنی انسانی زندگی کی پابندیاں۔ مثلاً

سانس لینا + نظام کہنۂ عالم سے خورد نوش اور حوائج زندگی مراد ہیں۔ آیۂ رحمت العٰلمین رحمت کا نشان۔ یہ ترکیب قرآن مجید کی اس آیت سے ماخوذ ہے۔

وَمَآ اَرْسَلْنٰکَ اِلَّا رَحْمَۃً لِّلْعٰلَمِیْنَ ۔ یعنی ہم نے آپکو ساری کائنات کے لئے رحمت بناکر بھیجا ہے۔ عندلیب باغ حجاز یعنی اے شاعر اسلام کلی کلی ہے تری الخ یعنی اسلام کی محبت تیری رگ رگ میں سمائی ہوئی ہے۔ سرخوش جام ولا۔ تو محبت کی شراب سے مست رہتا ہے۔ فنادگی بمعنی عاجزی۔ غیرت سجود نیاز۔ عاشق کے سجدہ سے بڑھ کر۔ آبگینہ۔ جام بلوریں۔ اعلیٰ قسم کے بلور کا پیالہ۔

تبصرہ:۔ یہ نظم اقبال نے اس جلسہ میں سنائی تھی جو ۱۹۱۲ء میں شاہی مسجد لاہور میں فدائے ملت حضرت مولانا ظفر علی خاں صاحب کی کوششوں سے منعقد ہوا تھا، تاکہ جنگ بلقان کے سلسلہ میں ترکوں کی مالی امداد کے لئے چندہ جمع کیا جائے۔ واضح ہو کہ مولانائے موصوف نے ۱۹۱۱ء میں سب سے پہلے ترکوں کے لئے چندہ جمع کرکے اس میڈیکل مشن کی وساطت سے ترکوں کو بھجوایا تھا، جو ڈاکٹر مختار احمد انصاری (متوفی ۱۹۳۶ء) کی قیادت میں قسطنطنیہ گیا تھا تاکہ مجروحین کی تیمارداری کرسکے۔ مولانا ظفر علی خاں کے اس احسان سے ملت اسلامیہ ہندیہ کبھی عہدہ برآ نہیں ہوسکتی کہ انھوں نے سب سے پہلے مسلمانوں کو ان کا بھولا ہوا سبق یاد دلایا کہ اِنَّمَا الْمُؤْمِنُوْنَ اِخْوَۃٌ یعنی تمام دنیا کے مسلمان آپس میں بھائی بھائی ہیں۔ بالفاظ دگر یوں سمجھ لیجئے کہ اقبال نے ساری عمر جو کہا، مولانا نے اس پر عمل کرکے دنیا کو دکھا دیا، مثلاً اقبال نے یہ کہا کہ۔

مبر پیش فرنگی حاجت خویش
ز طاق دل فرو ریز ایں صنم را

تو مولانا ظفر علی خاں نے کبھی انگریز کے سامنے ہاتھ نہیں پھیلایا۔ بلکہ ساری عمر اپنے ایمان کی پوری طاقت کے ساتھ اس کی فرعونیت کا مقابلہ کیا چنانچہ وہ خود کہتے ہیں

نشانی ہے اگر خاصانِ حق کی سختیاں سہنا
تو میری عمر بھی گذری ہے اب تک ابتلاؤں میں

مطلب :۔ جب میں اُن مصائب کو دیکھنے کی تاب نہ لا سکا، جو مسلمانوں پر نازل ہو رہے ہیں، تو میں نے سوچا کہ اس دنیا سے کسی اور دنیا میں چلا جاؤں تو بہتر ہے۔ چنانچہ میں یہاں سے روانہ ہو گیا۔ اور اگرچہ زمان و مکان کی قید میں رہا، لیکن حوائج زندگی سے بے نیازی اختیار کر لی انجام کار فرشتے مجھے سرکار دو عالم صلعم کی مجلس مبارک میں لے کر حاضر ہوئے (یہ سب شاعرانہ تخئیل ہے، جس کی کوئی اصلیت نہیں ہے) مجھے دیکھ کر سرکار ابد قرار صلعم یوں گویا ہوئے کہ اے شاعر اسلام! اے وہ کہ تو ملت کے غم میں فنا ہو چکا ہے! ہماری محبت میں ہمیشہ مست رہتا ہے! اور تیری عاجزی میں عاشقوں کے سجدۂ نیاز سے بھی بڑھ کر رنگ عبودیت نظر آتا ہے تو فرشتوں کے ساتھ دنیا سے یہاں آیا ہے، کیا تو ہمارے لئے کوئی تحفہ لایا ہے؟

میں نے ہاتھ باندھ کر عرض کی کہ اے سرورِ کائنات اور اے فخر موجودات! اے میرے آقا! مجھے اس دنیا میں آسودگی یا راحت حاصل نہیں ہوئی، بلکہ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ یہ جنس، اس بازار میں ملتی ہی نہیں۔ اگرچہ دنیا میں ہزاروں لاکھوں، بلکہ کروڑوں مسلمان آباد ہیں لیکن اسلام کے نام پر سر کٹانے والے بہت کم ہیں تاہم میں بڑی کوشش سے حضور کی نذر کے لئے ایک جھلکتا ہوا بلوریں جام لایا ہوں، اور اے میرے آقا! جو چیز اس میں ہے وہ کائنات کا تو ذکر ہی کیا ہے، جنت میں بھی نہیں مل سکتی اس جام میں آپ کی امت کی آبرو جھلک رہی ہے یعنی اس میں طرابلس کے شہیدوں کا خون بھرا ہوا ہے۔

نوٹ :۔ اطالیہ نے بلاوجہ محض ترکی کی کمزوری سے ناجائز فائدہ اُٹھا کر دشمنان اسلام یعنی انگریزوں کے ایما سے ۱۹۱۱ء میں طرابلس پر حملہ کر دیا تھا۔ انگریزوں نے جو مسلمانوں کے سب سے بڑے دشمن ہیں، اطالیہ سے کہہ دیا تھا کہ ترکی کے پاس بحری فوج تو ہے نہیں۔ وہ صرف مصر کے راستہ سے فوجیں بھیج سکتا ہے، لیکن

یہاں سے ہم اُن کو گذرنے نہیں دیں گے۔ اس لئے تم بآسانی طرابلس پر قابض ہو جاؤ گے چنانچہ ایسا ہی ہوا۔ اس کے باوجود مسلمان انگریزوں کو اپنا دوست سمجھتے ہیں ۔

شفاخانہ حجاز

حل لغات :۔ جدہ۔ مکہ معظمہ کا بندرگاہ ہے جو اس مقدس شہر سے ۵۵ میل فاصلہ پر ہے دارالشفاء یعنی شفاخانہ۔ جوائی بطحا۔ وادیٔ بطحا کے نزدیک۔ مکہ معظمہ وادی بطحا میں واقع ہے۔ عیسٰی سے یہاں ڈاکٹر مراد ہے۔ مسیحا اگرچہ حضرت عیسٰی کا لقب ہے لیکن چونکہ وہ مردوں کو زندہ اور بیماروں کو اچھا کر دیتے ہیں ۔ اس لئے مسیحا سے یہاں معالج یا ڈاکٹر مراد ہے۔ اہل درد سے عشاق مراد ہیں ۔

مطلب :۔ اقبالؔ کہتے ہیں کہ ایک دوست نے مجھ سے یہ کہا کہ جدہ میں شفاخانہ قائم ہو رہا ہے۔ چونکہ تو سرزمین حجاز سے بڑی الفت رکھتا ہے، اس لئے اس کار خیر میں دل کھول کر چندہ دے ، تاکہ وہاں ایک شاندار ہسپتال قائم ہو سکے۔

میں نے یہ سن کر جواب دیا کہ میں عاشق ہوں، اور عاشق، موت سے نہیں ڈرتا کیونکہ اس کی نگاہ میں موت، تجدید مذاقِ زندگی کا نام ہے۔ زندگی، موت میں اُسی طرح پوشیدہ ہے جس طرح حقیقت مجاز میں مخفی ہوتی ہے یہ مصرع تشریح طلب ہے۔ سنئیے! جب آپ زیدؔ کو شیر کہتے ہیں، تو یہاں لفظ شیر کا اطلاق مجازاً ہوا ہے کیونکہ زید حیوان نہیں، بلکہ انسان ہے۔ لیکن شیر کی حقیقت کیا ہے! بہادری۔ اور یہ چیز با صفت زید میں بھی پائی جاتی ہے۔ اس لئے حقیقت، مجاز میں پوشیدہ ہے۔ اسی طرح، حیات، موت کے پردہ میں پوشیدہ ہے اس کی تفصیل یہ ہے کہ مرنے کے بعد جو زندگی شہید کو حاصل ہوگی، عاشق اُسی کا تمنائی ہوتا ہے اور وہی حقیقی معنٰی میں زندگی ہے (یہی وجہ ہے کہ قرآن حکیم فرماتا ہے کہ جو شخص اللہ کی راہ میں

قتل ہو جائے، اُسے مردہ مت کہو، کیونکہ وہ زندہ ہے) لیکن یہ زندگی اسی وقت حاصل ہو سکتی ہے، جب عاشق موت کا پیالہ خوشی خوشی پی جائے۔

اس لئے عاشق کو جو لذت موت کے جام میں ملتی ہے، وہ خضرؑ کو زندگی کے جام میں بھی نہیں ملتی یعنی خضر کو زندگی میں وہ لذت محسوس نہیں ہو سکتی۔ جو عاشق کو موت میں محسوس ہوتی ہے۔ کیوں کہ وہ جانتا ہے کہ موت مجھے براہ راست، حریم ناز میں پہونچا دے گی۔ اس لئے آپ زندگی کا پیغام دوسروں کو دیں، کیونکہ میں تو موت ڈھونڈتا ہوں زمین حجاز میں۔ خوشا نصیب اُس عاشق کے جسے حجاز میں موت آ جائے۔ آپ کسے شفا کا پیغام دیتے ہیں؟ بھلا عاشق بھی کہیں مسیحا (معالج) کے آرزومند ہو سکتے ہیں؟

جوابِ شکوہ

حل لغات:۔ قدسی الاصل ہے یعنی اپنی اصلیت کے لحاظ سے پاکیزہ ہے۔ رضواں۔ یعنی داروغہ جنت + تگ و تاز بھاگ دوڑ، کوشش + تماک کی چٹکی یعنی انسان + شکانِ زمین، دنیا کے باشندے یعنی کے مکیں۔ دنیا کے رہنے والے شوخ بمعنی گستاخ۔ برہم۔ ناراض مسجود ملائکہ جسے فرشتوں نے سجدہ کیا تھا۔ عالم کیف ہے لغوی معنی کیفیت اشیاء کا جاننے والا ہے۔ "کیف" منطق کی اصطلاح ہے۔ ارسطو نے موضوع کا بیان کرنے کے لئے دس صورتیں قائم کی تھیں، جن کو "مقولات عشر" کہتے ہیں۔ دنیا میں آپ کسی چیز کا ذکر کریں گے تو ان ہی دس باتوں میں سے کوئی بات بیان کریں گے۔ ایک شئے یا جوہر ہوگی، یا عرض اگر عرض ہے تو اس کی نو صورتیں ممکن ہیں:۔

کیفؔ، کمؔ، فعلؔ، انفعالؔ، ملکؔ، وضعؔ، اضافتؔ، اینؔ اور متیٰؔ طلبہ کی سہولت کے لئے ان کا اردو میں ترجمہ بھی لکھے دیتا ہوں:۔[1]

---

[1] اب مثالوں سے سمجھاتا ہوں:۔ صفحہ ۳۵۵ پر۔

(۱) کیسا (۲) کتنا (۳) کام کرنا (۴) اثر قبول کرنا (۵) قبضہ (۶) حالت۔ (۷) تعلق (۸) کہاں؟ (۹) کب؟

عالم کیف ہے دانائے رموزِ کم ہے۔ اس مصرع کا مطلب یہ ہے کہ انسان منطق اور فلسفہ تو جانتا ہے، لیکن عاجزی (انکسار) سے ناواقف ہے۔ پیمانہ نمرا، یہاں پیمانہ سے آنکھیں مراد ہیں۔ جوہر قابل۔ یہ بھی منطق کی اصطلاح ہے۔ فطرت، فاعل ہے۔ اور اشیاء قابل ہیں قابل کہتے ہیں اصلاح، یا تربیت قبول کرنے والے کو، عرف عام میں "قابل" کہتے ہیں عقلمند کو لیکن منطق میں قابل اُسے کہتے ہیں جو فاعل کے فعل کو قبول کر سکے۔ گِل بمعنی مٹی نشانِ کئی یعنی شوکتِ شاہانہ کئی منسوب بہ کئے کے ایران کے قدیم بادشاہوں کا لقب ہے مثلاً کیخسرو، کیقباد، کیکاؤس وغیرہ۔ الحاد۔ خدا کا انکار کرنا۔ جو اشتراکیت کی پہلی تعلیم ہے۔ پسر آذر میں یعنی بیٹے بت پرست ہیں۔ بادہ آشام بمعنی شراب نوش۔ مایۂ رعنائی باعثِ افتخار۔ نازش وہ بات جس پر ناز کر سکیں لالۂ صحرائی سے مسلمان مراد ہے۔ یکجائی۔ یہ ہرجائی کی ضد ہے یعنی وہ شخص (محبوب) جو کسی خاص مقام میں محدود منحصر ہو۔ ملت احمد مرسل الخ اس مصرع میں بلا کا طنز پوشیدہ ہے۔ ملت اسلامیہ کبھی مقامی یعنی پابند مقام نہیں ہو سکتی رمضان۔ وہ مہینہ جس میں گذشتہ صدی کے مسلمان تقویٰ حاصل کرنے کے لئے روزے رکھا کرتے تھے۔ چونکہ انگریزوں نے تقویٰ کے بجائے "عہدہ" کو مقصودِ حیات بنا دیا

---

(۱) زید نیک آدمی ہے (کیف) (ب) زید کا وزن دو من ہے (کم) (ج) زید لکھ رہا ہے (فعل) (د) لوگ زید پر پھولوں کی بارش کر رہے ہیں۔ (انفعال) (ہ) زید کا گھوڑا بہت قیمتی ہے (ملک) (و) زید اپنے کمرے میں پلنگ پر لیٹا ہے (وضع) (ز) زید، بکر کا بھائی ہے (اضافت) (ح) زید، مکہ میں ہے (این) (ط) زید آج آئے گا۔ (متی)۔ تشریح کے لئے منطق کی مشہور کتاب ایساغوجی کا مطالعہ کافی ہے ۱۲۔

اس لئے اب روزہ رکھنا "رجعت پسندی" کی دلیل ہے۔ قوم مذہب سے ہے۔ یعنی مسلمان قوم کی بنیاد، وطن پر نہیں بلکہ مذہب پر ہے۔ اگر مذہب ختم ہو جائے تو قوم بھی ختم ہو جائے گی (جیسے کہ ہو گئی) اب صرف "ہجوم مومنین" باقی رہ گیا ہے۔ جو عید بقر عید کو شاہی مسجد سے نکلتا ہے، اور دس بیس مسلمانوں کو روندتا ہوا، اپنے گھروں کو واپس چلا جاتا ہے۔ نشیمن گھونسلہ جائے قیام۔ بجلیاں جس میں ہوں آسودہ الخ بہت بلیغ مصرع ہے یعنی اگر کوئی شخص تمہارے دلوں میں عشق رسول کی آگ جلائے تو وہ آگ فوراً سرد ہو جائے گی۔ اسلاف کے مدفن یعنی بزرگوں کی قبریں (واضح ہو کہ راقم الحروف نے گذشتہ ۲۵ سال میں بہت سے قبرستانوں کو "ٹکڑہ ہائے زمین برائے فروخت" کی شکل میں بچشم خود تبدیل ہوتے ہوئے دیکھا ہے۔ نکونام۔ نیک نام، لیکن اس سے مراد ہے بدنام۔ صنم بمعنی بُت۔ منتظر فردا یعنی بے عملی کی زندگی بسر کر رہے ہو اور اس کے باوجود رحمت الٰہی کے امیدوار ہو۔ فاطر ہستی، کائنات کا پیدا کرنے والا۔ مسلم آئیں یعنی اگر کافر اسلام کا دستور اختیار کر لے تو اُسے حور و قصور (محلات) مل گئے موسئی یعنی آرزومند۔ پنپنا۔ ہندی لفظ ہے بمعنی ترقی کرنا۔ تارکِ آئین یعنی شریعت اسلامیہ کا ترک کرنے والا + مصلحت یعنی جس بات میں ذاتی فائدہ نظر آئے اسے اختیار کر لینا خواہ وہ بات شریعت کے خلاف ہی کیوں نہ ہو + معیار بمعنی کسوٹی۔ شعار اغیار۔ کافروں کی تہذیب، یا غیر مسلموں کا تمدن۔ طرز سلف یعنی اپنے بزرگوں کا طریقہ۔ برق طبعی، بمعنی ذہانت، دانشمندی۔ شعلہ مقالی، پُر جوش تقریر۔ روح بلالیؓ، عشق رسولؐ۔ تلقین غزالیؒ یعنی عشق رسولؐ کا پیغام۔ وضع، یہاں اس لفظ سے لباس مراد ہے۔ تمدن۔ طریق معاشرت یا رہن سہن کے طریقے۔ لوث مراعات۔ یعنی مسلمان کسی کے ساتھ خواہ وہ اس کا بیٹا ہی کیوں نہ ہو بے جا رعایت نہیں کرتا تھا۔ لوث بمعنی آمیزش، ملاوٹ، آلودگی۔ فوق الادراک۔ عقل سے بالاتر۔ جوہر سے یہاں صیقل مراد ہے۔ جس کے بغیر آئینہ بیکار ہو جاتا ہے۔ تن آسانی بمعنی کاہلی۔ اوج ثریا سے بلندی مراد ہے۔ قلب سلیم، قرآن پاک کی اصطلاح میں اُس دل

کو کہتے ہیں جس میں تقویٰ اور ایمان اور عرفان تینوں چیزیں پائی جائیں + سریر کئے، یعنی
شاہان ایران کا تخت + حمیت، غیرت یعنی اپنی عزت پر سر کٹا دینے کا جذبہ کلی سے یہاں
عزت اور حکومت مراد ہے۔ مہجور نشیمن۔ آشیانہ یا وطن سے دور تہذیب سے تہذیب
مغرب مراد ہے قیس سے مسلمان نوجوان مراد ہے۔ حجاب رخ لیلیٰ نہ رہے یعنی اب
مسلمان نوجوان یہ چاہتا ہے کہ اس کی بہنیں بے پردہ کالجوں میں بازاروں میں ہوٹلوں
اور گلیوں میں اس کے ساتھ جائیں۔ عہد نو سے مغربی تہذیب مراد ہے۔ جو اسلام کے خرمن کے
حق میں بجلی ہے۔ شعلہ بہ پیراہن ہے یعنی تباہ ہو رہی ہے۔ مالی سے رہنمائے قوم مراد ہے۔
گل برانداز ہے یعنی پھول برسا رہی ہے۔ عنابی یعنی سرخ + ثمر چیدہ یعنی کامیاب۔ کاہیدہ
کمزور مرجھائے ہوئے بطن لغوی معنی پیٹ۔ برومندی کامیابی چمن بندی تربیت۔ ہر مصر ہے
کنعاں تیرا یعنی ہر ملک تیرا وطن ہے۔ عصر نو۔ موجودہ زمانہ صہیل۔ گھوڑے کے ہنہنانے کی
آواز۔ فرس بمعنی اسپ۔ کوکب قسمت امکاں یعنی دنیا کی تقدیر کا ستارہ۔ رخت بردوش۔
کنایہ ہے آمادگی سفر سے۔ پریشاں ہو جا یعنی دنیا میں پھیل جا۔ تنک مایہ۔ حقیر۔ تپش آمادہ یعنی
متحرک ورفعنا لک ذکرک۔ یہ قرآن عزیز کی آیت ہے۔ اللہ فرماتا ہے کہ اے رسولؐ (کیا)
ہم نے آپ کا ذکر دنیا میں بلند (نہیں) کر دیا؟ مردم چشم زمیں۔ زمین کی آنکھ کی پتلی (جو سیاہ
ہوتی ہے) کالی دنیا سے ملک حبشہ مراد ہے۔ شہدا پالنے والے۔ اشارہ ہے ابتدائی دور
کے مسلمانوں کی ہجرت حبشہ کی طرف۔ جب کہ قریش کے ظلم و ستم سے تنگ آ کر بہت سے
مسلمانوں نے نجاشی کے دربار میں پہنچ کر پناہ مانگی تھی، اور اس نے ان مسلمانوں کو اپنی
بادشاہت میں پناہ دی تھی۔ گرمئ مہر کی پروردہ۔ مطلب یہ ہے کہ وہاں گرمی بہت شدید
ہوتی ہے بلالی دنیا سے اشارہ ہے اس طرف کہ حضرت بلالؓ کا اصلی وطن حبشہ تھا۔ سپر
بمعنی ڈھال۔ درویش سے مسلمان کی حقیقی حیثیت کی طرف اشارہ ہے کیوں کہ اللہ اس
مسلمان کو پسند کرتا ہے جس میں درویشی کی شان پائی جائے جیسی فاروق اعظمؓ عمر ابن

عبدالعزیزؒ، نورالدین زنگی، محمود بیگڑا، اور عالمگیرؒ میں پائی جاتی ہے۔ ماسوی اللہ تصوف کی اصطلاح ہے۔ اللہ کے سوا جو کچھ ہے، اُسے ماسوی اللہ کہتے ہیں۔ یہ زن زر اور زمین کا مجموعہ ہے اور چونکہ یہ تینوں چیزیں انسان کو اللہ سے غافل کر دیتی ہے۔ اس لئے تصوف کی پہلی تعلیم یہ ہے کہ ان کی محبت پر اللہ کی محبت کو مقدم کرو۔ تقدیر ہے تا بہ تدبیر تری۔ یعنی پھر جو تو چاہیگا وہی ہوگا۔ لوح و قلم سے ساری کائنات مراد ہے۔

تبصرہ:۔ اقبال نے یہ نظم ۱۹۱۳ء میں لکھی تھی۔ اور موچی دروازہ لاہور کے باہر اُس جلسہ میں سنائی تھی، جو حضرت مولانا ظفر علی خاں صاحب کے زیر اہتمام، جنگ بلقان کے سلسلہ میں منعقد ہوا تھا تاکہ ترکوں کے لئے چندہ جمع کیا جائے۔ نظم کے اختتام پر اس کی ہزاروں کاپیاں ہاتھوں ہاتھ فروخت ہو گئیں، اور وہ تمام رقم بلقان فنڈ میں دیدی گئی۔ شکوہ کی طرح یہ نظم بھی اقبال کی اُردو شاعری کے نادر ترین نمونوں میں سے ہے۔ ذیل میں ہر بند کا مختصر مطلب درج کرتا ہوں۔

پہلا بند:۔ میں نے اللہ کی جناب میں جو شکوہ کیا تھا، چونکہ وہ میرے دل کی گہرائیوں سے نکلا تھا، اس لیے اس میں بڑی تاثیر پوشیدہ تھی اور اسی لئے وہ سب آسمانوں سے گذرتا ہوا عالم ملکوت میں پہونچ گیا۔ (جہاں فرشتے رہتے ہیں۔)

دوسرا بند:۔ فرشتے، سیارے، ستارے، چاند، کہکشاں، سب حیران ہو گئے کہ یہ کون ہے؟ لیکن معلوم نہ کر سکے۔ ہاں رضواں سمجھ گیا کہ یہ وہی ہے (اُسی کی اولاد ہے) جسے کچھ عرصہ ہوا جنت سے نکالا گیا تھا۔

تیسرا بند:۔ فرشتے اس شکوہ کے انداز بیان سے بہت حیران تھے اور اس میں جو گستاخی اور شوخی کا رنگ پایا جاتا ہے۔ اُس پر بہت ناراض تھے چنانچہ وہ کہنے لگے کہ یہ زمین کے لوگ بھی کتنے گستاخ اور سرکش ہوتے ہیں!

چوتھا بند:۔ حضرت انسان کی گستاخی تو دیکھو کہ اللہ سے بھی ناراض ہے! کیا یہ

وہی آدم ہے جس پر خدا نے اس قدر انعام فرمایا کہ ہمیں سجدہ کرنے کا حکم دیا تھا؟ اگر یہ وہی ہے تب تو واقعی بڑا ناشکرا ہے۔ یوں تو منطق اور فلسفہ دونوں میں طاق ہے لیکن بات کرنے کے سلیقہ سے محروم ہے۔

پانچواں بند:۔ فرشتے یہ گفتگو (تبصرہ) کر ہی رہے تھے کہ عرش سے آواز آئی کہ اے انسان بے شک تیرا افسانہ بہت دردانگیز ہے اور تیرا دل غموں سے چور ہے۔ تو نے اپنے حسن بیان کی بدولت، شکوہ کو شکر کے لباس میں پیش کیا ہے اور اس طرح بندوں کو خدا سے ہمکلامی کا شرف حاصل ہو گیا۔

چھٹا بند:۔ اے انسان! تو نے شکر کے رنگ میں جو شکوہ ہم سے کیا۔ اب اس کا جواب سن! ہم تو ہر وقت کرم کرنے کے لئے آمادہ ہیں، لیکن کوئی سائل بھی تو ہو۔ ہم سب کی تربیت کرنے کیلئے تیار ہیں، لیکن جو شخص تربیت یا اصلاح قبول ہی نہ کرے تو ہم کیا کریں؟ اگر کوئی شخص بادشاہت کی قابلیت رکھتا ہے تو ہم ضرور اس سے بادشاہ بنا دیتے ہیں۔

ساتواں بند:۔ لیکن اے مسلمانو! تمھاری حالت تو یہ ہے کہ تم دل میں ہمارے منکر ہو چکے ہو۔ اور ہمارے رسول (صلعم) کی تعلیمات سے بالکل برگشتہ ہو چکے ہو۔ تم میں جو لوگ بُت شکن تھے وہ تو رخصت ہو چکے اب صرف بت پرست باقی ہیں تم شریعت اسلامیہ پر قائم نہیں ہو، بلکہ تمھارا کعبہ بھی نیا (مختلف) ہے تمھارے بُت (مثلاً دولت، عہدے، خطابات، جاگیریں) بھی نئے ہیں اور تم خود بھی نئے ہو۔

آٹھواں بند:۔ ایک زمانہ وہ بھی تھا جب ہر مسلمان اللہ کا عاشق تھا۔ اور وہ لوگ اس کو پوجتے تھے۔ اسی سے محبت کرتے تھے، جسے آج تم "ہرجائی" کہہ رہے ہو۔ (دیکھو شکوہ "بات کہنے کی نہیں تو بھی تو ہرجائی ہے") اچھی بات ہے اگر ہم ہرجائی ہیں تو تم کسی "یکجائی" کو اپنا خدا بنالو اس سے عہد وفا باندھ لو اسکی۔ صورت یہ ہے کہ ہم نے تو ملت محمدیہ کو آفاق گیر بنایا تھا، یعنی جاپان سے مراکش تک سب مسلمان ایک قوم ہیں لیکن تم اب اپنے آپ کو

مقامی کرلو یعنی کسی ملک سے یا کسی نسل سے وابستہ کرلو! (مطلب یہ ہے کہ اسلام چھوڑ کر کفر اختیار کرلو، تاکہ کافروں کی طرح تم پر بھی فضل الٰہی نازل ہونے لگے۔) واضح ہو کہ یہ طنزیہ شاعری کی بہترین مثال ہے اقبال نے در پردہ ہمیں یہ تلقین کی ہے کہ جب تک ہم ساری دنیا کے مسلمان عقیدۂ وحدتِ ملی پر عمل نہیں کریں گے یعنی ایک قوم نہیں بن جائیں گے اُس وقت تک سربلندی حاصل نہیں کر سکتے۔ کیونکہ تمام کافر اقوامِ عالم، ہمارے مقابلہ میں "ملتِ واحدہ" بنی ہوئی ہیں۔

نواں بند:۔ اے مسلمانو! تمھاری حالت یہ ہے کہ تم ہماری عبادت پر خوابِ شیریں کو ترجیح دیتے ہو۔ اور رمضان کے روزوں کو ایک مصیبت سمجھتے ہو کیا یہی وفاداری کا طریقہ ہے! قوم تو مذہب سے بنتی ہے، جب تم نے مذہب کو چھوڑ دیا، تو قوم کس طرح زندہ رہ سکتی ہے! مثلاً یوں سمجھو کہ اگر ستاروں میں جذب باہمی باقی نہ رہے تو کیا کوئی ستارہ اپنی جگہ پر قائم رہ سکتا ہے؟

دسواں بند:۔ تم لوگ نہ کوئی فن جانتے ہو، نہ ہنر، نہ کوئی شے ایجاد کرتے ہو، نہ کوئی علمی تحقیق کرتے ہو۔ تمھیں اپنے اسلاف کی عزت کی کوئی پرواہ نہیں۔ بلکہ ان کی قبروں کو بیچ کر کھا رہے ہو جب تم قبر فروشی کر سکتے ہو تو بت فروشی میں تمہیں کیا تامل ہو سکتا ہے۔!

گیارھواں بند:۔ بے شک مسلمانوں نے دنیا سے کفر کو مٹا دیا اور انسانوں کو آزادی عطا کی۔ خانہ کعبہ کی حفاظت کی۔ اور قرآن مجید کی اشاعت کی لیکن یہ کام تو تمھارے بزرگوں نے کیا تھا۔ سوال یہ ہے کہ تم نے اسلام کی کیا خدمت کی؟

بارھواں بند:۔ تم یہ شکایت کرتے ہو کہ مسلمان کے لئے صرف وعدہ حور ہے، حالانکہ یہ شکایت بالکل ناروا ہے۔ خدا تو ہمیشہ سے عادل رہا ہے۔ کافروں کو دنیا کی نعمتیں اس لئے ملیں کہ انھوں نے اسلام کے اصول اختیار کر لئے۔ حق تو یہ ہے کہ تم میں کوئی مسلمان، حوروں کا آرزومند ہی نہیں۔ ہم تو آج بھی رحمت نازل کرنے کے لئے آمادہ ہیں، لیکن کوئی ہمارے فضل وکرم

کا مستحق ہی نہیں۔

تیرھواں بند:۔ مسلمانوں کا دین ایک ہے۔ اللہ ایک ہے، رسولؐ ایک ہے، خانہ کعبہ ایک ہے۔ قرآن بھی ایک ہے، اندریں حالات اگر سارے مسلمان بھی ایک ہو جاتے تو کتنا اچھا ہوتا؛ اس کے برعکس تمہارا حال یہ ہے کہ تم مختلف فرقوں اور ذاتوں اور قبیلوں میں منقسم ہو! کیا دنیا میں ترقی کرنے کی یہی صورت ؟

چودھواں بند:۔ تم شریعت اسلامیہ کے منکر ہو، تمہارا دین، صرف مصلحت وقت ہے کہ جس بات میں نفع نظر آئے اُسے اختیار کر لینا چاہیئے تم کافروں کے رسوم اور طرز معاشرت کو پسند کرتے ہو، اور اپنے بزرگوں کے طریقوں سے بیزار ہو۔ نہ تمہارے دل میں اسلام کی محبت ہے، اور نہ ہمارے رسولؐ کے ارشادات کی کوئی قیمت ہے۔

پندرھواں بند:۔ حالت یہ ہے کہ آج مساجد میں اگر نماز پڑھنے آتے ہیں تو غریب روزہ رکھتے ہیں تو غریب، ہمارا نام لیتے ہیں تو غریب، گویا تمہارا پردہ رکھتے ہیں تو غریب دولتمند تو اپنی دولت کے نشہ میں ہم سے بالکل غافل ہیں آج اگر اسلام زندہ ہے تو محض ان ہی غریب مسلمانوں کے دم سے۔

سولھواں بند:۔ نہ مسلمان واعظین کے وعظ میں کوئی اثر باقی ہے اور نہ اُن کے دل میں اسلام کی کوئی محبت ہے۔ اذان تو اب بھی ہوتی ہے لیکن اُس میں نہ خلوص ہے نہ اسلام کی محبت کا رنگ ہے۔ مسلمان، منطق فلسفہ تو پڑھتے ہیں لیکن ہمارے رسولؐ سے محبت نہیں کرتے یہی وجہ ہے کہ آج مسجدیں ویران پڑی ہوئی ہیں۔

سترھواں بند:۔ ایک شور مچا ہوا ہے کہ مسلمان مٹے جا رہے ہیں، لیکن سچی بات یہ ہے کہ مسلمان ہیں کہاں، جو اُن کے مٹنے کا ذکر کیا جا رہا ہے؟ جو اپنے آپ کو مسلمان کہتے ہیں ان کی حالت یہ ہے کہ وہ اپنی وضع قطع کے لحاظ سے تو عیسائی معلوم ہوتے ہیں اور تمدن کے اعتبار سے ہندو نظر آتے ہیں۔ اور معاملات کے اعتبار سے یہود سے بدتر ہیں

خاندانی لحاظ سے تم میں کوئی سید ہے، کوئی مرزا ہے۔ کوئی افغان ہے لیکن سوال یہ ہے کہ کوئی مسلمان بھی ہے؟

اٹھارھواں بند:۔ اگلے زمانہ کے مسلمانوں کی کیفیت تو یہ تھی کہ وہ سچ بولنے سے بالکل نہیں ڈرتے تھے وہ ہر شخص سے انصاف کرتے تھے۔ مسلمان اللہ کے عشق میں سرشار تھے اس لئے اسلام کی خاطر ہر قسم کی قربانی کرتے تھے اور دوسروں کی جان بچانے کے لئے اپنی زندگی بخوشی نثار کر دیتے تھے۔

انیسواں بند:۔ ہر مسلمان، ہر وقت کفر کا مقابلہ کرنے کے لئے تیار رہتا تھا۔ اور ہر گرم عمل تھا۔ اُسے ہمارے اوپر اور اس کے بعد اپنی قوت بازو پر بھروسہ تھا۔ تم موت سے ڈرتے ہو۔ لیکن وہ ہم سے ڈرتا تھا۔ اگر تمہارے اندر، تمہارے بزرگوں کی صفات نہیں ہیں، تو تم کو وہ مرتبہ کیسے حاصل ہو سکتا ہے جو ان کو نصیب تھا؟

بیسواں بند:۔ تم میں سے ہر مسلمان، آرام طلب ہے۔ نہ کسی میں حضرت علیؓ کی سی شانِ فقر پائی جاتی ہے، نہ حضرت عثمانؓ کی سی دولت نظر آتی ہے اگر تمہارے بزرگوں کو عزت حاصل ہوئی تو اس لئے کہ وہ مسلمان تھے۔ اور اگر تم دنیا میں ذلیل ہو تو اس لئے کہ تم مسلمان نہیں ہو۔

اکیسواں بند:۔ تم آپس میں ایک دوسرے کے دشمن ہو، لیکن تمہارے بزرگ آپس میں ایک دوسرے پر مہربان تھے۔ تم دوسروں کے عیب تلاش کرتے رہتے ہو وہ دوسروں کے عیبوں پر پردہ ڈالتے تھے۔ تم ان کی طرح سر بلندی کے خواہشمند تو ضرور ہو، لیکن کیا تمہارے دلوں میں اسلام کی ویسی ہی الفت ہے جیسی اُن میں تھی؟

بائیسواں بند:۔ تم اپنے ہاتھوں اپنے کو تباہ کر رہے ہو، لیکن تمہارے اسلاف غیرت مند اور خوددار تھے تم ایک دوسرے کے دشمن ہو، وہ ایک دوسرے پر جان فدا کرتے تھے۔ تم صرف باتیں بنانی جانتے ہو، لیکن وہ عمل کرتے تھے۔ تم آج دولت کے لئے

ترس رہے ہو لیکن دولت اُن کے پاؤں چومتی تھی۔ آج بھی تاریخ اُن کے کارناموں پر فخر کرتی ہے۔

تیئیسواں بند:۔ تمھاری حالت یہ ہے کہ ہم نے تمہیں سروری دی۔ لیکن تم نے اسلام کو چھوڑ کر کفر اختیار کر لیا۔ رسولؐ کو چھوڑ کر بتوں سے محبت کرنی شروع کر دی۔ دنیاوی ترقی کی دُھن میں اپنی ملی روایات سے بیگانہ ہو گئے بے عمل تو تھے ہی، دین سے بھی کنارہ کر لیا۔ آج تمھاری قوم کی یہ حالت ہے کہ شریعت کی قیود سے بالکل آزاد ہو چکی ہے اور مسجدوں کے بجائے ہوٹل اور کلب آباد کر رہی ہے۔

چوبیسواں بند:۔ مسلمان نوجوانوں کی حالت یہ ہے کہ اُن کے سینے عشق رسولؐ سے خالی ہو چکے ہیں اور مسلمان لڑکیاں پردہ سے بے نیاز ہوتی جاتی ہیں۔ نوجوان یہ کہتے ہیں کہ جب عاشق آزاد ہے تو معشوق کیوں پردہ میں رہے؟

پچیسواں بند:۔ یہ موجودہ زمانہ جس میں مادیت برسر عروج ہے، تمام قوموں کے لیے یکساں تباہی کا موجب ہے، یہ وہ آگ ہے جس میں ملت اسلامیہ سرعت کے ساتھ فنا ہوتی جا رہی ہے۔ لیکن اگر آج بھی مسلمانوں میں ایمان کا رنگ پیدا ہو جائے تو یہی آگ ان کے حق میں ''گلزار ابراہیمؑ'' بن سکتی ہے۔

چھبیسواں بند:۔ یہاں سے اس نظم کا انداز بدل جاتا ہے اور اقبالؔ قوم کو امید کا مژدہ سناتے ہیں۔ کہتے ہیں کہ ملت اسلامیہ کی زبون حالی سے مسلمانوں کو مایوس نہیں ہونا چاہیئے۔ مصائب کے بادل عنقریب چھٹنے والے ہیں۔ ملت اسلامیہ کی بہتری کے دن قریب آ چکے ہیں۔ خون شہدا کی سرخی ہر طرف پھول برسا رہی ہے یعنی مسلمانوں میں زندگی کے آثار پیدا ہو رہے ہیں۔

ستائیسواں بند:۔ اگرچہ موجودہ مسلمان واقعی آج کل بہت پریشان ہیں لیکن مایوس ہونے کی کوئی ضرورت نہیں ہے۔ جس طرح پہلے زمانہ میں مختلف قوموں نے اسلام لانے

کے بعد دین کی خدمت کی ہے، آئندہ بھی ایسا ہی ہوگا۔

اٹھائیسواں بند:۔ اے مسلمان! اس نکتہ کو ذہن نشین کر لے کہ مسلمان قوم کسی خاص وطن یا نسل سے وابستہ نہیں۔ اور نہ کسی خاص ملک میں محدود ہے کہ اگر وہ ملک تباہ ہو جائے تو قوم تباہ ہو جائے گی۔ یہ ساری دنیا مسلمان کا وطن ہے۔ اس لئے اسلام کبھی دنیا سے مٹ نہیں سکتا۔

اے مسلمان! تو دنیا کے لئے شمع کی مانند ہے۔ شمع کے شعلوں میں تیری ہی حرارت کارفرما ہے (ریشہ چراغ سے وہ فتیلہ یا بتی مراد ہے جو شمع کے اندر ہوتی ہے) تو اس شمع کی بتی ہے اگر تو نہ ہو تو شمع جل نہیں سکتی یعنی اگر مسلمان قوم دنیا سے مٹ جائے تو یہ دنیا مٹ جائے گی۔ تیرا اندیشہ عاقبت سوز یعنی نتائج سے بے پروا ہے اس لئے تو دنیا میں ضرور کامیاب ہوگا۔

انتیسواں بند:۔ جب صورت حال یہ ہے کہ تیرا وجود اس دنیا کی بقاء کے لئے ضروری ہے تو اطمینان رکھ: ایران کے مٹ جانے سے تو نہیں مٹ سکتا۔ نشہ، شراب میں ہوتا ہے نہ کہ پیمانہ میں۔ اسی طرح مسلمان تو ساری دنیا کے قیام کا باعث ہے۔ اسلام کا وجود ایران (پیمانہ) پر منحصر نہیں ہے۔ اگر تجھے تاریخی شہادت درکار ہو تو سلطنت عباسیہ کی تاریخ کا مطالعہ کر۔ کیا بغداد کے تباہ ہو جانے سے اسلام ختم ہو گیا؟ ہر گز نہیں۔ جن ترکوں نے سلطنت عباسیہ کا چراغ گل کیا تھا، وہی ترک مسلمان ہو کر، اسلام کے محافظ بن گئے۔ تو اسلام کی کشتی کا پاسبان ہے، اس لئے موجودہ زمانہ کی اقوام بھی تجھ ہی سے روشنی حاصل کریں گی۔

تیسواں بند:۔ اگر آج (۱۹۱۲-۱۳ء) ریاست ہائے بلقان نے ترکی پر چاروں طرف سے حملہ کر دیا ہے تو اس کا مطلب یہ نہیں ہے کہ ترک ختم ہو جائیں گے یا مسلمان دنیا سے مٹ جائیں گے۔ بلکہ یہ اس لئے ہے کہ مشیت ایزدی اس وقت تیرے ایثار اور حوصلہ کا امتحان لینا چاہتی ہے۔ تو دشمنوں کی کثرت سے کیوں خوفزدہ ہے؟ یقین رکھ کہ وہ اسلام کو فنا نہیں کر سکتے۔

اکتیسواں بند:۔ اے مسلمان! دنیا کی وہ قومیں جو تجھے مٹانا چاہتی ہیں اس حقیقت سے ناآشنا ہیں کہ ابھی دنیا کو تیری ضرورت باقی ہے۔ یہ دنیا محض تیرے وجود سے قائم ہے۔ دنیا میں اسلام کی حکومت تو مقدر ہو چکی ہے۔ اس تقدیر کو کوئی طاقت نہیں بدل سکتی پس تو اُٹھ اور دنیا کو توحید کا پیغام سُنا!

بتیسواں بند:۔ اے مسلمانو! گھروں سے نکلو، اور اسلام کا پیغام لے کر دنیا میں پھیل جاؤ۔ اسلام میں وہ خوبی ہے کہ تمھاری کمزوری، طاقت میں اور تمھاری قلت کثرت میں تبدیل ہو سکتی ہے۔ تم سرکار دو عالم صلعم کے عشق میں فنا ہو جاؤ اور یقین رکھو کہ اس عشق کی بدولت تمھارے اندر یہ طاقت پیدا ہو جائے گی، کہ تم ساری دنیا میں سرکارؐ کا نام بلند کر دو گے۔

تینتیسواں بند:۔ اے مسلمانو! یاد رکھو کہ اگر حضورؐ کی ذات اقدس نہ ہو تو دنیا تیرہ و تار ہو جائے۔ دنیا کی ساری رونق آپؐ ہی کے دم سے ہے۔ اگر آپؐ نہ ہوں تو پھر دنیا میں کوئی توحید کا نام لینے والا رہے نہ توحید رہے، اور نہ تم باقی رہو۔ بلا شبہ یہ کائنات حضورؐ ہی کے نام کی برکت سے قائم ہے۔ اور ہستی کی نبض میں آپؐ ہی کی بدولت حرکت اور زندگی نظر آتی ہے۔

چونتیسواں بند:۔ حضور انور صلعم کا نام نامی، جنگلوں، پہاڑوں میدانوں شہروں اور گاؤں میں، غرض کہ ہر جگہ لوگوں کی زبان پر ہے۔ اور سب سے بڑھ کر یہ کہ ہر مسلمان کے دل میں پوشیدہ ہے۔ انشاء اللہ آپؐ کا نام قیامت تک اسی طرح سربلند رہے گا، کیوں کہ خود اللہ نے وعدہ فرمایا ہے کہ "اے رسولؐ! ہم نے آپ کا نام ساری دنیا میں بلند کر دیا ہے۔"

پینتیسواں بند:۔ مثلاً دیکھو کہ برّ اعظم افریقہ، جہاں سیاہ فام لوگ بستے ہیں، جسے وہاں کے باشندوں کی سیاہ رنگت کی بنا پر چشم زمین کی پتلی سے تعبیر کر سکتے ہیں

جس براعظم میں نجاشی والی ملک حبشہ نے ابتدائی دور کے مسلمانوں کو اپنے یہاں پناہ دی تھی، جہاں شدید گرمی پڑتی ہے۔ جہاں مصر سے لے کر مراکش تک مسلمان ہی مسلمان آباد ہیں۔ جسے محبان اسلام، حضرت بلال ؓ کی دنیا بھی کہتے ہیں (کیوں کہ وہ حبشی الاصل تھے) یہ سرزمین تبلیغ اسلام کی بدولت روز بروز، نور اسلام سے منور ہوتی جاتی ہے۔ اور اس تاریک براعظم کے دور دراز گوشوں میں سرکار دوعالم صلعم کا نام مساجد کے میناروں سے بلند ہو رہا ہے۔

آخری بند:۔ آخری بند میں اللہ مسلمانوں سے یوں خطاب فرماتے ہیں کہ اے مسلمان! ہم نے تجھے دونوں خوبیاں عطا کر دی ہیں۔ تیرے پاس عشق کی طاقت بھی ہے اور عقل کی دولت بھی ہے۔ تو عشق کو اپنی تلوار بنالے۔ یعنی ہمارے محبوب ؐ کا نام دنیا میں بلند کر اور اس راہ میں جو مشکلات آئیں، ان کو اپنی عقل کی مدد سے دور کر یعنی عقل سے ڈھال کا کام لے۔ اگر تو سچے معنی میں مسلمان ہو جائے (ہمارا مطیع ہو جائے) تو پھر تیری تدبیر، ہماری مشیت (تقدیر) سے ہم آہنگ ہو جائے گی یعنی ہم تیری ہر آرزو پوری کر دیں گے۔ اور اگر تو ہمارے محبوب ؐ سے وفا کرے گا، یعنی آپ ؐ کی اطاعت کرے گا، تو اس دنیا کی حقیقت ہی کیا ہے، ہم تجھے ساری کائنات کا مالک بنا دیں گے۔

ساقی

مطلب:۔ اس نظم میں "ساقی" سے مسلمانوں کے لیڈر، رہنما، یا مصلحین مراد ہیں۔ اقبال نے رمزیہ انداز میں ان سب کو یہ مشورہ دیا ہے کہ جہاں تک قوم کو ذلیل کرنے کا تعلق ہے یہ کام تو ہر شخص کر سکتا ہے (اور ہوتا رہتا ہے)، ہر خود غرض لیڈر قوم کو نشہ پلا کر گرا سکتا ہے آپ حضرات کا کمال تو یہ ہے کہ آپ گمراہ لوگوں کو راہ راست پر لائیں، اور انکو ترقی کی راہیں سمجھائیں۔ اور اللہ اور اس کے رسول ؐ کی طرف بلائیں۔ اے رہنمائے قوم! اس حقیقت

پر غور کر کہ سچے مسلمان تو دنیا سے اُٹھتے جاتے ہیں لیکن کوئی شخص ان کی جگہ پُر کرنے کیلئے آگے نہیں بڑھتا یعنی تیری محفل سونی ہوتی جاتی ہے۔ اور یہی عالم رہا تو ایک دن میخانہ خالی ہو جائے گا۔ پس تو کہیں سے آبِ حیات مہیّا کر تا کہ تیری محفل قائم رہے اور میخانہ کی رونق برقرار رہے۔ یعنی اے لیڈر! تو مسلمان کو "ووٹوں" اور "نوٹوں" کے چکر سے نکال کر قرآن اور حدیث کی طرف متوجہ کر۔ ورنہ تیرا اور تیری قوم دونوں کا خدا ہی حافظ ہے۔

اے لیڈر! تیری ساری عمر تو ووٹ، الیکشن، اسمبلی اور جوڑ توڑ میں بسر ہوئی ہے۔ اب تو زندگی کی آخری منزل ہے، اس لئے اللہ اور اس کے رسولؐ کی اطاعت پر کمربستہ ہو جا! کچھ آخرت کی فکر بھی کر لے۔

نوٹ:۔ اقبالؔ نے جو کچھ کہا ہے، بالکل درست ہے، لیکن مومنؔ نے مدتوں پہلے حقیقتِ حال واضح کر دی ہے ؎

عمر تو ساری کٹی عشقِ بتاں میں مومنؔ
آخری وقت میں کیا خاک مسلماں ہونگے

تعلیم اور اس کے نتائج

حلّ لغات:۔ لبِ خنداں سے تبسم مراد ہے، فراغت، راحت، آسائش۔ الحاد سے خدا کا انکار مراد ہے جو موجودہ مغربی تعلیم کا منطقی نتیجہ ہے۔ پرویز۔ ایرانؔ کا مشہور بادشاہ جس کی ملکہ شیریںؔ پر فرہادؔ عاشق ہو گیا تھا۔ چونکہ یہ شخص پیشہ کے لحاظ سے کوہ کن یا سنگ تراش تھا، اس لئے اقبال نے تیشۂ فرہاد کی ترکیب استعمال کی ہے۔

تبصرہ:۔ اقبالؔ نے اس نظم میں ملا عرشی کے مشہور شعر پر تضمین کی ہے، یعنی اُس کو اپنے مقصد کی وضاحت کے لئے استعمال کیا ہے۔

ملا عرشی کا اصلی نام طہماسپ قلی بیگ تھا۔ وہ ایران کے مشہور شہر تبریز کا

باشندہ تھا اور اس کی طبیعت دشوار گوئی کی طرف مائل تھی۔ اس کا دیوان خاصا ضخیم ہے جس میں دس ہزار اشعار سے زائد ہیں۔ چونکہ اس کا لڑکا بہت بدصورت تھا، اس لئے ایک مجلس میں ایک ظریف نے یہ نکتہ پیدا کیا کہ ملا عرشی نے یہ شعر غالباً اپنے لڑکے ہی کو دیکھ کر کہا ہے کہ

تخم دیگر بکف آریم وبکاریم زنو الخ

اُس ظریف نے تو ظرافت کی راہ سے یہ بات کہی دراصل اس شعر کا مطلب یہ ہے کہ اب تک جو کچھ اعمال ہم سے سرزد ہوئے وہ مذموم تھے، جن سے کوئی فائدہ حاصل نہیں ہو سکتا اس لئے اگر ہم اپنی عاقبت کو سنوارنا چاہتے ہیں تو ہمیں اپنی زندگی میں ایک انقلاب پیدا کرنا پڑیگا اور از سر نو پاکیزہ زندگی بسر کرنی پڑے گی۔

اقبالؔ نے اسی حقیقی مطلب کو مد نظر رکھ کر اس پر تضمین کی ہے۔

مطلب:۔ کہتے ہیں کہ قوم کے نوجوانوں کی علمی ترقی سے میں بھی خوش ہوں لیکن میری مسرت میں رنج کا عنصر بھی شامل ہے۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ تعلیم حاصل کر کے نوجوانوں کو سرکاری ملازمت تو بیشک مل جاتی ہے لیکن اس مغربی تعلیم کی وجہ سے ان کے اندر الحاد کا رنگ بھی تو پیدا ہو جاتا ہے۔ مسلمان کے گھر میں دولت آ رہی ہے لیکن کفر کی لعنت بھی اس کے ساتھ ساتھ داخل ہو رہی ہے تو ایسی دولت کس کام کی؟ لہٰذا مناسب یہ ہے کہ ہم اس طرز تعلیم کو خیر باد کہہ کر اپنی قوم کے نوجوانوں کو از سر نو اسلامی تعلیم دیں (بکاریم زنو) کیونکہ اب تک جو تعلیم ہم نے اُن کو دی ہے (جو کچھ بویا ہے) وہ تو اس قدر مضرت رساں ثابت ہوئی ہے کہ قوم کو نفع کے بجائے نقصان ہو رہا ہے۔

نوٹ:۔ واضح ہو کہ مغربی تعلیم کے مضر ہونے پر اقبالؔ نے یہ فیصلہ ۱۹۱۲ء میں صادر کیا تھا اور قوم اُس وقت سے لے کر تا ایندم اسی سم قاتل کو نوش جان ناتواں فرما رہی ہے تو ناظرین خود اندازہ کر لیں کہ مریض اب کس منزل میں ہو گا!۱۲

قربِ سلطان

حلّ لغات:۔ محال کیا؛ یعنی ناممکن ہے۔ ہمدوش ہمسر یا مد مقابل۔ خواجہ پرستی آقا کی غلامی کرنا؛ اس کی ہاں میں ہاں ملانا۔ پرانا طرزِ عمل سے خواجہ پرستی مراد ہے۔ نئے اصول سے حکومت پرستی مراد ہے۔ مرشدِ شیراز یعنی خواجہ حافظ جن کا دیوان شیخ سعدی کی گلستان کے بعد فارسی ادب میں سب سے زیادہ مشہور کتاب ہے۔ سر نہاں خانہ ضمیر سروش۔ وہ راز جو فرشتہ کے دل کے پردوں میں پوشیدہ ہے یعنی بہت قیمتی نکتہ۔

مطلب:۔ کہتے ہیں کہ اس دنیا میں حاکم اور محکوم میں جو امتیاز ہے، وہ کبھی نہیں مٹ سکتا۔ یہ ناممکن ہے کہ کوئی فقیر کسی بادشاہ کا ہمسر ہوجائے۔

(۲) غلامی کا کمال یہ ہے کہ انسان کسی بادشاہ یا آقا کی خوشنودیٔ مزاج حاصل کرلے۔ اگر وہ اس میں کامیاب ہوجائے گا تو پھر بڑے عیش کے ساتھ زندگی بسر کرسکتا ہے" بادشاہ کی غلامی کر ریشمی لباس پہن"۔

(۳) لیکن اگر آج کل کوئی شخص حکومت کی خوشنودی حاصل کرے تو لوگ اُسے جاہ پرست، عہدہ کا طالب یا قوم فروش کا لقب دیتے ہیں۔

(۴) پرانے طرزِ عمل یعنی خواجہ پرستی میں تو دشواریاں بہت ہیں۔ اور نئے طرزِ عمل کو اختیار کرنے پر طبیعت مائل نہیں ہوتی۔

(۵) لہٰذا اس وقت مناسب یہی ہے کہ انسان دنیا میں اس طرح زندگی بسر کرے کہ اگرچہ اس کے دل میں ہزاروں باتیں اظہار کے لائق ہوں، لیکن وہ چپ رہے، یعنی گلستان کے تیسرے باب پر عمل کرے

(۶) سچ کہا ہے سعدی نے کہ خاموشی میں عافیت ہے اور حافظ بھی یہی فرماتے ہیں کہ اسے حافظ! تو ایک گوشہ میں بیٹھنے والا فقیر ہے اس لئے تجھے خاموشی لازم ہے اگر

انسان اس اصول پر کاربند ہو جائے تو زندگی بڑے سکون سے لبسر ہو سکتی ہے۔

(۷) لیکن اگر کوئی شخص ہنگامہ پسند ہو، اور یہ چاہے کہ پبلک میں ہر جگہ اس کا چرچا ہو اور "زندہ باد" کے نعرے ہوں تو بسم اللہ! شراب خالص حاصل کرے اور ارباب نشاط کی صحبت میں بیٹھ کر موسیقی کے ساتھ اپنے جام کو گردش میں لائے۔

(۸) یعنی بادشاہوں یا امیروں یا وزیروں کی محفل میں شریک ہو، اور ہوس کے پتھر سے اپنی عقل کے شیشہ کو چکنا چور کر دے یعنی عقل کو خیر باد کہہ دے۔

(۹) لیکن حافظؔ کا یہ قول ضرور مد نظر رکھے۔ کیوں کہ اس نے اس میں بڑا بلند پایہ نکتہ بیان کیا ہے۔

(۱۰) بادشاہ کی مبارک رائے، تجلی کے ظہور کی جگہ ہے یعنی بادشاہ پر خدا کا سایہ ہوتا ہے اگر تو اس کا قرب چاہتا ہے تو اپنی نیت اور اپنے ارادوں کو پاک صاف رکھ تاکہ تو اسے نیک صلاح دے سکے۔ اگر تیری نیت میں کھوٹ ہے تو اس کا تو کچھ نہیں بگڑے گا لیکن تو ضرور برباد ہو جائے گا۔

شاعر

حل لغات:- جوئے سرود آفریں۔ وہ ندی جس کی روانی سے نغمہ پیدا ہو۔ اقبالؔ نے پہاڑی ندیوں کی آواز کو عموماً نغمہ سے تعبیر کیا ہے۔ لالہ گوں، بمعنی سرخ میکدہ بہار سے یعنی مارچ اور اپریل میں جب پہاڑوں پر بارش ہوتی ہے، تو مئی میں پہاڑی ندیاں شور کرتی ہوئی وادیوں کو شاداب کر دیتی ہیں۔ مستِ مئے خرام۔ پہاڑی ندی سے کنایہ ہے۔ دختر خوشخرام ابر۔ یہ بھی ندی سے کنایہ ہے۔ اقبالؔ نے ندی کو بادلوں کی بیٹی قرار دیا ہے اور عورت قرار دے کر اس کے لیے دلکش چال بھی ثابت کر دی ہے۔ کرتی ہے عشق بازیاں اس مصرع میں تغزل کا رنگ پایا جاتا ہے۔ عشق بازی سے محبت آمیز طرز عمل مراد ہے۔ ظاہر ہے کہ جب

ندی میدان میں آتی ہے تو اس کے فیض (عشق بازی) سے سبزہ لہلہانے لگتا ہے۔ کوہ کے خمکدے سے وہ بارش مراد ہے جو موسم بہار میں پہاڑوں پہ ہوتی ہے کھیتوں کو پلاتی ہے یعنی پہاڑی ندیاں کھیتوں کو سیراب کرتی ہے۔ یہ تمام مناظر ہر اس شخص کے مشاہدہ میں آئے ہوں گے جس نے پہاڑوں کی سیر کی ہے۔ مزرع بمعنی کھیتی۔ شانِ خلیلؑ یعنی بت شکنی کا رنگ۔ آذری یعنی بت پرستی، زندگی دوام۔ ہمیشہ کی زندگی۔ "خون جگر" یہ اقبالؔ کی خاص اصطلاح ہے جیسے لالۂ صحرائی یا شاہین۔ اس سے اقبالؔ کی مراد ہے شاعر کا خلوص یا اس کے قلب کا سوز و گداز یا صداقت آمیز طریقِ زندگی۔ اقبالؔ کہتے ہیں کہ شاعری، شاعری کیلئے مت کرو بلکہ قوم کی اصلاح کے لئے کرو۔ اور شعر اس وقت کہو جب طبیعت شعر گوئی کی طرف مائل ہو۔ اور جب شعر کہو تو صداقت کو مدِ نظر رکھو۔ جھوٹ اور خوشامد اور نفسانی خواہشات کو پاس نہ آنے دو۔ نیز اُس وقت شعر کہو جب دل و دماغ اس واقعہ سے پوری طرح متاثر ہو چکے ہوں جس کو نظم کرنا چاہتے ہو۔ سخنوری بمعنی شاعری۔

مطلب:۔ اس نظم میں اقبالؔ نے شاعری کا صحیح مقام واضح کیا ہے۔ کہتے ہیں کہ کوہسار سے جو ندی نغمہ سرائی کرتی ہوئی وادیوں میں آتی ہے، وہ زبانِ حال سے انسان کو یہ پیغام دیتی ہے کہ دنیا میں زندہ رہنے کا حق اسی شخص کو حاصل ہے جو ہر وقت مصروفِ عمل رہتا ہے۔ چنانچہ ندی بھی ہر وقت اپنا فرض منصبی ادا کرتی رہتی ہے۔

اسی طرح، شاعر کے کلام سے زندگی ترقی کرتی ہے جب قوم غلط راستہ اختیار کر لیتی ہے تو شاعر، اس کی اصلاح کرتا ہے اور اپنے کلام سے مردہ دلوں کو زندگی بخشتا ہے یعنی انھیں جد و جہد پر آمادہ کرتا ہے

لیکن یہ کام صرف وہ شاعر انجام دے سکتا ہے جس کی شاعری میں اس کے دل کا سوز و گداز (خون جگر) بھی شامل ہو، جس کی شاعری خلوص اور صداقت پر مبنی ہو۔ اگر دنیا میں بھی یعنی قوموں کو ابھارنے والی شاعری کا وجود باقی نہ رہے تو دنیا کی ساری رونق اور دلچسپی

ختم ہو جائے۔

نویدِ صبح

حل لغات:۔ ہنگامہ۔ درد امن یعنی جب صبح ہوتی ہے تو دنیا میں ہر طرف زندگی (ہنگامہ) کے آثار نمایاں ہو جاتے ہیں۔ احرام باندھنا۔ احرام، فقہ کی اصطلاح میں اُن دو بغیر سلے ہوئے کپڑوں یا چادروں کو کہتے ہیں جن میں سے ایک کو حاجی لوگ کمر سے باندھتے ہیں اور دوسرے کو اوڑھ لیتے ہیں۔ گرمِ تقاضا، یعنی مصروفِ عمل۔ داغِ سحاب۔ بادلوں کے داغ۔ مراد ہے۔ کفر کے آثار۔ کرن کے خنجر سے اسلام کی خوبیاں مراد ہیں۔ سرگرمِ ستیز۔ کفر سے جنگ میں مشغول ہو جا۔ آدابِ گریز۔ بھاگنے کا طریقہ عریانی سے یہ مراد ہے کہ تو اپنے ذاتی جوہر کو دنیا پہ واضح کر دے یعنی۔ شاعت اسلام کر خود افشانی سے یہ مراد ہے کہ تو اپنی تمام طاقتوں کو اسلام کی اشاعت کے لئے وقف کر دے یا اپنے آپ کو اسلام کی راہ میں فنا کر دے + خفاش یعنی چمگادڑ۔ مراد ہے کفر +

مطلب: اس نظم میں اقبالؔ نے مسلمانوں کو یہ پیغام دیا ہے کہ اُٹھو! اور دنیا کو اسلام کے نور سے منور کر دو۔

پہلا بند:۔ اے مسلمانو! فطرت کے طرزِ عمل پر غور کرو۔ دیکھو جب صبح ہوتی ہے تو دنیا سے سکوت اور خاموشی رخصت ہو جاتی ہے اور ہر جگہ حرکت اور زندگی کے آثار ظاہر ہو جاتے ہیں باغوں میں پرندے نغمہ سرائی کرنے لگتے ہیں اور غنچے شگفتہ ہو کر پھول بن جاتے ہیں۔ اے مسلمانو! اسلام کا آفتاب طلوع ہو چکا ہے اس لئے تم بھی زندگی کا ثبوت دو اور ساری دنیا میں اسلام کی تبلیغ کرو۔

دوسرا بند:۔ اسلام چونکہ بجائے خود آفتاب ہے اس لئے تم آفتاب کی طرح ساری دنیا میں پھیل جاؤ! اسلام کے نور سے ساری دنیا کو منور کر دو۔ تاکہ دنیا سے کفر اور شرک کے

داغ دھبے بالکل مٹ جائیں۔

قرآن مجید سے دلائل کے ہتھیار حاصل کر اور دلائل کی تلوار سے باطل کو ہر میدان میں شکست دے کر بھگا دو۔ اے مسلمان! تو چونکہ قرآن حکیم کا حامل ہے اس لئے تو خود بھی سراپا نور ہے اور قاعدہ یہ ہے کہ چراغ کو صندوق میں بند نہیں کرتے بلکہ بلند مقام پر رکھتے ہیں تاکہ لوگ اس کی روشنی سے فائدہ اٹھائیں۔ اسی طرح تو بھی دنیا والوں پر قرآن کے نور کو واضح کر گوشہ نشینی تجھے زیب نہیں دیتی اللہ نے تجھے حجروں میں زندگی بسر کرنے کے لیے پیدا نہیں کیا ہے۔ میدان عمل میں آ، اور اپنے آپ کو تبلیغ اسلام میں فنا کر دے۔ جو لوگ اسلام کی خوبیوں سے آگاہ نہیں ہیں ان کو اس کی خوبیوں سے واقف کر۔ ان کی آنکھوں کو سرمۂ قرآنی سے روشن کر۔ اے مسلمان! تو، اس کائنات کا راز ہے یعنی اللہ نے یہ کائنات محض اس لئے پیدا کی ہے کہ تو اس میں اسلام کی اشاعت کرے اور اللہ کے نام کو بلند کرے پس تو دنیا والوں پر ظاہر ہو جا۔ یعنی اپنی ساری قوتوں کو تبلیغ اسلام کے لئے وقف کر دے۔ اور جو لوگ اسلام کی خوبیوں سے واقف نہیں ہیں، ان کو اس کے محاسن سے آگاہ کر دے۔

دعا

حل لغات:۔ وادئ فاران سے یہاں حقائق و معارف اسلام مراد ہیں۔ ذوقِ تقاضا سے تجلیاتِ انوارِ الٰہیہ سے فیض یاب ہونے کی آرزو مراد ہے۔ آہو سے مسلمان مراد ہے۔ وسعتِ صحرا سے بلند حوصلگی مراد ہے۔ دلِ ویراں سے وہ دل مراد ہے جو عشق رسول سے خالی ہے۔ محمل خالی سے دل مراد ہے۔ شاہد لیلیٰ سے عشق رسول مراد ہے۔ داغ محبت سے وہی عشق رسول مراد ہے۔ چاند کو شرما دے یعنی اپنی دلکشی، حسن و جمال اور کمال میں چاند سے بڑھ کر ہو۔ ہمدوشِ ثریا کر یعنی مسلمان کے ارادوں کو بہت بلند کر دے یعنی ان کے دل میں ساری دنیا کو اسلام کے نور سے منور کرنے کی آرزو پیدا کر دے۔ خود داری ساحل سے

ساحل کی سی خودداری مراد ہے یعنی دریا، ساحل کو بعض اوقات کاٹ دیتا ہے لیکن وہ کبھی دریا سے رحم کی التجا نہیں کرتا نیز دریا سے وابستہ ہونے کی باوجود کبھی دریا سے پانی طلب نہیں کرتا۔

مطلب:۔ یہ نظم اس زمانہ کی ہے جب مسلمان ملکوں پر مصائب کی گھٹائیں چھائی ہوئی تھیں اور اقبالؔ کا دل چونکہ ذکی الحس تھا اس لئے، ہر وقت مسلمانوں کی پریشانی پر خون کے آنسو بہاتا رہتا تھا۔ جب بیتابی حد سے فزوں ہو گئی تو انھوں نے اللہ سے دعا مانگی کہ۔

(۱) اے خدا! مسلمان کے دل میں، عشقِ رسولؐ کی ایسی آگ روشن کر دے جو اس کے دل کو گرما دے اور اس کی روح کو سراپا اضطراب بنا دے۔ یعنی وہ تبلیغ و اشاعت اسلام کے لئے آمادہ ہو جائے۔

(۲) اس شعر کے دو معنی ہیں پہلے یہ کہ مسلمانوں کے دلوں میں حجاز کی محبت پیدا کر دے اور ان کے دلوں میں مکہ مکرمہ اور مدینہ منورہ کی زیارت کا شوق پیدا کر دے دوسرے معنی یہ ہیں کہ اسلام (قرآن) کے حقائق اور معارف کو مسلمان کے قلوب پر واضح کر دے۔ ان کا سینہ فہم قرآن کے لئے کھول دے۔ انھیں مطالعہ کا شوق دے اور روحانیت حاصل کرنے کا (تجھ سے رابطہ پیدا کرنے کا) ذوق دے۔

(۳) ان کے دل میں سرکار دو عالمؐ کی محبّت پیدا کر دے اور جو آگ خدمت اسلام کی میرے سینے میں روشن ہے وہی آگ ان کے سینوں میں روشن کر دے۔

(۴) گم کردہ راہ مسلمانوں کو پھر اسلام اور بانی اسلامؐ کی محبت عطا فرما۔ مسلمان بڑا پست حوصلہ ہو گیا ہے، اُسے پھر ہمّت اور حوصلہ عطا فرما۔

(۵) اس کے دل میں سرکار دو عالم صلی اللہ علیہ وسلم کی محبت پیدا کر اور حضورؐ کے عشق میں دیوانہ بنا دے۔

(۶) اور اس کے عشق کو درجہ کمال تک پہنچا دے۔ اور اس کے دل کے داغ کو چاند سے[1] بھی زیادہ دلکشی عطا کر۔

(۷) مسلمانوں کے ارادوں میں بلندی عطا فرما اور ان میں غیرت، خودداری اور حریت کے جذبات پیدا کر دے۔

(۸) ان میں سچی اور پاکیزہ اور خالص محبت پیدا کر دے۔ ان کو سچ بولنے کی توفیق دے اور ان کے قلوب کو نور ایمان سے منور کر دے۔

(۹) انھیں اتنی سمجھ عطا فرما کہ وہ آنے والی مصیبتوں کا احساس کر کے، ان کے دفعیہ کا انتظام کر سکیں۔ اور آج کے ہنگاموں میں وہ کل سے متعلق بھی کچھ سوچ سکیں، کیونکہ جو شخص آئندہ کے لیے پہلے سے تیاری نہیں کرتا وہ عین وقت پر کچھ نہیں کر سکتا مثلاً جو طالب علم سالانہ امتحان کے لیے جو ایک سال کے بعد ہوگا، ابھی سے تیاری نہیں کرتا وہ کامیاب نہیں ہو سکتا۔

(۱۰) اے خدا! میں ایک ایسی قوم کا فرد (شاعر) ہوں جو برباد ہو چکی ہے۔ اس لیے تو میرے کلام میں ایسی تاثیر پیدا کر دے کہ میرا کلام قوم کے دلوں کو گرما سکے۔

عید پر شعر کہنے کی فرمائش کے جواب میں

حل لغات: شالامار: لاہور کا وہ مشہور باغ جسے شاہجہاں کے حکم سے ۱۶۴۲ء میں تعمیر کیا گیا تھا۔ اقبال نے اس باغ کو مسلمانوں کی عظمت رفتہ کا نشان قرار دیا ہے برگ زرد سوکھا ہوا پتہ۔ موسم گل سے مسلمانوں کی شان و شوکت کا زمانہ مراد ہے زائران چمن یعنی باغ کی سیر کرنے والے۔ چونکہ باغ اقبال کی نظروں میں محترم ہے اس لئے الفیوں ... ہے

---

[1] دل کے داغ سے عشق رسول مراد ہے اور اس کی دلکشی سے عاشق رسول کی سیرت کی دلکشی مراد ہے۔ ۱۲

"زائر" کا لفظ استعمال کیا ہے یعنی زیارت کرنے والا (کسی محترم یا مقدس مقام کی) نشیمن سے حکومت مراد ہے۔ خزاں سے مسلمانوں کا دور انحطاط مراد ہے۔ یادِ فصل بہار، عہد حکومت کی یاد۔ عہد کہن کے میخانے یعنی مسلمانوں کے لئے عہد حکومت کی شان دار عمارتیں۔ بادہ پرستوں سے نامور مسلمان مراد ہیں۔

مطلب:- اس نظم کا مطلب، اس کے عنوان سے ظاہر ہے۔ اقبال کے کسی دوست نے ان سے عید پر چند اشعار لکھنے کی فرمائش کی ہوگی۔ چونکہ وہ اس زمانہ میں ترکوں کی زبوں حالی اور بے کسی سے بہت ملول تھے اس لیے اس درخواست پر ان کا دل بھر آیا اور انھوں نے قوم کی بربادی پر یہ مرثیہ سپرد قلم کر دیا کہ اے مسلمانو! مجھے اس زمانہ میں عید کی کیا خوشی ہو سکتی ہے جب کہ مسلمانوں پر چاروں طرف تنزل اور ادبار کی گھٹائیں چھا رہی ہیں۔

کہتے ہیں کہ ایک دن میں شالامار باغ میں گیا تو وہاں کے در و دیوار نے زبانِ حال سے مجھ سے کہا کہ ہم نے اپنی آنکھوں سے مسلمانوں کی شان و شوکت کا زمانہ دیکھا ہے۔ اس لئے جو لوگ یہاں آتے ہیں۔ ان کو چاہیے کہ وہ ہمیں عبرت کی نگاہ سے دیکھیں کیونکہ ہم اُن کے عہد حکومت کی یادگار ہیں۔

یہ بات سُن کر (یعنی جب یہ خیال میرے دل میں آیا تو) میں بے قرار ہو گیا۔ باغ میں آیا تو اس لئے تھا کہ تفریح کروں گا لیکن اس باغ کے در و دیوار دیکھ کر میرے دل میں مسلمانوں کی عظمت ماضیہ کا تصور پیدا ہو گیا جس کی وجہ سے میں بہت غمگین ہو گیا۔

اندریں حالات جب کہ میں اس دور انحطاط میں، مسلمانوں کے زوال پر آنسو بہا رہا ہوں مجھے عید کی کیا خوشی ہو سکتی ہے۔ بلکہ جب میں ہلال عید کو دیکھتا ہوں تو مجھے ایسا محسوس ہوتا ہے کہ وہ ہمیں پیام مسرت نہیں دیتا بلکہ زخموں پر نمک چھڑکتا ہے

فاطمہ بنت عبداللہ

حل لغات: معصوم: پاک، بے گناہ۔ حورِ صحرائی سے فاطمہ مراد ہے۔ غازیان دین سے طرابلس کے وہ عرب قبیلے مراد ہیں جو شیخ سنوسی اور انور پاشا شہید کی زیر قیادت سروں سے کفن باندھ کر اطالوی درندوں کا مقابلہ کرنے کے لئے میدان جنگ میں اپنی شجاعت کے جوہر دکھا رہے تھے۔ یہ انہی غازیوں کی سرفروشی کا نتیجہ تھا کہ اطالوی فوجیں ایک سال کی مسلسل کوشش کے باوجود ساحلی علاقوں سے آگے نہ بڑھ سکیں۔ سقائی: پانی پلانا۔ صحرا سے قوم مراد ہے۔ آہو سے سرفروش (اسلام کے عاشق) مراد ہیں۔ بجلیاں یعنی اسلام کے عاشق مراد ہیں۔ پیدا ہو رہے ہیں۔ دل سے زبوں حال مسلمانوں کی قوم مراد ہے۔ وسعت مقصد سے ارادوں کی بلندی مراد ہے۔ آفرینش بمعنی پیدائش۔ تازہ انجم سے سرفروشوں کی وہ جماعت مراد ہے جو مسلمانوں میں پیدا ہو رہی ہے۔ پرتو بمعنی عکس۔

تبصرہ: یہ جگر دوز مرثیہ اقبال نے فاطمہ بنت عبداللہ کی یاد میں لکھا تھا، جو طرابلس کی جنگ میں غازیوں کو پانی پلاتی ہوئی شہید ہوئی تھی اس شیر دل عرب لڑکی کی شہادت کا حال میں نے ۲۱ نومبر ۱۹۱۲ء کے الہلال میں پڑھا تھا جو اس زمانہ میں مسلمانان ہند کے محبوب اور ان کی امیدوں کے مرکز جناب ابوالکلام آزاد کی ادارت میں کلکتہ سے شائع ہوتا تھا دل تو چاہتا ہے کہ اس موضوع پر بہت کچھ لکھوں لیکن یہ بانگ درا کی شرح ہے نہ کہ ہندی مسلمانوں کی تاریخ۔ اس نظم سے یہ بات عیاں ہوتی ہے کہ اقبال اس زمانہ میں ملت کے غم میں اشکبار رہتے تھے یہی وجہ ہے کہ انھوں نے فاطمہ بنت عبداللہ کو زندگی دوام عطا کر دی۔ جب تک مسلمان بانگ درا پڑھتے رہیں گے اس بہادر عرب لڑکی کا نام بھی زندہ رہے گا۔ انشاءاللہ تعالی۔

اطالیہ نے ستمبر ۱۹۱۱ء میں طرابلس پر حملہ کیا تھا۔ اس وقت ترکی سلطنت کے

پاس صرف دو جنگی جہاز تھے وہ بھی مرمت طلب، رہی بری فوج تو اس کا راستہ اطالوی شماطین کے بھائیوں یعنی انگریزوں نے مصر کی ناکہ بندی کر کے روک دیا تھا۔ اس لئے شیخ سنوسی مرحوم نے جو طرابلسی عربوں کے دینی اور سیاسی قائد تھے "اسلام کی عظمت برقرار رکھنے کے لیئے" جہاد فی سبیل اللہ کا اعلان کیا اور مسلمان اس بے سروسامانی کی حالت میں سرفروشی کے لئے میدان میں آئے کہ نہ توپیں تھیں نہ گولہ بارود، نہ سپلائی تھی نہ سامان رسد، نہ کوئی طبی امداد تھی نہ کمک کی امید، زندوں کو لباس نہ تھا نہ مردوں کو کفن بے کسی کا کچھ اندازہ اس بات سے بھی ہو سکتا ہے کہ فاطمہ بنت عبداللہ میدان جنگ میں مشکیزہ کاندھے پہ اٹھائے، زخمیوں کو پانی پلانی پھر رہی تھی۔ اس لڑکی کی عمر صرف ۱۴ سال کی تھی لیکن اس نے شیروں کا سا دل پایا تھا۔ فاطمہ بے شک شہید ہوگئی لیکن ہزاروں مسلمانوں کے دلوں میں آگ لگا کر، ان کو زندہ کر گئی۔ کاش ہمارے کالجوں کی مسلمان لڑکیاں اس جاہل مگر مسلمان لڑکی کی پاکیزہ زندگی سے کچھ سبق حاصل کر سکیں۔

مطلب:۔ بلاشبہ اے فاطمہ! تو اس دور کے مسلمانوں کے لئے باعث فخر ہے میں تیری خوش نصیبی پر رشک کرتا ہوں کہ تو نے غازیوں کو پانی پلا کر سعادت دارین حاصل کر لی ہے۔ سچ ہے اگر کسی کے دل میں شہادت کی آرزو پیدا ہو جائے تو زن اس قدر بہادر ہو جاتا ہے کہ بغیر تلوار اللہ کے راستے میں جہاد کرتا ہے جس طرح فاطمہ نے کیا۔ اس لڑکی کے دل میں اسلام کی محبت موجزن تھی اس لیئے اس نے سر ہتھیلی پر رکھ کر جہاد میں حصہ لیا۔ اللہ اللہ! میری قوم میں ابھی تک ایسی بہادر لڑکیاں موجود ہیں جو خدا کے راستہ میں جان دے سکتی ہیں! میں تو سمجھتا تھا کہ اب صرف راکھ ہی باقی رہ گئی ہے لیکن نہیں میں غلطی پر تھا، اس راکھ (قوم) میں کچھ چنگاریاں (عاشقان اسلام) ابھی تک پوشیدہ ہیں۔

اے فاطمہ! یہ سچ ہے کہ میں تیری یاد میں آنسو بہا رہا ہوں لیکن میرے غم میں

مسرت کا پہلو بھی شامل ہے۔ مجھے تیری شہادت سے بہت رنج ہوا، لیکن اس بات سے خوشی بھی ہوئی کہ تو نے اس گئے گذرے زمانہ میں ملتِ اسلامیہ کی لاج رکھ لی تیری شہادت سے میں نے یہ نتیجہ اخذ کیا کہ میری قوم دوبارہ سربلندی حاصل کرے گی۔ تیری خاک سے سرفروش مسلمانوں کی ایک ایسی جماعت پیدا ہوگی جو، از سرِ نو، اسلام کا نام دنیا میں بلند کردے گی۔ میں دیکھتا ہوں کہ مسلمان، اب خوابِ غفلت سے بیدار ہو رہے ہیں۔ اور قوم میں ایسے افراد پیدا ہو رہے ہیں جن کے اندر بزرگوں کا طریقہ (اندازِ کہن) بھی ہے اور اندازِ نو بھی ہے یعنی یہ سچے مسلمان حالاتِ حاضرہ سے بھی آگاہ ہیں اور عصرِ حاضر کے تقاضوں کو بھی پہچانتے ہیں۔ نیز ان کے طرزِ عمل میں تیری سرفروشی کا رنگ بھی پایا جاتا ہے۔

شبنم اور ستارے

حل لغات:- نرگسِ بیمار۔ شعراء گلِ نرگس کو آنکھ سے تشبیہ دیتے ہیں اور "بیمار" کہنے کی وجہ یہ ہے کہ شاعروں کی معشوقہ چونکہ ہر وقت شراب کے نشہ میں مخمور رہتی ہے اور اس حالت میں آنکھ پورے طور سے نہیں کھلتی۔ اور یہی کیفیت مریض (بیمار) کی ہوتی ہے کہ ضعف کی وجہ سے اس کی آنکھ بھی نیم وا رہتی ہے اس لئے نرگس کو حسنِ تعلیل کی بنا پر بیمار کہنے لگے۔ شمشاد کو آزاد اس لئے کہتے ہیں کہ وہ سدا بہار ہے، بہار اور خزاں کی قید سے آزاد ہے۔ شاعر نے تخیل کی بدولت آزاد کو قیدی کی ضد تصور کرکے یہ نکتہ پیدا کیا ہے کہ شمشاد دراصل تو پابند (قیدی) ہے یعنی حرکت نہیں کرسکتا لیکن اسے برائے نام آزاد کہتے ہیں۔ میں گریہ کرہ دوں ہوں الخ یعنی باغ کے رہنے والے اسقدر غمزدیدہ ہیں کہ مجھے آسمان کے آنسو تصور کرتے ہیں یعنی چونکہ وہ ہر وقت روتے رہتے ہیں اس لئے ساری دنیا کو اپنی ہی طرح سوگوار سمجھتے ہیں۔ کاشانۂ عالم یعنی

دنیا کا محل۔ بنیاد ہوا پر ہے یعنی دنیا کا نظام لائقِ اعتماد نہیں ہے۔ مراد ہے دنیا کی بے ثباتی۔ فریاد کی تصویر ہے۔ یعنی اس دنیا میں ہر شخص مصیبت میں مبتلا ہے۔ قرطاس بمعنی کاغذ۔ قرطاسِ فضا سے مراد یہ ہے کہ قدرت نے یہ دنیا نہیں بنائی ہے بلکہ فضا میں آہ و فریاد کی تصویر کھینچ دی ہے۔ مطلب یہ ہے کہ یہ دنیا سراسر مصیبت کا گھر ہے۔ سچ کہا ہے کسی نے دنیا "جسے کہتے ہیں بلا خانہ ہے، پامال ہے جو عاقل و فرزانہ ہے"۔

مطلب:۔ ایک رات ستارے شبنم سے کہنے لگے کہ تو ہر روز دنیا میں جاتی ہے اور نت نئے نظارے دیکھتی ہے۔ ہم نے ایک فرشتہ کی زبانی یہ سنا ہے کہ دنیا آسمان سے بہت دور ہے۔ تو ہمیں اس دلکش خطہ کا کچھ حال سنا جس کا طواف چاند کرتا ہے۔

شبنم نے کہا کہ اے ستارو! کرہ ارضی کا حال کچھ نہ پوچھو۔ وہ تو سراسر نالہ و فریاد کا گھر ہے۔ ہر شی پر موت اور فنا طاری ہے۔ کلی ادھر کھلی ادھر پھول بنی اور دوسرے دن مرجھا گئی۔ بلبل کی بدقسمتی دیکھو کہ وہ گل کے فراق میں رات دن آہ و فغاں کرتی رہتی ہے لیکن گل آہ، سماعت ہی سے محروم ہے۔ انسانوں کا ستم دیکھو کہ باغ میں جس قدر خوش آواز طائر پائے جاتے ہیں سب کو گرفتار کر کے پنجروں میں بند کر دیتے ہیں گویا ان بے چاروں کی خوبی، ان کے حق میں بلائے جان بن گئی ہے۔ پھر فطرت کا ستم یہ ہے کہ جہاں پھول ہے وہیں کانٹا بھی ہے۔ جہاں پھول توڑا، کانٹا بھی ہاتھ میں چبھ گیا۔ نرگس کو آنکھ ملی لیکن اس میں بینائی نہیں ہے شمشاد کا حال یہ ہے کہ یوں کہنے کو سب اسے آزاد کہتے ہیں لیکن ایک قدم نہیں چل سکتا۔

خلاصۂ داستان یہ ہے کہ دنیا کے لوگ اس قدر گرفتارِ رنج و الم ہیں کہ وہ تاروں کو بھی کسی مصیبت کے مارے ہوئے کی آہوں کے شرارے سمجھتے ہیں اور مجھے یہ سمجھتے ہیں کہ میں آسمان کے آنسوؤں کا مجموعہ ہوں یعنی آسمان رات بھر جس قدر روتا ہے صبح کو سب آنسو، شبنم کی شکل میں، دنیا پر نازل ہو جاتے ہیں، ایسی دلکش صنعت حسنِ تعلیل ہے)

اور چاند جو زمین کے گرد طواف کرتا ہے یہ دراصل اس کی نادانی ہے وہ یہ سمجھتا ہے کہ شاید کوئی اللہ کا بندہ میرے داغِ جگر کا علاج کر دے گا لیکن وہاں کے لوگ تو خود داغِ جگر میں مبتلا ہیں، وہ دوسرے کا کیا مداوا کریں گے؟

محاصرۂ ادرنہ

حلِّ لغات: ۔ حق و باطل کی چھڑ گئی یعنی جب باطل پرست بلقانی ریاستیں (بلغاریہ، سرویہ، رومانیہ، اور یونان) ترکی کے خلاف صف آرا ہو گئیں۔ حق خنجر آزمائی پہ مجبور ہو گیا یعنی ترک مجبوراً ان کے مقابلہ کے لئے نکلے۔ اقبال نے ترکوں کو حق پر لکھا ہے کیونکہ دشمنوں نے بلا وجہ ان پر حملہ کیا تھا۔ اس لئے وہ اپنی مدافعت کرنے میں حق پر تھے گرد بمعنی غبار۔ گردِ صلیب یعنی عیسائی حکومتیں۔ گردِ قمر یعنی ترکی کے چاروں طرف حلقہ زن یعنی چاروں طرف سے حملہ آور ہوئیں بشکری جنرل شکری پاشا جو بلغاریہ اور سرویہ اور مانٹی نیگرو کی متحدہ یورش کا مقابلہ کرنے کے لئے ایڈریانوپل کے محاذ کا سپہ سالار تھا جب ترکی افواج دشمن کے حملہ کی تاب نہ لا سکیں تو شکری پاشا ایڈریانوپل کے قلعہ میں داخل ہو گیا اور دشمنوں نے قلعہ کا محاصرہ کر لیا۔ سپہ سالار مذکور نے پانچ ماہ تک بڑی ہمت کے ساتھ مدافعت کی لیکن مجبور ہو کر فروری ۱۹۱۳ء میں ہتھیار ڈال دیئے۔ روئے امید آنکھ سے الخ یعنی کمک یا سامانِ رسد آنے کی کوئی امید نہیں تھی۔ امید عشکی سپہ سالار آئین جنگ یعنی "مارشل لا" جاری ہو گیا۔ شاہین سے ترکی فوج مراد ہے، عصفور یعنی چڑیا گدائے دانہ عصفور ہو گیا یعنی مسلمان اہل عیسائیوں کی خوراک کے محتاج ہو گئے گرما کے یعنی جوش میں آ گیا صاعقہ طور ہو گیا۔ صاعقہ بمعنی بجلی یعنی غصہ میں آ کر مسلمانوں پر برس پڑا ذمی فقہ کی اصطلاح میں وہ غیر مسلم ہے جو مسلمانوں کی حکومت میں رہتا ہو اور باقاعدہ "جزیہ" دیتا ہو۔ حکومت اس کی جان اور اس کے مال کی ذمہ دار ہوتی ہے کوئی

مسلمان شخص (فرد یا حکومت) ذمّی کا مال اس کی مرضی کے بغیر اپنے تصرف میں نہیں لا سکتا۔

تبصرہ:۔ یہ نظم اقبالؔ نے اس لئے لکھی تھی کہ ترکوں کی سیرت کا ایک روشن پہلو دنیا کے سامنے پیش کر سکیں۔ اس واقعہ سے اندازہ ہو سکتا ہے کہ اس گئی گذری حالت میں بھی ترکوں کے دل میں شریعت اسلامیہ کا کس قدر پاس ہے ایڈریانوپل جسے ترکی میں ادرنہ کہتے ہیں، فتح قسطنطنیہ سے پہلے ترکی کا پایہ تخت تھا یہ شہر فروری ۱۹۱۳ء میں ترکوں کے ہاتھ سے نکل گیا تھا لیکن غازی انور پاشا نے اس کو جولائی ۱۹۱۳ء میں دوبارہ فتح کیا تھا

اس نظم کا مطلب بالکل واضح ہے ترکی سپہ سالار نے مجبور ہو کر شہر کے باشندوں کے سامان پر قبضہ کر لیا لیکن فقیہ شہر نے فتوی دیا کہ ذمّی کا مال مسلمانوں کے لشکر پر حرام ہے اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ فوج نے بھوک کی تکلیف برداشت کی لیکن غیر مسلم رعایا کے سامانِ خور و نوش کو بجنسہٖ واپس کر دیا۔ اور اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ فوج نے مجبور ہو کر ہتھیار ڈال دیئے۔

غلام قادر رہیلہ

حل لغات:۔ شاہ تیموری سے شاہ عالم ثانی مراد ہے جو ۱۷۵۹ء میں تخت نشین ہوا اور طویل عرصہ تک ہر قسم کی مصیبت اور ذلت برداشت کرنے کے بعد ۱۸۰۳ء میں انگریزوں کا وظیفہ خوار بن گیا۔ ۱۸۰۶ء میں وفات پائی۔ سمن بر۔ سمن بمعنی چنبیلی کا پھول اور بر بمعنی سینہ۔ کنایہ ہے جسم سے یعنی وہ عورت جس کا جسم، پھول کی طرح نازک ہو۔ مغفر بمعنی خود آہنی جو پہلے زمانہ میں سر کی حفاظت کے لئے پہنتے تھے۔ سبق آموز تابانی الخ یعنی جس کی صیقل ستاروں کو شرماتی تھی۔ جوہر سے فولاد کی عمدگی مراد ہے۔ احمر بمعنی سرخ۔

تبصرہ:۔ نظم کا مطلب تو بالکل واضح ہے لیکن طلبہ اور ناظرین کی آگاہی کے لئے اس تاریخی واقعہ کو نہایت اختصار کے ساتھ لکھے دیتا ہوں۔

واضح ہو کہ غلام قادر خاں، نواب ضابطہ خان کا بیٹا اور امیر الامراء دکیل مطلق

نواب نجیب الدولہ کا پوتا تھا جنھوں نے مرہٹوں کا اقتدار ختم کرنے کے لئے احمد شاہ ابدالی کو دعوت دی تھی چنانچہ پانی پت کی تیسری لڑائی کے بعد، ہندوستان میں مرہٹوں کا اقتدار بالکل ختم ہو گیا تھا اور اگر احمد شاہ ابدالی اس وقت، دلّی کے تخت پر خود بیٹھ جاتا تو آج ہندوستان کی تاریخ بالکل مختلف ہوتی۔

جب تک نواب نجیب الدولہ زندہ رہے، مرہٹوں کو سر اٹھانے کی ہمت نہ ہو سکی لیکن جب ۱۷۷۰ء میں ان کا انتقال ہو گیا تو مرہٹوں نے مرحوم کے بیٹے ضابطہ خاں سے ۱۷۶۱ء کی شکست کا انتظام لینے کی غرض سے، پہلے شاہ عالم ثانی کے وزیر نجف علی خاں کو، جو روہیلوں سے للّہی بغض رکھتا تھا جس کی تفصیل کا یہ موقع نہیں ہے اپنے ساتھ ملایا، پھر شاہ عالم کو ہموار کیا۔ چنانچہ اس عقلمند بادشاہ نے سکھوں کے یا جاٹوں کے خلاف اعلان جنگ کرنے کے بجائے اپنے محسن کے بیٹے اور اپنے بھائیوں کے خلاف اعلان جنگ کر دیا، یعنی ۱۷۷۲ء میں مرہٹوں کا آلہ کار بن کر روہیلوں پر حملہ آور ہوا۔ بادشاہ سلامت کی فوج نے پتھر گڑھ کے قلعہ کا محاصرہ کیا اور جب روہیلوں نے ہتھیار ڈال دئے تو مرہٹوں اور شاہی فوج، دونوں نے افغانی خواتین کی عرفی معنوں میں بے عزتی کی چنانچہ جادو ناتھ سرکار لکھتا ہے کہ "مغل اور مرہٹہ سپاہی" روہیلہ سرداروں کی عورتوں کا ہاتھ پکڑ پکڑ کے اپنے خیموں میں لے گئے اور ....." تفصیل کے لئے دیکھو زوالِ سلطنتِ مغلیہ جلد سوم ص۵۶

غلام قادر خاں نے جس کی عمر اس وقت ۱۲۔ ۱۳ سال کی تھی، اپنی ماؤں اور بہنوں کی یہ بے عزتی اپنی آنکھ سے دیکھی تھی۔

اس کے بعد ۱۷۷۳ء میں مرہٹوں نے شاہ عالم کو دوبارہ روہیلوں پر حملہ کرنے کے لئے ابھارا چنانچہ یہ عقلمند بادشاہ، . . . . جاٹوں کی سرکوبی کے بجائے پھر اپنے بھائیوں کا خاتمہ کرنے کے لئے مرہٹوں کے ساتھ روہیلوں پر حملہ آور ہوا اور غوث گڑھ کا قلعہ فتح کرنے کے بعد اس نے روہیلوں کا خاتمہ کر دیا اور ضابطہ خاں کے اہل و عیال

کو آگرہ کے قلعہ میں قید کر دیا۔ گویا مرہٹوں نے شاہ عالم کی وساطت سے ۱۷۶۱ء کا انتقام پوری طرح روہیلوں سے لے لیا۔ اور جب بادشاہ پٹھانوں کی امداد سے محروم ہو گیا تو انھوں نے اُسے اپنا غلام بنالیا ع۔ چہ خوش بود کہ بر آید بیک کرشمہ دو کار۔ ہر تاریخ داں جانتا ہے کہ ۱۷۷۱ء سے لے کر ۱۸۰۳ء تک شاہ عالم مرہٹوں کی قید میں رہا۔

غلام قادر خاں نے جسے انگریز اور ہندو مورخین ظالم اور جفا جو کہتے ہیں، نہ شاہ عالم پر ظلم کیا نہ ستم۔ صرف اپنی ماؤں اور بہنوں کی بے عزتی کا انتقام لیا تھا اور وہ اس فعل میں بالکل حق پر تھا۔ اگر وہ واقعہ راقم الحروف پر گذرتا تو موقع حاصل ہو جانے کے بعد میں بھی یہی کرتا۔ اس نے پھر بھی انتہائی شرافت سے کام لیا یعنی کسی عورت کی بے عزتی نہیں کی۔ انگریزوں نے تو ۱۸۵۷ء میں مسلمانوں سے وہ انتقام لیا کہ تاریخ اس کی نظیر پیش کرنے سے قاصر ہے۔

میرا خیال ہے کہ ان تصریحات سے غلام قادر خاں کی پوزیشن بالکل صاف ہو سکتی ہے اس نے وہی کیا جو ہر غیرت دار انسان کو کرنا چاہیئے اس شرح میں اس سے زیادہ وضاحت نہیں کر سکتا۔ اگر خدا نے مجھے ہندوستان کی تاریخ لکھنے کی توفیق ارزانی فرمائی تو جہاں اور بہت سی غلط فہمیوں کا ازالہ کروں گا، شاہ عالم ثانی کے "دو کارناموں" کو بھی تفصیل کے ساتھ بیان کروں گا۔

ایک مکالمہ

حلِّ لغات:۔ مرغ سرا۔ وہ پرندے جو گھروں کے آس پاس یا دیواروں پر بیٹھے رہتے ہیں جیسے کوا۔ مرغ ہوا۔ وہ پرندے جو ہمیشہ فضا میں اڑتے رہتے ہیں جیسے شاہین۔ ہوا گیر۔ یعنی ہوا میں اڑنے والا۔ پندار۔ غرور یا تکبر۔ حمیت مجروح ہوئی یعنی اس نے اس گفتگو کو اپنی توہین سمجھا صدو یعنی جستجو یا تلاش۔

مطلب:۔ ایک کوے نے ایک شاہین سے کہا کہ جس طرح تو آزاد ہے اور اُڑ سکتا ہے

اُسی طرح میں بھی آزاد ہوں اور اُڑ سکتا ہوں۔ پھر تجھے مجھ پر کیا تفوّق حاصل ہے؟ شاہین نے یہ سن کر جواب دیا کہ بے شک تو بھی اُڑ سکتا ہے لیکن زیادہ سے زیادہ تیری پرواز صحن سے دیوار تک یا کسی درخت تک ہے۔ اس کے علاوہ تو پست ہمت بھی ہے کہ اپنا رزق زمین میں تلاش کرتا ہے لیکن میں ستاروں تک پہنچ جاتا ہوں۔

مطلب یہ ہے کہ انسان کی بزرگی اس کی ہمت کی بلندی پر موقوف ہے۔

میں اور تو

حل لغات:۔ مذاق دید سے تحقیق اور مطالعۂ فطرت کا جذبہ یا ذوق مراد ہے۔ رہن وہ چیز جسے گروی رکھ دیا جائے۔ مراد یہ ہے یعنی تیری خواہش کے مطابق ہے۔ سود بمعنی نفع۔ کاوشِ زیاں۔ نقصان کی تکلیف۔ محروم بازباں، مراد ہے شکستہ۔

مطلب:۔ (۱) اس دنیا میں ایک شخص کم علم اور نادان ہے، دوسرا بڑا محقق اور دانا ہے۔

(۲) ایک شخص ہر وقت مصیبتوں میں رہتا ہے دوسرا کامیابی کی زندگی بسر کر رہا ہے۔

(۳) ایک شخص کو دنیا میں کہیں ٹھکانا نصیب نہیں ہوتا، دوسرا محلوں میں رہتا ہے۔

(۴) ایک شخص دولت کما رہا ہے، دوسرا نقصان اٹھا رہا ہے۔

(۵) ایک شخص کو ترقی کے تمام وسیلے حاصل ہیں، دوسرا بے وسیلہ زندگی بسر کر رہا ہے۔

(۶) ایک قوی ہے، دوسرا ناتواں ہے لیکن ایسا ہے تو کیا ہوا؟ اور ویسا ہے تو کیا ہوا؟

(۷) اس دنیا میں کسی شخص کی زندگی ایک نہج پر بسر نہیں ہو سکتی۔ جو شخص آج دولتمند ہے کل مفلس ہو جاتا ہے۔ آج خوش ہے کل رنجیدہ نظر آتا ہے۔ اس لئے اگر کوئی شخص آج کامیاب ہے تو کیا؟ اور دوسرا ناکام ہے تو کیا؟ انجام دونوں کا یکساں ہے یعنی

یہ کہ نہ اُسے ہمیشگی ہے نہ اسے آخر کار دونوں موت کی آغوش میں سو جائیں گے۔

تضمین بر شعر ابو طالب کلیم

حل لغات:۔ شعار صاحب یثرب۔ سنت یا شریعت نبویؐ۔ حلقۂ خاتم انگوٹھی کا دائرہ۔ مراد ہے مسلمان کی ذات یا شخصیت۔ گردوں اسیر تھا یعنی دنیا غلام تھی۔ سلیمان سے مسلمان مراد ہے۔ نگین سے مراد ہے طاقت۔ آشیاں سے ملت اسلامیہ مراد ہے۔ آباد کرنے سے تبلیغ دین مراد ہے۔ رام بمعنی مطیع۔

تبصرہ:۔ اقبالؔ نے اس نظم میں ابو طالب کلیم کے ایک شعر پر تضمین کی ہے کلیم کا وطن ہمدان تھا جہانگیر کے عہد میں وارد ہندوستان ہوا۔ اور شاہنواز خاں صفوی کے دربار سے وابستہ ہو گیا۔ ۱۰۲۸ھ میں وطن واپس چلا گیا لیکن ۱۰۳۰ھ میں دوبارہ یہاں آیا۔ شاہجہاں نے جب تخت طاؤس پر جلوس کیا تو کلیم نے ایک قصیدہ دربار میں سنایا، جس پر شاہجہاں نے اُسے چاندی میں تلوایا جس کی قیمت ۵۰۰۰ روپے ہوئی۔ بادشاہ کے ساتھ کشمیر کی سیر کو گیا۔ یہ خطہ اسے اس قدر پسند آیا کہ بادشاہ کی اجازت سے یہیں مقیم ہو گیا۔ غنی کاشمیری سے دوستانہ تعلقات ہو گئے جو آخر وقت تک قائم رہے۔ ۱۰۶۱ھ میں وفات پائی سری نگری مزار الشعرا نامی قبرستان میں قدسی کے برابر محو خواب ہے۔ غنی نے تاریخ وفات کہی ع طور معنی بود روشن از کلیم۔

مطلب ا۔ اقبالؔ نے اس نظم میں مسلمانوں کو ان کی غفلت پر متنبہ کیا ہے کہ تم نے سنت نبویؐ کی پیروی اور اسلام کی اشاعت دونوں باتوں کو چھوڑ دیا ہے اس لئے تم دنیا میں غلام ہو گئے ہو۔ کہتے ہیں کہ تجھے سنت نبویؐ کی اتباع کا مطلق خیال نہیں رہا اور تیری زندگی بالکل غیر اسلامی ہو گئی ہے۔ جس گوہر کی بدولت تو دنیا پر حکمراں تھا، تو نے اپنی غفلت سے کھو دیا۔ اب تیری پیشانی پر مجھے سجدہ کا نشان بھی نظر نہیں آتا۔ اب

تجھ میں وہ صداقت بھی نظر نہیں آتی جس کی بنا پر تو بادشاہوں کے سامنے کلمہ حق کہہ سکتا تھا۔ کتنے افسوس کی بات ہے کہ تیرے آباؤ اجداد تو کفر کو مٹاتے تھے لیکن تو خود کافر دل کا دوست بنا ہوا ہے۔ اے مسلمان! از سر نو دینِ اسلام سے اپنا رشتہ استوار کر۔ دیکھا کلیمؔ نے کیا عمدہ نکتہ بیان کیا ہے "مناسب ہے کہ تو اس شخص (محبوب مراد ہے) کی پھر اطاعت شروع کر دے جس کے خلاف تو نے سرکشی کا شیوہ اختیار کر لیا (یعنی حضورؐ کی غلامی اختیار کر) اور شعلہ کی طرح تو جہاں سے اٹھا ہے، دوبارہ اسی جگہ بیٹھ جا۔ یعنی اسلام کی اطاعت کر۔

شبلی و حالی

حلِ لغات:۔ مسلم سے پوری قوم یا ملّت اسلامیہ مراد ہے۔ دیوان جُز و کل سے دنیا مراد ہے تیرا وجود فرد ہے یعنی دنیا میں ملّت اسلامیہ بے نظیر ہے فرد بمعنی یکتا یا بے نظیر۔ علوم نو۔ جدید فلسفہ اور سائنس بسر و در فتنہ سے مسلمانوں کے علوم و فنون مراد ہیں گرد سے ثمرہ یا نتیجہ مراد ہے یعنی دنیا تیری بدولت تہذیب و تمدن سے آشنا ہوئی۔ مردانِ کار یعنی عقلمند آدمی جو خرابی کا تدارک کر سکتے ہیں۔ چمن سے ملت اسلامیہ مراد ہے۔ خزاں سے زوال مراد ہے۔ ہم نبرد۔ جنگ آزما غمّاز بمعنی چغلخور یا راز فاش کرنے والا۔ چمنستان کے رازدار یعنی قوم کے غمگسار۔ نوائے درد۔ درد انگیز شاعری۔

تبصرہ:۔ اس نظم میں اقبالؔ نے مولانا شبلیؔ نعمانی اور مولانا حالیؔ پانی پتی کی وفات پر اپنے رنج والم کا اظہار کیا ہے۔ ان دونوں بزرگوں کی وفات میں صرف ۱½ ماہ کا فرق ہوا۔

مولانا شبلیؔ مرحوم، بلا شبہ ایک جامع حیثیات شخص گذرے ہیں؛ وہ بیک وقت منطقی فلسفی متکلم مورخ ادیب شاعر نقاد انشاپرداز مصنف لیکچرار استاد منتظم مدبر سیاست دان اور عالم دین تھے۔ میری نگاہ میں تو اُن کے یہی ۲ دو کارنامے ان کی

بزرگی اور عظمت کے ثبوت کے لئے کافی ہیں ایک تو یہ کہ ان کے گوہر بار قلم سے سیرت النبیؐ جیسی محققانہ کتاب عالم وجود میں آئی دوسرا یہ کہ انھوں نے حضرت سید سلیمان صاحب ندوی مدظلہٗ کو قوم کی خدمت کے لئے تیار کر دیا ان کا تیسرا کارنامہ ندوۃ العلماء کا قیام ہے جو ان کی عملی قوت اور علم دوستی کا ایک پائیدار نشان ہے۔ ۸ انومبر ۱۹۱۴ء کو ۵۷ سال کی عمر میں وفات پائی۔ (تفصیل کے لئے دیکھئے حیات شبلی مولفہ مولانا سید سلیمان ندوی)۔

مولانا حالی (خواجہ الطاف حسین شمس العلماء) ۱۸۳۷ء میں پانی پت میں پیدا ہوئے تھے، غالب کی صحبت میں رہکر ادب اور شاعری کے ذوق کی تکمیل کی۔ نہایت مخلص اور درد مند مسلمان تھے سرسید کی فرمائش پر ۱۸۷۹ء میں مسدس لکھا جس کی بدولت ان کا نام سارے ہندوستان میں مشہور ہو گیا۔ جس طرح "سرسید احمد خاں کے نام کا جزو بن گیا ہے اسی طرح "مسدس" حالی کے نام سے وابستہ ہو گیا ہے مرحوم نے ساری زندگی قوم کی خدمت میں بسر کی۔ اس دور میں حالی اکبر اور اقبال ہمارے بہترین قومی شاعر گذرے ہیں انھوں نے ۳۰ دسمبر ۱۹۱۴ء کو وفات پائی ان کا سب سے بڑا کارنامہ یہ ہے کہ انھوں نے اردو شاعری میں انقلاب پیدا کر دیا۔

مطلب: اے اقبال میں نے مسلمان یا (اپنی قوم) سے یہ کہا کہ تو اس دنیا میں اب بے نظیر ہے۔ جدید سائنس اور فلسفہ تیرا ہی پیدا کردہ ہے۔ اور دنیا تیری بدولت تہذیب سے آشنا ہوئی لیکن تو جانتا ہے کہ انسان کی آبرو بہت نازک شئے ہے۔ ذراسی غفلت یا غلطی سے زائل ہو جاتی ہے۔ اس لئے عقلمند آدمی، یہ معلوم کرتے رہتے ہیں کہ قوم کیوں روبزوال ہے؟ اور اس کے بعد اس کی اصلاح کی طرف متوجہ ہوتے ہیں۔ اے مسلمان! تو اپنی قوم کے بزرگوں سے دریافت کر کہ تیری قوم کیوں پستی کی طرف جارہی ہے؟ مسلم میری گفتگو سے بہت مضطرب ہو گیا اور کہنے لگا کہ اے اقبال! اور جب

وہ یہ کہنے لگا تو ٹھنڈی سانس نے اس کے غم پوشیدہ کو ظاہر کر دیا، قوم پر ایسا زوال آیا ہے کہ زندگی کے ہر شعبہ میں ضعف پیدا ہو گیا ہے، وہ لوگ جن کے کلام کی تاثیر سے دل میں قوم کی فطرت کا جذبہ پیدا ہوتا تھا۔ ایک ایک کر کے دنیا سے رخصت ہو رہے ہیں ابھی قوم شبلی کے ماتم سے فارغ نہیں ہوئی تھی۔ کہ حالی نے داغ مفارقت دے دیا۔ اندریں حالت کسے فرصت ہے کہ باغبان سے یہ پوچھے کہ بلبل نے کیا کہا؛ پھول نے کیا سنا اور صبا نے کیا کیا؟۔

مطلب یہ ہے کہ جو لوگ قوم کے امراض کا علاج کر سکتے تھے وہ تو رخصت ہوتے جاتے ہیں تو اب اصلاح کون کرے گا اعلاوہ بریں جو لوگ باقی رہ گئے ہیں وہ اس وقت اُن کی وفات کے رنج میں ایسے مبتلا ہیں کہ اصلاح کی طرف توجہ نہیں کر سکتے۔

ارتقاء

حل لغات:۔ ارتقاء: کسی چیز کا آہستہ آہستہ مختلف منازل سے گذر کر مرتبۂ کمال کو پہنچنا۔ ترقی کرنا۔ ستیزہ کار۔ برسر جنگ۔ ازل سے ابتداء سے۔ چراغ مصطفویؐ سے اسلام یا حق مراد ہے۔ مصطفےٰؐ، حضور سرورِ کائنات کا لقب ہے۔ شرار بولہبی سے کفر یا باطل مراد ہے بولہب، حضور اقدسؐ کے چچا کا لقب ہے۔ جو اسلام کا شدید ترین دشمن تھا۔ سرشت۔ ذاتی خصوصیات جو کسی وقت جدا نہ ہو سکیں۔ زمہریری سردی۔ شیشۂ حلبی۔ وہ آئینہ جو حلب واقع ملک شام میں تیار ہوتا تھا۔ قطرہ نیساں سے مارچ اپریل کے مہینہ میں بارش مراد ہے۔ نیساں قدیم عبرانی اور سریانی زبان میں اس مہینہ کا نام ہے جس میں وہ بارش ہوتی ہے جس سے صدف میں موتی اور انگور کی بیل میں خوشۂ انگور پیدا ہوتا ہے۔ آتش عنبی۔ کنایہ ہے شراب سے جو انگور کے شیرہ سے تیار ہوتی ہے۔ تب وتاب ملت عربی یعنی مسلمانوں کی ترقی کا راز۔ ستارہ می شکنند یعنی ایک

ادنیٰ چیز کو اعلیٰ چیز میں تبدیل کر دیتے ہیں۔

تبصرہ:۔ اس نظم میں جس کا انداز بیان بہت مشکل ہے، اقبال نے اس نکتہ کو واضح کیا ہے کہ قومیں، اس دنیا میں صرف، کشاکش پیہم یا مسلسل جدو جہد ہی سے زندہ رہ سکتی ہے۔ اس دعویٰ کے ثبوت میں انھوں نے نظام کائنات کو گواہ کے طور پر پیش کیا ہے۔ وہ کہتے ہیں کہ

(۱) غور کر کے دیکھ لو! ابتدا سے آج تک کفر اسلام سے مسلسل جنگ کر رہا ہے رات دن، اس کو مٹانے کی فکر میں لگا ہوا ہے۔

(۲) بات یہ ہے کہ زندگی کی ساخت ہی اس قسم کی ہے کہ وہ شعلہ مزاج ہے، غیور اور ہنگامہ خیز ہے۔ اور اپنی پیدائش کے اعتبار سے دشواری پسند اور جفا طلب ہے

(۳) مثلاً غور کرو کہ جو نغمہ صبح کے وقت ظہور میں آتا ہے اس کی ابتدا شام کی خاموشی سے ہوتی ہے۔ وہ خاموشی ارتقائی منزلیں طے کرتی ہوئی، آدھی رات کی آہ دخاں کی صورت سے گذرتی ہوئی کہیں صبح ہوتے نغمہ کی شکل میں ظاہر ہوتی ہے۔

(۴) اسی طرح وہ تاریک مٹی جو آخر کار آئینہ حلبی کی شکل میں ظاہر ہوتی ہے پہلے محض تاریک مٹی ہی ہوتی ہے۔ رفتہ رفتہ سردی اور گرمی کی کشمکش میں گرفتار ہو کر شیشہ بنتی ہے وہ شیشہ بھٹی میں پگھلایا جاتا ہے، میل کچیل صاف کرنے کے بعد اُسے صیقل کرتے ہیں پھر تراشتے ہیں تو آئینہ بنتا ہے۔

(۵) اس طرح قطرۂ نیساں پہلے دانۂ انگور میں بستہ ہوتا ہے پھر خوشوں کو توڑتے ہیں نچوڑتے ہیں۔ پھر شیرۂ انگور کو آگ پر چڑھاتے ہیں، پھر بھٹی میں کشید کرتے ہیں تو انگوری شراب بنتی ہے۔

۶ خلاصہ کلام یہ ہے کہ قومیں اسی کشمکش کی بدولت جسے اصطلاح میں تنازع للبقاء کہتے ہیں، دنیا میں زندہ رہ سکتی ہیں۔ اگر مسلمان زندہ رہنا چاہتے ہیں تو انھیں بھی

دن رات جدوجہد میں مصروف رہنا لازمی ہے۔

(۷) وہ شراب فروش جو انگور سے شراب بناتے ہیں، دیکھ لو! کیا کمال کرتے ہیں! وہ انگور کی بیل سے انگور توڑتے ہیں اور مسلسل جدوجہد سے انگوروں کو (جو ستاروں سے مشابہ ہیں) شراب کی شکل میں تبدیل کر دیتے ہیں (جو اپنی گرمی اور تیزی کی وجہ سے آفتاب سے مشابہ ہے)

خلاصہ یہ ہے کہ ارتقاء اس دنیا کا قانون ہے کوئی چیز اس سے مستثنیٰ نہیں ہے لیکن ترقی وہی چیز کر سکتی ہے جو ترقی کے لئے دن رات کوشش کرے۔ چارپائی پر لیٹ کر حقہ پینے سے نہ کوئی فرد۔۔ ترقی کر سکتا ہے نہ قوم ترقی کر سکتی ہے۔ کاش مسلمان اب بھی اس نکتہ سے آگاہ ہو جائے تو انشاء اللہ ۲۵ سال کے بعد برطانیہ کو اپنا غلام بنا سکتا ہے۔

صدّیق

حلّ لغات:۔ فرطِ طرب: خوشی کے مارے۔ درہم: چاندی کا سکہ جو مسلمانوں کے ابتدائی دور میں رائج تھا، موجودہ چوّنی سے کچھ زیادہ۔ راہوار: گھوڑا۔ رسولِ امین ﷺ۔ امین وہ لقب ہے جو اہل مکہ نے، دعوئ نبوت سے پہلے آپ ﷺ کو دیا تھا۔ ایثار کی دست نگر الخ یعنی جب تک انسان قربانی نہ کرے، وہ کوئی کام شروع نہیں کر سکتا۔ اعتبار سے اس جگہ عزت مراد ہے۔ ملکِ یمین سے کنیز یا غلام مراد ہے، یہ عربی ترکیب ہے، اس کے لغوی معنی ہیں وہ شئے جس کا مالک داہنا ہاتھ ہو۔ جنس سے سامان خورد و نوش مراد ہے اسپِ قمر سم۔ ایسا گھوڑا جس کے سُم چاند کی طرح حسین ہوں۔ ناقہ یعنی خچر۔ حمار یعنی گدھا۔ اے تجھ سے دیدۂ مہ و انجم الخ یعنی حضور کی بدولت چاند اور ستاروں میں روشنی ہے اے تیری ذات باعثِ الخ یعنی حضور کے لئے یہ دنیا پیدا کی گئی۔ واضح ہو کہ صوفیائے کرام کا عقیدہ یہ ہے

کہ اللہ نے یہ دنیا حضورؐ کی خاطر پیدا کی۔ چونکہ اقبالؔ خود اسی عقیدہ کو صحیح سمجھتے ہیں اس لئے انھوں نے اس شعر میں اس کو نظم کر دیا ہے یہ عقیدہ اس حدیث سے مستنبط ہے لَوْ لَاکَ لَمَا خَلَقْتُ الْاَفْلَاکَ ـــــ اس کی تشریح لکھ چکا ہوں۔

تبصرہ:- یہ نظم اقبالؔ نے حضرت سیدنا صدیق اکبرؓ کی منقبت (فضیلت) میں لکھی ہے جو "ثانیٔ اسلام وغار و بدر و قبر" ہیں، افضل البشر بعد الانبیا رہیں اور سرکار دو عالم صلعم کے سچے عاشق ہیں۔ مسلمانوں کے سرتاج اور سردار ہیں، اس جگہ ان کے مناقب تو بیان نہیں کر سکتا صرف ارشاد نبوی پر اکتفا کرتا ہوں کہ فرمایا حضور سرور کائنات صلی اللہ علیہ وسلم نے کہ دنیا میں کوئی شخص ایسا نہیں ہے جس کے احسانات کا نعم البدل میں نے نہ کر دیا ہو لیکن ابوبکر کے احسانات کا بدل نہیں کر سکا۔ صدیق اکبرؓ نے پانچ ہزار روپیہ تو ہجرت کے موقع پر حضورؐ کی نذر کیا اور دو مرتبہ سارا گھر، سارا اثاث البیت اسلام کی اشاعت کے لئے حضورؐ کے قدموں میں لا کر ڈال دیا۔ ایک مرتبہ تن کے کپڑے بھی دے دیئے اور صرف ایک کمبل اپنے لئے باقی رہنے دیا۔ جب نماز پڑھتے تو ببول کا ایک بڑا سا کانٹا لگا لیتے تھے تاکہ حالت رکوع میں وہ کمبل شانوں سے نہ سرک جائے۔ زندگی بھر ساتھ رہے تو بعد وفات بھی محبوبؐ کی قربت نصیب ہوئی ع یہ نصیب! اللہ اکبر! لوٹنے کی جائے ہے۔

فاروق اعظمؓ اگرچہ عشق و اخلاص و صدق و صفا میں صدیق اکبرؓ سے کمتر ہیں لیکن ان کو چھوڑ کر دنیا کی تاریخ میں، عدیم المثال ہیں۔ میری کیا مجال کہ شیخینؓ کی مدح کر سکوں۔ صرف اس واقعہ کے بیان پر اکتفا کرتا ہوں کہ جب ۱۹۳۷ء میں ہندوستان کو صوبجاتی خود مختاری ملی تو بھارت کے رہنما اور دنیا کے تمام مذاہب کی تاریخ سے آشنا مسٹر ایم کے گاندھی نے کانگریس کے لیڈروں کو یہ مشورہ دیا تھا کہ "اگر کسی آئیڈیل حکمراں کا نمونہ درکار ہو تو مسلمانوں کے محبوب پیشوا حضرت عمرؓ کی زندگی کا مطالعہ

لیے مشعل ہدایت ہے کیوں کہ ان سے بہتر حکمراں آج تک دنیا میں نہیں ہوا"۔

واضح ہو کہ گاندھی جی کے اس قول میں مطلق مبالغہ نہیں ہے۔ واقعی دنیا میں آج تک کوئی حکمراں ایسا پیدا نہیں ہوا جس کے کرتے میں بارہ ۱۲ بارہ ۱۲ پیوند لگے ہوئے ہوں، جس کے پاس دوسرا جوڑہ بدلنے کے لئے نہ ہو، جو پھٹا ہوا تہ بند باندھ کر جمعہ کی صبح کو، پیوند لگے ہوئے کپڑے خود دھوتا ہو لیکن قیصر و کسریٰ اس کے نام سے لرزہ براندام ہوں، اور ۳۶ ہزار شہر اور قلعے اس کے زیر نگیں ہوں اور خالد جانباز جیسا شہرہ آفاق سپہ سالار جس کے نام سے شیروں کے پتے پانی ہوتے تھے اس کا ادنیٰ غلام ہو اور نصاریٰ بیت المقدس کی کنجیاں خود اس کے حوالہ کرنے میں اپنی عزت سمجھیں۔

اتنی صراحت اور ضروری معلوم ہوتی ہے کہ جس واقعہ کو اقبال نے نظم کیا ہے اس کا تعلق غزوہ تبوک سے ہے جو ۹ھ میں واقع ہوا تھا۔ اس موقع پر حضرت عثمان رضؓ نے اس قدر دولت اور سامان جنگ حضورؐ کی خدمت میں پیش کیا تھا کہ آپؐ نے بھرے مجمع میں انکے جنتی ہونے کی بشارت دیدی تھی۔

نظم کا مطلب تو بالکل واضح ہے، یعنی جب حضورؐ نے صحابہؓ سے جہاد کے لیے مال طلب فرمایا تو سب نے اپنی اپنی حیثیت کے مطابق نذرانہ پیش کیا۔ (حضرت عثمان رضؓ نے موجودہ کرنسی کے مطابق ایک لاکھ سے زیادہ حاضر خدمت کیا تھا) حضرت عمر رضؓ نے اپنا آدھا مال پیش کر دیا لیکن صدیق اکبرؓ نے، جن کی ذات سے دنیا میں عشق کا وجود برقرار ہے، سارا اثاثہ حاضر خدمت کر دیا۔ کنیز غلام چاندی، سونا، اثاث البیت غلہ، سامانِ زندگی، لباس، اسباب خانہ داری، گھوڑے، اونٹ، خچر اور گدھے غرضیکہ جو کچھ ان کے پاس تھا سب لا کر حضورؐ کے قدموں پر نچھاور کر دیا جب سرکار دو عالم صلی اللہ علیہ وسلم نے یہ دریافت کیا کہ "اے ابو بکر! اپنے عیال و اطفال یعنی بیوی بچوں کے لئے کیا چھوڑ کر آئے ہو؟ تو اس سرخیل عاشقانِ عالم نے جو جواب دیا وہ رہتی

دنیا تک محفلِ عشاق کو اپنی روشنی سے جگمگاتا رہے گا یعنی یہ کہ میرے اور میرے عیال و اطفال کے لئے اللہ اور اُس کا رسولؐ کافی ہے :۔ ؎

پروانے کو چراغ ہے بلبل کو پھول بس
صدیقؓ کے لئے ہے خدا کا رسولؐ بس

تہذیبِ حاضر

حلِ لغات :۔ بھبھوکا ۔ ہندی لفظ ہے یعنی آگ کا شعلہ ۔ تاب مستعار ۔ مانگی ہوئی چمک ۔ آفتاب جلوہ فرما سے تہذیب مغرب مراد ہے ۔ تدبّر یعنی کسی معاملہ کے سارے پہلوؤں اور اس کے نشیب و فراز اور انجام پر غور کرنا کہ اس کا نتیجہ کیا ہوگا ۔ تخیل سے افکار و خیالات مراد ہیں ۔ ہنسی سمجھی گُلِ گلشن میں الخ بڑا بلیغ مصرع ہے یعنی قوم کے نوجوان اسقدر بے باک اور گستاخ ہو گئے ہیں کہ بزرگوں کی نصیحتوں پر غور کرنے اور عمل کرنے کے بجائے انھوں نے ان بزرگوں ہی کا مذاق اڑانا شروع کر دیا (کالج کی اصطلاح میں اسے فول بنانا کہتے ہیں) " تازہ پروازوں سے کالج کے وہ لڑکے لڑکیاں مراد ہیں جنھوں نے ابھی ابھی ڈراموں میں پارٹ لینا شروع کیا ہے ۔ آشیاں گم کر دیا یعنی اپنی ملی روایات فراموش کر دیں یا شعائر اسلامی ترک کر دیئے ۔ ساحر سے انگریزی حکومت مراد ہے جس نے مسلمان قوم کو کمال چابکدستی کے ساتھ دین سے بیگانہ بنا دیا ۔ کمالِ فن یہ ہے کہ جس قدر اسلامیہ کالجوں کی تعداد میں اضافہ ہوتا گیا " مسلمان لڑکیاں اور لڑکے اسی قدر دین سے بیگانہ ہوتے چلے گئے ۔ حیاتِ تازہ سے وہ تہذیب مغرب مراد ہے جس کی بدولت نوجوان لڑکیاں ، غیروں کے ساتھ شام کے وقت دریائے راوی کے کنارے زندگی کے اسرار یعنی فرائڈ کے نظریات کو سمجھنے کی کوشش کرتی ہیں ۔ وہ اسرار تو

ان کی سمجھ میں کیا آتے (ان کے اساتذہ خود نہیں سمجھتے) ہاں، رقابت، خودفروشی ناشکیبائی اور ہوسناکی کی صفات ضرور پیدا ہو جاتی ہیں۔

دل کی گہرائی سے صدائے آفرین بلند ہوتی ہے اقبال کی ژرف نگاہی اور فراست اور دوربینی پر کہ انہوں نے ۱۹۱۵ء میں وہ منظر دیکھ لیا جس کے دیکھنے کا شرف راقم الحروف کو ۱۹۵۱ء میں حاصل ہوا۔ جب میں یہ شعر پڑھتا ہوں کہ حیاتِ تازہ اپنے ساتھ لائی لذتیں کیا کیا۔

رقابت، خود فروشی، ناشکیبائی ہوسناکی

تو حیران رہ جاتا ہوں کہ اقبال نے زمانہ آئندہ کی اس قدر صحیح تصویر کیسے کھینچ دی! جس کو شک ہو، وہ اپنی قوم کے افراد کی زندگی کا مطالعہ کرلے کم وبیش یہی صفاتِ چہارگانہ، ان کی زندگیوں میں نظر آئیں گی۔

فروغِ شمع نو سے تہذیب مغرب کی ظاہری چمک دمک مراد ہے۔ بزم مسلم سے مسلمان قوم مراد ہے۔ پروانوں سے کالج کے نوجواں مراد ہیں۔ کہنہ ادراک سے وہ عقل و فہم مراد ہے جو تجربہ کی بنا پر پایۂ تکمیل کو پہونچتی ہے۔

تبصرہ اقبال نے اس نظم میں تہذیب مغرب کے مفاسد اور مصائب سے قوم کے نوجوانوں کو آگاہ کیا ہے۔ یہ سچ ہے کہ کسی نے اس طرف توجہ نہیں کی لیکن انھوں نے تو اپنا فرض ادا کر دیا اس نظم میں انھوں نے فیضی کے مشہور شعر پر تضمین کی ہے اور حق یہ ہے کہ تضمین کا حق ادا کر دیا ہے

فیضی، اکبر مرتد کا درباری شاعر اور ندیم تھا۔ عربی فارسی ترکی اور سنسکرت چاروں زبانوں میں ید طولیٰ رکھتا تھا۔ جودتِ طبع اور ذہانت کے لحاظ سے اس کے زمانہ میں کوئی شخص اس کا ہمسر نہیں تھا۔ چنانچہ اس کی تفسیر سواطع الالہام

آج بھی اس بات پر شاہد ہے۔ اس کے فارسی دیوان میں صدہا اشعار ایسے ہیں کہ ایک مصرع فارسی میں ہے، دوسرا نہایت فصیح عربی میں ہے ہے۔ ۷۹۰ھ میں پیدا ہوا اور ۸۶۰ھ میں فوت ہوا۔

مطلب :- کہتے ہیں کہ مغربی تہذیب نے جس کی بنیاد مادہ پرستی پر ہے، نوجوانوں کے جذبات کو اس قدر برانگیختہ کر دیا ہے کہ وہ دائرۂ اعتدال سے باہر ہو چکے ہیں۔

(۲) اس تہذیب کا ظاہری پہلو یہ ہے کہ دیکھنے والوں کو قوم کے نوجوانوں کی زندگیاں بڑی کامیاب نظر آتی ہیں۔ بظاہر یہ معلوم ہوتا ہے کہ وہ بڑی ترقی کر رہے ہیں، حالانکہ معاملہ بالکل دگرگوں ہے

(۳) ان کی طبیعت میں انقلابِ عظیم پیدا ہو گیا ہے۔ چنانچہ ان کی زندگی میں جو بے فیشن پرستی، آزادی، بیباکی اور بے باکی نظر آتی ہے یہ سب اس تہذیب کا کرشمہ ہے۔

(۴) ان کے خیالات اور افکار میں اس قدر بے راہ روی پیدا ہو گئی ہے کہ وہ اب بزرگوں کی نصیحت کو خاطر ہی میں نہیں لاتے اور اپنی بربادی کو ترقی سمجھتے ہیں۔

(۵) لیکن حقیقتِ حال یہ ہے کہ اس تہذیب کی بدولت وہ اپنی ملی روایات سے بالکل بیگانہ ہو چکے ہیں۔ اور اب انھیں اپنے اسلاف کے طریقوں سے کوئی وابستگی باقی نہیں رہی ہے۔

(۶) اب ان کی زندگی میں ہمدردی کے بجائے رشک و حسد، غیرت کے بجائے خود فروشی، صبر و استقلال کے بجائے ناشکیبائی اور ضبطِ نفس کے بجائے ہوسناکی کارفرما ہے۔

(۷) اگرچہ اس تہذیب کی بنا پر ہر طرف ترقی کا شور برپا ہے اور بیداری کے آثار نظر آ رہے ہیں لیکن اس کے باوجود میں اپنی قوم کے نوجوانوں سے یہ کہنا چاہتا ہوں

(۸) کہ اے مسلمان نوجوانو! یہ جو کچھ "ترقی" تم کر رہے ہو، یہ تمہاری ذاتی خوبی کی بنا پر نہیں ہے۔ تم نے اپنے آپ کو مستعار لباس سے آراستہ کر رکھا ہے۔ اگر واقعی تم ترقی کے آرزو مند ہو تو غیروں کی تہذیب کے بجائے اپنی قومی روایات پر عامل ہو کر دنیا میں عزت حاصل کرو یعنی مسلمان رہ کر دنیا میں چمکو تو یہ قابلِ فخر بات ہے۔

والدہ مرحومہ کی یاد میں

حلِّ لغات:۔ زندگی متقدر ہے یعنی مشیتِ ایزدی کا پابند ہے۔ شکست انجام یعنی غنچہ کے سبو کا انجام شکست (فنا) ہے۔ غنچہ کا سبو یعنی غنچہ۔ زنجیر عالم گیر سے اللہ کا قانون مراد ہے جس میں ہر شی جکڑی ہوئی ہے۔ سیل رواں یعنی سیلاب۔ بادہ دارِ رنگِ عنابی یعنی سرخ آنسوؤں سے لبریز۔ آلام الم کی جمع ہے۔ نیرنگیٔ دوراں یعنی وہ تبدیلیاں جو دنیا میں ہر وقت ہوتی رہتی ہیں۔ نیرنگ کے لغوی معنی ہیں دھوکہ، فریب یا طلسم قاصد سے یہاں باعث یا محرک مراد ہے۔ آئینہ سے دل مراد ہے۔ . . . . . .
. . . . گنج آب آورد سے آنسوؤں کی جھڑی مراد ہے۔ حیرتی بمعنی حیران۔ پابپا یعنی قائم یا وابستہ۔ اوج گاہ بمعنی بلندی۔ طفل سادہ۔ بے وقوف یا بھولہ بچہ کھوئے ہوئے فردوس سے بچپن مراد ہے۔ وہ جوان۔ اشارہ ہے اپنے بھائی کی طرف۔ ہم پہلو۔ رفیق یا شیر۔ بازو بمعنی مددگار۔ مسا بمعنی شام۔ برنا و پیر۔ جوان اور بوڑھا۔ دخترانِ مادرِ ایام سے وہ آفات اور مصائب مراد ہیں جو دنیا میں رونما ہوتی رہتی ہیں۔ چونکہ آفات، زمانہ کی بدولت پیدا ہوتی ہیں۔ اس لئے اس کو مادر قرار دیا ہے۔ کلبہ بمعنی گھر یا مکان۔ طوقِ گلو افشار۔ گلے کو بھینچ دینے والا طوق۔ کنایہ ہے مصیبت سے۔ نہ پردہ گردوں سے نو آسمان مراد ہیں۔ قدیم فلسفہ کی رو سے آسمان نو ہیں۔ خاک پا سپرِ گئے لغوی معنی ہیں وہ خاک جو ایک دن فنا ہو جائے گی۔ کنایہ ہے جسم خاکی سے۔ مشرق

غبار، کنایہ ہے جسم خاکی سے، جو روح کے لیے عارضی محمل ہے۔ ذوق حفظ زندگی، زندگی کی حفاظت (بقاء) کا جذبہ۔ نقش سے وہ صورتیں مراد ہیں۔ جو دنیا میں بنتی رہتی ہیں حجت بمعنی دلیل۔ شہید آرزو یعنی آرزو میں مبتلا۔ سر بزانو یعنی حیران آں سوئے افلاک لغوی معنی ہیں افلاک کے اس طرف مراد ہے عالم لاہوت یا غیر مادی عالم۔ قدسیوں سے فرشتے مراد ہیں کیونکہ وہ گناہ سے پاک ہیں۔ کم بہا یعنی کم قیمت۔ اپنا آفتاب یعنی روح انسانی۔ شیرازہ بند۔ جمع کرنے والی۔ تجدید مذاقِ زندگی یعنی زندگی کی کیفیت کو از سر نو پیدا کرنا۔ جمز سنجیدن پر یعنی اڑنے کے لیے پر تولنے کے علاوہ۔ سرشک آباد وہ جگہ جو آنسوؤں سے آباد ہو۔ جوہر انسان یعنی روح یا نفس ناطقہ۔ دلآسائی بمعنی راحت یا سکون یا تسکین۔ رودبار، دریا۔ عروس دلہن۔ ہمکنار، ہم آغوش۔ دام سیمین تخیل تخیل کا وہ جال جو چاندی کے تاروں سے بنایا گیا ہو۔ مراد ہے دلکش تخیل آفاق گیر ساری دنیا کو قابو میں لانے والا۔ جولانگاہ میدانِ عمل۔ خاکی شبستان یعنی قبر۔ سبزۂ نورستہ وہ سبزہ جو نیا (تازہ) اگا ہوا ہو +

تبصرہ:۔ اقبال نے یہ نظم، جس کا ہر شعر سوز و گداز میں ڈوبا ہوا ہے، اور جس کا ہر بند عبرت اور تفکر کا مرقع ہے، اپنی والدہ ماجدہ مرحومہ کی یاد میں لکھی ہے اور حق یہ ہے کہ اس میں انھوں نے الفت فرزندی کی تصویر کھینچ دی ہے لیکن جذبات سے قطعِ نظر کے، اس نظم کی سب سے بڑی خصوصیات یہ ہے کہ اس میں انھوں نے موت و حیات کے فلسفہ کو نہایت عمدگی کے ساتھ بیان کیا ہے اور عام فہم مثالوں سے اس خشک موضوع کو بہت دلکش بنا دیا ہے۔ اس نظم میں تیرہ ۱۳ بند ہیں پہلے ہر بند کا مطلب لکھونگا پہلے بند میں اس حقیقت کو واضح کیا ہے کہ کائنات میں ہر شئے تقدیر الٰہی کی پابند ہے۔

دوسرے بند میں یہ بتایا ہے کہ جب انسان کو اس حقیقت کا علم ہو جاتا

ہے کہ ہیں خدا کی مشیئت کے سامنے مجبور ہوں تو وہ سر تسلیم خم کر دیتا ہے۔
تیسرے بند میں یہ بتایا ہے کہ والدہ مرحومہ کے تصور سے مجھے اپنا بچپن یاد آ گیا۔
چوتھے بند میں یہ بتایا ہے کہ ماں کی نظر میں اس کا جوان بیٹا بھی بچہ ہی ہوتا ہے۔
پانچویں بند میں اپنی مادر مشفقہ کو یاد کیا ہے اور اپنے درد دل کا اظہار کیا ہے۔
چھٹے بند میں یہ بتایا ہے کہ دنیا مصائب کا گھر ہے اور موت سے کسی کو مفر نہیں
ساتویں بند میں یہ بتایا ہے کہ موت، انسانی زندگی کو فنا نہیں کر سکتی۔
آٹھویں بند میں یہ بتایا ہے کہ قدرت خود زندگی کی محافظ ہے۔
نویں بند میں یہ بتایا ہے کہ روح انسانی، فنا سے پاک ہے۔
دسویں بند میں یہ بتایا ہے کہ موت، تجدید مذاق زندگی کا دوسرا نام ہے یعنی موت وہ دروازہ ہے جس میں سے گذر کر ہم زندگی کی دوسری اور بلند تر منزل میں داخل ہوتے ہیں۔
گیارھویں بند میں سابقہ مضمون کو واضح کیا ہے کہ جوہر انسان عدم سے آشنا نہیں ہوتا۔
بارھویں بند میں یہ بتایا ہے کہ مرقد انسان کی شب کا انجام بھی صبح ہوتا ہے۔ یعنی انسان بھی مر کر دوبارہ زندہ ہو جاتا ہے۔
تیرھویں بند میں والدہ مرحومہ کے لئے دعائیں کی ہیں۔
پہلا بند:۔ کائنات میں ہر چیز مشیئت الٰہی کی پابند ہے اور انسان جو تدبیر بھی اپنی بہتری کے لئے کرتا ہے وہ اسی وقت کامیاب ہوتی ہیں جب اللہ تعالیٰ بھی چاہے اگر وہ نہ چاہے تو کوئی تدبیر کارگر نہیں ہو سکتی یعنی تدبیر، تقدیر کے سامنے عاجز ہے۔
(۲) کائنات میں ہر شئی مجبور ہے آسمان، سورج، چاند اور ستارے حرکت

کرنے پر مجبور ہیں۔

(۲) غنچہ مجبور ہے کہ پھول بن کر مرجھا جائے اسی طرح سبزہ و گل بھی اگنے پر مجبور ہیں۔

(۳) بلبل کا نغمہ اور ضمیر کی آواز یعنی ہر شئی خواہ ظاہر ہو یا پوشیدہ، تقدیر الہی کی پابند ہے۔

دوسرا بند:۔ جب انسان اس حقیقت سے آگاہ ہو جاتا ہے کہ ذرہ ذرہ دہر کا زندانی تقدیر ہے تو وہ مشیئت ایزدی کے سامنے سر تسلیم خم کر دیتا ہے اور اس پر کوئی مصیبت وارد ہوتی ہے تو خاموشی کے ساتھ برداشت کرتا ہے کیونکہ وہ جانتا ہے کہ یہ سب مشیئت ایزدی کے مطابق ہے۔

(۲) پھر حالت یہ ہوتی ہے کہ انسان عیش اور غم دونوں سے بیگانہ ہو جاتا ہے نہ جینے کی خوشی نہ مرنے کا غم۔ زندگی تو رہ جاتی ہے لیکن لطف زندگی جاتا رہتا ہے۔

(۳) یہ علم و حکمت، یہ احساس کہ میں مشیئت ایزدی کے سامنے مجبور ہوں انسان کو رونے دھونے اور نالہ و فریاد کرنے سے باز رکھتا ہے۔ بالفاظ دگر جو شخص اس حقیقت سے آگاہ ہو جاتا ہے اس کا دل پتھر کا ہو جاتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ وہ دولت کے ملنے سے خوش نہیں ہوتا اور دولت کے چلے جانے سے رنجیدہ نہیں ہوتا۔

(۴) اگرچہ میری آنکھوں میں آنسو نہیں ہیں۔ یعنی میں اپنے غم کو ضبط کر رہا ہوں۔

(۵) اور چونکہ میں انسانی مصائب کا راز جانتا ہوں کہ جو خدا چاہتا ہے وہی ہوتا ہے انسان خدا کی مشیئت کے سامنے بالکل مجبور ہے، اس لئے میں کسی مصیبت پر شکوہ نہیں کرتا

(۶) اس لئے میں کسی سے زمانہ کی شعبدہ بازی کا تذکرہ نہیں کرتا۔ اس لئے اگر کوئی تکلیف یا مصیبت مجھ پر آتی ہے تو نہ میں حیران ہوتا ہوں نہ پریشان نہ خنداں نہ گریاں۔

(۷) لیکن اے مادرِ مہربان! جب میں تیری تصویر دیکھتا ہوں تو دل پر قابو نہیں رہتا۔ بے اختیار میری آنکھوں سے آنسو رواں ہو جاتے ہیں۔ یعنی تیری تصویر (تصور سے میری رائے میں والدہ مرحومہ کا تصور مراد ہے) میرے اس عقیدہ کی تردید کر دیتی ہے۔

"تیسرا بند": کسی کی یاد میں آنسو بہانے سے زندگی کی بنیاد مضبوط ہو جاتی ہے یعنی محبت کے سامنے عقل کی کوئی حقیقت نہیں ہے۔ واضح ہو کہ اقبال نے عقل کو سنگدل اس لئے کہا ہے کہ عقل ہمیں رونے سے باز رکھتی ہے۔

(۲) آہ و فریاد سے انسان کا دل منور ہو جاتا ہے۔ اسی لئے میں ہر وقت روتا رہتا ہوں

واضح ہو کہ اس مصرع میں "گنجِ آبِ آورد سے معمور ہے دامن مرا" صنعتِ مبالغہ پائی جاتی ہے لفظی ترجمہ اس مصرع کا یہ ہوگا کہ آنسوؤں کے خزانے سے میرا دامن معمور ہے۔ یعنی میں ہر وقت روتا رہتا ہوں۔

گنجِ آبِ آورد کی ترکیب بھی غور طلب ہے، اقبال نے اپنی ندرتِ طبع سے کام لے کر گنجِ بادآورد کے مقابلے میں گنجِ آبِ آورد کی ترکیب وضع کی ہے۔ گنجِ بادآورد خسرو پرویز کے آٹھ خزانوں میں سے ایک خزانہ کا نام تھا جو ادبِ فارسی میں بہت مشہور رہے حضرت اقبال نے، شدتِ گریہ کے اظہار کے لئے گنجِ آبِ آورد کی ترکیب وضع کر کے، اردو ادب کا دامن بہت وسیع کر دیا۔

(۳) مادرِ مرحومہ سے عالمِ خیال میں خطاب کر کے کہتے ہیں کہ میں تیری تصویر (یتر سے تصور) کے اعجاز پر حیران ہوں! اس میں ایسی قوت پائی جاتی ہے کہ اُس نے زمانہ کی رفتار کا رُخ بدل دیا یعنی آگے بڑھنے کے بجائے زمانہ پیچھے کی طرف لوٹنے لگا وہ اس طرح کہ

(۴) اُس نے ماضی کو حال کے ساتھ وابستہ کر دیا یعنی میں جوانی کے عالم میں ہوں لیکن بچپن کا دور میری آنکھوں کے سامنے آگیا۔

(۵) وہ زمانہ، جب میں تیری آغوش میں پرورش پا رہا تھا اور اچھی طرح بول بھی نہیں سکتا تھا۔

(۶) اور اب وہی میں ہوں کہ ساری دنیا میں میری گفتگو (شاعری) کا شہرہ ہے اور میرا کلام اہل نظر کی نگاہوں میں، موتیوں سے بڑھ کر ہے۔

چوتھا بند:۔ یہ ایک حقیقت ثابتہ ہے کہ انسان خواہ کتنا ہی عالم فاضل کیوں نہ ہو، اور کتنا ہی عمر رسیدہ کیوں نہ ہو، دنیاوی اعتبار سے کتنا بلند مرتبہ کیوں نہ ہو جسمانی اعتبار سے کتنا ہی طاقتور کیوں نہ ہو، لیکن جب وہ اپنی ماں کے سامنے آتا ہے تو از سر نو وہی طفل ناداں بن جاتا ہے جو کبھی تھا وہی ہنسی وہی بے فکری۔

پانچواں بند:۔ اب اقبال اپنی مادر مشفقہ کی یاد میں اپنے جذبات کا اظہار کرتے ہیں کہ اب کون میرا انتظار کیا کرے گا؟ کون میرے خط نہ ملنے سے بیقرار ہوا کرے گا؟ اب کون آدھی رات کو اٹھ کر میرے لئے دعا کیا کرے گا؟

اس کے بعد تصور میں اپنی ماں سے، جس کی پاؤں کے نیچے جنت ہے، خطاب کرتے ہیں کہ اے مادر مہربان! یہ آپ ہی کی تربیت کا فیض تھا کہ میں ستاروں کا ہمنشیں بن گیا۔ آپ ہی نے میرے دل میں اسلام کی محبت کا چراغ روشن کیا۔ آپ ہی نے مجھے اولیاء اللہ سے محبت کرنا سکھایا۔ آپ ہی کی نگاہ سے میرے اندر قوم کا عشق پیدا ہوا جسکی بدولت میرے باپ دادا (خاندان) کا نام دنیا میں روشن ہو گیا۔ اے مادر مہربان! دنیا میں آپ کی زندگی نہایت قابل قدر تھی اور میں نے آپ سے دینی اور دنیاوی دونوں قسم کی نعمتیں حاصل کیں۔

افسوس یہ ہے کہ آپ نے ساری عمر میری خدمت کی لیکن جب میں آپ کی خدمت کے لائق ہوا تو آپ رخصت ہو گئیں۔

میرا بڑا بھائی جو میرا محسن بھی ہے رفیق بھی ہے مشیر بھی ہے، اور غمگسار بھی آپ

کی وفات پر بچوں کی طرح پھوٹ پھوٹ کر روتا ہے۔

اگرچہ ہم دونوں میں پہلے بھی بہت محبت تھی لیکن شرکت غم سے وہ محبت اور محکم ہو گئی۔

چھٹا بند:۔ یہ دنیا کیا ہے؟ ایک ماتم خانہ ہے جس میں ہر شخص مصروف ماتم نظر آتا ہے۔ خواہ جوان ہو یا بوڑھا۔

(۲) یہاں زندگی بسر کرنا تو دشوار ہے لیکن موت نہایت ارزاں ہے اور ہر جگہ مل سکتی ہے ہوا کی طرح موت بھی ہر جگہ پائی جاتی ہے۔

(۳) دنیا میں امراض کے علاوہ موت کی اور صورتیں بھی تو ہیں مثلاً زلزلے، بجلیاں قحط سیلاب اور جنگ وغیرہ۔

(۴) موت ہر جگہ ہے۔ فقیر کے "کلبۂ احزاں" سے لے کر بادشاہ کے عشرت کدہ تک ہر جگہ۔

(۵) اس کی حکومت ہے خشکی کے علاوہ سمندر میں بھی اس کا راج ہے۔

(۶) نہ کوئی شخص موت سے بچ سکتا ہے اور نہ اُسے ٹال سکتا ہے۔ اور نہ کوئی شخص کسی سے یہ پوچھ سکتا ہے کہ فلاں شخص کو بیٹھے بٹھائے موت کیوں آ گئی غور سے دیکھو تو زندگی کیا ہے، سراسر مصیبت ہے۔

(۷) یہ دنیا ایک پلیٹ فارم ہے جہاں سے ہر وقت ہر لحہ موت کی گاڑی روانہ ہوتی رہتی ہے۔ گویا ہر وقت چل چلاؤ لگا ہوا ہے۔ اور ہر شخص اپنے عزیزوں کی جدائی میں آنسو بہاتا رہتا ہے۔

ساتواں بند:۔ لیکن آخر کار امتحان کا دور (موت کا سلسلہ) ختم ہو جائے گا اس دنیاوی زندگی کے بعد دوسری زندگی ضرور نصیب ہو گی۔

(۲) یہ مانا کہ اس دنیا میں ہر شخص غمگین ہے لیکن موت کے بعد ہمیشگی حاصل

(۳) ہو گی تو زندگی کے باغ میں از سرِ نو بہار آجائے گی۔
(۴) اگر اس مٹی کے جسم میں ہماری روح مقید ہے تو کوئی گھبرانے کی بات نہیں ہے
(۵) زندگی (روح انسانی) کا انجام فنا یا نیستی نہیں ہے۔
آٹھواں بند: اب اقبالؔ زندگی کا فلسفہ بیان کرتے ہیں:۔
(۲) زندگی (اصول حیات) فطرت کی نظر میں اس قدر قیمتی ہے کہ اس نے ہر شی کے اندر اس کی حفاظت کا جذبہ پیدا کر دیا ہے۔ اگر موت، زندگی کو فنا کر دینے پر قادر ہوتی تو فطرت موت کو اس قدر عام نہ کرتی۔
(۳) چونکہ موت عالمگیر ہے اس لئے یہ نتیجہ نکلتا ہے کہ اس کی حقیقت خواب سے زیادہ نہیں ہے جس طرح خواب سے زندگی میں خلل واقع نہیں ہو سکتا اسی طرح موت بھی زندگی کو ختم نہیں کر سکتی۔
(۴) اے مخاطب! تو موت سے ڈرتا ہے کیونکہ تو موت کی حقیقت سے واقف نہیں ہے نقش (انسان) کی ناپائیداری کا مطلب، وہ نہیں جو تو سمجھتا ہے، تو یہ سمجھتا ہے کہ موت انسان کو فنا کر دیتی ہے۔ یہ غلط ہے۔ صرف نقش فنا ہوتا ہے انسان بدستور باقی رہتا ہے
(۵) ہوا کو دیکھو وہ ہر وقت پانی کے بلبلوں کو توڑتی رہتی ہے، لیکن وہ اس بیدردی
(۶) سے اسی لئے توڑتی ہے کہ وہ ان کو دوبارہ پیدا کر سکتی ہے اور واقعی پیدا کرتی رہتی ہے۔
(۷) اسی طرح قدرت (خداوندی) اگر انسان کو موت دیتی ہے تو اسی لئے کہ وہ دوبارہ اُسے پیدا کر سکتی ہے اور کرتی ہے۔
(۸) ہوا کے طرزِ عمل سے ثابت ہے کہ وہ بلبلوں کی تعمیر پر قادر ہے۔ اسی طرح ہم کہہ سکتے ہیں کہ فطرت در اصل "شہید آرزو" ہے۔
(۹) یعنی اُسے یہ آرزو ہے کہ میں بہتر سے بہتر انسان پیدا کر دوں، اس لئے وہ

خوب تر پیکر کی تلاش میں، پیکر موجودہ کو مٹاتی رہتی ہے (ادنیٰ کو مٹا کر اعلیٰ بناتی رہتی ہے)۔

نواں بند:۔ اب بقائے روح کو دوسری مثال سے سمجھاتے ہیں۔

(۱) ذرا آسمان کے ستاروں پر غور کرو جو رات کو حُسن عطا کرتے ہیں۔

(۲) انسان کی عقل حیران ہے، وہ نہیں بتا سکتی کہ ستارے کب پیدا ہوئے تھے۔

(۳) تو حضرت انسان، جو اس قدر بلند مقاصد رکھتا ہے۔ جو مقاصد کی پاکیزگی میں فرشتوں سے بھی بڑھ کر ہے جو محفل قدرت میں، شمع کی حیثیت رکھتا ہے، اگر وہ نہ ہو تو ساری کائنات میں اندھیرا ہو جائے یعنی ساری کائنات بیکار ہو جائے۔

(۴) جس کے تخیلات میں اس قدر وسعت ہے کہ اس کے سامنے آسمان ایک نقطہ سے زیادہ نہیں ہے۔

(۵) جو دنیا میں اللہ کے نام کو بلند کرنا چاہتا ہے اور جس کا وجود اس کائنات کے لئے اتنا ہی ضروری ہے جتنا ستار کے لئے مضراب کا۔ یعنی دنیا کی رونق اس کی ذات پر موقوف ہے۔

"جس کی نادانی صداقت کے لئے بیتاب ہے" بہت بلیغ مصرع ہے۔ اس میں لفظ "نادانی" قرآن مجید کی اس آیت سے ماخوذ ہے اِنَّهٗ كَانَ ظَلُوْمًا جَهُوْلًا۔ یعنی انسان ظالم ہے اور جاہل بھی۔ اقبال نے اس حقیقت کو اس مصرع میں بھی نظم کیا ہے

ع ہائے کیا اچھی کہی ظالم ہوں میں، جاہل ہوں میں

یعنی انسان صداقت (توحید) کے اظہار کے لئے ساری دنیا سے قطع تعلق کر سکتا ہے۔

(۶) تو کیا یہ انسان، اپنی ذات کے لحاظ سے، آسمان کے ستاروں سے بھی کمتر ہے؟

دسواں بند:۔ اسی سابقہ مضمون کو تیسری مثال سے سمجھاتے ہیں۔

(۱) ذرا پھول کی زندگی پر غور کرو۔ آپ تخمِ گل کوزہ میں بوتے ہیں۔ وہ مٹی میں چھپ جاتا ہے لیکن مٹی میں مل کر بھی ظہور کے لئے بیتاب رہتا ہے۔

(۲) یعنی مٹی میں پوشیدہ ہو جانے سے اُس کی زندگی کا شعلہ تو فنا نہیں ہو جاتا۔

(۳) وہ بدستور ابھرنے کے لئے آمادہ رہتا ہے۔

(۴) چنانچہ کچھ دنوں کے بعد وہ تخم اپنی "تربت" سے نکل کر پھول کی شکل میں دنیا میں ظاہر ہو جاتا ہے۔

(۵) مطلب یہ نکلا کہ گل کی لحد خود اس کی حیاتِ ثانیہ کا انتظام کرتی ہے۔ کتنا عجیب قانونِ قدرت ہے! تو

(۶) کیا موت، دراصل روح کے فنا کا نام نہیں ہے بلکہ زندگی کی کیفیت میں ایک خاص انقلاب کا نام ہے۔

(۷) اندریں حالات (جب یہ ثابت ہو چکا کہ موت، فنائے کلّی کا نام نہیں ہے، انسان کو مرنے سے مطلق ہراساں نہیں ہونا چاہئے۔ کیوں؟ اس لئے کہ موت تو دوسری دنیا میں جانے کے لئے "پرتولنے" یعنی تیاری کرنے کا نام ہے۔

گیارھواں بند:۔ (۱) لوگ کہتے ہیں کہ "موت کا کوئی علاج نہیں، اور مرنے والوں کی جدائی کا صدمہ، کچھ عرصہ کے بعد زائل ہو جاتا ہے"۔

(۲) لیکن جذباتی قسم کے انسان کا دل، جس میں مرنے والوں کا غم آباد ہے، صبح و شام یعنی زمانہ کی قید سے آزاد ہے۔ اس لئے وقت کا مرہم اس کے زخم کو شفا نہیں دے سکتا۔ واضح ہو کہ اس شعر کے پہلے مصرع میں تعقید لفظی پائی جاتی ہے۔ اس کی نثر یوں ہوگی و دیگر (وہ) دل، جہاں (جس میں مرنے والوں کا غم آباد ہے" وقت (زمانہ) اُن کے غم کو زائل نہیں کر سکتا، وہ ہمیشہ اپنے محبوب کو یاد رکھتے ہیں اور اس کے غم میں

روتے رہتے ہیں۔ چنانچہ اگلے شعر میں اقبال نے خود اس کی وضاحت کردی ہے۔

(۳) طویل زمانہ گذر جانے کے بعد بھی اُن کا غم زائل نہیں ہوتا۔ یعنی وقت، جدائی کے زخم کو اچھا نہیں کر سکتا۔

(۴) جب انسان پر کوئی مصیبت پڑتی ہے تو وہ رونے لگتا ہے۔

(۵) اور رنج وغم اس کی عادت بن جاتا ہے۔ اس کے دل کو نالہ و فریاد سے ایک مستقل وابستگی ہو جاتی ہے۔

(۶) اگرچہ انسان، اس صدمہ کی تاب نہیں لا سکتا لیکن اس کے دل میں یہ احساس

(۷) ضرور پوشیدہ طور پر موجود ہے کہ انسان مرنے کے بعد فنا نہیں ہو جاتا۔

(۸) اگرچہ غم، انسان کو زندہ درگور کر دیتا ہے اور بسا اوقات وہ لطفِ ہستی سے محروم ہو جاتا ہے لیکن یہ احساس، کہ میرا محبوب فنا نہیں ہوا ہے، اُس کے غم کو کسی حد تک کم کر دیتا ہے۔ یعنی یہ احساس، گویا وہ پانی ہے، جس سے غم کی آگ ٹھنڈی ہو جاتی ہے۔

(۹) یاد رکھو! یہ ضبط فغاں، یعنی اگر انسان، اپنی فغاں کو ضبط کر لیتا ہے، تو اس کی وجہ یہ نہیں ہے کہ وہ اپنے محبوب کی یاد سے غافل ہو جاتا ہے بلکہ یہ آگہی (شعور) اس کے غمزدہ دل کو تسلی دے دیتی ہے کہ میرا محبوب فنا نہیں ہوا۔

بارھواں بند:۔ اب ایک مثال سے اس حقیقت کو واضح کرتے ہیں:۔

(۱) غور کرو! جب صبح ہوتی ہے تو وہ تمام چیزیں جو رات کے وقت "مردہ" تھیں، دوبارہ زندہ ہو جاتی ہیں۔

(۲) لالۂ افسردہ، دوبارہ تر و تازہ ہو جاتا ہے۔ پھول شگفتہ ہو جاتے ہیں۔ چڑیاں چہچہانے لگتی ہیں۔

(۳) بلبل گانے لگتی ہے۔ قصہ مختصر فضا، طائروں کے نغموں سے گونج اٹھتی ہے ہر طرف زندگی کے آثار نمودار ہو جاتے ہیں۔

(۴) باغوں میں پہاڑوں میں دریاؤں اور خشکی میں جتنے جاندار رات کو سوئے ہوئے تھے سب بیدار ہو جاتے ہیں۔ یعنی دوبارہ زندگی حاصل کرتے ہیں۔

(۵) پس اگر ہستی کا قانون یہ ہے کہ ہر شام کے بعد صبح ہے یعنی ہر موت کے بعد زندگی ہے تو انسان مر کر، دوبارہ زندہ کیوں نہیں ہوگا؟

تیرھواں بند:۔ آخری بند میں پھر والدہ مرحومہ سے خطاب کرتے ہیں:۔

(۱) اے مادر مہربان! میرا تخیل اس قدر زبردست ہے کہ ساری دنیا اس کے قبضہ میں ہے چنانچہ اس کی بدولت میں نے تیری یاد کو بھی اپنے قبضہ میں کر لیا۔

(۲) اور جسطرح کعبہ کی فضا، دعاؤں سے معمور ہے اسی طرح میرے دل کی فضا، تیری یاد سے معمور ہے۔

(۳) زندگی فرائض کے ایک طویل سلسلہ کا نام ہے۔ چنانچہ اس کا سلسلہ صرف اسی جہاں میں محدود نہیں ہے بلکہ اس کی جلوہ گاہیں بہت سی ہیں۔

(۴) اور زندگی ہر جلوہ گاہ (دنیا) میں مختلف طور طریقے رکھتی ہے جسے ہم آخرت کہتے ہیں وہ کیا ہے؟ نئی قسم کی زندگی کا دوسرا نام ہے۔ یعنی مرنے کے بعد، انسانی زندگی ایک نئی منزل میں داخل ہوتی ہے اور وہاں اس کی رسم و راہ (طریق عمل) اس دنیا سے مختلف ہوگی۔

(۵) اگر وہاں انسان کے پاس، اس دنیا کے اعمال صالحہ کا حاصل (سرمایہ) نہیں ہوگا۔ یعنی اگر انسان نے اس دنیا میں، اُس دنیا کے لئے کوئی سرمایہ .... جمع نہیں کیا تو وہاں وہ انسان اجل کا لقمہ بن جائیگا۔ اور جو لوگ یہاں سے عمل صالح کا سرمایہ اپنے ساتھ لے جائیں گے وہ وہاں ہمیشگی کی زندگی حاصل کرلیں گے بالفاظ دگر، اگر اس دنیا میں عمل صالح کا تخم بو دیا ہے تو اس دنیا میں اس کا پھل کھا سکتے ہیں

(۶) یاد رکھو! تمھاری روح (نور فطرت) ہمیشہ کے لئے جسم کی قید میں نہیں ہے۔

وہ اس دنیا میں بیشک جسم سے وابستہ ہے لیکن اس کے معنی یہ نہیں کہ وہ ہمیشہ اس جسم کی تاریکی میں مقید رہیں گی۔ انسانی قوت فکر، مادیات سے بالاتر بھی ہو سکتی ہے یعنی عقل کا تقاضا ہے کہ انسان اس عالم میں بھی ترقی کرے گا۔

(۷) اب اقبال اپنی والدہ مرحومہ کے حق میں اللہ تعالیٰ سے دعا کرتے ہیں۔ لے مادر مشفقہ! آپ کی زندگی، نور اسلام اور ضیائے ایمان کی بدولت چاند سے بھی زیادہ روشن تھی اور آپ کی رحلت نجم السحر سے بھی زیادہ قابل ستائش تھی یعنی آپ کا انجام بھی بخیر ہوا۔ کیونکہ آپ کا خاتمہ ایمان پر ہوا!

(۸) خدا کرے آپ کی قبر ہمیشہ نور سے معمور اور منور رہے۔

(۹) اور آسمان سے آپ کی قبر پر ہمیشہ رحمتِ الٰہی کا نزول ہوتا رہے۔

شعاعِ آفتاب

حل لغات: سودائی نظارہ تھی یعنی جب میں طلوع آفتاب کا نظارہ کر رہا تھا۔ لذت تنویر۔ دوسروں کو روشن کرنے کی آرزو۔ مستوں سے غافل انسان مراد ہے۔

مطلب: کہتے ہیں کہ صبح کے وقت میں نے ایک شعاع کو دیکھا کہ وہ بہت مضطرب تھی میں نے اس سے پوچھا کہ تو اس قدر مضطرب کیوں ہے؟ کیا تو کوئی بجلی ہے جس کو آسمان قوموں کی بربادی کے لئے تیار کر رہا ہے؟

یہ سُن کر اس شعاع نے جواب دیا کہ میری زندگی میں بڑے ہنگامے پوشیدہ ہیں اس کی وجہ یہ ہے کہ میں نے صبح کی آغوش میں پرورش پائی ہے۔ لہٰذا میں دوسروں کو منور کرنے کے لئے بیتاب ہوں۔ اگرچہ میں ناری ہوں لیکن بجلی نہیں ہوں۔ میرا کام دوسروں کو جلانا نہیں بلکہ بیدار کرنا ہے میں چاہتی ہوں کہ انسانوں کو بیدار کردوں اس لئے میں تجھ سے یہ دریافت کرتی ہوں کہ تیری قوم میں کوئی شخص، اسرار کائنات

کے سمجھنے اور فطرت کا مطالعہ کرنے کا بھی آرزومند ہے تاکہ میں اس کی آنکھوں میں سرمہ بن کر سما جاؤں؟ اس نظم میں اقبال نے مسلمانوں کو سحر خیزی کی تلقین کی ہے۔

عُرفی

حلِ لغات: ۱۔ عُرفی۔ ایران کے اُن شعرا میں سے ہے جنھوں نے ہندوستان میں شہرت حاصل کی۔ وہ ۱۵۵۶ء میں پیدا ہوا تھا۔ اکبر مرتبہ کے عہد میں یہاں آیا، اور ۳۶ سال کی عمر پا کر ۱۵۹۲ء میں فوت ہوگیا۔ لاہور میں دفن ہوا۔ تمام تذکرہ نگار متفق ہیں کہ اس کی طبیعت میں غضب کی جدت تھی اور طرزِ بیان میں بے پناہ زور تھا۔ تخیل کی بلندی کے لحاظ سے، فارسی کے صرف چند شعرا اس کا مقابلہ کر سکتے ہیں۔ مجھے اس کی شاعری میں انسانی تخیل کی معراج نظر آتی ہے۔ چنانچہ علامہ اقبال نے خود اس نظم کے پہلے شعر میں اس حقیقت کا اعتراف فرمایا ہے۔ حیرت خانہ سینا۔ یعنی حکیم ابو علی سینا کا فلسفہ۔ یہ شخص اپنے زمانہ میں طب، ریاضی، منطق، فلسفہ اور کلام میں اپنا جواب نہیں رکھتا تھا بعض لوگوں کی رائے میں اس سے بڑا فلسفی مسلمانوں میں پیدا نہیں ہوا۔ وہ ۹۸۰ء بخارا کے قریب ایک گاؤں میں پیدا ہوا تھا اور اس نے ۱۰۳۶ء میں وفات پائی۔ اس کی تصانیف میں اشارات، شفا اور قانون بہت مشہور ہیں۔ فارابی، اس کا نام محمد بن طرخان ابو نصر فارابی تھا۔ ابن خلکان کی رائے میں کوئی مسلمان فلسفی اس کے مرتبہ کو نہیں پہنچ سکا۔ غالباً ۸۷۰ء میں بمقام فاراب ترکستان میں پیدا ہوا اور ۹۵۰ء میں دمشق میں وفات پائی۔ اُس نے دنیا کے تمام علوم و فنون پر کتابیں لکھی تھیں۔ ابن سینا نے ارسطو کی.... مابعد الطبیعات کے مطالب پر فارابی ہی کی شرح کی بدولت عبور حاصل کیا تھا یہی وجہ ہے کہ مسلمان حکما، اس کو معلم ثانی کہتے ہیں۔

تبصرہ:۔ اقبال نے اس نظم میں عرفی کے ایک مشہور شعر پر تضمین کی ہے اور ضمناً

اس کی خدمت میں خراج تحسین بھی پیش کر دیا ہے۔

(۱) عرفی کا شاعرانہ تخیل اسقدر بلند ہے کہ ابن سینا اور الفارابی کا فلسفہ بھی اس پر نثار ہے واضح ہو کہ یہ شاعرانہ انداز بیان ہے جس کا مطلب یہ ہے کہ عرفی کا تخیل بہت بلند ہے۔ ورنہ اقبال سے بہتر کون جان سکتا ہے کہ شعراء اور حکماء کا دائرہ ایک دوسرے سے جدا ہوتا ہے اس لئے ان دونوں میں منطقی اعتبار سے موازنہ نہیں ہو سکتا۔

(۲) اس کلام میں عاشقانہ سوز و گداز اس درجہ پایا جاتا ہے کہ پڑھنے والا بیتاب ہو جاتا ہے۔

(۳) ایک دن میں نے اس سے یہ کہا کہ اب مسلمانوں میں جدو جہد کا جذبہ سرد ہو گیا ہے۔

(۴) اور ان میں وہ تڑپ نظر نہیں آتی جو ان کے اسلاف کا امتیازی نشان تھی

(۵) چونکہ قوم خواب غفلت سے بیدار ہونا نہیں چاہتی اس لئے میرا پیغام بیداری انھیں پسند نہیں آتا یعنی وہ میرے پیغام کی طرف متوجہ نہیں ہوتے۔

(۶) اور وہ متوجہ بھی کیسے ہو سکتے ہیں؟ جب کوئی قوم تاریکی (غفلت) کو مقصد حیات بنالے تو روشنی (اسلام) کی طرف کیسے مائل ہو سکتی ہے؟

(۷) عرفی نے یہ سن کر جواب دیا کہ اسے اقبال اپنی قوم کی شکایت مت کر بلکہ اگر تو یہ دیکھتا ہے کہ تیری قوم گہری نیند سو رہی ہے (بہت زیادہ غافل ہے) تو اپنی لے اور اونچی کر دے اور اگر قوم شریعت کی پابندی (محمل) کو گراں خیال کرتی ہے تو اپنا پیغام (حدی) زیادہ جوش و خروش کے ساتھ اس کو سنا۔ حدی۔ وہ نغمہ ہے جو عرب لوگ اونٹوں کو سناتے ہیں اور اس نغمہ سے مست ہو کر اونٹ تیز چلنے لگتے ہیں۔

ایک خط کے جواب میں

حلّ لغات: ہوس سے اس جگہ آرزو مراد ہے۔ تگ و تاز۔ جد و جہد یا کوشش۔ تلاش سے کوشش (خوشامد مراد ہے)۔ ریزہ کار صنعت و حرفت کی اصطلاح میں اس کاریگر کو کہتے ہیں جو بہت باریک یا مہین کام کر سکتا ہو۔ یہاں مراد ہے دقیقہ سنج یا وہ شاعر جو بہت مشکل مضامین باندھ سکے۔ فتنہ تراش سے مراد ہے وہ شخص جو جوڑ توڑ میں ماہر ہو۔ یہ فن موجودہ زمانہ میں ترقی کے لئے شرط اولین ہے۔ مثالِ سحاب۔ بادل کی طرح۔ دریا پاش یعنی بہت زیادہ فیض پہونچانے والا۔ عقدہ ہائے سیاست سے وہ سیاسی گتھیاں مراد ہیں جن کو سلجھائے بغیر آدمی آگے نہیں بڑھ سکتا۔ فیض عشق سے ناخن ہے میرا سینہ تراش۔ اس نظم میں بہترین مصرع ہے یعنی میں اپنی قوم کے عشق میں رات دن تڑپتا رہتا ہوں۔ ہوائے بزم سلاطین سے حکمراں طبقہ کی صحبت مراد ہے۔ دلیلِ مردہ دلی یعنی صرف وہ لوگ بادشاہوں (حکمرانوں) کی صحبت کے آرزومند ہوتے ہیں جن کا دل "مردہ" ہو چکا ہو۔

مطلب:۔ اقبال کے ایک دوست نے، جن کا نام انھوں نے مصلحتاً ظاہر نہیں کیا ایک دفعہ اپنے خط میں یہ مشورہ دیا تھا کہ کبھی کبھی حکام کو اپنے یہاں کھانے پر مدعو کر لیا کیجئے اور چیف جسٹس کو کسی ترکیب سے "رام" کیجئے۔ مثلاً کسی ہندو کے یہاں شادی کے موقع پر اس سے مل کر، اپنے اشعار کے "لعل" اس پر نثار کیجئے۔ کیا عجب کہ اس شادی اور لعل کے سنجوگ سے آپ کا کام بھی بن جائے۔ ڈاکٹر صاحب نے اس خط کے جواب میں یہ نظم سپرد قلم کی جو ان کی استاد طبع کی سچی تصویر ہے۔

(۱) کہتے ہیں کہ اے دوست! اول تو مجھے عہدوں، خطابوں اور جاگیروں کی آرزو نہیں، اور اگر ہو بھی تو مجھ میں دوڑ دھوپ کی ہمت نہیں۔ اور تم جانتے ہو کہ دنیاوی عزت

حاصل کرنے کے لیے 'بھاگ دوڑ' پہلی شرط ہے' جیسا کہ لسان العصر حضرت اکبر الہ آبادی نے اس شعر میں واضح کر دیا ہے:۔

شوق لیلائے سول سروس نے مجھ مجنوں کو،

اتنا دوڑایا، لنگوٹی کر دیا پتلون کو

(۲) میں خدا کا شکر ادا کرتا ہوں کہ اُس نے مجھے دقیقہ سنج طبیعت عطا فرمائی ہے اور مجھ میں جوڑ توڑ کا مادہ بالکل نہیں ہے جو حصول جاہ کے لیے دوسری شرط ہے۔

(۳) میں تو اپنے کلام سے اپنی قوم کو زندہ کرنا چاہتا ہوں بلکہ میرا کلام اُس بادل کی طرح ہے جو سارے عالم کو سیراب کرتا ہے۔

(۴) چوں کہ میں اپنی قوم کی زبوں حالی سے سخت رنجیدہ ہوں بلکہ اس کے غم میں دن رات گھُل رہا ہوں اس لئے سیاست کی گتھیاں سلجھانا میرے بس کی بات نہیں۔

(۵) میں تو یہ سمجھتا ہوں کہ حکام کی صحبت کا آرزومند وہی ہوتا ہے جس کا دل مردہ ہو جاتا ہے۔ جب تک کسی کے دل میں زندگی کی رمق باقی ہے وہ انگریز سے ملنے کا متمنی نہیں ہو سکتا۔ چنانچہ عارف شیرازی نے اس حقیقت کو یوں واضح کیا ہے کہ اے مسلمان!

(۶) اگر تو برگزیدہ اور پاکباز لوگ (خضر) کی صحبت کا آرزومند ہے تو بادشاہوں اور حکام (اسکندر) کی آنکھوں سے اسی طرح پوشیدہ ہو جا جیسے آب حیواں پوشیدہ ہو گیا تھا کیونکہ وہ اس کے لائق نہیں تھا یہ نعمت تو خضر کے لئے مخصوص تھی۔

نوٹ:۔ اس نظم میں اقبال نے قوم کو اس نکتۂ زرین سے آگاہ کیا ہے کہ اگر ہمیشہ کی زندگی چاہتے ہو تو بادشاہوں کی صحبت سے دور رہو۔ ان کے پاس بیٹھ کر نفس امارہ تو بے شک زندہ ہو جاتا ہے لیکن دل مردہ ہو جاتا ہے ۔۱۲۔

نانک

حلّ لغات :۔ قوم سے ہندو قوم مراد ہے۔

گوہر یکدانہ۔ بے نظیر موتی۔ قابل جس میں کسی بات کے قبول کرنے کی صلاحیت یا استعداد ہو۔ شودر۔ ہندوؤں کی چوتھی اور سب سے نیچی ذات جس کے افراد اونچی ذات والوں کی خدمت کرتے ہیں۔ مئے پندار۔ تکبر، گھمنڈ۔ شمع گوتم سے گوتم بدھ کی تعلیمات مراد ہیں۔ محفل اغیار سے ہندوستان کے علاوہ دوسرے ممالک مراد ہیں مثلاً تبت، چین، برہما اور لنکا۔ بت کدہ سے ہندوستان مراد ہے۔ نور ابراہیم سے توحید الٰہی مراد ہے۔ آذر کے گھر سے ہندو قوم مراد ہے۔

تبصرہ :۔ اقبال نے اس نظم میں گورو نانک مہاراج کی خدمت میں خراج تحسین پیش کیا ہے کیونکہ وہ خود بھی موحد مسلمان تھے اور انھوں نے ساری عمر توحید ہی کی تبلیغ و اشاعت میں بسر کی۔ افسوس کہ اس شرح میں، ان اسباب اور حالات کی تفصیل درج نہیں کی جا سکتی جن کی بنا پر، ان کے پیرو "سکھ" مسلمانوں کے دشمن بن گئے۔

اس قدر لکھنا کافی ہے کہ حضرت نانک مسلمان تھے اور ان کے اسلام پر ان کا کرتا جسے سکھ "چولا صاحب" کہتے ہیں، آج بھی گواہی دے رہا ہے۔

سدھارتھ گوتم جو دنیا میں مہاتما بدھ کے لقب سے مشہور ہے غالباً ۵۶۷ ق م میں شمالی ہند (بہار) کے ایک راجہ کے یہاں پیدا ہوا تھا جو کپل وستو میں راج کرتا تھا۔ انتیس سال کی عمر میں اس نے دنیا ترک کر دی اور دس سال کی ریاضت اور دماغی کاوش کے بعد اس نے یہ اعلان کیا کہ مجھے صحیح علم حاصل ہو گیا ہے چنانچہ اس نے اپنے خیالات کی تبلیغ شروع کی اور بہت جلد لاکھوں آدمی اس کے حلقہ بگوش ہو گئے جنھوں نے اسے بدھ کا لقب دیا یعنی وہ شخص جس کی روح منور ہو چکی ہے۔ اس کے

مذہب کی تفصیل تو اس جگہ درج نہیں کر سکتا، اتنا لکھنا کافی ہے کہ اُس نے ہندو دھرم کی کامل طور سے تردید کردی، اور انسانوں کو مساوات اور اعلیٰ درجے کی اخلاقی زندگی بسر کرنے کا پیغام دیا۔ اس کا اخلاقی نظام آٹھ اصولوں پر مشتمل ہے جس کو اشٹنگ مارگ کہتے ہیں یعنی صحیح خیال، صحیح عقیدہ، صحیح عمل، صحیح قول، صحیح کوشش، صحیح طریق معاش، صحیح گیان دھیان اور صحیح یادداشت۔ اس کے پیغام کا خلاصہ یہ ہے کہ انسان کو ایسی پاکیزہ زندگی بسر کرنی چاہیئے کہ کسی کو اس کی ذات سے کسی قسم کی تکلیف نہ پہونچے۔

مطلب:- (۱) افسوس ہے کہ ہندوؤں نے گوتم بدھ کے پیغام کو رد کر دیا۔ یعنی انھوں نے اپنی کم فہمی کی بناء پر اپنی قوم کے بہترین فرد کی کوئی قدر نہیں کی۔

(۲) افسوس ہے کہ ہندو اُس بڑی سچائی سے غافل رہے جو بدھ نے ان کے سامنے پیش کی تھی ان کا حال اس میوہ دار درخت کا سا ہوا کہ دوسرے اس کا پھل کھاتے ہیں لیکن خود وہ درخت اپنے پھل سے محروم رہتا ہے۔

(۳) اگرچہ گوتم بدھ نے ہندوؤں کو زندگی کی حقیقت سے آگاہ کیا کہ برہمن اور شودر دونوں بھائی بھائی ہیں۔ دونوں ایک آدم کی اولاد ہیں۔ ذات پات کا امتیاز بنی آدم کے حق میں سب سے بڑی لعنت ہے۔ اور نیک وہ ہے جو نیکی کرے اور پاکیزہ زندگی بسر کرے نہ کہ وہ جو نیکوں کے گھر میں پیدا ہو۔ لیکن افسوس کہ ہندو قوم اپنے خیالی فلسفہ یعنی ذات پات کے جھوٹے امتیاز میں مبتلا رہی۔ اور گوتم کے پیغام کو نہ سمجھ سکی۔

(۴) افسوس کہ ہندو قوم میں حق کو قبول کرنے کی صلاحیت ہی نہ تھی۔

(۵) افسوس کہ ہندوستان شودروں کے لیئے مدتوں سے رنج اور مصیبت کا گھر ہے کیوں کہ ہندو دھرم کی رو سے، ایک شودر خواہ وہ کتنا ہی نیک کیوں نہ ہو برہمن کا ہم پلہ ہونا تو کجا، وہ اس کے ساتھ ایک چارپائی پر بیٹھ بھی نہیں سکتا۔ اور اگر وہ

وید کا کوئی منتر سن پائے تو بقول منوجی اس کے کان میں سیسہ پگھلا کر ڈال دینا چاہئے

(۶) برہمن ابھی تک اس خام خیالی میں مبتلا ہے کہ میں سب سے افضل ہوں، یہی وجہ ہے کہ گوتم کی تعلیمات دوسرے ملکوں میں تو مروج ہیں لیکن ہندوستان اس نعمت سے محروم ہے بات یہ ہے کہ گوتم بدھ نے مساوات نسل انسانی کا درس دیا تھا اور یہ عقیدہ چونکہ برہمنوں کے اقتدار پر ایک کاری ضرب تھا اس لئے انہوں نے بادشاہوں کو ترغیب دے کر اس مذہب کو تلوار کے زور سے ختم کرا دیا۔ چنانچہ آج ہندوستان میں بدھ دھرم کا کوئی پیرو موجود نہیں۔

(۷) لیکن صدیوں کے بعد ہندوستان میں پھر ایک شخص پیدا ہوا جس نے توحید کا علم بلند کیا اور ہندوؤں کو خواب غفلت سے بیدار کیا۔

یہ اشارہ ہے گرو نانک کی طرف

کفر و اسلام

حل لغات (۱) کلیم طور۔ حضرت موسیٰؑ جنھوں نے کوہ طور پر خدا کی تجلی دیکھی تھی (۲) وادی سینا۔ وہ خطہ جس میں کوہ طور واقع ہے اسی لئے اس کو طور سینا بھی کہتے ہیں۔ آتش نمرود۔ نمرود، وہ کافر اور خدائی کا مدعی بادشاہ جس نے حضرت ابراہیمؑ کو جلانے کے لیے بہت بڑی آگ روشن کرائی تھی + آتش نمرود سے کفر یا بت پرستی مراد ہے غائب سے ذات باری تعالیٰ جو نگاہوں سے پوشیدہ ہے۔ یا ایمان بالغیب مراد ہے حاضر سے کفر یا بت مراد ہے جو نظروں کے سامنے موجود ہوتا ہے ذوق حاضر سے اللہ تعالیٰ کو دیکھنے کی آرزو مراد ہے۔ ایمان خلیلؑ سے حضرت ابراہیمؑ کا سا یقین (ایمان) مراد ہے ورنہ خاکستر ہے الخ یعنی اگر تو نے ایمان خلیل پیدا نہ کیا تو تیرا وجود بیکار ہے اگر تو

دیوانہ غائب ہے یعنی اگر تو ان دیکھے خدا سے محبت کرتا ہے۔ وادی فاران سے شریعت اسلامیہ مراد ہے۔

تبصرہ:۔ اس نظم میں اقبال نے میر رضی دانش کے ایک شعر پر تضمین کی ہے یہ ایرانی شاعر مشہد کا رہنے والا تھا۔ عہد شاہجہانی میں اپنے باپ کے ساتھ ہندوستان آیا۔ بادشاہ کی خدمت میں ایک قصیدہ لکھ کر پیش کیا جس کا مطلع یہ تھا۔

بخواں بلند کہ تفسیر آیہ کرم است
خطے کہ از کف دست مبارکش پیداست

شاہجہاں نے دو ہزار روپیہ انعام دیا۔ کچھ عرصہ کے بعد بادشاہ کو چھوڑ کر دارالشکوہ کی ملازمت اختیار کر لی۔ اس عقلمند شاہزادہ نے اس کو اس شعر پر ایک لاکھ روپیہ انعام دیا تھا

تاک را سرسبز کن اے ابر نیساں در بہار
قطرۂ تامے تواند شد چرا گوہر شود

لیکن مجھے اس کا یہ شعر بہت پسند ہے۔

متاب رخ نفسے تا بجائے خود باشیم
چو عکس آئینہ بازندہ از نگاہ تو ایم

حضرت اقبال نے اس کے جس شعر کو تضمین کے لئے منتخب کیا ہے اس کا مطلب یہ ہے کہ پروانوں کا محبوب تو سب کے سامنے محفل میں موجود ہے لیکن ہمارا محبوب، آتش سنگ کی طرح لوگوں کی نگاہوں سے پوشیدہ ہے اور اسکا نظروں سے اوجھل رہنا ہی اچھا ہے تاکہ آتش شوق بھڑکتی رہے)
اقبال نے جب یہ شعر پڑھا تو انھوں نے اپنی خداداد ذہانت سے یہ مفہوم پیدا کیا کہ کفر (بت) ظاہر ہے لیکن ہمارا محبوب (خدا) پوشیدہ ہے "تو زہا" سے شاعر کی مراد تو اس کا محبوب ہے لیکن اقبال نے اس سے خدا کی ذات مراد لی ہے اس نکتہ نے شعر کو

کہیں سے کہیں پہنچا دیا۔ یعنی اقبال نے اس پر تضمین کر کے شعر اور صاحب شعر دونوں کو زندہ جاوید بنا دیا۔

مطلب:- اقبال کہتے ہیں کہ ایک دن میں نے حضرت موسیٰ سے پوچھا کہ کفر تو دنیا میں

(۱) ہر جگہ جلوہ گر ہے لیکن خدا کا جلوہ کہیں نظر نہیں آیا۔ اس کی کیا وجہ ہے؟

(۲) و (۳) حضرت موسیٰ نے جواب دیا کہ اے اقبال! اگر تو مسلم ہے تو ایمان بالغیب کی تعلیم کو مدنظر رکھ۔ اللہ نے مسلمانوں کو حکم دیا ہے کہ وہ غائب پر ایمان لائیں یعنی اس خدا پر، جو آنکھوں سے نظر نہیں آتا۔

(۴) و (۵) لیکن اگر تو خدا کے دیدار کا طالب ہے تو پھر اپنے اندر حضرت ابراہیم کا سا ایمان پیدا کر۔ لیکن اگر تو اس مرتبہ تک نہیں پہنچ سکتا۔ تو ایمان بالغیب حاصل کر اور اگر تو ایمان بالغیب رکھتا ہے تو کفر کی مطلق پرواہ مت کر۔ اطمینان کے ساتھ، شریعت کی پابندی کر۔ اور یوم قیامت کا انتظار کر جب کہ ہر سچے مسلمان کو اللہ تعالیٰ کا دیدار حاصل ہوگا۔

(۶) یاد رکھ! کفر کی شان و شوکت محض عارضی اور چند روزہ ہے۔ اور اسلام کی شوکت دائمی ہے۔ کفر ایک دن ضرور مٹ جائے گا لیکن اللہ چونکہ حق ہے اس لئے ہمیشہ قائم رہے گا۔ اس صداقت کو کہ اللہ تعالیٰ حق ہے، محبت کے ساتھ وہی رابطہ نسبت ہے جو روح کو جسم کے ساتھ ہے۔ یعنی اگر اللہ تعالیٰ سے محبت کا رنگ پیدا ہو جائے تو آدمی اس صداقت کو سمجھ سکتا ہے۔

(۷) اگر کفر یا بت پرستی (شعلہ نمرود) زمانہ میں ہر جگہ آشکارا ہے تو ہراساں ہونے کی ضرورت نہیں ہے۔ شمع کو دیکھ وہ انجمن میں سب کو اپنا جلوہ دکھاتی ہے یعنی اس میں شان ظہور پائی جاتی ہے لیکن یہ شان عارضی ہے کیونکہ صبح ہوتے شمع ختم ہو جاتی ہے۔ اسکے مقابلہ میں ہمارا نور (خدا) شمع کی طرح دنیا والوں کو جلوہ تو نہیں دکھاتا بلکہ آتش سنگ کی طرح پوشیدہ ہے لیکن اس کا وجود دائمی ہے اس پر کبھی فنا طاری نہیں ہوگی۔

بلالؓ

حل لغات :۔ مغربی حق شناس سے یورپ کا وہ مصنف مراد ہے جو عام یورپین مصنفین کے خلاف سچائی کا اعتراف کر سکتا تھا۔ سکندر رومی۔ دنیا کا مشہور فاتح جس نے ۳۳۵ ق م میں اربیلہ کے مقام پر ایران کے بادشاہ دارا کو اور ٹیکسلا کے مقام پر ۳۲۷ ق م میں راجہ پورس کو شکست دی تھی۔ مستنیر لغوی معنی ہیں روشنی طلب کرنے والا۔ یہاں "منور" مراد ہے اُس صدا سے صدائے اذان مراد ہے۔ اسود۔ کالا۔ احمر۔ سرخ۔ اختلاط۔ میل ملاپ۔

مطلب :۔ اقبال نے بانگِ درا کے پہلے حصہ میں بھی سیدنا حضرت بلالؓ کی منقبت میں ایک نظم لکھی ہے۔ چونکہ انھیں حضرت موصوفؓ سے بہت زیادہ عقیدت تھی اس لیے اس نظم میں، باندازِ دگر، ان کی خدمت میں خراجِ تحسین پیش کیا ہے۔ اقبال کی عقیدت کا سبب صرف یہ ہے کہ سیدنا بلالؓ اسلام اور بانیٔ اسلام صلعم دونوں ہی کے عاشقِ زار تھے۔ حضرت موصوفؓ نے اسلام قبول کرنے کے بعد مدتوں تک اس قدر مصائب برداشت کیے کہ راقم الحروف جیسے نقلی مسلمان، ایک دن کے لیے بھی ان کی تاب نہیں لا سکتے یہی وجہ ہے کہ سکندر رومی کا نام تو صرف تاریخوں میں باقی رہ گیا ہے لیکن حضرت بلالؓ کا نام آج بھی زندہ ہے اور قیامت تک زندہ رہے گا۔

مسلمان اور تعلیم جدید

حل لغات :۔ مرشد، کنایہ ہے انگریزی تعلیم کے حامی سے۔ شوریدہ وہ شخص جس کے دماغ میں "باغیانہ" خیالات کا ہجوم ہو۔ راہرو سے ہر وہ شخص مراد ہے جو دنیا میں شادی کر کے زندگی بسر کرنی چاہتا ہے۔ گہر ان قیمت سے علمائے دین مراد ہیں۔ اب ہیں منبع

کس محر یعنی ایسا "مال" ہیں جس کا بازار میں کوئی خریدار نہیں یہ انگریزوں کی قابلیت کا ایک ادنیٰ کرشمہ ہے کہ انھوں نے کمال خوبصورتی کے ساتھ علم اور علماء دونوں کو ہندوستان سے ختم کر دیا شعلۂ روشن سے ایمان مراد ہے ظلمت سے کفر مراد ہے رشید ائے غائب سے اللہ کا پرستار مراد ہے۔ دیوانہ موجود سے مادہ پرست بلکہ اقتدار پرست مراد ہے یعنی وہ شخص جو اللہ کی بجائے ارباب اقتدار کو اپنا معبود سمجھتا ہو معبود حاضر سے بھی دولت اور حکومت مراد ہے۔ باغ سے ہندوستان مراد ہے۔ پھندا، کنایہ ہے علم دین سے۔ مرغ تیز پر سے قوم مراد ہے۔ رہبر سے مرشد مذکو۔ مراد ہے۔ سودا بمعنی عشق۔ خضر سے رہنما مراد ہے۔ زبون بختی بد قسمتی رفتم کہ خار از پا کشم محمل نہاں شد از نظر الخ اس شعر کا لفظی ترجمہ یہ ہے کہ میں قافلہ سے جدا ہو کر، سڑک کے کنارے بیٹھ کر پاؤں میں سے کانٹا نکالنے لگا۔ لیکن جب کانٹا نکال چکا تو کیا دیکھتا ہوں کہ معشوقہ کا محمل، نظروں سے غائب ہو چکا ہے۔ ہائے میں ایک لحظہ کے لیے غافل ہو کر، اپنی معشوقہ سے مدتوں کے لیے بچھڑ گیا۔ مطلب اس لاجواب شعر کا یہ ہے کہ مسلمان اپنی روایات ملی سے کنارہ کش ہو کر (علمائے حق کے گروہ سے نکل کر) کالج میں داخل ہو گیا تاکہ اپنی "روٹی" کا کچھ انتظام کر سکے لیکن جب وہ کسی دفتر میں ملازم ہو گیا تو اس میں اور اسلام میں بڑا فاصلہ پیدا ہو گیا بلکہ صاف لفظوں میں کیوں نہ کہوں کہ وہ اسلام سے بیگانہ ہو گیا۔

تبصرہ:۔ اقبال نے اس نظم میں جو سراسر رفرد ایماد سے معمور ہے۔ ملک قمی کے مشہور مصرع شعر پر تضمین کی ہے۔ اور حق یہ ہے کہ تضمین کا حق ادا کر دیا ہے۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ شاعر نے یہ شعر اقبال ہی کے لئے لکھا تھا۔

ملک قمی کا مولد منشاء ایران کا شہر قم تھا۔ ابتدائی تعلیم کے بعد کاشان آیا اس کے بعد چار سال تک قزوین رہ کر استفادہ کیا۔ ۹۸۷ھ میں دکن کا رخ کیا کیونکہ ابراہیم عادل شاہ والی بیجاپور شعرا کا بہت قدردان تھا۔ چنانچہ اس بادشاہ نے اس کو

اپنا درباری شاعر مقرر کیا اور بہت عزت افزائی کی۔ ۱۰۲۵ھ میں وفات پائی۔ اس کا یہ شعر مجھے بہت پسند ہے ؎

تا چند غمِ سود و زیاں، پردہ براندز تا ہر دو جہاں را بفروشم بہ نگاہے

مطلب:۔ اقبال نے اس نظم میں تعلیم جدید کی خرابیاں اور مفاسد رمز و ایمار کے پردے میں بیان کئے ہیں۔ لکھتے ہیں کہ۔

(۱) مجھ سے مرشد نے یہ کہا کہ دنیا میں زندگی بسر کرنے کیلئے تجھ کو سامان آسائش حاصل کرنا ضروری ہے۔

(۲) ہندوستان میں انقلاب آچکا ہے۔ علم دین اور علماء کی اس زمانہ میں کوئی قدر و منزلت باقی نہیں رہی ہے۔

(۳) تو کسی زمانہ میں یہاں حکمراں تھا لیکن اب تیرا دنیاوی اقتدار بالکل ختم ہو چکا ہے

(۴) اس لئے اب علوم دینی کے بجائے "جدید تعلیم" حاصل کر کیوں کہ اس زمانے میں سب لوگ جدید علوم (معبود حاضر) حاصل کر کے ترقی کر رہے ہیں (اس کے بغیر نوکری نہیں مل سکتی۔

(۵) اب تو ہندوستان میں عربی فارسی اور دینی علوم پڑھ کر کامیابی حاصل نہیں کر سکتا یہ علوم پرانے ہو گئے اور تیری قوم اب ان علوم کی طرف مائل بھی نہیں ہو سکتی۔

(۶) اس دور میں اگر تو ترقی کرنی چاہتا ہے تو انگریزی تعلیم حاصل کر۔ اس کی بدولت تیرے دماغ میں جس قدر غلط خیالات (خون فاسد) ہیں سب دور ہو جائیں گے

(۷) رہبر کی یہ نصیحت سن کر میرے (قوم) اندر انگریزی تعلیم حاصل کرنے کا شوق پیدا ہو گیا۔ لیکن میری (قوم کی) بدبختی ملاحظہ ہو کہ۔

رفتم کہ خار از پا کشم محمل نہاں شد از نظر
یک لحظہ غافل گشتم و صد سالہ راہم دور شد

پھولوں کی شہزادی

حل لغات:۔ پھولوں کی شہزادی سے فطرت مراد ہے۔ باغ رضواں سے جنت مراد ہے۔ فردوس در دامن یعنی گلستان کا منظر نہایت دلکش ہے۔ سربرآرا حکمراں۔ درخشندہ بمعنی چمکیلی۔ پیام عید۔ پیغام مسرت۔ اہل محترم۔ غمگین رنجیدہ:۔

تبصرہ:۔ اقبال نے اس دلکش تمثیلی نظم میں اس حقیقت کو واضح کیا ہے کہ فطرت کی نگاہ میں کسی دکھ درد کے مارے کا اشک "آتشیں" سب سے زیادہ قیمتی ہے۔

مطلب:۔ ایک دن شبنم نے کلی سے کہا کہ اگرچہ میں مدتوں تک جنت میں رہ چکی ہوں لیکن تمہارے باغ کا حسن تو اس سے بڑھ کر ہے۔ میں نے یہ سنا ہے کہ ایک شہزادی اس باغ کی حکمراں ہے اور اس میں یہ خاصیت ہے کہ اگر وہ جنگل میں چلی جائے تو اس کے قدموں کی تاثیر سے پھول پیدا ہو جاتے ہیں (یہ کتنا دلکش انداز بیان ہے اس حقیقت کے اظہار کے لیے کہ فطرت صحرا کو گلزار بنا دیتی ہے) چونکہ میں اس کے دیدار کی طالب ہوں اس لئے تو کسی دن مجھے بھی اپنے ساتھ اپنے دامن میں چھپا کر لے چل۔ کلی نے یہ سن کر جواب دیا کہ اس میں تو کوئی شک نہیں کہ ہماری شہزادی بڑی خوبیوں کی مالکہ ہے اگر اس کا قدم کسی پتھر پر پڑ جائے تو وہ نگین ہو جاتا ہے مگر دشواری یہ ہے کہ تو بہت شوخ اور چمکیلی ہے اور ہماری شہزادی (فطرت) بہت نازک مزاج ہے، اس لئے تو میری ہمنشین بن کر تو نہیں پہنچ سکتی لیکن اگر تو کسی غمزدہ کا آنسو بن جائے تو بآسانی باریاب ہو سکتی ہے ہماری شہزادی کا دل محبت اور ہمدردی کے جذبات سے لبریز ہے۔ اس کی نگاہ رنجیدہ اور غمگین انسانوں کے حق میں مسرت کا پیغام ہے۔ اور اگر اس کے سامنے کسی غمزدہ کی آنکھ سے آنسو نکل آتا ہے تو وہ گوہر بنا دیتی ہے۔

تضمین بر شعر صائب

حل لغات :۔ آشیاں سے خدمت قوم کا جذبہ مراد ہے۔ نوا سے پیغام باغ سے قوم اور بلبل سے ذات شاعر مراد ہے۔ اس زمین سے مسلمان قوم اور تخم سینائی سے اللہ کی محبت کا جذبہ مراد ہے۔ برنائی بمعنی جوانی۔ دلِ آگاہ سے اسلام کا جذبہ یا سرکارِ دو عالم کی محبت مراد ہے۔ نو آگر سے مصلح قوم اور نشکر خالی سے پاکیزہ شاعری مراد ہے۔

تبصرہ :۔ اس نظم میں اقبال نے مرزا صائب کے ایک شعر پر تضمین کی ہے خلاصہ اس کا یہ ہے کہ قوم مردہ ہو چکی ہے، اسلام سے بیگانہ ہو چکی ہے اس لئے وہ میرے کلام کی طرف کیسے متوجہ ہو سکتی ہے؟

مرزا صائب کا نام محمد علی تھا۔ تبریز میں پیدا ہوا۔ اصفہان میں تعلیم پائی۔ بعد ازاں ظفر خان صوبہ دار کابل کی خدمت میں آیا اور قصیدہ لکھ کر پیش کیا۔ اس نے اس کی بہت قدر کی اور فکرِ معاش سے بے نیاز کر دیا۔ آخر عمر میں اصفہان واپس چلا گیا۔ اور ۱۰۸۰ھ میں وفات پائی۔ ایران سے جو شعراء قسمت آزمائی کے لئے ہندوستان آئے ان میں غالباً صائب ہی سنی المذہب تھا۔ مجھے اس کا یہ شعر بہت پسند ہے۔

مرا بروز قیامت غمِ یکہ ہست اینست

کہ روئے مردمِ عالم دو بارہ باید دید!

مطلب :۔ شاعر اپنے نفس سے خطاب کرتا ہے کہ!

(۱) اے اقبال! تو بھی کس قوم میں پیدا ہوا یا تو نے بھی کس قوم کی خدمت کا ارادہ کیا ہے! اس قوم میں تو تیرا پیغام، تیرے حق میں سامان رسوائی بن جائے گا۔

(۲) تو مسلمانوں کے دلوں میں اسلام کی محبت کا بیج تو بو رہا ہے لیکن یہ تخم بار آور نہیں ہو سکے گا۔ کیوں کہ قوم بے حس ہو چکی ہے۔

(۳) جس قوم کے افراد بے حس ہوں، اور اپنی ترقی سے بالکل غافل ہوں وہاں اگر کوئی شخص حُسن اتفاق سے اُبھرنا یا ترقی کرنا چاہے بھی تو کامیاب نہیں ہو سکتا۔

(۴) افسوس ہے کہ مسلمان بالکل مردہ ہو چکے۔ نہ اس قوم کے بوڑھوں کے اندر ایمان کا رنگ باقی ہے اور نہ جوانوں میں سرفروشی کا جذبہ ہے۔

(۵) جب کوئی قوم مردہ ہو جاتی ہے تو کسی مصلح (شاعر) کے لئے، قوم کی اصلاح کا فریضہ نہایت دشوار ہو جاتا ہے۔

(۶) یا تو تو خاموش ہو جا، اور اگر ضبط سخن ممکن نہ ہو تو پھر اس قوم سے قطع تعلق کر کے گوشہ نشینی اختیار کر لے۔ بلاشبہ مردہ قوم میں رہنے سے جنگل میں تنہا زندگی بسر کرنا زیادہ اچھا ہے۔

(۷) یہی مناسب ہے کہ لیلیٰ کسی بیاباں میں اپنا جلوہ دکھائے کیونکہ شہر کے لوگ حسن صحرائی کی قدر نہیں کر سکتے۔

نوٹ:۔ اس شعر میں "حسن صحرائی" سے صاحبؔ کی مراد تو یہ ہے کہ لیلیٰ نے صحرائے نجد میں (نہایت عمدہ آب و ہوا میں) پرورش پائی تھی اس لئے اُس کے حسن میں بڑی دلکشی تھی۔ اُس کا حسن بالکل فطری تھا۔ فطرت کا پروردہ تھا۔ شہری عورتوں کی طرح سامان آرائش کا محتاج نہیں تھا لیکن اقبال کی مراد یہ ہے کہ اسلام چونکہ دین فطرت ہے اسلئے اس میں قدرتی طور پر دلکشی پائی جاتی ہے لیکن مسلمان چونکہ مردہ ہو چکے ہیں اس لئے اسلام کے فطری محاسن کی قدر نہیں کر سکتے۔ لہٰذا یہی مناسب ہے کہ مبلغ اسلام (شاعر) کسی جنگل میں جا کر درختوں اور پرندوں کو اسلام کی تبلیغ کرے۔

مجھے یقین ہے کہ اس مفہوم میں طنز کا جو پہلو پوشیدہ ہے اگر ناظرین اُس کو مد نظر رکھ کر اس شعر کو پڑھیں گے تو اقبال کے جذبات کی شدت سے کسی قدر ضرور آگاہ ہو جائیں گے۔

فردوس میں ایک مکالمہ

حل لغات :۔ ہاتف لغوی معنی پکارنے والا۔ مراد ہے وہ فرشتہ جو بعض اوقات انسان کو مخفی امور پر مطلع کر دیتا ہے۔ واماندۂ منزل ہے یعنی راستہ ہی میں کہیں تھک کر رہ گیا ہے۔ مصروف تگ و تاز۔ منزل مقصود تک پہنچنے کی کوشش کر رہا ہے۔ گرمیٔ آواز سے نعرۂ تکبیر مراد ہے۔ اے صاحب اعجاز۔ اقبال نے سعدی کو "صاحب اعجاز" اس لئے کہا کہ ان کی گلستاں بلاشبہ فارسی میں لاجواب کتاب ہے۔ تزلزل آ گیا یعنی عقائد تہ و بالا ہو گئے۔ مقاصد یعنی ارادے یا نصب العین۔ زمیں گیر۔ بہت پست زمین تاز یعنی وہ صرف مادی فوائد کے لئے جد و جہد کر سکتے ہیں۔ زخمہ بمعنی مضراب۔ دیوارہ چمن سے قومیت کا احساس مراد ہے۔ گلستاں سے قوم یا ملت مراد ہے۔ زمزم۔ اس چشمۂ شیریں کا نام ہے۔ جو اللہ نے اپنی قدرت سے حضرت اسمٰعیل کے لئے خانہ کعبہ کے قریب ظاہر فرما دیا تھا۔ زمزمِ ملت سے تہذیبی روایات یا شعائرِ اسلامیہ مراد ہیں۔ الحاد بمعنی انکار خدا۔ غماز بمعنی چغلخور۔

تبصرہ :۔ اس بغایت موثر نظم میں اقبال نے کمال خوبی کے ساتھ شیخ سعدیؒ کے مشہور شعر پر تضمین کی ہے۔ انھوں نے اپنے جذبات ملی کے اظہار کے لئے جن دو بزرگوں کو منتخب کیا ہے، یہ دونوں ہماری ملی تاریخ میں اس اعتبار سے بہت بلند مقام رکھتے ہیں۔ وہ کون سا تعلیم یافتہ مسلمان ہے جس نے حالی کی مسدس اور سعدی کی گلستاں نہیں پڑھی!

مطلب :۔ ایک دن جنت میں حالی سے سعدی نے کہا کہ۔

(۲) تو نے اپنی نظموں سے چاند اور ستاروں کو منور کر دیا۔

(۳) ہندی مسلمانوں کی حالت تو بیان کر، کہ ان پر تیری نظموں کا کیا اثر مرتب

ہوا؟! یا وہ ہاتھ پر ہاتھ دھرے بیٹھے ہیں یا اپنی ترقی کے لیے کچھ کوشش کر رہے ہیں

(۴) جس قوم کے نعرۂ تکبیر سے کسی زمانہ میں بحر و بر میں لرزہ پڑ جاتا تھا، اب اس قوم کے مذہبی جوش کا کیا عالم ہے؟۔

(۵) سعدی کا یہ سوال سن کر، حالی پر رقت طاری ہو گئی، اور وہ یوں گویا ہوا کہ

(۶) جب انگریزوں نے ہندوستان کو فتح کر لیا تو انھوں نے مسلمانوں سے یہ کہا کہ اگر تم عہدے حاصل کرنا چاہتے ہو تو اسلامی علوم ترک کر کے انگریزی تعلیم حاصل کرو۔

(۷) مسلمانوں نے اس مشورہ پر عمل کیا۔ اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ قوم میں "ڈپٹی کلکٹر" تو پیدا ہونے لگے لیکن عقیدوں میں ضعف نمودار ہو گیا یعنی دنیا تو مل گئی لیکن دین سے ہاتھ دھو بیٹھے۔

(۸) جس چیز سے مسلمان کے ارادوں میں بلندی پیدا ہو سکتی تھی وہ تو دین ہی تھا۔ چونکہ دین رخصت ہو گیا اس لئے اب قوم کے نوجوانوں کی فطرت بالکل پست ہو گئی ہے۔

(۹) قوم کے اندر، مذہب سے ہم آہنگی اور اتحاد پیدا ہو سکتا ہے۔ اگر دین سلامت نہ رہے، تو ملت کا وجود بھی برقرار نہیں رہ سکتا۔

(۱۰) اور اگر ملت کا احساس مٹ جائے تو ملت (قوم) کی بقا ناممکن ہے

(۱۱) چونکہ قوم کے نوجوانوں نے قومی روایات سے کنارہ کر لیا اس لئے اب ان میں کفر و الحاد کے آثار نمایاں ہوتے جاتے ہیں۔

(۱۲) آپ اس بات کا تذکرہ سرکار دو عالم صلی اللہ علیہ وسلم کی بارگاہ میں نہ کیجیے مبادا ہندی مسلمان مجھے چغلخور سمجھ لیں۔ لیکن حقیقت حال یہ ہے کہ۔

(۱۳) جو کانٹے ہم نے بوئے ہیں اُن سے کھجوریں کیسے حاصل ہو سکتی ہیں؟ اور جو اون ہم نے کاتی ہے اس سے مخمل کا کفن کیسے تیار ہو سکتا ہے یعنی جب ہم کافروں کا مقرر کردہ نصاب تعلیم پڑھ رہے ہیں تو ہمارے اندر مسلمانوں کا

رنگ (اسلام کا جذبہ) کیسے پیدا ہو سکتا ہے؟

مذہب

حلِ لغات:۔ پیر فلسفہ، مغرب سے یورپ کے حکماء اور سائینسداں مراد ہیں۔ ہستی غائب سے ذات خداوندی مراد ہے۔ صنم تراش سے بت پرست مراد ہے محسوس سے عالم مادّی مراد ہے جو حواس خمسہ سے محسوس ہو سکتا ہے۔ جنونِ خام سے جنون کی ابتدائی حالت یا کیفیت مراد ہے۔

"فلسفہ زندگی" سے فلسفۂ اسلام مراد ہے مرشد کامل سے میرزا بیدل کی طرف اشارہ ہے۔

انتعاش بمعنی اٹھنا، بلند ہونا۔

تبصرہ:۔ اس نظم میں اقبال نے بیدل کے ایک مشہور شعر پر تضمین کی ہے اور مقصد ان کا اس تضمین سے اسبات کا اظہار ہے کہ مذہب (اسلام) کی بنیاد خدا تعالیٰ کی محبت پر ہے۔ بیشک مذہب کے لئے عقل بھی ضروری ہے لیکن جب تک مسلمان میں "جنون" کا رنگ نہ ہو اس وقت تک وہ حقیقی معنی میں مسلمان نہیں بن سکتا۔ چونکہ بیدل کا یہ شعر اقبال کے مسلک کا موید ہے، اس لئے انھوں نے اسے تضمین کے لئے منتخب کیا۔

مرزا عبدالقادر بیدل، پٹنہ (عظیم آباد) میں پیدا ہوئے تھے۔ وہ اپنے دور کے سب سے بڑے شاعر گذرے ہیں۔ مشکل پسندی، مضمون آفرینی، اور رفعت تخیل کے لحاظ سے، غالب اور عرفی کے علاوہ اور کوئی شاعر ان کا ہمسر نہیں ہے۔ چنانچہ غالب نے اس شعر میں ان کی عظمت کا اعتراف کیا ہے۔

طرزِ بیدل میں ریختہ لکھنا
اسداللہ خاں، قیامت ہے

میں جس وجہ سے بیدل کی عزت کرتا ہوں وہ یہ ہے کہ انھوں نے ساری عمر اپنی زبان کو کسی دولتمند کی مدح سے آلودہ نہیں کیا۔ وہ حضرت عالمگیرؒ کے دوسرے بیٹے شاہزادہ اعظم کی سرکار میں منشی کے عہدہ پہ ممتاز تھے۔ ایک دن کسی مصاحب نے شہزادہ سے کہا کہ حضور! آپ کے منشی نثر کے علاوہ نظم میں بھی کمال رکھتے ہیں۔ شاہزادہ نے انھیں بلا کر کہا کہ اگر آپ میری تعریف میں قصیدہ لکھیں تو میں آپ کا مرتبہ کلیم سے بھی بڑھا دوں گا۔ میرے دادا نے اُسے چاندی میں تلوایا تھا میں آپ کو سونے میں تلوا دوں گا۔ اس کے جواب میں بیدل نے استعفا لکھ کر پیش کر دیا اور ملازمت ترک کر کے دلی میں سکونت اختیار کرلی۔

ساری عمر کسی امیر کے مکان پر نہیں گئے۔ اس شان استغنار کا نتیجہ یہ نکلا کہ نظام الملک بھی ملنے کے لئے مکان آتا تھا۔ اور جب اس نے دکن میں اپنی حکومت قائم کی تو انھیں بلوایا لیکن انھوں نے خط کے جواب میں یہ شعر لکھ کر بھیج دیا۔

دنیا اگر دہند نہ خیزم زجائے خویش
من بستہ ام حنائے قناعت بپائے خویش

بیدل کی اخلاقی جرارت کا یہ عالم تھا کہ جب حسین علی خاں نے سلطان فرخ سیر کو قتل کرایا تو انھوں نے بادشاہ کی تاریخ وفات اس مصرع سے نکالی۔

"سادات بہ وے نمک حرامی کردند" ۱۱۳۱ھ

حضرت عالمگیرؒ کو بیدل کا یہ شعر بہت پسند تھا۔

من نمی گویم زیاں کن یا بفکر سود باش
اے زفرصت بے خبر در ہر چہ باشی زود باش

بیدل نے ۳ صفر ۱۱۳۳ھ کو دلی میں وفات پائی۔ خودداری کا یہ عالم تھا کہ مرتے وقت دوستوں کو وصیت کی جب میرے مکان میں صحن موجود ہے تو مجھے کسی قبرستان

ہیں دفن نہ کرنا غیر کا احسان کیوں اٹھاؤں؛ چونکہ مجھے بیدل سے محبت ہے اس لئے ان کے سوانح حیات میں قدرے تفصیل سے کام لیا ہے۔ علاوہ بریں ان کا مطالعہ ہر شخص کے لئے اپنے اندر سامانِ عبرت رکھتا ہے۔

مطلب:۔ اقبال کہتے ہیں کہ آج کل جو فلسفہ یورپ میں مروج ہے اس کی تعلیم یہ ہے کہ وہ لوگ سراسر نادان ہیں جو مادّہ کے علاوہ کسی غیر محسوس ہستی کی تلاش کرتے ہیں۔

(۲) چنانچہ اس کا نتیجہ یہ نکلا ہے کہ مسلمان بھی اس نظریہ کے قائل ہوتے جاتے ہیں اور برہمن کی طرح وہ بھی بت پرستی کی طرف مائل نظر آتے ہیں۔

(۳) بلاشبہ آج کل یورپ، مادہ پرستی میں غرق ہے اور اُس نے علوم جدیدہ کی بنیاد مادہ پرستی یا محسوسات ہی پر رکھی ہے۔ واضح ہو کہ اس شعر میں اقبال نے فرانس کے مشہور فلسفی، آگسٹے کانگٹ (AUGUSTE COMTE) کے فلسفہ کی طرف اشارہ کیا ہے جسنے اس نظریہ کو باضابطہ فلسفہ کی شکل میں جس کا نام (Positivism) ہے، انیسویں صدی کے وسط میں یورپ کے سامنے پیش کیا تھا۔ اُس نے ۱۸۵۷ء میں وفات پائی۔

(۴) لیکن مرزا بیدل نے مجھے اس حقیقت سے آگاہ کیا کہ اسلام کا فلسفہ اس کے برعکس یہ کہتا ہے کہ ہر کمال کے ساتھ کسی قدر محبت کا رنگ بھی ہو تو بہت اچھی بات ہے۔ اس لئے اے مخاطب! اگر تو "عقلِ کل کے مرتبہ کو پہنچ گیا ہے تو بھی اپنے اندر کسی قدر جنون کا رنگ ضرور پیدا کر لے تاکہ تو اپنی حقیقت سے آگاہ ہو سکے یعنی جب تک کوئی شخص عشق اختیار نہیں کرے گا وہ اپنی اور اس کائنات کی حقیقت سے واقف نہیں ہو سکتا۔

(۵)

نوٹ:۔ واضح ہو کہ عقل کل کے دو معنی ہیں (۱) عرفی معنی تو بہت عقلمند کے آتے ہیں چنانچہ اردو زبان میں بہت دانشمند آدمی کو "عقل کل" کہہ دیتے ہیں۔

(۲) فلسفہ اشراق کی اصطلاح میں عقلِ کل وہ روحانی (غیر مادی) جوہر ہے جو ذات

واحد سے صادر ہوا، اور اس کے واسطہ سے یہ دنیا عالمِ وجود میں آئی اسی لئے اس کو عقلِ فعال بھی کہتے ہیں۔

خلاصہ اس نظم کا یہ ہے کہ اقبال کی رائے میں محض عقل، کائنات کی گتھی کو نہیں سلجھا سکتی۔ اس لئے انسان، خواہ وہ کتنا ہی عقلمند کیوں نہ ہو، عشق کا محتاج ہے۔ کیونکہ عشق میں یہ طاقت ہے کہ وہ انسان کو حقیقت سے آگاہ کر سکتا ہے۔

جنگِ یرموک کا ایک واقعہ

حلِ لغات:۔ حنا سے خون مراد ہے۔ امیرِ عساکر سپہ سالارِ افواج۔ صورتِ سیماب مضطر یعنی شوقِ شہادت میں بیتاب۔ صبر کا جام لبریز ہو گیا، یعنی میں اب بالکل صبر نہیں کر سکتا۔ صفتِ تیغِ بے نیام۔ ننگی تلوار کی طرح۔ غیور۔ غیرت مند۔

تبصرہ:۔ اس پر جوش نظم میں اقبال نے ایک مومن کے شوقِ شہادت کا تذکرہ قلمبند کیا ہے جس سے ان کا مقصد یہ واضح کرنا ہے کہ اس دور کے مسلمانوں کو اللہ کے وعدوں پر کس قدر پختہ یقین حاصل تھا۔ یہ الفاظ کہ میں بہت جلد سرکارِ دوعالم صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمتِ اقدس میں حاضر ہونے والا ہوں اس لئے اگر آپ (ابو عبیدہؓ) کو کوئی پیغام دینا ہو تو دے دیجئے میں بارگاہِ رسالت میں پہنچا دوں گا'' وہی مسلمان کہہ سکتا ہے جس کو اس بات کا یقین کامل ہے کہ شہادت کے بعد مجھے حضوری کی نعمت حاصل ہو جائے گی

جنگِ یرموک عہدِ فاروقیؓ کی فیصلہ کن جنگوں میں سے ہے۔ یہ جنگ ۱۵ھ میں ہوئی تھی جس میں بیس ہزار مسلمانوں نے دو لاکھ رومیوں کو شکستِ فاش دی تھی جس طرح قادسیہ کی جنگ کے بعد ایرانیوں کا زور ختم ہو گیا اس جنگ کے بعد رومیوں کے حوصلے پست ہو گئے، اور تھوڑے ہی عرصہ میں سارا ملک شام مسلمانوں کے قبضہ میں آگیا۔ یرموک کا میدان اردن کے علاقہ میں دمشق سے کچھ فاصلہ پر ہے۔

حضرت ابوعبیدہ ابن جراحؓ کی جلالت شان کا اندازہ اس بات سے ہو سکتا ہے کہ وہ "عشرۂ مبشرہ" میں سے ہیں۔ یعنی اُن دس مبارک اصحاب رسول میں سے ہیں جن کے جنتی ہونے کی بشارت ان کی زندگی ہی میں حضور انور صلی اللہ علیہ وسلم نے دے دی تھی حضرت ابوعبیدہؓ کا شمار شجاعانِ عرب میں ہے۔ ہر معرکہ میں حضور کے ساتھ رہے لیکن جنگ احد میں انہوں نے اپنی شجاعت کے جوہر پورے طور سے دکھلائے اور حضور کی خوشنودی حاصل کی۔ حضرت عمرؓ نے انھیں سپہ سالار بنا کر شام بھیجا چنانچہ تاریخ میں ان کا لقب فاتح شام ہے۔ بسنہ ۱۸ھ میں بعمر ۵۸ سال عمواس میں بعارضہ طاعون وفات پائی۔

مطلب:۔ جنگ شروع ہونے سے پہلے ایک نوجوان نے سپہ سالار سے یہ عرض کی کہ میں شوقِ شہادت میں اس قدر بیتاب ہوں کہ آغاز جنگ کا انتظار نہیں کر سکتا، اس لئے آپ مجھے یکہ و تنہا دشمنوں کی صفوں میں گھس جانے کی اجازت دیجئے۔ اور اگر آپ سرکار دو عالم صلی اللہ وسلم کو کوئی پیغام بھیجنا چاہتے ہیں تو فرما دیجئے تاکہ میں شہادت کے بعد آپ کا پیغام حضور کی خدمت میں پہنچا دوں۔ یہ سن کر حضرت ابوعبیدہؓ پر رقت طاری ہوگئی اور ان کی ان آنکھوں میں جن کے سامنے باطل ٹھہر نہیں سکتا، آنسو آگئے اور یوں گویا ہوئے کہ اے نوجوان! عشق رسول کی بدولت تیرا مرتبہ اس قدر بلند ہو گیا کہ بوڑھوں کو بھی تیری عزت کرنی لازم ہے۔ اللہ تیری آرزو پوری کرے۔ جب تو حضور اقدس کی خدمت میں پہنچے تو میری طرف سے یہ عرض کرنا کہ خدا تعالیٰ کا فضل و کرم ہمارے شامل حال ہے۔ حضور نے جس قدر وعدے فتح و نصرت کے فرمائے تھے وہ سب ہماری آنکھوں کے سامنے پورے ہو رہے ہیں۔

نوٹ:۔ مقصد اس نظم سے اقبال کا یہ ہے کہ اگر موجودہ دور کے مسلمان، اپنے اندر ایمان کا یہی رنگ پیدا کر لیں تو نصرت الٰہی ان کے شامل حال بھی ہو سکتی ہے۔

ہم تو مائل بہ کرم ہیں کوئی سائل ہی نہیں

مذہب

مطلب:۔ اس نظم میں اقبال نے یہ حقیقت مسلمانوں پر واضح کی ہے کہ اسلام دنیا میں نرالا دین ہے۔ اس لئے اے مسلمانو! تم قومیت کا اصول، اہل مغرب سے مت سیکھو کیونکہ ان کی رائے میں قوم، وطن یا نسب یا نسل یا رنگ یا زبان سے بنتی ہے لیکن اسلام نے ان خود ساختہ امتیازات کو مٹا کر تمہاری قومیت کا انحصار عقیدۂ توحید (اسلام) پر رکھا ہے۔ لہذا تمہاری جمعیت (جماعت) کا دارومدار، دین پر ہے۔ اگر تم اس اصل کو ترک کردو گے تو تمہاری جمعیت فنا ہو جائے گی اور جب یہ اصل ہاتھ سے نکل گئی تو پھر ملتِ اسلامیہ بھی ختم ہو جائے گی۔

بیشک، دنیا کی دوسری تمام قومیں، اوطان سے بنتی ہیں۔ لیکن مسلمانوں کی قوم کسی وطن سے وابستہ نہیں ہے۔ تمام دنیا کے مسلمان چین سے لے کر مراقش تک ایک قوم ہیں۔ محض اس لئے کہ ان کی قومیت کی بنیاد وطن نہیں ہے بلکہ دین ہے ۱۹۳۸ء میں حضرت اقبال نے مولانا حسین احمد صاحب رحمۃ اللہ علیہ مدنی سے جو اختلاف کیا تھا اس کا سبب یہی تھا کہ مولانا نے ۹ جنوری ۱۹۳۸ء کو دلّی میں اپنی تقریر کے دوران میں یہ فرمایا تھا کہ "موجودہ زمانہ میں قومیں اوطان سے بنتی ہیں۔ اس لئے ہندو اور مسلمان دونوں مل کر ایک قوم بن سکتے ہیں"۔

پیوستہ رہ شجر سے امیدِ بہار رکھ

حل لغات:۔ گلستاں سے قوم مراد ہے۔ فصل خزاں کا دور ہے یعنی قوم روبہ زوال ہے جیب گل سے مسلمان کا دل مراد ہے۔ زر کامل عیار سے ایمان مراد ہے۔ نغمہ زن تھے

یعنی مصروف جہاد تھے۔ طیور سے علمائے حق مراد ہیں۔ شجر سایہ دار سے قوم مراد ہے بریدہ بمعنی کٹی ہوئی۔ قاعدۂ روزگار سے فطرت مراد ہے۔ پیوستہ رہ شجر سے یعنی ملت سے وابستہ رہ۔

تبصرہ:۔ اقبال نے اس نظم میں اس حدیث کا مفہوم واضح کیا ہے کہ " لَا اِسْلَامَ اِلَّا بِالْجَمَاعَةِ یعنی جماعت سے الگ ہو کر کوئی شخص اپنے اسلام کو برقرار نہیں رکھ سکتا دوسری حدیث یہ ہے " عَلَیْکُمْ بِالْجَمَاعَةِ مَنْ شَذَّ شُذَّ فِی النَّارِ" مسلمانو! تم پر اجتماعی زندگی بسر کرنا فرض ہے جو شخص جماعت سے علیحدہ ہو جائے گا وہ دوزخ میں ڈالا جائے گا۔ ع فرد قائم ربط ملت سے ہے تنہا کچھ نہیں۔ علامہ مرحوم نے اسلام کے اس بنیادی اصول کو اپنی کتاب رموز بیخودی میں بڑی وضاحت کے ساتھ بیان کیا ہے۔

مطلب:۔ خزاں کے زمانے میں جو شاخ درخت سے ٹوٹ جاتی ہے وہ موسم بہار میں بارش سے ہری نہیں ہو سکتی۔ اس پر ہمیشہ کے لیے خزاں طاری ہو جاتی ہے اور پھر نہ کبھی اس پر پتے لگتے ہیں نہ پھل۔ اے مسلمان تیری قوم بھی آج کل خزاں یعنی پستی یا زوال کی زد میں آئی ہوئی ہے۔ اس وقت تو زوال کے دور میں سے گزر رہا ہے یعنی مسلمانوں میں ضعف ایمانی پیدا ہو گیا ہے۔ سچے مسلمان انیسویں صدی میں ختم ہو چکے ہیں۔ چونکہ تو قوانین فطرت سے ناآشنا ہے۔ اس لیے ٹوٹی ہوئی شاخ سے سبق لے، قانون قدرت یہ ہے کہ پھل اسی شاخ پر لگ سکتا ہے جو درخت سے وابستہ ہو۔ اس قاعدہ کی رو سے، تو بھی دنیا میں اسی وقت اور اسی صورت میں ترقی کر سکتا ہے (کامیاب ہو سکتا ہے) جب تو ملت سے وابستہ اور پیوستہ رہے۔ اگر تو ملت سے جدا ہو کر کسی غیر اسلامی جماعت میں شامل ہو گیا۔ تو جس وقت ملت پر بہار آئے گی اس وقت تو فیض بہار سے محروم رہ جائے گا۔

شب معراج

حل لغات :۔ اخترِ شام ۔ وہ خاص ستارہ جو شام کے وقت طلوع ہو جاتا ہے لیکن یہاں اس سے نظام کائنات مراد ہے ۔ سجدہ کرتی ہے یعنی شب معراج کی عظمت کا اعتراف کرتی ہے ۔ رہ یک گام ہے یعنی صرف ایک قدم کا فاصلہ ہے ہمت ۔ یہ لفظ اس قطعہ کی جان ہے ، اس سے مراد ہے جدوجہد جو قرآنی تعلیمات کی رو سے ہے عرشِ بریں سے قرب الٰہی مراد ہے ۔ معراج کے لغوی معنیٰ ہیں سیڑھی ۔ عرش کے لغوی معنیٰ ہیں تخت شاہی ۔

مطلب ۔ اس بلاغت آفریں قطعہ میں اقبال نے معراج نبوی سے ، جو نبوت کے بارھویں سال میں واقع ہوئی تھی ، یہ نکتہ پیدا کیا ہے کہ اگر مسلمان کوشش کرے اور ہمت سے کام لیں تو اُسے بھی قرب الٰہی حاصل ہو سکتا ہے ۔ بالفاظ دگر ، اگر مسلمان ، سرکار دو عالم صلعم کی کامل اتباع کرے تو وہ بھی خدا تک پہنچ سکتا ہے ۔

اقبال نے یہ نکتہ حضور انور کے اس ارشاد گرامی کی بدولت پیدا کیا ہے الصلوٰۃ معراج المومنین یعنی نماز مومنوں کے لیے (معراج) قربِ الٰہی کا ذریعہ ہے اس قطعہ کو پڑھتے وقت معراج کے دو معنی مدِ نظر رکھیئے ۔

(۱) معراج کے اصطلاحی معنیٰ یعنی حضور کی معراج (جس میں کوئی شریک نہیں ۔)
(۲) معراج کے مرادی معنیٰ یعنی قرب خداوندی (جو ہر مومن کو نصیب ہو سکتا ہے)

پھول

حل لغات :۔ گل سے مسلمان (فرد) مراد ہے ۔ دل صد چاکِ بلبل سے قوم مراد ہے پیرہن کے چاک سے سیرت کی خرابیاں مراد ہیں ۔ کانٹوں سے مصائب اور دشواریاں

مراد ہیں۔ پابہ گل یعنی گرفتار۔ تنگ بخشی سے فطرت کی بے اعتنائی مراد ہے مطلب اس کا یہ ہے کہ فطرت، بعض آدمیوں کو اُن کی خواہش یا ضرورت کے مطابق ترقی کے وسائل عطا نہیں کرتی + استغنا بمعنی بے نیازی، لاپرواہی۔ نہ رہ منت کش شبنم یعنی غیر کا احسان مت اٹھا۔ چمن سے توڑ کر یعنی ملت سے جدا کر کے۔ دستار میں رکھ لے۔ تجھے اپنا آلہ کار بنالے یا تجھ سے ناجائز فائدے حاصل کرے۔ مذاقِ جورِ گلچیں ہو یعنی اگر تو گلچیں کے ظلم و ستم کا آرزومند ہو مطلب یہ کہ اگر تو دنیا کی مصائب میں مبتلا ہونا چاہے۔ تو پیدا رنگ و بو کرلے، یہاں رنگ و بو سے ذاتی خوبیاں مراد ہیں۔ خزاں ناآشنا سے دنیا کی مصیبتوں سے نجات مراد ہے۔ جہان رنگ و بو سے دنیا کی مختلف بلکہ گوناگوں دلفریبیاں مراد ہیں۔ مثلاً عورت، دولت، جاگیر، باغات، محلات اور مناصبِ عالیہ زینتِ دامن کرے یعنی مقرب بارگاہ بنالے۔ آئینہ رو یعنی محبوب +

تبصرہ:۔ یہ ایک عجیب و غریب نظم ہے۔ نہایت دلکش مگر نہایت سنجیدہ اس میں اقبال کی رمزیہ شاعری اپنی معراج کو پہنچ گئی ہے۔ اس کا عنوان ہے "پھول" جسے بظاہر نفس مضمون سے کوئی علاقہ نظر نہیں آتا۔ لیکن غور کرو تو زبردست علاقہ مضمر ہے۔ پھول سے مراد ہے "مردِ مسلمان" اقبال نے مسلمان کو پھول اس لئے قرار دیا ہے کہ جس طرح باغ کی زینت پھول سے ہے۔ دنیا کی زینت مسلمان سے ہے۔ جس طرح پھول باغ میں سب سے زیادہ دلکش ہوتا ہے، مسلمان بھی دنیا میں سب سے زیادہ دلکش ہے۔ پھول میں حُسن پایا جاتا ہے فرقِ اتنا ہے کہ پھول کا حُسن ظاہری ہے مسلمان کا حُسن باطنی ہے۔ پھول، فطرت کا مادی شاہکار ہے۔ مسلمان فطرت کا روحانی شاہکار ہے۔ پھول سے دنیا کی فضا مہک اٹھتی ہے۔ مسلمان کا وجود بھی دنیا کے لئے برکت کا موجب ہے۔ پھول کبھی سرنگوں نہیں ہوتا۔ مسلمان بھی غیر اللہ کے آگے سر نہیں جھکاتا۔

دوسری خوبی اس نظم میں یہ ہے کہ اس میں اقبال نے باغ کا تلازمہ باندھا ہے

چنانچہ ہر شعر میں مراعاۃ النظیر کی صنعت پائی جاتی ہے اور ساری نظم باغ کے لوازم سے معمور ہے مثلاً پھول، گل، بلبل، چاک، رفو، گلزار، کانٹے، صنوبر، آزاد، پا بگل، شبنم جام و سبو، چمن، غنچہ، گلچیں، رنگ و بو، خزاں، زینت دامن اور آئینہ رو۔ کیا یہ تلازمہ اقبال کی قدرت شاعری پر شاہد عادل نہیں۔؟

مطلب :۔ (۱) اے مسلمان! اگر تو اپنی قوم کی خدمت یا اس کے مفاد کی اصلاح کرنی چاہتا ہے تو اس کا طریقہ یہ ہے کہ پہلے تو اپنی سیرت کی تکمیل کر لے یعنی قوم کی اصلاح وہ شخص کر سکتا ہے جس نے کسی مرشد کامل کی صحبت میں بیٹھ کر پہلے اپنی اصلاح کر لی ہو۔

(۲) اے مسلمان! اگر تو دنیا میں عزت کے ساتھ زندگی بسر کرنی چاہتا ہے تو زندگی کی مصیبتوں کو برداشت کرنے کی عادت پیدا کر لے۔ جو شخص مصائب سے گھبراتا ہے وہ کامیاب نہیں ہو سکتا۔ اگر تجھے شک ہو تو سرکار دو عالم صلعم کی تیرہ برس کی مکی زندگی کا مطالعہ کر لے۔

(۳) اگر تو آزادی حریت کا آرزومند ہے تو اس کا طریقہ یہ نہیں کہ تمام قواعد و ضوابط شرعی و نقلی کو بالائے طاق رکھ دے (جیسا کہ اس زمانہ میں اشتراکی ادیب مسلمان نوجوانوں کو تلقین کر رہے ہیں) بلکہ صنوبر سے سبق حاصل کر کہ اس نے قانون فطرت

نوٹ :۔ ممکن ہے اقبال نے جب یہ نظم لکھی تھی اس وقت یعنی ۱۹۱۵ء میں اصلاح قوم کی یہی شرط مروج ہو۔ مگر اب یہ طریقہ متروک ہو چکا ہے۔ اب ماشاء اللہ قوم کے جس قدر مصلحین ہیں وہ سب "صحبت مرشد" کو فضول سمجھتے ہیں:۔ چنانچہ ان میں سے کوئی بھی صحبت یافتہ نہیں ہے شیخ سعدیؒ نے ان ہی حضرات کے حق میں یہ کہا تھا۔ ع از خویشتن گم است کرا رہبری کند۔

پابندی کر کے آزادی حاصل کی ہے۔ یعنی حقیقی آزادی قانونِ "شریعت" کی پابندی سے نصیب ہو سکتی ہے۔

(۴) اگر تو سمجھتا ہے کہ فطرت یا مشیت تیری مرضی کے مطابق نہیں ہے تو لازم ہے کہ تو اپنے اندر شانِ استغناء پیدا کر لے۔ بہر حال تو دنیا میں کسی غیر کا احسان مت گوارا کر۔ جام کو نگوں کرنے سے مراد ہے بے نیازی کی شان پیدا کرنا، جو مومن کا طغرائے امتیاز ہے۔

(۵) اے مسلمان! خودداری (عزتِ نفس) اسلام کا پہلا سبق ہے۔ اس لیئے تو ہرگز اس بات کو گوارا مت کر کہ اغیار تجھے اپنے مقاصد کی تکمیل کے لیئے استعمال کریں۔ مثلاً جب انھیں تیری ضرورت ہو تو تجھے اونچا عہدہ دیدیں، لیکن جب مطلب نکل جائے تو تجھے "فرقہ پرست" کہہ کر ذلیل و خوار کر دیں۔ یا جب ملہبیہ میں استصواب رائے عامہ کا مرحلہ درپیش ہو تو مسلمانوں کو بیرسلمو! آئی غلامی کا سبق پڑھانے کے لیئے تجھے خاص اہتمام کے ساتھ کافی سے زیادہ "زادِ راہ" دے کر وہاں کا دورہ کرنے کے لیئے بھیج دیں، لیکن جب مقصد حاصل ہو جائے تو پھر تیرے "دارالعلوم" کی تلاشی کے وقت تجھ سے بات بھی نہ کریں۔

ع کوئی دستار میں رکھ لے، کوئی زیبِ گلو کر لے

(۶) اے مسلمان! اس دنیا کا قانون یہی ہے کہ یہاں راست بازوں اور مخلص انسانوں کو جن میں راستی اور کمال (رنگ و بو) پایا جاتا ہے، دنیا کے لوگ (گلچیں) ہر قسم کی تکالیف پہنچاتے ہیں۔ دیکھ لو! گلچیں سوکھے سڑے اور مرجھائے ہوئے پھولوں کو تو ہاتھ نہیں لگاتا۔ بلکہ ان ہی پھولوں کو چُن چُن کے توڑتا ہے جو حسین (رنگ) اور خوشبو دار (بو) ہوتے ہیں۔

دیکھ لو! مامون اسلاطین عباسیہ میں ایک جابر سلطان گزرا ہے جس کا

دامن مسلمانوں کے خون سے داغدار ہے) نے کسی ضمیر فروش مسلمان کو نہیں ستایا اس ظالم کے ظلم کا تختۂ مشق تو حضرت احمد بن حنبلؒ ہی بنے جنھوں نے صداقت اور حق گوئی کو شعارِ زندگی بنایا تھا۔ ان کے علاوہ تاریخ میں صدہا مثالیں اس قسم کی مل سکتی ہیں مثلاً جہانگیر مے نوش نے حضرت شیخ احمد سرہندیؒ کو گوالیار کے قلعہ میں کیوں محبوس کیا؟ محض اس لیے کہ انھوں نے اس "زن مرید" کے سامنے سرِ تسلیم خم نہیں کیا۔

گردن نہ جھکی جس کی جہانگیر کے آگے۔
جس کے نفسِ گرم سے ہے گرمیٔ احرار (بال جبریل)

(۷) اور اگر تو دنیا کی آفات سے محفوظ رہنا چاہتا ہے تو اس کا طریقہ یہ ہے کہ اپنے دل کو آفاتِ ثلاثہ یعنی زن۔ زر اور زمین کی محبت سے پاک کر لے اور دنیا والوں سے کسی قسم کی توقع مت رکھ۔ پھر تیرے اوپر خزاں (مصیبت) طاری نہیں ہو سکے گی۔

(۸) اے مسلمان! دنیا میں ہر قوم اور مذہب نے کمال کا جداگانہ معیار مقرر کیا ہے مثلاً وطنیت کے نزدیک کمالِ زندگی یہ ہے کہ آدمی وطن پر نثار ہو جائے۔ سرمایہ داری کے لحاظ سے کمالِ زندگی یہ ہے کہ آدمی نارڈن بن جائے۔ ملوکیت کے زاویۂ نگاہ سے کمال زندگی یہ ہے کہ آدمی "کے سی ایس آئی" بن جائے جمہوریت کی نگاہ میں کمالِ زندگی یہ ہے کہ آدمی منکرِ خدا ہو کر لینین کا پرستار بن جائے۔ اسلام کی رو سے کمالِ زندگی یہ ہے کہ آدمی سرکارِ دو عالم صلعم کا عاشقِ زار بن جائے۔

پس اے مسلمان! تو اس طرح زندگی بسر کر کہ حضورِ انور صلعم قیامت کے دن تجھے اپنے غلاموں کی صف میں جگہ عطا فرما دیں

شیکسپیر

حلِ لغات:۔ آئینہ سے وہ آلہ مراد ہے جو کسی شے کو یا اس کی خوبیوں کو واضح کر دے

یا اس شے کے وجود کو ثابت کرتی ہے، یا اس کی طرف انسانی ذہن کو منتقل۔ مثلاً برگ گل، بہار کے عارض زیبا کے لئے آئینہ کا کام دیتا ہے یعنی (۱) برگ گل یا گل کر دے دنیا میں بہار کے وجود کا مظہر ہے (۲) اس کو دیکھ کر دنیا کے لوگ یہ جان لیتے ہیں کہ بہار آگئی اس کو دیکھ کر ہمارا ذہن بہار کی طرف منتقل ہو جاتا ہے (۳) برگ گل سے بہار کی کیفیت اور نوعیت آشکارا ہو سکتی ہے۔ یعنی یہ سمجھ میں آجاتا ہے کہ بہار کسے کہتے ہیں۔

میں نے لفظ آئینہ کی وضاحت اس لئے کر دی ہے کہ اس نظم کے پہلے تین شعروں کا مطلب اسی لفظ کے سمجھنے پر موقوف ہے۔ آئینہ کے جو لغوی اور عرفی معنی ہیں وہ شے جس میں کسی دوسری شے کا عکس یا جلوہ نظر آئے۔ آئینہ بمعنی مظہر یا واضح کرنے والا مآل ہستی۔ ہستی کا انجام۔ شاعرانہ مبالغہ ہے یعنی تیری فطرت، ہستی کا مقصد تھی۔ تجھے پیدا کرنے کے لئے فطرت نے یہ کارخانہ عالم پیدا کیا تھا۔ دیدۂ دیدار طلب۔ وہ انسان جو حقیقت کا طالب ہے۔ چشم عالم سے تو ہستی الخ۔ اس مصرع میں بھی مبالغہ کا رنگ ہے۔ مطلب یہ ہے کہ تیرے کلام کو سمجھنا بہت دشوار ہے۔

تبصرہ:۔ اقبال نے اس نظم میں شیکسپیئر کی خدمت میں خراج تحسین و عقیدت پیش کیا ہے اور کئی جگہ شاعرانہ مبالغہ سے اپنے کلام میں زور اور اثر پیدا کیا ہے۔

راقم الحروف بھی ۱۹۲۵ء تک شیکسپیئر کے پرستاروں میں رہا۔ چنانچہ اس زمانہ میں اس کے ساتھ وابستگی کا یہ عالم تھا کہ انگریزی تحریر اور تقریر میں اس کے ڈراموں کے جملے استعمال کرنے کو کمال زندگی سمجھتا تھا۔ لیکن جب مثنوی پڑھی تو دنیا ہی بدل گئی نہ شکسپیئر کا کہیں نشان رہا نہ بارکلے کا، نہ اسپنسر سے کوئی تعلق رہا نہ ہیوم سے۔ وہ دن ہے اور آج کا دن ہے، کوئی حسین نظروں میں نہیں سماتا

دراصل اقبال اس زمانہ میں انگریزوں کی اس شیفتگی سے متاثر ہو گئے تھے جو اس زندہ قوم کو اپنی زبان کے سب سے بڑے ڈرامہ نویس کے ساتھ ہے جس کا اندازہ

اس بات سے ہوسکتا ہے کہ انگریز اکثر اوقات یہ کہا کرتے ہیں کہ اگر ہمیں سلطنت انگلشیہ اور شیکسپیر ان دونوں میں سے ایک چیز کے انتخاب پر مجبور کیا جائے تو ہم بلا تامل شیکسپیر کو انتخاب کریں گے۔

واضح ہو کہ انگریز ادیبوں اور نقادوں کا یہ قول محض شاعرانہ انداز بیان ہے جو سراسر مبالغہ پر مبنی ہے ورنہ حقیقت یہ ہے کہ انگریز بہرحال انگریز ہے جو قوم صرف نہر سویز سے دست بردار نہیں ہو سکتی وہ اپنی پوری سلطنت سے کیسے دست بردار ہو سکتی ہے۔؟ ایں خیال است و محال است و جنوں۔

شیکسپیر جسے انگریز، جوشِ عقیدت میں دنیا کا سب سے بڑا شاعر سمجھتے ہیں ۱۵۶۴ء میں پیدا ہوا تھا اور ۱۶۱۶ء میں فوت ہوا۔ ۱۵۸۲ء میں اس کے والدین نے اس کی شادی ایسی لڑکی کے ساتھ کر دی جو اس سے عمر میں صرف آٹھ سال بڑی تھی۔ پانچ سال تک اس نیک بخت کی رفاقت سے بہرہ اندوز ہونے کے بعد وہ لندن چلا گیا تا کہ قسمت آزمائی کر سکے۔ یہاں آکر اس نے "تھیٹریکل کمپنی" کے لیے ڈرامے لکھنے شروع کئے۔ پہلا ڈرامہ ۱۵۹۴ء میں لکھا جو بہت مقبول ہوا۔ یہ سلسلہ ۱۶۱۱ء تک جاری رہا۔ اس کی وفات کے بعد ۱۶۲۳ء میں اس کے ڈراموں کا پہلا مجموعہ شائع ہوا جس میں ۳۶ ڈرامے شامل تھے۔

شیکسپیر کی سب سے بڑی خصوصیت یہ ہے کہ اس نے اپنے ڈراموں میں انسانی فطرت کے ان تمام پہلوؤں کو کسی نہ کسی طریقے سے واضح کر دیا ہے جو ہمارے ذہن میں آسکتے ہیں اس کے معنی یہ ہیں کہ وہ فطرتِ انسانی کا سب سے بڑا نباض یا ماہر تھا۔ اس لئے ایک شاعر نے بایں الفاظ اس کی شخصیت پہ تبصرہ کیا ہے "اس میں انسانی خوبیوں کا ایسا عمدہ امتزاج پایا جاتا تھا کہ فطرت بھرے مجمع میں کھڑی ہو کر

کہہ سکتی ہے کہ اگر میرا شاہکار دیکھنا ہے تو شیکسپیر کو دیکھو"

اگر اس نظم کو غور سے پڑھا جائے تو معلوم ہوگا کہ اس کے لکھتے وقت شاید یہی مقولہ اقبال کے پیش نظر تھا۔ کیونکہ انھوں نے بھی اسی سے ملتے جلتے خیالات ظاہر کئے ہیں۔

پہلا بند:۔ جس طرح صبح کا حسن دریا کی روانی میں نظر آتا ہے۔ شام کی دلفریبی، شام کے وقت نمایاں ہوتی ہے۔ بہار کا حسن، برگِ گل میں دکھائی دیتا ہے۔ شراب کا حسن اور اس کی دلکشی، جامِ شراب سے ظاہر ہو سکتی ہے۔ اسی طرح شکسپیر کا حسنِ کلام اور اسلوبِ بیان (فطرت انسانی کی عکاسی) دل کا آئینہ ہے یعنی اس کے کلام میں انسان کے واردات و جذبات قلبی کا مکمل عکس نظر آتا ہے اور انسان کا دل حسن و جمال کا آئینہ ہے یعنی کائنات کا حسن۔ انسان کے دل میں منعکس ہوتا ہے اور حسن حق کا آئینہ ہے یعنی حسین شے کے اندر خالق فطرت کا جلوہ نظر آتا ہے، لہٰذا شیکسپیر کا کلام آئینۂ حق ہے یعنی اس کے کلام میں خدا کی قدرت کا جلوہ نظر آتا ہے۔ خلاصۂ کلام یہ ہے:۔

(۱) تیرا حسنِ کلام، دل انسان کے لئے آئینہ ہے۔ (۲) دل انسان، حسن کے لئے بمنزلہ آئینہ ہے۔ (۳) حسن، حق کے لئے آئینہ ہے۔ (۴) یعنی تیرا کلام حق کے لئے آئینہ ہے

تیرا تخیل آسمانوں سے باتیں کرتا ہے اور اس کی رفعت میں مجھے ہستی انسانی کا کمال نظر آتا ہے ایسا معلوم ہوتا ہے کہ تیری فطرت (شخصیت) ہستی کا مقصود تھی۔

دوسرا بند:۔ جب کسی نقادِ فن نے تیری شخصیت کا اندازہ کرنا چاہا تو تیری تصانیف (تابِ خورشید) میں تیری شخصیت (خورشید) پوشیدہ نظر آئی۔

حقیقت یہ ہے کہ دنیا والے تو تجھے کماحقہٗ نہ سمجھ سکے (یہ مبالغہ ہے) لیکن تو نے دنیا والوں کا کماحقہٗ سمجھ لیا۔ (یہ اشارہ ہے اس کی قابلیتِ فن کی طرف جس کی تشریح "تبصرہ" میں کر چکا ہوں)

ع اور عالم کو تیری آنکھ نے عریاں دیکھا" یہ مصرع اس نظم کی جان ہے کیوں کہ شکسپیئر کا کمالِ فن یہی ہے کہ دنیا میں انسانی سیرت کے جتنے پہلو ذہن میں آ سکتے ہیں، اُس نے ان سب کی عکاسی کر دی ہے۔

چونکہ فطرت اپنے اسرار و رموز کی بہت حفاظت کرتی ہے اس لئے میرا خیال ہے کہ وہ شیکسپیئر کے بعد اپنے اسرار کا دوسرا "رازدان" پھر پیدا نہیں کرے گی، یعنی اسرار فطرت کا ایسا ماہر اب پیدا نہ ہوگا۔

میں اور تو

حل لغات :- کلیم کا سلیقہ، اس سے مراد ہے حضرتِ موسیٰ کا سا اشتیاق دید و خلیل کا قرینہ۔ اس سے مراد ہے حضرت ابراہیم کا سا رنگِ ایمان۔ سامری اس شخص کا اصلی نام موسیٰ ابن ظفر تھا لیکن وہ اپنے قبیلہ کے نام سے مشہور ہو گیا اس نے بنی اسرائیل کو گمراہ کرنے کے لئے سونے کا بچھڑا بنایا تھا جس میں سے آواز نکلتی تھی۔ رفتہ رفتہ لفظ "سامری" ساحر کے معنی میں استعمال ہونے لگا قتیل بمعنی مقتول۔ آذری سے بت پرستی مراد ہے۔ نوائے سوختہ در گلو سے نامرادی ناکامی مراد ہے۔ بریدہ رنگ۔ کنایہ ہے رنجیدہ غم سے حدیث سے داستان مراد ہے سم بمعنی زہر۔ بود بمعنی ہستی یا شخصیت ہم نفس عدم یعنی میرا ہونا اور نہ ہونا دونوں برابر ہیں۔ گرو عجم۔ یعنی غیر اسلامی خیالات میں گرفتار دمِ زندگی دم زندگی یعنی ہر سانس عمر کو کم کرتی چلی جاتی ہے۔ قلندری۔ بانگِ درا میں اقبال نے پہلی مرتبہ اس لفظ کو اس نظم میں استعمال کیا ہے۔ آئندہ تصانیف میں یہ لفظ اقبال کی خاص اصطلاح بن گیا۔ ضرب کلیم اس کے ذکر سے معمور ہے اس سے مراد ہے مومن کی طرز حیات۔ خاک سے یہاں جوہر خودی یا شخصیت یا دل مراد ہے۔ شرر سے عشق رسول مراد ہے۔ نان شعیر۔ جو کی روٹی۔ چراغ حرم سے رہنمائے قوم مراد ہے۔ پتنگ

سے مسلمان مراد ہے۔ سرشتِ سمندری بسمندر! وہ کیڑا جو آگ میں رہتا ہے۔ روایت یہ ہے کہ پارسیوں کے جس آتش کدہ میں مسلسل صدیوں تک آگ روشن رہے تو ایک کیڑا پیدا ہو جاتا ہے جو آگ ہی میں رہتا ہے اور اگر آگ سے باہر نکال لیا جائے تو مرجاتا ہے بعضوں کا یہ خیال ہے کہ کیڑا نہیں بلکہ چوہے کی شکل کا ایک جانور پیدا ہو جاتا ہے اس باب میں قول راجح یہ ہے کہ یہ ایک غیر معروف چھوٹا سا جانور ہے۔ آتش کدہ یا آگ سے اس کا کوئی تعلق نہیں ہے۔ سرشتِ سمندری سے آتشیں مزاج مراد ہے۔ طرز طواف سے اسلامی زندگی مراد ہے۔ جفائے وفا نما سے ایسی جفا یا بیوفائی مراد ہے جو بظاہر وفا معلوم ہو۔ حرم سے دین اسلام مراد ہے۔ اہل حرم سے مسلمان مراد ہیں۔ ہری۔ یہ وشنو کا مشہور لقب ہے اور وشنو ہندی تر یمورتی کا دوسرا رکن ہے۔ ہندو دھرم میں پرماتما (خدا) کے تین سروپ مانے گئے ہیں برہما، وشنو اور شو۔ ستیزہ گاہ۔ میدان جنگ۔ حریف پنجہ فگن زبردست دشمن۔ فطرتِ اسداللہی سے حضرت علیؓ کی سیرت مراد ہے اور حضرت علیؓ اسلام کے محافظ اور وکیل ہیں۔ اسداللہ یعنی اللہ کا شیر یہ حضرت علیؓ کا مشہور لقب ہے۔ مرحبی یعنی فطرت مرحبی۔ مرحب۔ عرب کا مشہور بہادر تھا جو خیبر میں قلعہ قموس کا محافظ تھا غزوۂ خیبر میں حضرت علیؓ کے ہاتھ مارا گیا۔ مرحب کے مرادی معنی ہیں کفر کا علمبردار یا وکیل عنتری عنتر بھی عرب کا مشہور بہادر تھا اور مرحب کا بھائی تھا۔ اس کے قتل کے بعد حضرت علیؓ سے انتقام لینے کے لئے میدان میں آیا تھا لیکن انھوں نے اُس کو بھی قتل کر دیا۔

تبصرہ:۔ یہ بانگِ درا کی مشکل نظموں میں سے ہے۔ مضامین کی بلندی کے علاوہ اس میں شاعرانہ خوبیاں بھی بدرجہ اتم موجود ہیں۔ بندش کی چستی، الفاظ کا انتخاب اور صوتی ہم آہنگی اس کی نمایاں خصوصیات ہیں بحیثیت مجموعی یہ نظم اقبال کی قادر الکلامی کا ایک بہت عمدہ نمونہ ہے اس کے عنوان میں بھی ندرت پائی جاتی ہے۔ میں سے ذاتِ شاعر اور تو سے نظم پڑھنے والا مراد ہے۔ میں اور تو سے پوری قوم بھی مراد ہو سکتی ہے

کہتے ہیں کہ۔

(۱) نہ مجھ میں حضرت موسیٰ کی طرح اللہ سے ملاقات کی آرزو پائی جاتی ہے اور نہ تجھ میں حضرت ابراہیم کا سا ایمان پایا جاتا ہے۔ اگر میں سامری کا پیرو ہوں تو، تو آذر کا متبع ہے مطلب یہ ہے کہ پوری قوم اسلام سے منحرف ہو چکی ہے۔

(۲) میری حالت اس ناکام اور نامراد عاشق کی سی ہے جو عرضِ مطلب یا حالِ دل بیان کرنے کی بھی طاقت نہیں رکھتا اور تو مسلسل شکستوں اور مصیبتوں کی وجہ سے نیم جان ہو چکا ہے۔ میرے پاس رنج و غم کی داستان کے علاوہ اور کچھ نہیں اور تو اپنی بدنصیبی اور محرومی کا رونا روتا رہتا ہے۔ مطلب یہ ہے کہ پوری قوم تباہ ہو چکی ہے۔

(۳) میری کیفیت یہ ہے کہ مجھے عیش میں کوئی لطف محسوس نہیں ہوتا اور میری خوبی بھی دنیا کو برائی نظر آتی ہے، مختصر یہ کہ میرا وجود اور عدم دونوں یکساں ہیں۔ اور تیری حالت یہ ہے کہ تیرا دل جو دراصل حرم تھا وہ کفر کا غلام ہو چکا ہے اور تو نے اپنے ایمان کو کافروں کے ہاتھ فروخت کر دیا ہے۔

(۴) اے مسلمان! تیری دنیاوی زندگی کو ہمیشگی حاصل نہیں ہو سکتی، یہ دنیاوی زندگی محض کھیل تماشا ہے، چند روزہ ہے اگر تو مرنے کا غم کرے گا یہ غم تیرے حق میں زہر بن جائے گا تیری زندگی بیکار ہو جائے گی۔ اس لئے زندگی کے گذرنے پر غم نہ کر اور غم کا زہر مت کھا بلکہ ہر حال میں راضی برضا رہ۔ کیونکہ مسلمان کا شیوہ یہی ہے کہ وہ مشیت ایزدی کے سامنے سر تسلیم خم کرتا ہے۔

(۵) اگر تیرے دل میں عشق رسول کی چنگاری موجود ہے تو پھر یہ پرواہ مت کر کہ تو دولتمند ہے یا مفلس ہے۔ کیونکہ کامیابی کے لیے دولت ضروری نہیں ہے کیا تجھے علم نہیں کہ حضرت علیؓ جو کی روٹی کھاتے تھے لیکن عشق رسول کی بدولت ان میں یہ طاقت پیدا ہو گئی تھی کہ انھوں نے خیبر کا دروازہ اپنی قوت بازو سے

اکھیڑ نہ پایا تھا، یعنی کفر کا مقابلہ کرنے کے لیئے دولت نہیں بلکہ عشق درکار ہے
(۶) اسے رہنمائے قوم! تو مسلمانوں کو ایسی زندگی بسر کرنے کی تلقین کر کہ ان میں یعنی ان کے دلوں میں عشق رسول کی آگ بھڑکنے لگے اور وہ سراپا آگ بن جائیں۔
(۷) اسے مسلمانو! تم نے اسلام کے ساتھ ایسی بیوفائی کی ہے کہ بظاہر وہ وفا ہے لیکن دراصل جفا ہے یعنی تم زبان سے توحید کا دعویٰ کرتے ہو لیکن تمھارا عمل اس کے خلاف ہے۔ تمھاری اس دورنگی سے اسلام کو اس قدر ضعف پہنچا ہے کہ اگر میں تمھاری منافقت کی داستان کافروں کو سناؤں تو وہ بھی "ہری ہری" پکار اٹھیں، یعنی تمھارے طرزِ عمل سے شدید نفرت کا اظہار کریں۔

اس شعر کے دوسرے مصرع میں بڑی شان بلاغت پائی جاتی ہے اس کا ایک مطلب تو وہ ہے جو اوپر بیان کیا گیا۔ دوسرا مطلب یہ ہے کہ اگر میں کسی صنم (بت) کے سامنے یہ بات بیان کردوں کہ اسلام نے مسلمانوں پر کس قدر احسانات کیئے لیکن اس کے جواب میں مسلمانوں نے اسلام جیسے پاکیزہ دین کے ساتھ کس قدر بیوفائی کی تو گمان غالب یہ ہے کہ بت بھی اس خدا پر ایمان لے آئے گا جس نے اہل دنیا کو اسلام جیسا پاکیزہ دین عطا فرمایا۔

اس کے علاوہ اس مصرع کے اسلوب میں بڑی دلکشی پائی جاتی ہے۔ اقبال نے اس کی بندش میں ایسی قابلیت صرف کی ہے کہ شاعری میں ساحری کا رنگ پیدا ہو گیا ہے صنم، جیسا کہ سب جانتے ہیں، ہری (خدا) کی ضد ہے۔ اقبال نے کمالِ فن کا مظاہرہ کیا ہے کہ صنم کو خدا کا پرستار بنا دیا۔ اس مصرع کو پڑھ کر بلاشبہ مسلمان کی احسان فراموشی کی تصویر سامنے آجاتی ہے کہ اس کی بیوفائی کی داستان اس قدر عبرت انگیز ہے کہ انسان تو کیا اگر پتھر بھی سن پائے تو کانوں پر ہاتھ رکھ لے اور خدا کو یاد کرنے لگے حقیقت تو یہ ہے کہ صنم اور ہری میں جو تضادِ معنوی پایا جاتا ہے اس نے

اس مصرع کو تضمین سے بالاتر کر دیا ہے۔

(۸) اے مسلمانوں! اگر موجودہ زمانے میں کفر یا طاغوتی طاقتیں تمہارے خلاف متحد ہو کر صف آرا ہو گئی ہیں تو یہ کوئی نئی بات نہیں ہے (اس لئے تم بالکل ہراساں مت ہو) ذرا صدر اسلام کی تاریخ تو اٹھا کر دیکھو کیا حضرت علیؓ کے مقابلہ میں مرحب اور عنتر نہیں آئے تھے؟ پس جس طرح عشق رسول کی بدولت حضرت موصوف اپنے زمانے کے کافروں پر غالب آئے تھے اسی طرح تم بھی غالب آسکتے ہو۔

اسی مضمون کو اقبال نے ایک جگہ یوں باندھا ہے۔

ستیزہ کار رہا ہے ازل سے تا امروز
چراغ مصطفوی سے شرار بولہبی

(۹) اب اقبال سرکار دو عالم صلی اللہ علیہ وسلم سے استمداد کرتے ہیں کہ آقائے کائنات اے سرور موجودات! اس وقت آپ کی نگاہ کرم درکار ہے۔ ذرا پردہ اٹھا کر تو دیکھئے آپ کے دروازے پر وہ لوگ دست بستہ منتظر کرم کھڑے ہوئے ہیں جو بظاہر۔ یعنی آپ کے سامنے تو بیشک گدا ہیں لیکن آپ سے نسبت غلامی کی وجہ سے ان کے اندر یہ شان پیدا ہو گئی ہے کہ وہ بادشاہوں کو بھی خاطر میں نہیں لاتے۔

اسیری

حل لغات:۔ اعتبار افزا۔ عزت بڑھانے والی۔ بلند پاکیزہ یا شریف ارجمند بمعنی قیمتی۔ مشک اذفر بہترین قسم کا مشک۔ نافہ آہو یعنی ہرن کی ناف بہرہ مند یعنی حصہ پانے والے۔

تبصرہ:۔ دسمبر ۱۹۱۹ء میں جب علی برادران (مولانا شوکت علی اور مولانا محمد علی) قید فرنگ سے آزاد ہوئے تو امرتسر میں ان کی تشریف آوری کے موقع پر انہا فت

کمیٹی کے زیر اہتمام ایک عظیم الشان جلسہ منعقد ہوا جس میں علامہ اقبال مرحوم نے یہ نظم ان کو مخاطب کر کے پڑھی تھی۔

مطلب:۔ کہتے ہیں کہ اگر کسی انسان میں ذاتی پاکیزگی اور شرافت کا جوہر موجود ہو تو اسیری سے اس کی عزت میں اضافہ ہو جاتا ہے۔ دیکھ لو! ماہ نیساں (اپریل) میں جب ایک خاص قسم کی بارش کی بوندوں میں چونکہ ذاتی جوہر موجود ہوتا ہے اس لئے اسکے قطرے جب صدف کی قید میں چلے جاتے ہیں تو وہاں سے موتی بن کر نکلتے ہیں۔ اسی طرح خطا اور ختن کے علاقوں کے ہرنوں کے خون میں چونکہ ذاتی جوہر پوشیدہ ہوتا ہے جب وہ خون ان ہرنوں کی ناف میں مقید ہو جاتا ہے تو بہترین قسم کا مشک بن جاتا ہے لیکن فطرت ہر شے کی اس طرح تربیت نہیں کرتی یعنی ہر شخص جیلخانہ میں جانے سے محترم نہیں بن سکتا۔ دنیا میں بہت کم پرندے ایسے ہیں جن کو گرفتاری سے عزت حاصل ہوتی ہے۔ مثلاً دیکھ لو کوے اور چیل کو کوئی شخص قید نہیں کرتا یہ سعادت تو صرف باز اور شاہین کے حصے میں آتی ہے۔

دریوزۂ خلافت

حل لغات:۔ دریوزہ۔ بھیک۔ بیوفائی بمعنی سرتابی یا نافرمانی + ننگ۔ بمعنی شرم یا عزت، تیز بے شرمی یا بے عزتی۔ شکستن۔ لغوی معنی ٹوٹنا، مرادی معنی افلاس یا محتاجی مومیائی ایک مشہور مگر کمیاب دوا ہے جس سے ٹوٹی ہوئی ہڈی جڑ سکتی ہے۔

تبصرہ:۔ اس نظم کا عنوان ہے "خلافت کی بھیک" اس لئے جب تک مسئلہ خلافت کی مختصر تاریخ نہ لکھی جائے یہ نظم سمجھ میں نہیں آسکتی۔ واضح ہو کہ پہلی جنگ عظیم میں ترکوں کو عربوں کی غداری کی بدولت شکست فاش نصیب ہوئی۔ چنانچہ ۳۰ نومبر ۱۹۱۸ء کو انھوں نے غیر مشروط طور پر ہتھیار ڈال دئے اور مسلمانانِ عالم کے سب سے بڑے دشمن یعنی انگریزوں کی دلی تمنا پوری ہوگئی چنانچہ انگلستان کے وزیر اعظم نے جب جنرل ایلنبی فاتح فلسطین کے سینے پر تمغہ لگایا تو اس کی فتح کو ہلال پر صلیب کی فتح قرار دیا اور کہا کہ سلطان صلاح الدین کے ہاتھوں جو شکست ہمیں نصیب ہوئی تھی اس کا انتقام اب ہم نے لیا ہے۔

انگریزوں نے ہندوستانی مسلمان کے ساتھ جو جھوٹے وعدے کئے تھے ان میں سے ایک یہ بھی تھا کہ خواہ کچھ بھی ہو ترکی کی سالمیت برقرار رکھی جائے گی یعنی اس کے حصے بخرے نہیں کئے جائیں گے۔ لیکن جب دشمنان اسلام کو اپنے مقاصد میں کامیابی حاصل ہوگئی تو انھوں نے شرافت اور انسانیت ہر چیز کو بالائے طاق رکھ کر ترکی کے خاتمہ کا فیصلہ کر دیا اور ۱۹۱۹ء سے اس پر عمل درآمد بھی شروع ہوگیا۔

جب ہندی مسلمانوں نے یہ دیکھا کہ سلطنت ترکی صفحۂ ہستی سے نابود ہونے والی ہے تو مجھے اچھی طرح یاد ہے کہ پشاور سے لے کر مدراس تک اور کراچی سے لے کر ڈھاکہ تک سارے ہندوستان میں صفِ ماتم بچھ گئی تھی

مسلمانوں نے ساری ملک میں جلسے منعقد کر کے اپنی ناراضگی کا اظہار کیا اور ان میں انگریزوں کو ترکوں کی سابقہ "حماقتوں" کا واسطہ دیا مثلاً

(۱) ۱۷۹۹ء میں سلطنت ترکی نے سلطان ٹیپو کی امداد کرنے کے بجائے سلطنت برطانیہ کی امداد کی تھی یعنی سلطان شہیدؒ کو بھی غلامی قبول کر لینے کا مشورہ دیا تھا

(ب) ۱۸۵۵ء میں کریمیا (روس) کی جنگ میں ترک اور انگریز دونوں دوش بدوش لڑے تھے

(ج) ۱۸۵۷ء میں ترکوں نے انگریزوں کو اجازت دی تھی کہ وہ ہندوستانی مسلمانوں کا بسرعت تمام قلع قمع کرنے کے لئے اپنی فوجیں مصر کے راستے سے ہندوستان پہنچا سکتے ہیں۔ ان جلسوں کے بعد دسمبر ۱۹۱۹ء میں امرتسر میں خلافت کانفرنس کا اجلاس منعقد ہوا اور اس میں یہ طے پایا کہ جنوری ۱۹۲۰ء میں انگلستان کو ایک وفد روانہ کیا جائے جو حکومت برطانیہ سے درخواست کرے کہ خلافت کا خاتمہ نہ کیا جائے

چنانچہ یہ وفد آٹھ مہینے انگلستان رہ کر ۶۵ ہزار روپیہ ضائع کرنے کے بعد بے نیل ومرام واپس آیا تھا۔

علامہ اقبال کی نگاہ دوربین نے پہلے ہی محسوس کر لیا تھا کہ حکومت برطانیہ جو خود زوالِ خلافت کی سب سے زیادہ آرزومند ہے اور اس تمام فتنہ کی بانی ہے، وہ بھلا کب ارکان وفد کی باتوں پر غور کرے گی اس لئے انھوں نے یہ بلیغ نظم سپرد قلم کی کہ:۔

(۱) اے مسلمان! اگر ترکی ختم ہوتی ہے تو بلا سے ہو جائے لیکن تو شریعتِ اسلامیہ سے بے وفائی مت کر یعنی دشمنان ملت کے سامنے دستِ سوال دراز مت کر۔

(۲) کیا تو دنیا کی تاریخ سے آگاہ نہیں ہے کہ حکومت یا سلطنت بھیک کا ٹکڑا نہیں ہے جو کوئی کسی کی جھولی میں ڈال دے حکومت اپنے زور بازو سے حاصل ہو سکتی ہے نہ کہ دوسروں کی مہربانی سے۔

(۳) مسلمانوں کے لئے تو وہ حکومت سراسر باعث ذلت ہے جو تلوار کے زور سے حاصل نہ کی جائے بلکہ کسی کی مہربانی سے حاصل ہو جائے یقیناً ایسی حکومت غلامی کی دلفریب شکل ہوگی، دگر ہیچ۔ یہ شعر اردو ادب میں ضرب المثل ہو گیا ہے۔

(۴) مجھے اپنے جسم کی کسی ہڈی کے ٹوٹ جانے سے اس قدر صدمہ نہیں پہنچے گا جس قدر اس بات سے کہ میں اس کو جوڑنے کے لئے غیروں کے آگے ہاتھ پھیلاؤں
شیخ سعدی کہتے ہیں

حقا کہ با عقوبت دوزخ برابر است . رفتن بپائے مروئ ہمسایہ در بہشت

ہمایوں

حل لغات: ۔ سراپا سوز تھی یعنی تجھ میں قوم کی ہمدردی کا مادہ کوٹ کوٹ کر بھرا ہوا تھا۔ جنگاری سے شخصیت مراد ہے۔ انجمن افروز یعنی قوم کی عزت کا باعث تھی۔ شعلہ گردوں نورد۔ یہ ممدوح کے دل کی صفت ہے۔ ایسا شعلہ جو آسمان کو اپنی لپیٹ میں لے سکتا تھا مشت خاکستر سے جسم مراد ہے۔ شب کی خاموشی سے مرقد کی خاموشی کی طرف اشارہ ہے + ہنگامہ فردا، کنایہ ہے روز حشر سے۔

تبصرہ: ۔ یہ اثر آفریں اور معنی خیز نظم، اقبال نے اپنے محترم دوست مسٹر جسٹس میاں شاہ دین صاحب مرحوم کی وفات پر لکھی تھی۔ میاں صاحب موجودہ صدی کے ابتدائی دور میں ہندوستان کے نامور مسلمانوں میں سے تھے۔ اور علامہ مرحوم ان کی بڑی عزت کرتے تھے

میاں صاحب ۱۸۹۰ء میں ولایت سے بیرسٹری پاس کر کے آئے تھے اور اپنی ذاتی قابلیت کی بدولت جج ہائیکورٹ کے عہدہ جلیلہ پر فائز ہوئے۔ ۱۹۱۸ء میں وفات پائی علامہ مرحوم نے ان کی تاریخ وفات اس شعر سے برآمد کی تھی۔

می جست عندلیب خوش آہنگ سال فوت
"علامۂ فصیح" زہر چار سو شنید

علامۂ فصیح کے عدد ۳۳۴ ہوتے ہیں ان کو ۴ سے ضرب دی جائے تو ۱۳۳۶ھ سال

وفات بن جاتا ہے میاں صاحب مرحوم ہمایوں تخلص کرتے تھے۔ مرحوم کے نامور فرزند عزت مآب میاں بشیر احمد صاحب سفیر دولت پاکستان متعینہ جمہوریہ ترکیہ نے ۱۹۲۲ء میں اپنے والد کی یادگار قائم کرنے کے لئے رسالہ ہمایوں جاری کیا تھا جس کا شمار پاکستان کے ممتاز ترین جرائد میں ہوتا ہے میاں بشیر احمد دوستی اور خدمت قومی کے اعتبار سے اپنے نامور والد کے صحیح جانشین ہیں۔ ان کی عمر بھی قوم کی خدمت ہی میں بسر ہوئی ہے

مطلب:۔ اے ہمایوں! تو نے اپنی ساری عمر قوم کی خدمت میں بسر کی اور تیری ذات ملتِ اسلامیہ کے لئے باعثِ صد عز و افتخار تھی۔

(۲) اگرچہ جسمانی اعتبار سے تو نحیف الجثہ تھا لیکن خدا نے تجھے بہت اعلیٰ درجے کا دماغ عطا کیا تھا۔

(۳) اور تیرے کمزور جسم میں نہایت طاقتور دل پوشیدہ تھا جو کسی مخالف سے مرعوب نہیں ہوا۔

(۴) عقلمند آدمی موت سے نہیں ڈرتا کیونکہ جسطرح رات کے بعد دن کا آنا یقینی ہے اسی طرح موت کے بعد دوبارہ زندگی بھی یقینی ہے

(۵) نادان لوگ، موت کو زندگی کا خاتمہ سمجھتے ہیں۔ لیکن درا صل موت کے بعد ایسی زندگی نصیب ہوگی جس کو کبھی فنا نہ ہوگی

خضرِ راہ

حلّ لغات:۔ محوِ نظر۔ فطرت کا مطالعہ کر رہا تھا۔ سکوت افزا۔ خاموشی بڑھانے والا ہوا آسودہ۔ ہوا ساکن تھی۔ نرم سیر۔ آہستہ چلنے والا۔ آشیانوں میں اسیر یعنی گھونسلوں میں سو رہے تھے۔ کم ضو۔ جن کی روشنی بہت کم تھی۔ خضر۔ ایک بزرگ کا نام ہے جو بھولے بھٹکوں کو راستہ دکھاتے ہیں۔ جویائے راز یعنی وہ شخص جو خدا کے ارادوں

یا نظامِ کائنات سے آگاہ ہونا چاہتا ہو۔ تقدیرِ عالم یعنی نظامِ کائنات کے پوشیدہ قوانین
شہیدِ جستجو یعنی اسرارِ کائنات سے آگاہ ہونا چاہتا تھا۔ دریا سے کائنات مراد ہے۔ کشتیِ
مسکین و جانِ پاک و دیوارِ یتیم" اس مصرع میں تلمیح ہے ان تین واقعات کی طرف
جو قرآن حکیم میں مذکور ہیں۔ کشتیِ مسکین سے ان غریب ملاحوں کی کشتی مراد ہے جس میں
خضر نے سوراخ کر دیا تھا۔ جانِ پاک سے وہ لڑکا مراد ہے جسے خضر نے قتل کر دیا تھا۔
اور دیوارِ یتیم سے ایک گاؤں کے یتیموں کی وہ دیوار مراد ہے جو گرنے والی تھی خضر
نے اس کو درست کر دیا تھا۔

(ان واقعات کی تفصیل کے لئے دیکھو سورۂ کہف آیات ۶۴ تا ۸۲) حیرت فروش
یعنی حضرت موسیٰ پر بھی تیرے علم کی وسعت دیکھ کر، حیرت طاری ہو گئی تھی۔ اقوامِ نو دولت
سے وہ اقوام مراد ہیں جو موجودہ زمانے میں برسرِ عروج آئی ہیں مثلاً امریکہ، روس، انگلستان
وغیرہ۔ پیرایہ پوش یعنی پیرو یا مقلد۔ فطرتِ اسکندری سے ملوکیت مراد ہے۔ گرمِ ناؤنوش
سے ترقی اور فروغ مراد ہے۔ ہاشمی سے عربوں کی قوم مراد ہے۔ علی الخصوص شریف مکہ جس نے
۱۹۱۶ء میں ترکوں سے غداری کر کے انگریزوں سے دوستی کی تھی یعنی اس غدار نے جس کا نام
حسین تھا، اسلام کی عزت کفار کے ہاتھوں نہایت ارزاں قیمت پر فروخت کر دی۔ آگ
سے ۱۹۱۴ء کی جنگِ عظیم کی طرف اشارہ ہے۔ اولادِ ابراہیم سے مسلمانوں کی حکومتیں
مراد ہیں۔ نمرود سے یورپین اقوام مراد ہیں۔ تگاپوئے دمادم۔ ہر وقت مصروفِ عمل رہنا۔ کے
رہینِ خانہ سے کاہل اور آرام طلب انسان مراد ہے یعنی مسلمان۔ بانگِ رحیل، روانگی
گھنٹے کی آواز۔ سیماب پا تیز رفتار۔ جس سے روشن تر ہوئی الخ۔ اس مصرع میں تلمیح ہے
آیاتِ قرآنی کی طرف جن کا مطلب یہ ہے کہ جب شام ہوئی اور اخترِ شام طلوع ہوا تو
حضرت ابراہیمؑ نے کہا کہ شاید یہ میرا رب ہے کیونکہ بہت چمکدار ہے پھر جب وہ غروب
ہو گیا اور چاند کو دیکھا تو کہا شاید یہ میرا رب ہے کیونکہ یہ روشن تر ہے پھر جب وہ

غروب ہوگیا اور دوسرے دن سورج کو دیکھا تو کہا شاید یہ میرا رب ہے کیوں کہ یہ سب سے بڑا ہے لیکن جب وہ غروب ہوگیا تو[1] کہا میں غروب ہونے والوں سے محبت نہیں کرسکتا بلکہ میں تو اس [illegible] اپنا رب تسلیم کرتا ہوں جو غروب نہیں ہوتا[1]۔ زنجیری بمعنی قیدی۔ گردش پیہم سے مسلسل [illegible] مراد ہے۔ تسلیم جاں سے ایثار، قربانی، سرفروشی اور جاں نثاری مراد ہے۔ سِرِّ آدم یعنی آدم کی حقیقت۔ ضمیر کُن فکاں سے اشارہ ہے قول خداوندی کی طرف کہ خدا جب کسی شئی کو پیدا کرنا چاہتا ہے اس وقت کہتا ہے "کن" یعنی ہو جا۔ "فیکون" پس وہ ہو جاتی ہے۔ ضمیر کُن فکاں سے رازِ آفرینش مراد ہے۔ کُن امر کا صیغہ ہے کَانَ فعل ناقص سے بمعنی ہے یا تھا یا ہوگیا۔ کوہکن فرہاد کا لقب ہے جو شیریں ملکہ ایران پر عاشق ہوگیا تھا جوئے شیر و تیشہ و سنگِ گراں سے کوہکن کی زندگی کی طرف اشارہ ہے۔ اس کی تفصیل یہ ہے کہ بادشاہ نے اپنا پیچھا چھڑانے کے لئے میاں فرہاد سے یہ کہا کہ اگر تم کوہ بیستون کاٹ کر دودھ کی نہر جو اُس طرف بہ رہی ہے اس طرف میرے محل تک لے آؤ تو میں اپنی ملکہ تمہارے حوالے کر دوں گا۔ فرہاد اپنے تیشہ سے پہاڑ کاٹ کر، جوئے شیر محل کی طرف لے آیا۔ اردو میں جوئے شیر لانے کا مطلب ہے کسی بڑے دشوار کام کو انجام دینا۔ ع صبح کرنا شام کا لانا ہے جوئے شیر کا + بندگی بمعنی غلام، جوئے کم آب۔ وہ نہر جس میں بہت تھوڑا پانی ہو بحرِ بیکراں۔ نہایت وسیع سمندر جس کا کنارا نظر آئے۔ قوتِ تسخیر۔ اشیائے کائنات کو مغلوب کرلینے کی قوت۔ قلزم۔ سمندر۔ زیاں خانہ سے یہ دنیا مراد ہے۔ خام سے سیرت کی خامیاں مراد ہیں۔ پختہ سے سیرت کی تکمیل مراد ہے۔ شمشیر بے زنہار سے وہ تلوار مراد ہے جو کسی شئے کے کاٹنے میں تامل نہ کرے یعنی ہر چیز کو کاٹ کر رکھ دے زنہار بمعنی پناہ یا امان۔ مداقت سے اسلام مراد ہے۔ مستعار۔ مانگی ہوئی چیز۔ یہ چنگاری

---

[1] سورہ انعام آیات ۷۶ تا ۷۸

کنایہ ہے خودی سے فروغِ جاودان ۔ شانِ دوام یا ہمیشگی کی صفت ۔ خاکِ مشرق سے ایشیائی ممالک مراد ہیں ۔ بدخشاں خراساں کے قریب ایک خطہ ہے جہاں کے لعل مشہور ہیں ۔ ع

لعل قیمت کو پہنچتا ہے بدخشاں چھوڑ کر

یہاں بدخشاں سے ملت اسلامیہ مراد ہے ۔ لعلِ گراں یعنی بیش قیمت لعل مراد ہے مسلمان ۔ نالہ شبگیر سے مراد ہے پچھلی رات کو اٹھ کر خدا کی عبادت کرنا اور اس کی جناب میں آہ و زاری کرنا راز داں پیدا کرے یعنی عالم ملکوت سے رابطہ پیدا کرے ۔ رمز آیہ اِنَّ الْمُلُوْکَ تلمیح ہے اس آیہ شریف کی طرف اِنَّ الْمُلُوْکَ اِذَا دَخَلُوْا قَرْیَۃً اَفْسَدُوْھَا وَجَعَلُوْٓا اَعِزَّۃَ اَھْلِھَآ اَذِلَّۃً ۚ وَکَذٰلِکَ یَفْعَلُوْنَ ۝ (۲۷ : ۳۴) یعنی دنیا کے بادشاہوں کا یہ دستور ہے کہ جب وہ کسی گاؤں یا بستی (ملک) میں داخل ہوتے ہیں (فتح کرتے ہیں) تو اس کو خراب (برباد) کر دیتے ہیں اور اس کے معزز لوگوں کو ذلیل و خوار کر دیتے ہیں ۔ اور یہ بادشاہ لوگ (ملوکیت کے زعم میں) ہمیشہ ایسا ہی کیا کرتے ہیں ۔ بیدار ہوتا ہے یعنی اگر اپنی آزادی کے لیے کوشش کرتا ہے ۔ جادوئے محمود سے نظام ملوکیت مراد ہے ۔ چشم ایاز سے غلاموں کی آنکھ مراد ہے ۔ حلقۂ گردن سے غلامی کی لعنت مراد ہے ۔ ساز دلبری سے عزت کا نشان مراد ہے ۔ خونِ اسرائیل سے غلام قومیں مراد ہیں ۔ موسیٰ سے حریت کا علمبردار مراد ہے طلسم سامری سے غلامی کی زنجیر مراد ہے ۔ وہی ساز کہن ۔ وہی مطلق العنانی ، وہی شخصی حکومت دیو استبداد یعنی ظلم و ستم ۔ پائے کوب ناچنے والا ۔ نیلم پری ۔ اندرسبھا میں ایک حسین پری کا نام تھا جو راجہ اندر کی محبوبہ تھی اور اس کے پروں میں نیلم اور دوسرے جواہرات ٹکے ہوئے تھے ۔ مجالس آئین یعنی لیجسلیٹو اسمبلی ۔ اصطلاح سے وہ (Reforms) یا اختیارات مراد ہیں جو انگریزوں نے ۱۹۰۹ء اور ۱۹۱۹ء میں ہندیوں کو عطا کئے تھے ۔ رعایات سے وہ رعایات مراد ہیں جو اقلیت کو

دی جاتی ہیں مثلاً ایک فرقہ کو اس کی آبادی کے تناسب سے کچھ زیادہ حصہ دینا۔ حقوق سے امتیازی سلوک مراد ہے مثلاً قبل تقسیم ہندوستان میں ایک سفید رنگ کے مجرم کو کالے رنگ کا سپاہی گرفتار نہیں کر سکتا تھا۔ گرمیٔ گفتار سے زوردار بحثیں مراد ہیں۔ اعضائے مجالس۔ اسمبلی کے ارکان۔ سرمایہ دار یہ بھی جدید سیاسی اصطلاح ہے۔ اس کے معنی محض دولت مند کے نہیں ہیں۔ کیونکہ دولتمندی تو کوئی جرم نہیں ہے اقبال نے اگر سرمایہ داری کی مذمت کی ہے تو اس کے سیاسی مفہوم کو مدنظر رکھ کر کی ہے (جس طرح وطنیت کا سیاسی مفہوم مذموم ہے) سیاسی اصطلاح میں سرمایہ دار وہ شخص ہے جو

(۱) دولت جمع کرنے کو مقصد حیات سمجھتا ہے۔ (۲) اس کے حصول کے لئے ہر طریقہ کو جائز سمجھتا ہے خواہ وہ طریقہ اخلاق اور مذہب کے لحاظ سے ناجائز ہی کیوں نہ ہو۔

(۳) رات دن اپنی دولت میں اضافہ کرتا ہے یا کرنے کا آرزومند رہتا ہے۔

(۴) چونکہ وہ دولت کو مقصود حیات سمجھتا ہے اس لئے کسی کاشتکار یا مزدور کے ساتھ ہمدردی کرنا اس کے مذہب میں سب سے بڑا جرم ہے۔ وہ اللہ کی مخلوق کا رات دن خون چوستا رہتا ہے لیکن اس کی تسکین نہیں ہوتی یہ چاہتا ہے کہ مزدور رات دن میرے کارخانہ میں کام کرتا رہے لیکن کم از کم اجرت پائے اور راحت کا خیال بھی دل میں نہ لائے کیونکہ دنیا کی راحت تو صرف سرمایہ دار کے لئے مخصوص ہے۔

(۵) وہ اپنی دولت کو اللہ کے لئے (اللہ یا مذہب کا سرمایہ دار کے یہاں گذر نہیں ہو سکتا) یا قوم کے لئے (سرمایہ دار کی نظر میں قوم کا وجود ہی نہیں ہوتا) خرچ نہیں کرتا سرمایہ دار کسی غریب کو انسان ہی نہیں سمجھتا۔ بلکہ وہ اس دولت کو اپنے اقتدار کو قائم کرنے کے لئے یا اس میں اضافہ کے لئے استعمال کرتا ہے۔ اس کے محل کے برابر ایک فاقہ کش مزدور ایڑیاں رگڑ رگڑ کر مر جائے لیکن اس کو اس بے کس کی وفات کے

مقابلہ میں اپنے شکاری کتے کے مرجانے کا زیادہ افسوس ہوتا ہے۔

چونکہ سرمایہ داری، ملوکیت کے بعد دنیا میں سب سے بڑی لعنت ہے اسی لئے اسلام نے ان دونوں کی صاف لفظوں میں مذمت کی ہے۔ اور اسی لیے اقبال چونکہ وہ قرآن حکیم کے علمبردار ہیں، سرمایہ داری کے خلاف ہیں جنگ زرگری۔ نکتہ یہ کی لڑائی یعنی تصنع یا دوسروں کو دھوکہ دینا۔ سراب رنگ و بو سے جمہوری نظام مراد ہے سرمایہ دار حیلہ گر یکر و فریب اند مہب سرمایہ داری کا پہلا سبق یا اس کی بنیادی تعلیم ہے بشاخ آہو الخ۔ اقبال نے اس مصرع میں مشہور فارسی ضرب المثل کا ترجمہ کر دیا ہے۔ فارسی میں یوں کہتے ہیں "برات عاشقان بر شاخ آہو" چنانچہ استاد ذوق نے اس محاورے کو یوں باندھا ہے

سوال وصل کو ٹالا جواب چین ابرو سے
برات عاشقاں بر شاخ آہو اسکو کہتے ہیں

اس کا مطلب ہے کسی سے جھوٹے وعدے کرنا، حیلے بہانے کرنا، ٹال مٹول کرنا، یا بہکانا۔ دست دولت آفریں سے مزدور مراد ہے جو دولت پیدا کرتا ہے مزد یعنی مزدوری۔ ساحر الموط نے الخ یہ بہت بلیغ مصرع ہے۔ ساحر یعنی جادوگر لیکن اس سے مراد ہے حسن صباح۔ الموط اس مستحکم قلعہ کا نام ہے جس کو مشہور دشمن اسلام حسن صباح نے جو فرقۂ باطنیہ کا سب سے بڑا مبلغ گزرا ہے، اپنی نکتہ کش سرگرمیوں کا مرکز بنایا تھا یہ قلعہ کوہ البرز کی ایک چوٹی پر جو دس ہزار فٹ بلند ہے، واقع تھا۔ اس کے لغوی معنی ہیں آشیانۂ عقاب۔ حسن صباح دراصل اللہ کا عذاب تھا، اسی طرح سلطنت عباسیہ پر مسلط ہوا جسطرح بندہ بیراگی سلطنت مغلیہ پر۔ یہ شخص طوس کا باشندہ تھا اسلئے جوانی میں باطنی مذہب اختیار کیا اور ساری عمر اسکی تبلیغ میں بسر کردی سنہ ۱۰۹۰ء میں اپنی قابلیت کی بدولت قلعہ الموط پر قابض ہوگیا۔ اور جس طرح بندہ بیراگی نے فرخ سیر کے زمانہ میں پنجاب کے مسلمانوں کا قتل عام

کیا تھا اسی طرح اس نے ایران اور عراق کے مسلمانوں کو قتل کرنے کا سلسلہ شروع کیا۔
افسوس کہ میں اس مختصر شرح میں نہ اس کی لائیف لکھ سکتا ہوں نہ اس کے مذہب کا حال
بیان کر سکتا ہوں۔ لیکن لفظ باطنی کی تشریح لازمی ہے۔ واضح ہو کہ شیعوں کے ایک اہم
فرقہ موسومہ اسمٰعیلیہ کا دوسرا نام باطنیہ بھی ہے اس کی ابتدا اس طرح ہوئی کہ شیعوں کے
چھٹے امام جناب امام جعفر صادق کے دو بیٹے تھے۔ اسمٰعیل اور موسیٰ کاظم جو شیعہ یہ مانتے تھے
کہ جناب جعفر صادق کے بعد اُن کے صحیح جانشین موسیٰ کاظم ہوئے وہ تو اثنا عشری شیعہ کہلاتے
ہیں یعنی بارہ اماموں کے پیرو۔ اور یہی عام طور سے ایران اور پاکستان میں پائے جاتے
ہیں لیکن بعض شیعوں نے یہ کہا کہ اسمٰعیل ہی صحیح جانشین ہے وہ اسمٰعیلی مشہور ہو گئے
ان اسمٰعیلیوں نے اپنے مذہب کو مخفی طریقوں سے پھیلایا اور لوگوں سے یہ کہا کہ قرآن
کے دو معنی ہیں ایک ظاہری دوسرے باطنی چونکہ یہ قرآن کے ہر لفظ سے باطنی معنی نکالتے
تھے اس لئے رفتہ رفتہ ان کو باطنی کہنے لگے میری رائے میں ساری دنیا نے اسلام کو
اس قدر نقصان نہیں پہنچایا جسقدر صرف اسی مٹھی بھر جماعت نے۔ لیکن میں پہلے ہی لکھ چکا
ہوں کہ عذاب الٰہی فرقہ باطنیہ کی شکل میں متمثل ہو گیا تھا

برگِ حشیش ۔ بھنگ کا پتہ۔ اس کی تشریح یہ ہے کہ حسن صباح
نے قلعہ الموط میں ایک جنت ارضی بنائی تھی۔ اس میں جارجیہ اور سرکاشیہ (کوہ قاف) کی
حسین عورتیں جمع کی تھیں۔ اہل علم جانتے ہیں کہ اس خطہ کی عورتیں اتنی حسین ہوتی ہیں کہ پہلے
زمانہ میں ان کو کوہ قاف کی "پریاں" کہا کرتے تھے حسن صباح چونکہ مردم شناس تھا اسلئے
حسن پرست نوجوانوں کو بھنگ پلا کر عالم بیہوشی میں اس جنت میں بھیج دیتا تھا وہاں وہ
نوجوان چند روزہ زندگی کا لطف اٹھاتے تھے۔ اس کے بعد ہر نوجوان کی محبوبہ اپنے دستِ
نازک سے جامِ شراب پلاتی تھی جس میں بھنگ شامل ہوتی تھی۔ اور جب وہ بیہوش
ہو جاتے تھے تو اس دنیا میں واپس آجاتے تھے۔ ان کی واپسی کے بعد مذہب حقہ

باطنیہ کا داعیٔ کبیر حسن صباح اُن سے کہتا تھا کہ اگر تم دوبارہ اپنی محبوبہ کے پاس جانا چاہتے ہو تو فلاں بادشاہ یا فلاں وزیر یا فلاں مسلمان۔ عالم دین کو قتل کرو۔ چنانچہ یہ لوگ اپنے "مرشد" کے حکم کی تعمیل کرتے تھے اور فدائی کا لقب حاصل کرنے کے بعد دوبارہ اپنی محبوبہ سے شرف ملاقات حاصل کرتے تھے اور "حسن صباح زندہ باد" کا نعرہ بلند کرتے تھے شاخ نبات۔ مصری کی ڈلی خواجہ حافظ نے اس اصطلاح کو کمالِ فن شاعری یا ملکۂ شاعری یا تکلم کے معنی میں استعمال کیا ہے خواجگی سے ملوکیت مراد ہے مسکرات نشہ آور چیزیں۔ واضح ہو کہ نسل قومیت نظام کلیسائی، سلطنت، تہذیب مغرب اور رنگ یہ سب باتیں نظام ملوکیت کی تائید کرتی ہیں اسی لئے اسلام نے ان سب کی نفی کر دی ہے۔ واضح ہو کہ ان اصولوں سے وحدت ملی یا وحدت آدم، جو مقصود اسلام ہے فنا ہو جاتی ہے اسی لئے اسلام نے ان تمام امتیازات کو مٹا دیا۔ مستی، نشہ یا سرور۔ سادگی بے وقوفی، نادانی۔ غنچہ ساں کلی کی طرح۔ شبنم سے قلیل سرمایہ مراد ہے سکندر و جم سے ملوکیت مراد ہے۔ آفتاب تازہ سے اشتراکیت مراد ہے بادہ نئے سیاسی تصورات جو یورپ میں پیدا ہو رہے ہیں۔ ڈوبے ہوئے تاروں سے ملوکانہ جاگیردارانہ اور سرمایہ دارانہ یا شخصی نظامِ حکومت مراد ہے۔ کرگس ناداں سے مسلمان افواہ مراد ہیں۔ طوافِ شمع سے ملوک پرستی مراد ہے۔ اسلام شخصی حکومت کا جو باپ سے بیٹے کو ورثہ میں ملے، قائل نہیں ہے۔ تثلیث کے فرزندوں سے انگریز مراد ہیں اور میراث خلیل سے عربی ممالک مصر، حجاز، فلسطین، شام اور عراق مراد ہیں۔ کلاہ لالہ رنگ سے ایران مراد ہے۔ اسمٰعیل صفوی شاہ ایران نے سرخ ٹوپی اپنی فوج کے سپاہیوں کی وردی میں شامل کی تھی (قزل بمعنی سرخ اور باش بمعنی سر) میئے سرکش سے غیر اسلامی تصورات مراد ہیں۔ مینا گداز ایسی شراب جو اپنی گرمی سے بوتل کو پگھلا دے + گاز بمعنی قینچی ربط وضبط ملت بیضا سے تمام اسلامی ممالک کا اتحاد مراد ہے، جیسے آج کل "مسلم

ورد ہلاک" کہتے ہیں۔ حفظِ حرم سے حفاظت واشاعت اسلام مراد ہے نیل مصر کا مشہور دریا ہے۔ کاشغر چینی ترکستان کا مشہور شہر ہے، اب یہ علاقہ روس کے قبضہ میں ہے + خرگاہ شاہی خیمہ + والا گہر۔ عالی خاندان۔ اسلاف کا قلب وجگر۔ بزرگوں کی سیرت آئینہ گفتار سے شاعر نے اپنی نظمیں مراد لی ہیں + آزمودہ فتنہ سے انقلاب مراد ہے۔

اِنَّ اللّٰہَ لَا یُخلِفُ المِیعَادَ۔ بیشک اللہ اپنے وعدہ کا خلاف نہیں کرتا (۳ : ۸)

تبصرہ :۔ یہ بانگ درا کی پانچ بہترین نظموں میں سے ہے جن کا ذکر قبل ازیں ہو چکا ہے اس نظم کی سب سے بڑی خصوصیت یہ ہے کہ اس سے اقبال کی انقلابی شاعری کا آغاز ہوتا ہے اور وہ پہلی مرتبہ اُس فاقہ کش اور بے کس طبقہ کے ہمدرد بن کر سامنے آتے ہیں جسے دنیا والے مزدور کے نام سے پکارتے ہیں اور بہت ذلیل سمجھتے ہیں حالانکہ جاگیرداروں، سرمایہ داروں اور نوابوں کے شکاری کتنے بلکہ وہ خود اسی مزدور کے پسینے کی بدولت عیش کرتے ہیں۔ اس کا پسینہ آقائے کائنات صلعم کی نگاہوں میں اس قدر قیمتی ہے کہ آنحضرت صلعم نے ارشاد فرمایا ہے کہ مزدور کی مزدوری اس کا پسینہ خشک ہو جانے سے پہلے ادا کردو۔ نیز" الکاسب حبیب اللہ" (یعنی مزدور اللہ کا محبوب ہے) فرما کر اس کا مرتبہ نوابوں سے بھی بالاتر کر دیا اور حقیقت تو یہ ہے کہ اسلام نوابوں کا تو مذکور ہی کیا ہے، بادشاہوں کے وجود کو بھی تسلیم نہیں کرتا۔ اسلام دنیا کا پہلا اور آخری دین ہے جس نے ببانگ دُھل اس صداقت کا اعلان کیا کہ "لا ملوکیت فی الاسلام" یعنی اسلام ملوکیت کو تسلیم نہیں کرتا۔

اقبال نے یہ نظم ۱۹۲۱ء میں لکھی تھی۔ یہ وہ زمانہ ہے جب مسلمانوں پر پیہم دس بارہ سال سے آفات ارضی وسماوی کا نزول ہو رہا تھا۔ ان کا دل تو پہلے ہی سے مسلمانوں کی زبوں حالی پر خون کے آنسو رو رہا تھا ۱۹۱۹ء میں جب قسطنطنیہ سے خلیفہ اور خلافت دونوں کا خاتمہ ہو گیا تو اقبال کے دل پر کوہ غم ٹوٹ پڑا چنانچہ خضر

راہ نما یہ شعر ان کے جذبات قلبی کا آئینہ دار ہے۔

بیچتا ہے ہاشمی ناموس دین مصطفےٰ
خاک و خوں میں مل رہا ہے ترکمانِ سخت کوش

ترکی ہی پر کیا منحصر ہے کہ ۱۹۱۹ء میں سلطنت ہی پارہ پارہ ہوگئی۔ ہندوستان سے لے کر مراقش تک تمام دنیائے اسلام پر نکبت اور ادبار کی گھٹائیں چھا رہی تھیں مثلاً عربوں نے انگریزوں کے دام فریب میں آکر ترکوں سے عین وقت پر غداری کی لیکن ترکمان جفا پیشہ کے پھندے سے نکل کر انگریزوں کے چنگل میں گرفتار ہوگئے بیت المقدس پر صلیبی پرچم لہرانے لگا۔ دمشق اور بغداد پر اغیار کا قبضہ ہوگیا اور حجاز کا حکمراں برطانیہ کا وظیفہ خوار بن گیا۔ ناظرین ان باتوں کو مدنظر رکھ کر اس نظم کا مطالعہ کریں تاکہ اس کے مطالب سے بہرہ اندوز ہو سکیں۔ اقبال نے یہ نظم انجمن حمایت اسلام کے سالانہ جلسہ منعقدہ ۱۹۲۲ء میں پڑھ کر سنائی تھی اور سننے والوں کا بیان ہے کہ جب وہ اس نظم کو پڑھ رہے تھے تو وفور جذبات سے ان کی طبیعت بالکل بے قابو تھی وہ اکثر پڑھتے پڑھتے رک جاتے تھے کیونکہ گریہ پیہم ہر شعر کے بعد گلوگیر ہو جاتا تھا۔ آنکھوں سے آنسوؤں کی جھڑی لگی ہوئی جب انہوں نے یہ شعر پڑھا۔

آگ ہے اولاد ابراہیم ہے نمرود ہے
کیا کسی کو پھر کسی کا امتحاں مقصود ہے

تو بیس ہزار کا مجمع بے اختیار رو رہا تھا اور خود اقبال کا تو یہ حال تھا کہ روتے روتے گگھی بندھ گئی تھی اور اقبال کے دوستوں کا بیان ہے کہ اس سے زیادہ رقت ان پر کسی نظم کے پڑھتے وقت طاری نہیں ہوئی بلا شبہ ساری نظم سوز و گداز میں ڈوبی ہوئی ہے۔

اس نظم میں گیارہ بند ہیں پہلے ہر بند کا خلاصہ لکھتا ہوں پھر مطلب بیان

کروں گا۔

(۱) پہلے بند میں شاعر کی خضر سے ملاقات ہوتی ہے جو اس سے یہ کہتا ہے کہ:

چشمِ دل وا ہو تو ہے تقدیرِ عالم بے حجاب

(۲) یہ سن کر شاعر اس سے حسبِ ذیل سوالات کرتا ہے۔ (۱) تو صحرا نوردی کیوں کرتا ہے؟ (ب) زندگی کی حقیقت کیا ہے؟ (ج) سلطنت (ملوکیت) کیا چیز ہے؟ (د) سرمایہ اور محنت میں یہ کیسی آویزش ہو رہی ہے؟ (ہ) دنیائے اسلام پر مصائب کا نزول کیوں ہو رہا ہے؟ ع کیا کسی کو پھر کسی کا امتحاں مقصود ہے۔

(۳) تیسرے بند میں خضر پہلے سوال کا جواب دیتا ہے ع ہے یہی اے بے خبر رازِ دوامِ زندگی (۴) چوتھے بند میں زندگی کی حقیقت واضح کرتا ہے (۵) پانچویں بند میں خضر، جوہرِ زندگی پیدا کرنے اور صفتِ دوام حاصل کرنے کی ترکیب بتاتا ہے

(۶) چھٹے بند میں خضر تیسرے سوال کا جواب دیتا ہے یعنی ملوکیت کے مفاسد بیان کرتا ہے (۷) ساتویں بند میں خضر نے چوتھے سوال کا جواب دیا ہے یعنی سرمایہ داری کی مذمت کی ہے (۸) آٹھویں بند میں خضر نے مزدور کو انقلاب برپا کرنے کی تلقین کی ہے (۹) نویں بند میں خضر نے پانچویں سوال کا جواب دیا ہے اور ضمناً وطنیت کی خرابیاں بیان کی ہیں (۱۰) دسویں بند میں، خضر نے مسلمانوں کی ترقی اور کامیابی کا گر بتایا ہے (۱۱) گیارھویں بند میں خضر نے شاعر کو تسلی دی ہے یعنی یہ پیشین گوئی کی ہے کہ انجام کار ملوکیت اور سرمایہ داری دونوں لعنتیں دنیا سے ختم ہو جائیں گی اور اسلام نے حریت اخوت اور مساوات کا جو خواب دیکھا تھا عنقریب دنیا اس کی تعبیر دیکھ لے گی۔

پہلا بند: (۱) رات کے وقت میں عالمِ اضطراب میں دریا کے کنارے ٹہل رہا تھا

(۲) اس دور۔۔ میں ہر طرف خاموشی چھائی ہوئی تھی۔ ہوا بھی ساکن تھی اور دریا بھی

ساکن تھا۔ (۳) موجیں اس طرح سو رہی تھیں جیسے گہوارے میں کوئی بچہ سو رہا ہو۔

(۴) پرندے اپنے آشیانوں میں بسیرا لے رہے تھے اور چاندنی کی روشنی میں ستارے ٹمٹما رہے تھے۔ (۵) یکایک میری ملاقات خضر سے ہو گئی جو بڑھاپے میں بھی جوانوں سے زیادہ چاق و چوبند نظر آتے تھے۔ (۶) مجھے دیکھ کر وہ کہنے لگے کہ میں جانتا ہوں کہ تو اس دنیا کے نظام سے آگاہی حاصل کرنے کے لئے بیتاب ہے اگر تو غور و فکر سے کام لے تو اسرارِ کائنات سے واقف ہو سکتا ہے (۷) یہ بات سن کر میرے دل میں حقائق کائنات معلوم کرنے کا زبردست جذبہ پیدا ہو گیا اور میں نے خضر سے کہا۔

دوسرا بند :۔ تو دانائے رموزِ کائنات ہے۔ بلکہ ان باتوں سے بھی واقف ہے جو ابھی ظہور میں نہیں آئی ہیں۔ (۲) تیرا علم اسقدر وسیع ہے کہ حضرت موسیٰ بھی اس باب میں تیری برابری نہیں کر سکتے۔ چنانچہ وہ یہ نہ سمجھ سکے کہ تو نے ملاحوں کی کشتی میں سوراخ کیوں کر دیا؟ اور ایک بے گناہ بچے کو کیوں قتل کر دیا؟ اور یتیموں کی شکستہ دیوار بغیر اجرت لئے کیوں بنائی (۳) تو ہمیشہ صحرا نوردی میں کیوں مصروف رہتا ہے؟ تیرے اوپر زمانہ کا کوئی اثر کیوں مرتب نہیں ہوتا (۴) زندگی کی حقیقت کیا ہے ملوکیت کیا چیز ہے؟ اور سرمایہ اور محنت میں یہ جنگ کیوں ہو رہی ہے (۵) ایشیائی ملکوں پر یہ آفات کیوں نازل ہو رہی ہیں اور ہماری قوم کے نوجوان اقوام مغرب کی تقلید کیوں کر رہے ہیں؟

(۶) یہ کیا بات ہے کہ اگرچہ بادشاہ آئے دن مرتے رہتے ہیں لیکن بادشاہت ہنوز زندہ ہے؟ (۷) عرب قومیں اسلام کی عزت کافروں کے ہاتھ بیچ رہی ہیں۔ اپنوں کے بجائے غیروں سے دوستی کر رہی ہیں اور ترکوں پر پیہم مصائب نازل ہو رہے ہیں (۸) اس وقت عالم اسلام کی یہ حالت ہے کہ مسلمان چاروں طرف سے آفات میں محصور ہیں تباہی ان کے سروں پر منڈلا رہی ہے کیا خدا تعالیٰ پھر مسلمانوں کا امتحان لینا چاہتا ہے۔؟

تیسرا بند۔ یہ سن کر خضر نے جواب دیا کہ (۱) تجھ کو میری صحرانوردی پر تعجب کیوں ہے؟ یہ مسلسل جدوجہد ہی تو زندگی کی دلیل ہے۔ اسی کی بدولت زندگی کا مفہوم انسان پر عیاں ہو سکتا ہے۔ اس کائنات کی بنیاد ہی حرکت اور عمل پر ہے۔

(۲) کیا تو نے نہیں دیکھا کہ قافلے رات دن مصروف سفر رہتے ہیں، اگر وہ تیری طرح پاؤں توڑ کر گھر میں بیٹھ رہیں تو کبھی منزل مقصود تک نہیں پہنچ سکتے۔

(۳) ہرنوں کی زندگی پر نظر کر۔ کیا وہ ہر وقت سفر میں نہیں رہتے؟ غور کر! اگر وہ کہیں قیام بھی کرتے ہیں (خضر) تو کوئی ساز و سامان اپنے ساتھ نہیں رکھتے۔ اور سفر کرتے ہیں تو میلوں نکل جاتے ہیں۔

(۴) ستاروں کو دیکھ! وہ ہر وقت گردش کرتے رہتے ہیں، طلوع آفتاب سے پہلے ان کو دیکھو تو یہ معلوم ہوتا ہے کہ جبرئیل کی پیشانی چمک رہی ہے۔

(۵) آفتاب کو دیکھو! ہر وقت مصروف سفر رہتا ہے۔ صبح کو طلوع ہوتا ہے تو شام کو غروب ہوتا ہے۔ اسی طلوع و غروب کا نظارہ دیکھ کر حضرت ابراہیم نے اللہ کی معرفت حاصل کی تھی۔

(۶) ستارہ ان کی حرکت پر غور کر! دن بھر چلتا ہے شام کو کسی چشمے پر پہنچ کر سب مسافر اس طرح اس چشمہ کے گرد جمع ہو جاتے ہیں جیسے جنتی لوگ سلسبیل کے گرد۔

(۷) خلاصۂ کلام یہ ہے کہ حرکت اور سفر (صحرانوردی) سے زندگی کی پوشیدہ طاقتیں ہوئے کار آتی ہیں۔ ہر وہ شخص جس کے سر میں سودا ہے۔ ہر وقت نئے مقامات تلاش کرتا رہتا ہے۔ لیکن جو لوگ آبادیوں میں بے مقصد (سودائے محبت کے بغیر) زندگی بسر کرتے ہیں وہ راحت کے طالب ہو جاتے ہیں اور یہ راحت پسندی ان کے حق میں پیام موت بن جاتی ہے۔

انسان تو اسی وقت تک زندہ رہتا ہے جب تک اس کے دل میں تڑپ ہو

اور یہ تڑپ اُسے صحرانوردی (جستجو) پر مجبور کرتی رہے۔

(۸) یہی تڑپ اور جستجو اُسے صفت دوام عطا کر دیتی ہے اور وہ موت کا شکار ہو جانے کے بجائے موت کو شکار کر لیتا ہے یعنی زندہ جاوید ہو جاتا ہے، زندگی گردش پیہم ہی سے مستحکم ہوتی ہے۔

چوتھا بند:۔ اے اقبال! اس جگہ شاید تجھے یہ وسوسہ لاحق ہو کہ موت تو ہر وقت انسان کو فنا کرتی رہتی ہے تو زندگی کو صفتِ دوام کیسے اور کیوں کر حاصل ہو سکتی ہے

(۱) زندگی مرنے اور جینے کے تصور سے بالاتر حقیقت ہے۔ زندگی دنیا میں محض زندہ رہنے یا نفس شماری کا نام نہیں ہے۔ بہت سے لوگ ہیں کہ زندہ ہیں لیکن در حقیقت مردہ ہیں (جیسے عثمان علی خاں آف حیدر آباد) اور بہت سے لوگ ہیں کہ مردہ ہیں لیکن زندوں سے بڑھ کر ہیں (جیسے سلطان ٹیپو شہید) زندگی کبھی جینے کا نام ہے اور کبھی جان دینے کا نام ہے۔

(۲) زندگی کو دنوں اور مہینوں یا برسوں کے پیمانہ سے مت ناپ، زندگی روز و شب سے بالاتر ہے۔ وہ ایک دائمی حقیقت ہے پیہم حرکت کا نام ہے اور ہر دم جواں ہے زمانہ اس کو فنا نہیں کر سکتا۔

(۳) اگر تو ہمیشہ زندہ رہنے کا آرزومند ہے تو اپنی دنیا آپ پیدا کر یعنی عمل صالح کی بدولت حیات جاوید حاصل کر لے۔ زندگی سرِ آدم ہے اور راز "کن فکاں" ہے یعنی زندگی کی اصل حقیقت ایک جوش اور ولولہ ہے جس کی بدولت وہ ظہور کے لئے بیتاب رہتی ہے زندہ وہ ہے جو خدا کی طرح "کن" کہہ کر نئی دنیا پیدا کر سکے۔

(۴) زندگی کی حقیقت کوہکن کی زندگی کا مطالعہ کرنے سے عیاں ہو سکتی ہے اس نے جد و جہد کی بدولت ناممکن کو ممکن کر دکھایا یعنی پرویز کے سامنے۔ اپنی جد و جہد سے ایک نئی دنیا پیدا کر دی۔ اگر تیرے اندر کوہکن کی طرح عمل کا جذبہ پیدا ہو جائے تو پھر تو بھی

زندۂ جاوید ہو جائے گا۔

(۵) زندگی کی کیفیت یہ ہے کہ وہ غلامی میں فنا ہو جاتی ہے لیکن جو شخص آزاد ہے، اس کی زندگی، بحرِ بے کراں ہوتی ہے، یعنی اس کی ترقی کی کوئی حد مقرر نہیں کی جا سکتی کیوں کہ خدا نے انسان میں ترقی کی لامحدود استعداد ودیعت فرما دی ہے۔ غلامی اور زندگی ایک دوسرے کی ضد ہیں۔ یہ دونوں ایک جگہ جمع نہیں ہو سکتیں

(۶) اگرچہ زندگی (خودی) جسم میں پوشیدہ ہے لیکن وہ کائنات کو مسخر کرنے کی طاقت رکھتی ہے۔ اور اسی عملِ تسخیر سے وہ اپنے آپ کو عیاں کر سکتی ہے۔

(۷) تجھ کو خدا نے اسی لئے پیدا کیا ہے کہ تو شریعت اسلامیہ کی اتباعِ کاملہ کی بدولت اپنی مخفی قوتوں کو بروئے کار لائے اور کائنات کو مسخر کر کے امتحان میں کامیابی حاصل کرے۔ یہ دنیا دار العمل (امتحان گاہ) ہے۔ جو شخص اپنی خودی کی صلاحیتوں کو بروئے کار نہیں لاتا وہ یقیناً فنا ہو جائے گا۔

(۸) جب تک تو اپنی خودی کی تربیت نہ کرے، تجھ میں اور تودۂ خاک میں کوئی فرق نہیں ہے۔ لیکن اگر تو عشقِ رسول کی بدولت اپنی خودی کو مستحکم کر لے تو پھر تو تلوار بن جائے گا یعنی باطل پر غالب آ کر صفتِ دوام حاصل کر لے گا۔

پانچواں بند:۔ جو شخص اس جوہرِ زندگی کے حصول کا آرزومند ہو، جو شخص، بقا کا طالب ہو، اس کا فرض یہ ہے کہ وہ سب سے پہلے اپنے اندر جان پیدا کرے یعنی عشقِ رسول اختیار کرے، اس کے بغیر کوئی انسان حقیقی معنوں میں زندہ نہیں ہو سکتا

(۲) پھر اپنے آپ کو حضور کے عشق میں فنا کر دے۔ اس فنا کے بعد حقیقی زندگی حاصل ہوگی۔ اقبال نے اس نکتہ کو بانگ درا سے لے کر ارمغان حجاز تک ہر کتاب میں بیان کیا ہے۔ اس جگہ زبورِ عجم سے صرف ایک شعر نقل کرتا ہوں:۔

صورت گری را از من بیاموز!
شاید که خود را باز آفرینی!

" یہ باز آفرینی " یہ دوبارہ زندگی حاصل کرنا ہی اقبال کے فلسفہ کا خلاصہ ہے۔

(۳) عشق رسول میں فنا ہو کر جب تو دوبارہ زندہ ہو جائے گا تو تجھ میں اس قدر طاقت پیدا ہو جائے گی کہ تو زندگی کی قوتِ پنہاں کو آشکار کر دے گا۔ یعنی تیری خودی کی تمام مخفی استعدادیں بروئے کار آجائیں گی۔ اور تیری خودی (چنگاری) صفت دوام حاصل کر لے گی۔

ع ہرگز نمیرد آنکہ دلش زندہ شد بعشق

(۴) پھر تو (تیری قوم) ایشیا (خاکِ مشرق) کو فتح کر لے گا، اور اقوام عالم کی نگاہوں میں وہی عزت حاصل کر لے گا جو تیرے اسلاف کو حاصل تھی۔

(۵) پس تو راتوں کو اٹھ کر اللہ کے حضور میں خضوع اور خشوع کے ساتھ دعائیں کرتا کہ، وہ تجھ پر مہربان ہو۔ " نالہ شب گیر" کے بغیر روحانیت پیدا نہیں ہو سکتی۔

(۶) اسے مخاطب! تو یہ قیامت سمجھ کہ حشر مرنے کے بعد برپا ہوگا۔ بلکہ یہ سمجھ کہ حشر برپا ہو چکا ہے، اس لئے تو اپنی زندگی پر غور کر کہ تو نے کوئی عمل کیا ہے یا نہیں!

اے مخاطب! خواب غفلت سے بیدار ہو کر جد و جہد میں مصروف ہو جا!

چھٹا بند:۔ اب میں تجھے 'ملوکیت' کے معنی سمجھاتا ہوں جب کوئی قوم کسی دوسری قوم پر غالب آجاتی ہے تو مفتوح قوم کو ذلیل و خوار کر دیتی ہے۔ اور یہ چاہتی ہے کہ وہ ہمیشہ کے لئے اس کی غلام بن جائے۔

(۲) اگر محکوم قوم، آزادی حاصل کرنے کے لئے کوشش کرتی ہے تو حکمراں قوم ہر ممکن طریقہ سے اس کو اپنے مقصد سے غافل کر دیتی ہے

(۳) یہی وجہ ہے کہ غلام (ایاز) کی نظر میں غلامی کا طوق، جو اس کی گردن میں پڑا ہوتا ہے، عزت کا نشان (ساز دلبری) دکھائی دیتا ہے۔ مثلاً حکمراں اس کو تابو

میں رکھنے کے لئے جو خطاب یا عہدہ عطا کرتا ہے، وہ اُسے بہت قیمتی سمجھتا ہے حالانکہ درا صل وہ طوق لعنت ہے۔

(۴) کبھی ایسا بھی ہوتا ہے کہ کوئی اللہ کا بندہ اپنی قوم کو آزاد کرنے کے لئے وہی کوشش کرتا ہے جو حضرت موسی نے بنی اسرائیل کو آزاد کرنے کے لیے، کی تھی یعنی اُس طلسم کو توڑ دیتا ہے جو ملوکیت نے باندھا تھا۔

(۵) حقیقت یہ ہے کہ بادشاہت صرف اللہ کے لیے زیبا ہے بس وہی سچا اور حقیقی حکمراں ہے۔ دنیا کے جتنے بادشاہ ہیں، جو دوسروں کو غلام بناتے ہیں، وہ سب بُت ہیں۔ اور مسلمان کا فرض ہے کہ ان بتوں کو توڑ دے۔

(۶) اے مسلمان! غلامی اختیار کر کے اپنی خودی کو جسے اللہ نے آزاد پیدا کیا ہے رسوا مت کر۔ اگر تو مسلمان ہونے کے باوجود، کسی انسان کے سامنے سر جھکائے تو بلاشبہ تو برہمن سے بڑھ کر کافر ہے۔

(۷) ملوکیت کی مذّمت کے بعد، خضر، مغربی جمہوریت کی حقیقت بیان کرتے ہیں کہ یورپ میں جس قسم کی جمہوریت رائج ہے وہ دراصل ملوکیت (قیصریت) ہی کی ایک بدلی ہوئی صورت ہے۔

(۸) ظلم وستم اور مطلق العنانی کا دیو، جمہوریت کے لباس میں لوگوں کے سامنے ناچ رہا ہے، لیکن عوام اُسے آزادی کی نیلم پری سمجھتے ہیں۔

(۹) یہ مجلس وضع آئین، اصلاحات (ریفارمس) اقلیت کو مراعات، اور حکمراں طبقہ کی طرف سے کسی جماعت کو حقوق کا عطا کرنا، یہ سب افیون کی گولیاں ہیں جن پر شکر چڑھی ہوئی ہے۔ کھانے میں میٹھی ہیں، لیکن کھانے والوں کو غافل کر دیتی ہیں، تاکہ وہ آزادی کے لئے جدوجہد نہ کر سکیں۔

(۱۰) جب مجلس آئین (اسمبلی) میں حکومت کے ارکان، عوام کے حق میں تقریریں

کرتے ہیں تو عوام سمجھتے ہیں کہ سلطنت یا حکومت ہم پر بہت مہربان ہے۔ لیکن دراصل یہ بھی سرمایہ داروں کے وہ ہتھکنڈے ہیں، جن کی بدولت وہ رعایا کو بیوقوف بناتے ہیں۔

(۱۱) اے مسلمان! افسوس ہے کہ تو اس سراب (دھوکہ) کو گلستاں اور اس قفس کو آشیاں (آزادی) سمجھے بیٹھا ہے۔ خلاصہ کلام یہ ہے کہ ملوکیت کی طرح موجودہ مغربی جمہوریت بھی ایک لعنت ہی ہے۔

ساتواں بند:۔ اب خضر، مزدور کو پیغام دیتے ہیں اور کہتے ہیں کہ یہ میرا پیغام نہیں ہے، بلکہ کائنات کا پیغام ہے یعنی ایک حقیقت ثابتہ ہے۔

(۱) اے مزدور! ساری کائنات کو تجھ سے ہمدردی ہے۔ اور ساری دنیا جانتی ہے کہ سرمایہ دار کی عشرت کا دارومدار تیری محنت پر ہے لیکن اُس نے تجھ کو تباہ کر دیا رات دن تیرا خون چوس رہا ہے۔ لیکن سیر نہیں ہوتا۔ اُس نے ہزاروں برسوں سے تجھ کو اپنا غلام بنا رکھا ہے۔ اور تجھے دھوکہ دیتا رہتا ہے۔ اس کی پوری زندگی مکر و فریب، عیاری اور دغابازی کی مسلسل داستان ہے۔

(۳) اس کی سنگدلی کا یہ عالم ہے کہ وہ تجھے مزدوری اس طرح دیتا ہے، جیسے کوئی دولتمند آدمی کسی محتاج کو بھیک یا زکوٰۃ دے۔

(۴) افسوس! سرمایہ دار نے تجھ کو زہر کا پیالہ پلا دیا (تیرا خون چوس لیا۔) لیکن تو نے اپنی غلطی سے اس کو آبِ حیات سمجھا یعنی تو یہ سمجھتا ہے کہ اگر سیٹھ صاحب مجھے تین روپیہ یومیہ عطا نہ کریں تو میں مر جاؤں گا۔ حالانکہ حقیقت یہ ہے کہ اگر تو اس کی فیکٹری میں کام نہ کرے تو اس کا خاتمہ ہو جائے گا۔

(۵) سرمایہ داری اور سرمایہ دارانہ نظام نے انسانوں کو اپنا غلام بنانے کے لیے مختلف قسم کے حربے اور آلات ایجاد کئے ہیں، مثلاً ذات پات کا امتیاز

جس کی بدولت برہمن، شودر پر حکومت کرتا ہے، یا قومیت اور وطنیت کا جذبہ جسکی بنا پر ایک قوم دوسری قوم پر حکومت کرتی ہے، یا کلیسائی نظام جس کی بدولت پوپ عوام کے ذہنوں پر حکومت کرتا ہے۔ یا سلطنت، جس کے پردہ میں بادشاہ عوام پر حکومت کرتا ہے۔ یا تہذیب جس کے پھیلانے کے بہانے سے مغربی قومیں افریقہ اور ایشیا، پر حکومت کر رہی ہیں (جب انگریز کسی ملک کو فتح کرنا چاہتے ہیں تو یہ اعلان کرتے ہیں کہ ہم اس قوم کو مہذب بنانا چاہتے ہیں) یا رنگ، جس کی بنا پر سفید رنگ کا آدمی کالے رنگ کے آدمی پر حکومت کرتا ہے۔

(۶) خضر، مزدور سے کہتے ہیں کہ یہ سب وہ نقلی معبود ہیں جن کی تو پرستش کرتا رہتا ہے بلکہ سرمایہ داری نے تجھے غلام بنانے کے لئے یہ مختلف قسم کے دیوتا وضع کر دیئے ہیں۔ اور تو ان کی پرستش میں مقصد حیات سے غافل ہو گیا۔

(۷) یہ سرمایہ دار کی خالص عیاری کی دلیل ہے کہ اس نے تجھے اپنے جال میں پھانسنے کے لئے یہ مختلف قسم کے پھندے تیار کر لئے ہیں۔ اور تو اپنی بے وقوفی سے ان پھندوں میں پھنس گیا۔

(۸) لیکن اب تو آنکھیں کھول کر دیکھ! دنیا میں انقلاب آچکا ہے "اب بزم جہاں کا اور ہی انداز ہے"۔ اس مصرع میں اس انقلاب کی طرف اشارہ ہے جو ۱۹۱۷ء میں روس میں برپا ہوا تھا۔ یعنی اے مزدور! اب تو اُٹھ اور سرمایہ داری کے طلسم کو پاش پاش کر دے۔ جنگ عظیم نے دنیا کا نقشہ ہی بدل دیا۔ زار روس کی حکومت ختم ہو گئی۔ اس کی جگہ لینن حکومت کر رہا ہے۔ جرمنی، فرانس، انگلستان اور اطالیہ، تمام ملکوں کی فضائیں "انقلاب زندہ باد" کے نعروں سے گونج رہی ہیں۔ اب وہ زمانہ آنے والا ہے کہ مشرق اور مغرب، غرض کہ ساری دنیا میں تیری ہی حکومت ہو گی۔ زار روس کا خاتمہ اس بات کی دلیل ہے کہ۔

گیا دورِ سرمایہ داری گیا!
تماشا دکھا کر مداری گیا!

آٹھواں بند:۔ اب خضر، مزدور کو انقلاب برپا کرنے اور زمامِ حکومت اپنے ہاتھوں میں لینے کی تلقین کرتے ہیں۔

(۱) اے مزدور! اگر تو ہمت اور حوصلہ سے کام لے تو ساری دنیا تیرے قدموں میں جھک سکتی ہے، تو ساری دنیا کے خزانوں کا مالک ہو سکتا ہے۔ تو کب تک روزانہ اُجرت (شبنم) پر دوسروں کی خدمت کرتا رہے گا؟

(۲) اب دنیا میں ہر طرف آزادی اور جمہوریت کا زور ہے، تو کب تک ملوکیت اور سرمایہ داری کی غلامی کرتا رہے گا؟

(۳) تجھے خبر نہیں کہ روس میں عظیم الشان انقلاب (آفتابِ تازہ) رونما ہو چکا ہے پس تو کب تک پرانے اور فرسودہ طریقوں (زمینداری جاگیرداری سرمایہ داری اور ملوکیت) کے گیت گاتا رہے گا؟۔

(۴) میں تجھے خوشخبری سناتا ہوں کہ مزدوروں نے زار روس کا تختہ اُلٹ دیا۔ آخر چشمِ آدم (مزدور طبقہ) آسائش دنیوی (جنت) کے لئے کب تک روتی رہتی؟ سوال یہ ہے کہ کیا مزدور، انسان نہیں ہے؟ حضرت آدم کی اولاد نہیں ہے؟ اگر وہ انسان ہے تو کیا وجہ ہے کہ ایک شخص تو اپنے کتوں کو بھی گوشت کھلائے لیکن دوسرا شخص (جو اسی کی طرح انسان ہے) اپنی اولاد کو روٹی بھی نہ کھلا سکے! چونکہ اسلام اس ناانصافی کو روا نہیں رکھتا۔ اس لئے خضر نے مزدور کو انقلاب برپا کرنے کا پیغام دیا ہے۔ وہی انقلاب جو اسلام نے ساتویں صدی میں برپا کر دیا تھا!

(۵) اے مزدور! حالاتِ حاضرہ کا مطالعہ کر۔ سرمایہ دار تیری ہستی دگل کو مدتوں

سے زخمی کررہے ہیں۔ تو کب تک مرہم کی تلاش کرے گا؟ سرمایہ داری کا خاتمہ کیوں نہیں کردیتا تاکہ زخم ہی نہ لگے جو مرہم کی ضرورت ہو!

(۶) پس اے نادان مزدور! آنکھیں کھول! سرمایہ داروں کی غلامی (طواف شمع) سے باز آجا! اور ان کے خلاف بغاوت کا علم بلند کردے۔ تو اپنی فطرت کے اقتضاء پر غور کر، کیا خدا نے تجھے سرمایہ داروں کی غلامی کرنے کے لیے پیدا کیا ہے؟ ہرگز نہیں، پھر تو کیوں ان کی غلامی کرتا ہے؟ اُٹھ اور اس باطل نظام کو فنا کردے اور بنی آدم کو، ان کے ظلم وستم سے آزاد کردے۔

نواں بند:۔ اے اقبال! میں مسلمانوں اور اسلامی ملکوں کی زبونِ حالی سے بخوبی واقف ہوں۔

(۲) مسلمانوں کی حماقت کا یہ نتیجہ نکلا کہ مراقش، الجیریا، تونیشیا، طرابلس، مصر، شام، فلسطین، عراق، اور ہندستان، سارے اسلامی ممالک، عیسائی اقوام کے غلام ہوگئے۔ اور خود حجاز کی سرزمین عربوں کی کوتاہ بینی کی بدولت کلیسا کے زیرِ اثر آگئی۔

(۳) ایران کی سرزمین، جو کسی زمانہ میں بہت باوقار تھی، آج آخری سانسیں لے رہی ہے۔ اور وہاں کے لوگ یورپ کی تہذیب اور معاشرت اختیار کررہے ہیں۔

(۴) اسلامی ممالک میں وطنیت کا غیر اسلامی نظریہ مقبول ہوتا جاتا ہے۔ یہ وہ اُصول (مے) ہے جس کی وجہ سے اسلام (مینا) کا وجود خطرہ میں پڑ جائے گا۔ جب بوتل ٹوٹ جائے گی تو شراب یقیناً ضائع ہوجائے گی۔

(۵) نیز مسلمان مغربی فلسفہ کے زیرِ اثر، خدا اور رسولؐ سے منکر ہوتے جاتے ہیں اور ملت اسلامیہ کی وحدت، وطنیت کی بدولت اس طرح ٹکڑے ٹکڑے ہوگئی جس طرح قینچی سونے کے اوراق کو کاٹ کر پرزے پرزے کردیتی ہے

اسلام نے تو یہ تعلیم دی تھی کہ چین سے لے کر مراقش تک سب مسلمان ایک قوم ہیں لیکن آج ترک اپنے آپ کو عربوں سے اور عرب اپنے آپ کو ترکوں سے جدا سمجھتے ہیں۔ یہی حال دوسرے ملکوں کا ہے۔

(۶) اس کا نتیجہ یہ نکلا کہ مسلمان کا خون، پانی سے بھی زیادہ ارزاں ہو گیا۔ اشارہ ہے عربوں کی بے وفائی کی طرف جنھوں نے دشمنوں کے ساتھ مل کر بھائیوں کے سینے گولیوں سے چھلنی کر دیئے۔ اگر مصطفےٰ کمال پاشا نے عربوں کی اس بے وفائی اور ملت فروشی کا انتقام اس طرح لیا کہ عربی زبان ترکی سے خارج کر دی، تو خواہ اسلام کے زاویہ نگاہ سے اس کا یہ فعل غیر محمود ہو، لیکن عرب اقوام اُسے مطعون نہیں کر سکتیں

(۷) لیکن اے اقبالؔ! تو ترکوں کی بربادی سے رنجیدہ مت ہو۔ کیا تجھے مرشد رومی کا قول یاد نہیں کہ جب ہم کسی پرانی عمارت کو دوبارہ تعمیر کرنا چاہتے ہیں تو پہلے اُس کو مسمار کرتے ہیں، پھر از سرِ نو عمارت بناتے ہیں۔

دسواں بند: اگر بغداد، دمشق۔ اور دہلی پر اغیار کا قبضہ ہے تو مایوس ہونے کی کوئی وجہ نہیں ہے، یہ شہر دوبارہ ہمارے قبضہ میں آ سکتے ہیں اے مسلمان! خدا نے تجھے عقل دی ہے بس تو غور کر کہ یہ ملک تیرے ہاتھ سے کیوں نکل گئے؟

(۲) اے مسلمان! تو اپنے مصائب کا علاج غیروں سے مت طلب کر، بیشک تو بےکس چیونٹی ہے۔ لیکن حکمراں (سلیمان) کے پاس امداد طلب کرنے کے لئے مت جا۔

(۳) اس کے بجائے تمام مسلمانوں کو پاکستان سے لے کر مراقش تک ایک متحدہ محاذ قائم کرنا چاہئے۔ ایشیا کے مسلمان اس نکتہ سے اب تک بے خبر ہیں کہ اگر وہ متحد ہو جائیں تو سارے براعظم کو یورپ کی غلامی سے آزاد کر سکتے ہیں۔

(۴) لہذا میں تمام مسلمانوں کو مشورہ دیتا ہوں کہ وہ سبا سیات سے کنارہ کش

ہوکر، اسلام کی تبلیغ و اشاعت میں منہمک ہو جائیں۔ جس چیز (ملک و دولت) کے لیے وہ بیتاب ہیں وہ اسلام کی اشاعت (حفظ حرم) کا ایک ادنیٰ ثمر ہے۔

(۵) تمام مسلمان، اسلام کی حفاظت کے لئے ملتِ واحدہ بن جائیں، اور نیل سے لے کر کاشغر (مصر سے لے کر چین تک) سارے اسلامی ممالک ایک ہو جائیں۔

(۶) جو مسلمان ملک رنگ یا خون کا امتیاز تسلیم کرے گا وہ مٹ جائے گا۔ خواہ وہ ترک ہو، یا عرب، ایرانی ہو یا پاکستانی۔

(۷) اگر مسلمانوں نے اپنی نسل کو اپنے دین (اسلام) پر مقدم کر لیا (یعنی اگر تم ہندوستانی پہلے ہو اور مسلمان بعد میں ہو) تو وہ رفتہ رفتہ دنیا سے ختم ہو جائیں گے

(۸) اگر تم دنیا میں اپنی خلافت دوبارہ قائم کرنا چاہتے ہو تو اپنے اندر وہی صفات پیدا کرو، جو حضرت فاروق اعظم رض اور حضرت عمر ابن عبدالعزیز رح میں پائی جاتی تھیں۔

(۹) لیکن اے مسلمانو! مجھے افسوس ہے کہ تم خفی اور جلی میں یعنی پوشیدہ اور ظاہر میں فرق نہیں کر سکتے۔ تم کو یہ بھی نہیں معلوم کہ ضروری کیا ہے۔ اور غیر ضروری کیا ہے یعنی تم یہ نہیں جانتے کہ اصولی باتیں کیا ہیں۔ اور فروعی امور کیا ہیں۔ نیز یہ کہ جو قومیں دنیا میں ترقی کرنے کی آرزومند ہوتی ہیں، وہ جلی (واضح اصول) کو چھوڑ کر خفی (فروعی یا مبہم امور) کا اتباع نہیں کرتیں۔

نوٹ:- اقبال نے اس مصرع میں قوم کی سب سے زیادہ دکھتی ہوئی رگ کو چھیڑا ہے لیکن میں اپنی قوم کو ذہنیت سے آگاہ ہوں، اس لئے دوسرے مصرع کی تشریح نہیں کروں گا۔ صرف اس کا مطلب بیان کئے دیتا ہوں اے نادانو! تم کب تک اس مسئلہ پر آپس میں لڑتے رہو گے کہ حضرت ابوبکر رض اور حضرت علی رض میں سے کون افضل ہے! آگاہ ہو جاؤ کہ دشمن تمہاری اس خانہ جنگی سے حسب دلخواہ فائدہ حاصل کرے گا، اور تم انجام کار تباہ ہو جاؤ گے

گیا رِضوانِ بند؛۔ آخری بند میں خضر مسلمانوں کو خوشخبری سناتے ہیں کہ :

(۱) مسلمانوں پر مصائب کا نزول ہو چکا، اور اس نے مسلمانوں کو بیدار کر دیا چنانچہ انھوں نے اللہ کی جناب میں فریاد کی۔ اب اس کی تاثیر ظاہر ہونے والی ہے۔

(۲) یورپ کی قوموں کا عروج تم نے دیکھ لیا، لیکن اب یہ بھی دیکھو کہ ان کی بیدینی اور مادہ پرستی ان کے حق میں وبالِ جان بن جائے گی۔

(۳) آج سے تیرہ سو سال پہلے اسلام نے دنیا کو، اصولِ سہ گانہ، حریت، اخوت اور مساوات کی تعلیم دی تھی۔ اب وقت آگیا ہے کہ دنیا ان پاکیزہ اُصول پر عامل ہو کر، اسلامی تعلیمات کی صداقت پر شہادت دے گی۔

"عام حریت" سے اقبال کی مراد یہ ہے کہ ہر شخص اپنی ماں کے پیٹ سے آزاد ہی پیدا ہوتا ہے۔ آگے چل کر غیر اسلامی نظام (ملوکیت اور سرمایہ داری) کی بدولت وہ اس نعمت سے محروم ہو جاتا ہے۔ اس لئے اسلام دراصل ملوکیت اور سرمایہ داری کے حق میں پیامِ موت ہے۔

(۴) جب ملوکیت اور سرمایہ داری کا خاتمہ ہو جائے گا تو نئی دنیا پیدا ہو گی۔ گویا ان دونوں کی خاکستر سے نیا نظام (اسلامی نظام) عالمِ وجود میں آئے گا۔

(۵) میرے کلام میں تم کو آئندہ دنیا کی دھندلی سی تصویر نظر آسکتی ہے۔ یعنی آئندہ زمانہ میں، دنیا میں اسلامی نظام قائم ہو جائے گا

(۶) جس طرح اسلام پہلے دور میں دنیا کے حق میں پیامِ رحمت ثابت ہو چکا ہے اسی طرح آئندہ دور میں رحمت ثابت ہو گا۔

(۷) اگر تو مسلمان ہے تو اپنے سینہ کو آرزو سے آباد رکھ اور اس آیت کو ہمیشہ مدنظر رکھ کہ اللہ کبھی وعدہ خلافی نہیں کرتا، اس کا وعدہ ہے کہ اگر مسلمان ایمان لا کر نیک کام کریں گے تو وہ ضرور اُن کو دنیا میں عزت (خلافت) عطا فرمائے گا۔

طلوعِ اسلام

حل لغات :- تنک تابی. کم کم چمکنا۔ گراں خوابی. گہری نیند کی کیفیت. عروق عِرق کی جمع ہے بمعنی رگ۔ مشرق سے اقوام مشرق مراد ہیں. طوفان مغرب سے پہلی جنگ عظیم مراد ہے. گوہر سے مسلمان مراد ہے. شکوہ ترکمانی سے : وہ غیر معمولی سطوت اور شوکت مراد ہے جو دنیا میں ترکی قوم کو نصیب ہوئی. تفصیل کا تو یہ موقع نہیں ہے صرف ایک واقعہ لکھے دیتا ہوں۔ ملک شاہ سلجوقی (۴۶۵ھ تا ۴۸۵ھ) جس کی سلطنت دیوار چین سے لے کر قسطنطنیہ تک وسیع تھی، جب ۴۸۳ھ میں ترکستان فتح کرنے کے لئے روانہ ہو رہا تھا تو قیصر روم کے سفراء سالانہ خراج لے کر حاضر خدمت ہوئے اس باجبروت بادشاہ نے حکم دیا کہ میں خراج کی رقم کاشغر کے پھاٹک پر وصول کرونگا یہ حکم سُن کر سفراء نے سرِ تسلیم خم کر دیا۔ اور اس شہر کو فتح کرنے کے بعد جب اُس نے دربار منعقد کیا تو ان لوگوں کو مخاطب کر کے کہا کہ میں نے تم سے خراج کی یہ رقم اس لئے پایۂ تخت کے بجائے یہاں وصول کی ہے کہ آئندہ مورخین یہ لکھیں کہ ملک شاہ سلجوقی کو اللہ نے یہ عزت عطا کی تھی کہ روم کے شہنشاہ نے کاشغر کے پھاٹک پر اُسے خراج کی رقم پہونچائی تھی. اس کے بعد سلطان نے خاقان چین کو اطاعت کا پیام بھیجا۔ جس کے جواب میں شہنشاہ چین دست بستہ حاضر خدمت ہو کر آداب بجالایا اور اظہار اطاعت کیا۔ اب ناظرین ملک شاہ کی سطوت کا خود اندازہ کرلیں کہ مشرق میں شہنشاہ چین اُس کا فرمانبردار تھا۔ اور مغرب میں شہنشاہ روم اس کا باجگذار تھا ذہن ہندی سے ہندو قوم کی دانش و فہم مراد ہے۔ واضح ہو کہ ہندو قوم قدیم زمانہ سے حکمت اور فلسفہ میں ممتاز چلی آتی ہے، راقم الحروف کی رائے میں یہ قوم فلسفہ میں اہل یونان سے بھی چار قدم آگے ہے. نطق اعرابی سے عربوں کی سی

فصاحت مراد ہے۔ واضح ہو کہ عرب قوم ہمیشہ سے فصاحت کے لئے مشہور ہے۔ تقدیر سیمابی۔ سیماب کی خاصیت یا اس کے خواص۔ برگستوان۔ ہندی میں اس کو پاکھر کہتے ہیں۔ یہ ایک قسم کا مضبوط چار جامہ ہوتا ہے جو گھوڑے کی پشت پر اس کی حفاظت اور زیبائش کے لئے ڈال دیتے ہیں۔ جگر تابی یعنی شجاعت یا جوش جہاد۔ ضمیر لالہ سے مسلمان کا دل مراد ہے۔ واضح ہو کہ اقبال کے یہاں "لالہ" اصطلاح ہے اس کا ذکر انھوں نے شاہین کی طرح ہر جگہ اور ہر کتاب میں کیا ہے۔ چمن سے مسلمان قوم مراد ہے نیساں ابر نیساں مراد ہے یعنی وہ بادل جسکے قطروں سے موتی پیدا ہوتے ہیں نیساں قدیم سریانی میں وہ مہینہ ہے، جو اپریل سے مطابقت رکھتا ہے۔ خلیل اللہ کے دریا سے ملت اسلامیہ مراد ہے شیرازہ بندی سے کتاب کی رعایت سے شیرازہ کا لفظ لائے ہیں۔ اس سے استحکام مراد ہے شرارِ ہاشمی سے مسلمان قوم مراد ہے۔ ہاشم، سرکار دوعالم کے پردادا کا نام ہے + تبریز یہ ایران کا مشہور شہر ہے شمال مغرب میں واقع ہے۔ آبادی دو لاکھ سے کچھ زیادہ ہے۔ جہاں بینی نظام کائنات کو سمجھنا یا قوموں کے عروج و زوال کے اسباب معلوم کرنا جگر خوں ہو۔ بہت غور و فکر کی جائے۔ رہ یدہ در۔ دانائے اسرار کائنات۔ بلبل سے ذات شاعر مراد ہے کبوتر سے محکوم مسلمان مراد ہے۔ خدائے لم یزل، یعنی وہ خدا جسے کبھی زوال نہیں ہوگا۔ آنی آن سے نکلا ہے آن، وقت کا سب سے چھوٹا حصہ۔ کمیں سے انسان مراد ہے + حنا بند، آرائش کرنے والا، امین یعنی ... ممکنات زندگانی انسانی ترقی کی تمام ممکن صورتیں جوہر مضمر کائنات کے پوشیدہ اسرار + ارمغان تحفہ یا سوغات + رمز مسلمانی، اسلام کی حقیقت میان شاخساراں درختوں کی شاخوں میں + قہستان خراساں میں ایک خطہ یا ضلع ہے۔ گماں آباد ہستی سے یہ دنیا مراد ہے قندیل رہبانی سے وہ چراغ مراد ہے جو کسی راہب کی جھونپڑی میں جل رہا ہو استبداد، یعنی ظلم و ستم۔ فقر بوذر صحابہ کرامؓ میں حضرت ابوذر غفاریؓ اپنے فقر کے لئے مشہور ہیں۔ ان کی زندگی فقر اسلامی کی بہترین تصویر ہے۔ صدقِ سلمانی سے حضرت

سلمان فارسیؓ کی سچی اسلامی زندگی مراد ہے۔ المانی جرمنی کا باشندہ + تورانی سے ترکان عثمانی مراد ہیں۔ واضح ہو کہ دنیا میں ترکان عثمانی کے علاوہ اور کوئی قوم ایسی نہیں ہے جس نے ان کے برابر جنگ و جدل میں حصہ لیا ہو۔ اور پھر زندہ موجود ہو بلکہ ابھی تک حکمراں ہو۔ انگارہ نقش ناتمام + انگارۂ خاکی سے انسان مراد ہے روح الامین، حضرت جبرائیل کا لقب ہے۔ ذوق یقین سے ایمان محکم مراد ہے۔ اقبال نے اکثر یقین کو ایمان کے معنی میں استعمال کیا ہے۔ ولایت سے روحانیت یا قربِ خداوندی مراد ہے۔ اگر واو کو زبر سے پڑھا جائے تو اس کے معنی ہوں گے مدد کرنا۔ اقبال نے اسے پہلے معنی میں استعمال کیا ہے۔ براہیمی نظر سے شان یا رنگ توحید مراد ہے۔ حذر۔ بچنا یا ڈرنا۔ چیرہ دست ظالم۔ تعزیر۔ سزا۔ کم نگاہی۔ غفلت شرمندۂ ساحل بڑی بلیغ ترکیب ہے۔ مراد ہے وہ شخص جس نے اپنے آپ کو محدود کر لیا ہو۔ مصاف بمعنی میدان جنگ + حریر وں پرنیاں۔ اعلیٰ قسم کا ریشم۔ شہریاری سے ملوکیت مراد ہے ریزہ کاری مہین کام۔ نازک۔ پرورات ہیں نگینے جڑنا خروش آموزِ بلبل ہو یعنی انسانوں کو محبت کا سبق پڑھا۔ اطلس قبایان تتاری سے ترکان عثمانی مراد ہیں۔ مرغ زار سے بلبل مراد ہے۔ نگار بمعنی معشوق۔ خیمہ کشیدن۔ چھا جانا امنڈ آنا۔ آبشار۔ جھرنا۔ بسرت گردم، میں تیرے قربان قانون پیشین۔ پرانا دستور۔ قانون کے دو معنی ہیں (۱) دستور (۲) ایک باجہ کا نام ہے خیل بمعنی لشکر۔ ہزار بلبل۔ مشتاقاں۔ عشاق۔ احمد بیٹا قصہ، بات، داستان۔ خواجۂ بدر و حنین۔ یہ سرکار دو عالم صلعم کا لقب ہے۔ بدر سے جنگ بدر مراد ہے۔ جو ۲ھ میں اور حنین سے جنگ حنین مراد ہے جو ۸ھ میں ہوئی تھی۔ تصرف لغوی معنی ہیں کسی شئے پر قبضہ یا اقتدار حاصل کرنا۔ اصطلاحی معنی ہیں، کسی نبی یا ولی کی روحانی طاقت جس کی بدولت وہ بغیر آلات و وسائل کائنات پر حکومت کرتا ہے + یہاں اصطلاحی معنی مراد ہیں۔ شاخ خلیل سے ملت اسلامیہ مراد ہے + کامل عیار۔ کھرا نہال بمعنی پودا + سازگار۔ موافق + طرح دیگر انداختن، انقلاب برپا کرنا۔

تبصرہ:۔ یہ بانگ درا کی آخری نظم ہے۔ اور اپنی نوعیت کے لحاظ سے بے نظیر ہے جیسا کہ میں پہلے لکھ چکا ہوں۔ اس کتاب میں تین نظمیں بہت بلند پایہ ہیں "شمع اور شاعر" "خضر راہ" اور "طلوع اسلام" چونکہ ان میں سے ہر ایک کا موضوع جداگانہ ہے اس لئے ان میں موازنہ نہیں ہو سکتا۔ اپنی اپنی جگہ ہر نظم لاجواب ہے۔

"شمع اور شاعر" کا پس منظر یہ ہے کہ ۱۲-۱۹۱۱ء میں دنیائے اسلام پر نکبت، اور ادبار کے مسلط ہو جانے کی وجہ سے اقبال کا دل رنج وغم سے معمور ہو گیا تھا۔ اس لئے اس نظم میں انھوں نے مسلمانوں کی غفلت پر نوحہ خوانی کی ہے۔ اور اس کے بعد انھیں دوبارہ زندہ ہو جانے کی ترکیب بتائی، جس پر انھوں نے ابھی تک عمل نہیں کیا اور نہ مستقبل قریب میں راقم الحروف کو اس کی کوئی امید نظر آتی ہے۔ ع۔ تھا جنھیں ذوقِ تماشا وہ تو رخصت ہو گئے

"خضر راہ" کا پس منظر یہ ہے کہ پہلی جنگ عظیم کے بعد ۲۰-۱۹۱۹ء میں، دنیا میں ایک انقلاب عظیم رونما ہو رہا تھا یعنی پرانے نظام کی جگہ، نیا نظام قائم ہو رہا تھا اس جنگ نے ملوکیت اور سرمایہ داری دونوں کے مفاسد آشکار کر دیئے اس لئے اقبال نے اس نظم میں، زندگی کی حقیقت بیان کی ہے حیات کے اسرار آشکار کئے ہیں سلطنت اور حکومت کی ماہیت واضح کی ہے، سرمایہ اور محنت کی آویزش کا نقشہ کھینچا ہے، ممالک اسلامیہ کی غیر اسلامی روش (قوم پرستی کی طرف میلان) پر تنقید کی ہے۔ اور آخر میں مسلمانوں کو امید کا درس دیا ہے

"طلوع اسلام" کا پس منظر یہ ہے کہ انھوں نے ۱۹۲۲ء میں لکھی تھی چونکہ اس زمانہ میں مصطفےٰ کمال پاشا نے سقاریہ کی جنگ میں یونانیوں کو شکست دے کر ساری دنیا پر یہ حقیقت آشکار کر دی تھی کہ ترک ابھی زندہ ہیں۔ اور سمرنا فتح کر کے مسٹر گلیڈسٹن کے خاندان میں صف ماتم بچھا دی تھی، اس لئے اقبال نے جس طرح مایوسی کے عالم میں "شمع اور شاعر" لکھی تھی، اسی طرح رجائیت کے عالم میں یہ نظم لکھی۔

اس نظم کا بنیادی تصور خود اس کے عنوان ہی میں مضمر ہے اور اس کا پہلا بند مسرت

اور شادمانی کے جذبات سے لبریز ہے۔ بلکہ ساری نظم میں یہی رنگ نظر آتا ہے۔ اقبال نے مصطفیٰ کمال کی کامیابی کو طلوعِ اسلام سے تعبیر کیا ہے۔ "خضرِ راہ" میں کہیں نہ کہیں ناامیدی اور مایوسی کا رنگ بھی جھلکتا ہے لیکن اس نظم میں اقبال کا دل اس یقین سے معمور ہے کہ اگر مسلمان اپنے اندر ایمان پیدا کرلے تو وہ پھر ساری دنیا کو فتح کرسکتا ہے۔

ع ذرا نم ہو تو یہ مٹی بہت زرخیز ہے ساقی!

میری رائے میں بندش اور ترکیب، مضمون آفرینی، اور بلند پروازی، رمز و کنایہ کی فراوانی اور مشکل پسندی، شوکتِ الفاظ، اور فلسفہ طرازی، غرضکہ صوری اور معنوی محاسن شعری کے اعتبار سے یہ نظم بانگِ درا کی تمام نظموں پر فوقیت رکھتی ہے۔ اقبال کی شاعرانہ عظمت کا نقش، میرے دل پر اسی نظم کے مطالعہ سے مرتسم ہوا۔ اور اس کی سب سے بڑی وجہ یہ ہے کہ یہ نظم انھوں نے اس وقت لکھی جب ترکوں کی کامیابی سے ان کے دل میں مسرت کے جذبات موجزن تھے۔ ع

اُفق سے آفتاب اُبھرا گیا دورِ گراں خوابی!

تجزیہ:- اس شاہکار میں نو بند ہیں۔ ہر بند کا بنیادی تصور ذیل میں درج کرتا ہوں۔ اسکے بعد مطلب بیان کروں گا۔

پہلے بند میں شاعر نے قوم کو ترقی اور کامیابی کا مژدہ سنایا ہے۔ یہ مصرع اس بند کی جان ہے ع۔ مسلماں کو مسلماں کردیا طوفانِ مغرب نے

اس بند کی وہ خصوصیت جس کی بدولت اس کو امتیازی شان حاصل ہوگئی، یہ ہے کہ جب ۱۹۲۳ء میں عمائدِ لاہور نے شاہدرہ (مقبرۂ جہانگیر) میں اقبال کو، خطاب کے سلسلہ میں، ایک شاندار پارٹی دی تھی، تو حاضرین کے اصرار پر (کہ کچھ سنائیے) انھوں نے اپنی طرف اشارہ کرکے پڑھا تھا۔ جس کا مطلب یہ تھا کہ وہ یہ سرکا خطاب مجھے اعلائے کلمۃ الحق سے باز نہیں رکھ سکتا۔

تڑپ صحنِ چمن میں آشیاں میں، شاخساروں میں — جُدا پارے سے ہو سکتی نہیں تقدیر سیمابی

دوسرے بند میں مصطفےٰ کمال کی طرف ع ربودآں ترک شیرازی دل تبریز و کابل کا اشارہ ہے اور پھر اس مصرع میں اس کی خدمت میں خراج تحسین پیش کیا ہے:۔

ع بڑی مشکل سے ہوتا ہے چمن میں دیدہ ور پیدا

تیسرے بند میں مسلمان کو اس کی پوزیشن (حیثیت) سے آگاہ کیا ہے اور اُس کو یہ تاکید کی ہے کہ تو مناسب حال تیاری کر لے، کیوں کہ عنقریب تجھ سے دنیا کی امامت کا کام لیا جائے گا چوتھے بند میں اسلام کی حقیقت بیان کی ہے اور مسلمان کو اسلاف کی تقلید کا درس دیا ہے ع۔

وہ کیا تھا؟ زورِ حیدر، فقرِ بوذر، صدقِ سلمانی

پانچویں بند میں، جو شاعری، فلسفہ اور مذہب ان تینوں خوبیوں کا حامل ہے، انھوں نے قوم کو "ذوقِ یقیں" کے ثمرات سے باخبر کیا ہے۔

چھٹے بند میں ترکوں کی کامیابی کی طرف اشارہ ہے۔

ساتویں بند میں مسلمانوں کی اخوت اور محبت کا بھولا ہوا سبق یاد دلایا ہے۔

آٹھویں بند میں ملوکیت کی مذمت کی ہے

نویں بند میں ساقی (قوم) سے خطاب کیا ہے؛

پہلا بند:۔ ستاروں کا ٹمٹمانا اس بات کی دلیل ہے کہ آفتاب طلوع ہونے والا ہے مسلمان مدتوں غفلت کی نیند سوتے رہے شکر ہے کہ مصطفےٰ کمال (آفتاب) نے انہیں بیدار کر دیا

(۲) مسلمانوں کی مردہ رگوں میں پھر زندگی کے آثار نمایاں ہو گئے اس راز کو فلسفی یا منطقی لوگ بالکل نہیں سمجھ سکتے (کیونکہ یہ بات فضلِ ایزدی سے متعلق ہے)

(۳) سچ تو یہ ہے کہ جنگِ عظیم (۱۹۱۴ء-۱۸ء) نے مسلمانوں کو اس حقیقت سے آگاہ کر دیا کہ اگر ہم جدوجہد نہیں کریں گے تو فنا ہو جائیں گے، اگر دریا (دنیا) میں تلاطم

بر پا نہ ہو تو موتی (مسلمان) میں آب و تاب پیدا نہیں ہو سکتی یعنی مسلمان کے جوہر عیاں نہیں ہو سکتے۔

(۴) آثار بتا رہے ہیں کہ مسلمانوں کو دنیا میں دوبارہ سربلندی نصیب ہوگی۔ ترکوں کی سی شان و شوکت، ہندیوں کی سی دانائی اور عربوں کی سی فصاحت و بلاغت۔

(۵) اے اقبال! (بلبل) اگر تو دیکھے کہ قوم میں غفلت کا اثر ہنوز باقی ہے، تو اپنی شاعری میں مزید جوش و خروش کا رنگ پیدا کر دے۔ اگر لوگوں میں گانا سننے کا ذوق نہیں ہے تو مطرب کو چاہیے کہ زیادہ دلکشی کے ساتھ گائے تاکہ لوگ متوجہ ہوں۔

(۶) اور ہر جگہ اور ہر مجلس، اور ہر جلسہ اور ہر تقریب میں مسلمانوں کو بیدار کر۔ جہاں موقع ملے اور جس طرح ممکن ہو سکے، قوم کو بیداری کا پیغام دے۔ تو اپنی قوم پر عاشق (سیماب) ہے۔ اور تڑپ، عاشق سے جدا نہیں ہو سکتی۔

نوٹ ۱۔ اقبال لاکھ خطا کار سہی لیکن اُس اللہ کے بندے نے اپنے طرزِ عمل سے اس مصرع کو سچ کر دکھایا، وہ جب تک زندہ رہا (میں گواہی دیتا ہوں کہ) قوم کے عشق میں تڑپتا رہا۔ میرے علاوہ صدہا انسانوں نے اُسے بچشمِ خود تڑپتے دیکھا، بلکہ اُس نے بہت سے مسلمانوں کو تڑپنا سکھا دیا۔ مجھے اب تک یاد ہے کہ ایک مرتبہ تڑپنے کی حالت میں یہ الفاظ اُس کے منہ سے نکلے تھے: یاد رکھو! سرکارِ دو عالم صلعم کا عاشق دنیا میں کبھی ذلیل نہیں ہو سکتا۔"

(۷) وہ شخص، جو کسی مردِ غازی کے ایمان کا نظارہ کر سکتا ہے، اسے یہ دیکھنے کی مطلق ضرورت نہیں ہوتی کہ اس غازی کے گھوڑے کی زین یا ظاہری آرائش کیسی ہے۔ یعنی مسلمانوں کا اندازہ ان کے ایمان سے کرنا چاہیئے نہ کہ ظاہری ساز و سامان سے

(۸) اے اقبال! تو قوم کے ہر فرد کے دل میں عشقِ رسول کی آگ بھڑکا دے اور قوم کے افراد کے دل میں یہ آرزو پیدا کر دے کہ وہ اپنی کھوئی ہوئی عظمت کو دوبارہ حاصل

کرسکیں۔

نوٹ: جستجو سے مراد ہے عظمتِ رفتہ کی جستجو اور آرزو سے مراد ہے سرکار دو عالم (صلی اللہ علیہ وسلم) کے نقش قدم پر چلنے کی آرزو ۱۲۔

دوسرا بند:۔ اگر مسلمان اللہ کے حضور میں عاجزی اور گریہ وزاری کرے تو اس کے آنسو جناب باری کی نظر میں نہایت قیمتی ثابت ہو سکتے ہیں۔ یعنی اللہ ضرور اپنا فضل نازل فرمائے گا۔ اور مجھے امید ہے کہ فضل الٰہی نازل ہونے والا ہے۔

(۲) اور مسلمانوں کو دنیا میں پھر سربلندی حاصل ہوگی۔

(۳) چنانچہ اللہ نے مصطفےٰ کمال پاشا کو محض اپنے فضل و کرم سے "یہ فتح مبین" عطا فرمائی ہے جس کی بدولت اُس کو تمام دنیائے اسلام میں ہر دلعزیزی حاصل ہوگئی ہے (ترک شیرازی سے مصطفےٰ کمال کی طرف اور تبریز و کابل سے دنیائے اسلام کی طرف اشارہ ہے) آج ترکوں کی کامیابی کی خوشبو تمام دنیائے اسلام میں پھیلی ہوئی ہے۔

(۴) اے مسلمانو! یہ سچ ہے کہ جنگ عظیم میں ترکوں نے نقصان عظیم برداشت کیا بلکہ سلطنت، سیادت اور سطوت تینوں چیزوں کا خاتمہ ہوگیا لیکن یہ آزردہ ہونے کی بات نہیں ہے، ہمیشہ مصائب کے بعد راحت نصیب ہوتی ہے۔ اور اگر فطرت سے اس کی شہادت درکار ہے تو سحر پر غور کرو، لاکھوں ستارے فنا ہو جاتے ہیں تو ایک سحر پیدا ہوتی ہے۔

(۵) اے مسلمانو! حکومت تو ایک عارضی شئے ہے۔ آج چلی گئی تو کل آجائے گی۔ بڑی چیز "جہاں بینی" ہے۔ یعنی تمہیں قوموں کے عروج و زوال کے فلسفہ کا مطالعہ کرنا چاہیئے تاکہ تم وہ غلطی نہ کرو جس کا نتیجہ تباہی ہوتا ہے۔ "نظر" سے فراست مراد ہے۔

(۶) یاد رکھو! ایسا شخص جو کسی مردہ قوم کو زندہ کردے کہیں صدیوں میں جاکر پیدا ہوتا ہے "دیدہ ور" سے اشارہ ہے مصطفےٰ کمال کی طرف جنہوں نے ۱۹۲۲ء میں اقبال کے اس شعر پر عمل کر کے دکھایا۔

پھونک ڈالے یہ زمین و آسمانِ مستعار اور خاکستر سے آپ اپنا جہاں پیدا کرے

دنیا شاہد ہے کہ اس نے نئی تہذیب پیدا کر دی، جس میں نہ ملوکیت ہے نہ احبار ہیں۔ نہ حرم سرائے سلطانی ہے نہ کنیزوں کی فوج ظفر موج، نہ گنڈا ہے، نہ تعویذ۔

(۷) اے اقبال! اب وقت آگیا ہے کہ تو مسلمانوں کو اسلام کے محاسن سے آگاہ کر دے تاکہ یہ محکوم قوم (کبوتر) یورپ کا مقابلہ کر سکے۔

(۸) تو چونکہ اسرار حیات سے آگاہ ہے، اسلئے مسلمان کو اسکے مقام اور کامیابی کے طریق سے آگاہ کر دے۔

تیسرا بند: ۱۔ اے مسلمان! تو اللہ کی قدرت کا نشان اور تیرے ذریعہ سے، وہ دنیا والوں سے ہمکلام ہونا چاہتا ہے۔ یعنی اُس نے تجھے اپنے کلام کا امین اور مبلغ بنایا ہے۔ تیرے پاس وہ ضابطۂ حیات موجود اور محفوظ ہے جو اللہ کی مشیئت کا ترجمان ہے۔ پس تو اللہ کی ہستی پر یقین کامل پیدا کر لے۔

(۲) تیرا نصب العین اس قدر بلند ہے کہ آسمان کی بھی اس کے سامنے کوئی حقیقت نہیں ہے تو اُس کارواں سے مشابہ ہے، جسکی منزل مقصود کی رفعت ستاروں کو بھی شرماتی ہے۔

(۳) یاد رکھ! یہ دنیا فانی ہے۔ اور اس میں تیرا قیام (انسانی زندگی) عارضی ہے لیکن تو اپنی ذات کے اعتبار سے غیر فانی ہے اور تیرے بعد کوئی قوم پیدا نہیں ہو گی۔

نوٹ: "ازل تیرا" یہ شاعرانہ انداز بیان ہے۔ ورنہ اقبال انسان کو ازلی نہیں کہہ سکتے کیونکہ یہ بات اسلام کی تعلیمات کے خلاف ہے ۱۲۔

چونکہ قرآن مجید، اللہ کا آخری پیغام ہے اور تو اس کا حامل ہے، اس لئے تو بھی قرآن حکیم سے رابطۂ قلبی کی بنا پر جاودانی ہے۔

(۴) تیرے اندر عشق رسول کا جو وصف (خون جگر) پایا جاتا ہے) اس کی بدولت تیری ذات اس کائنات کی رونق کا سبب بن گئی۔

واضح ہو کہ اس بند میں یہ اور اگلے دو شعر بہت مشکل ہیں۔ مضامین نہایت بلند ہیں

اور بندش بغایت پیچیدہ ہے ع حنا بند عروس لالہ ہے خون جگر تیرا، بہت بلیغ مصرع ہے اقبال نے اس مصرع کو بال جبریل میں یوں باندھا ہے ع مسلماں کے لہو میں ہے سلیقہ دلنوازی کا "عروس لالہ" سے وہ افراد اور اشیاء مراد ہیں، جن میں ترقی کی صلاحیت پائی جاتی ہے یا جن کا وجود دنیا کے لئے زیب و زینت کا موجب ہے۔

تجھے حضرت ابراہیمؑ سے نسبت خصوصی حاصل ہے اس لئے تو بھی اس دنیا کا معمار ہے جس طرح انھوں نے خانۂ کعبہ تعمیر کیا تھا تو بھی نئی (اسلامی) دنیا تعمیر کر۔

(۵) اے مسلمان! اللہ نے تیری فطرت میں ترقی کی غیر محدود صلاحیتیں ودیعت فرمادی ہیں (ممکنات زندگانی اقبال کی وضع کردہ اصطلاح ہے اس لئے تو اپنی اہمیت کا صحیح شعور پیدا کر۔ اگر تو نے اپنی صلاحیتوں کو برباد کر دیا تو یہ کائنات گویا امتحان میں فیل ہو جائے گی اللہ نے اس کائنات میں بہت سی نعماء مخفی کر دی ہیں۔ اگر تو ان کو مسخر نہیں کرے گا تو اس کائنات کی تخلیق کا مقصد ہی فوت ہو جائے گا۔

(۶) اے مسلمان! تو وہ تحفہ ہے جس کو نبوت اس دنیا سے عالم جاودانی کی خاطر اپنے ساتھ لے گئی۔ اس بلیغ شعر کا مطلب یہ ہے کہ قیامت کے دن اللہ تعالیٰ سرکار دوعالم صلعم سے دریافت فرمائے گا کہ ہم نے آپ کو دنیا میں نبی بنا کر بھیجا تھا آپ نے وہاں کیا کارِ نمایاں انجام دیا؟ تو حضور اقدس صلعم بارگاہ ایزدی میں عرض کر سکتے ہیں کہ میں نے تیرے مخلص بندوں کی ایک جماعت پیدا کر دی، مثلاً صدیق اکبرؓ فاروق اعظمؓ عثمان غنیؓ اور علی مرتضیٰؓ وغیرہم۔ لہذا اے مسلمان! تو اپنے اندر ایمان پیدا کر لے تا کہ قیامت کے دن تیرا شمار بھی ان مسلمانوں میں ہو سکے جن پر حضور انور فخر کریں گے۔ میرا خیال ہے کہ اقبال نے جب یہ شعر لکھا تھا تو اس وقت یہ حدیث ان کے پیش نظر تھی "اِنّی اُباھی بکُمُ الاُمَمَ" یعنی میں تمہاری وجہ سے قیامت کے دن دوسری امتوں پر فخر کروں گا کہ اے خدا میری امت نے سب امتوں سے بڑھ کر تیرے نام کو بلند کیا۔

(۷) اے مسلمان! اگر تو اپنے اسلاف کی تاریخ کا مطالعہ کرے تو تجھ پر یہ حقیقت عیاں ہو جائے گی کہ ایشیائی اقوام کی حفاظت صرف تو ہی کر سکتا ہے۔

(۸) لہٰذا تو اپنے اندر صداقت عدالت اور شجاعت کے جوہر پیدا کر لے تاکہ اللہ تعالیٰ تجھ کو دنیا کی قوموں کا سردار بنا دے۔ اس شعر میں اقبال نے اس آیت کا مفہوم واضح کیا ہے کُنْتُمْ خَیْرَ اُمَّۃٍ اُخْرِجَتْ لِلنَّاسِ (اے مسلمانو!) تم بہترین امت ہو اور تم لوگوں کی اصلاح کے لیے پیدا کیے گئے ہو۔" یہی وجہ ہے کہ اقبال نے مسلمانوں کو صفات سہ گانہ مذکورہ بالا اپنے اندر پیدا کرنے کا مشورہ دیا ہے۔ کیونکہ ان کے بغیر کوئی قوم امامت کی اہل نہیں ہو سکتی۔

چوتھا بند (۱) فطرت کا مقصد اور اسلامی تعلیمات کی روح یہ ہے کہ دنیا میں اخوت کا راج ہو اور محبت کی بہتات ہو یعنی ہر شخص دوسروں کو اپنا بھائی سمجھے۔ اور بھائیوں کی طرح ان سے محبت کرے۔

(۲) پس اے مسلمان! تو ذات، پات، نسل، خاندان، اور قبیلہ کے امتیازات کو مٹا دے اور اپنے آپ کو افغانی، ایرانی، تورانی، یا پاکستانی کہنے کے بجائے ملت اسلامیہ کا فرد قرار دے یعنی اپنے آپ کو کسی ملک یا نسل سے منسوب مت کر۔

(۳) جب تو دنیا کی بلند ترین فضا (ملت) میں پرواز کر سکتا ہے تو پھر کسی باغ کے درخت کی ڈالی (قبیلہ) پر بیٹھ کر، بلبلوں (افراد) سے رسم و راہ کی کیا ضرورت ہے!

دوسرے معنی یہ ہو سکتے ہیں کہ جب تو ساری دنیا کو فتح کرنے کی صلاحیت رکھتا ہے تو کسی خاص خطۂ ارض پر کیوں قناعت کرتا ہے؟

(۳) یاد رکھ کہ اس دنیا میں، ایمان کا مرتبہ وہی ہے، جو صحرا میں کسی درویش کی جھونپڑی میں چراغ کا ہو سکتا ہے جس طرح وہ چراغ بھولے بھٹکے مسافروں کو راہ دکھا سکتا ہے یا پناہ دے سکتا ہے۔ اسی طرح مسلمان اس دنیا میں گمراہ انسانیت کو راہ راست دکھا سکتا ہے۔

(۴) اے مسلمانو! اس نکتہ پر غور کرو کہ تمہارے اسلاف نے اگر دنیا سے ملوکیت کی لعنت کو ہٹایا تو اس کے لئے انھوں نے اپنے اندر مناسب حال

صفات پیدا کر لی تھیں۔ اگر تم اپنے زمانہ میں ملوکیت کو مٹا کر اسلامی مساوات قائم کرنا چاہتے ہو تو اپنے اندر حضرت علیؓ کا زور، حضرت ابوذر غفاریؓ کا فقر اور حضرت سلمان فارسیؓ کا صدق پیدا کرو۔

نوٹ:۔ یہ شعر افادیت کے لحاظ سے اس نظم کا حاصل ہے۔ اگر اقبال صرف یہی ایک شعر لکھ کر اس نظم کو ختم کر دیتے تو ان کا مقصد پورا ہو جاتا۔ میری رائے میں مسلمانوں کی سب سے بڑی نادانی یہ ہے کہ وہ دنیا میں حکمرانی کی آرزو تو رکھتے ہیں لیکن ساری دنیا جانتی ہے کہ وہ اس کے اہل نہیں ہیں۔ اور وہ خود بھی اس تلخ حقیقت سے بے خبر نہیں ہیں قرآن مجید یہ فرماتا ہے کہ پہلے حکمرانی کی اہلیت پیدا کرو پھر آرزو کرو۔ لیکن میری قوم کا طرز عمل یہ ہے کہ خود تو اسلام سے دور کا واسطہ بھی نہیں ہے۔ لیکن پاکستان میں اسلامی حکومت کے قیام کی آرزومند ہے ۱۲۔

(۵) مسلمانوں نے اس شان کے ساتھ دنیا میں حکومت کی یعنی بنی آدم کو حریت کا درس دیا کہ جو لوگ صدیوں سے انسانوں کی غلامی میں مبتلا تھے وہ یکسر جنبشِ نگاہ آزاد ہو گئے مثلاً جب مصری، شامی، عراقی، ایرانی، اور ہندی اقوام اسلام لائیں تو وہ بتوں، برہمنوں ذات پات اور توہمات کی غلامی سے آزاد ہو گئیں۔

(۶) یاد رکھو! صرف ایمان کی مضبوطی سے تم کو ثبات و استحکام حاصل ہو سکتا ہے یہی وجہ ہے کہ جرمن قوم سے ترک قوم زیادہ مضبوط اور پائیدار ثابت ہوئی اقبال کا اشارہ ان فتوحات کی طرف ہے جو ترکوں نے ۱۹۱۸ء کی شکست کے صرف چار سال بعد ۱۹۲۳ء میں دول متحدہ پر حاصل کیں۔

(۷) بات یہ ہے کہ جب انسان میں یقین (ایمان) کی صفت پیدا ہو جاتی ہے تو وہ جبرائیل (روح الامین) کی طرح قدسی نفس اور مقرب بارگاہِ خداوندی ہو جاتا ہے۔

پانچواں بند:۔ (۱) اے مسلمانو! تم اس وقت غلامی کی لعنت میں گرفتار ہو۔ اس سے نکلنے کا طریقہ۔ اسلامی طریقہ یہ ہے کہ تم فتنہ و فساد اور قتل و غارت کا سلسلہ شروع کرنے

کے بجائے اپنے اندر ایمان کا رنگ پیدا کر لو۔ مثلاً سرکار دو عالم صلعم نے مسلمانوں کے اندر پہلے ایمان پیدا کیا پھر اللہ نے ان کو جنگ بدر میں کامیاب کیا۔ اکبر الہ آبادی کہتے ہیں

خدا کے کام دیکھو بعد کیا ہے اور کیا پہلے نظر آتا ہے مجھ کو بدر سے غارِ حرا پہلے

یعنی پہلے ایمان، پھر جہاد۔ گویا یہ شعر اقبال نے اسوۂ رسول مقبول صلعم کو پیش نظر رکھ کر لکھا ہے۔ راقم الحروف کا بھی یہی مسلک ہے کہ اگر مسلمان اپنے دشمنوں سے انتقام لینا چاہتے ہیں تو پہلے ایمان پیدا کر لیں۔

(۲) اے مسلمانو! جب تمہارے اندر ایمان پیدا ہو جائے گا تو تم دنیا میں اسی طرح انقلاب برپا کر دو گے جس طرح تمہارے اسلاف نے پیدا کر کے دنیا کو محو حیرت بنا دیا تھا اقبال کہتے ہیں کہ نگاہِ مردِ مومن سے تقدیر تک بدل سکتی ہے۔ جب مسلمان اس شعر کو سنتے ہیں تو بغیر سمجھے واہ واہ اور سبحان اللہ کرنے لگتے ہیں۔ لیکن افسوس ہے کہ پچیس تیس سال میں کسی کو یہ توفیق حاصل نہ ہو سکی کہ وہ اس کا مفہوم سمجھتا اور پھر اس پر عمل کرتا۔ بات یہ ہے کہ ہم لوگ کلام اقبال کو محض سیاسی اغراض یا گرمی محفل، یا قوالی، یا تقریر کی زینت کیلئے استعمال کرتے ہیں

بیشک نگاہِ مردِ مومن سے "تقدیر" بدل سکتی ہے۔ لیکن پہلے کوئی مسلمان کسی مومن کی صحبت میں بیٹھ کر کچھ دنوں اس کی کفش برداری کر کے اپنے اندر نگاہ تو پیدا کر لے۔ افسوس کے ساتھ لکھنا پڑتا ہے کہ مغربی تعلیم کی بدولت مسلمانان کی ذہنیت اس قدر مادہ پرستانہ ہوگئی ہے کہ وہ اس بات کو تسلیم ہی نہیں کرتا کہ (ا) تقدیر بھی کوئی چیز ہے یا (ب) نگاہ کی بھی کوئی اصلیت ہے یا (ج) صحبت سے یہ چیز پیدا ہو سکتی ہے یا (د) دنیا میں مجھ سے زیادہ قابل بھی کوئی شخص موجود ہے۔ خدا معلوم اقبال کا تجربہ کیا تھا، راقم الحروف کا تیس سالہ تجربہ تو یہ ہے کہ میری قوم میں جہل مرکب کی کیفیت یہ ہے کہ معمولی پڑھا لکھا آدمی تو اپنے آپ کو ارسطو سے بڑھ کر سمجھتا ہے اور شریعت کا بر لئے نام پابند مسلمان اپنے آپ کو مجدد الف ثانی کا ہم پلہ یقین کرتا ہے اندریں حالات "نگاہ" پیدا ہو تو کیسے؟

(۳) اے مسلمانو! وہ تمام باتیں جو تمھیں مرغوب ہیں، مثلاً قربِ خداوندی، روحانیت حکومت بادشاہی، فلسفہ، حکمت اور سائنس یہ سب نعماء تم کو صرف ایمان ہی کی بدولت حاصل ہو سکتی ہیں۔ اور وہ "ایمان" ہے تمھیں یقین نہ ہو تو عربوں کی تاریخ کا مطالعہ کرلو ان کو یہ سب نعمتیں حضور انور کی غلامی (ایمان) کی بدولت حاصل ہوگئیں تھیں۔

(۴) لیکن یہ ضرور ہے کہ ایمان بڑی مشکل سے پیدا ہوتا ہے۔ کیوں کہ انسان کے اندر دنیا حاصل کرنے کی ہوس بڑی شدت سے کارفرما ہے۔ اور اس ناپاک مگر ذاتی صفت کی بدولت، انسان زبان سے تو اسلام کا ادعا کرتا ہے، لیکن دل میں خدا کے بجائے اپنی ہوا وہوس یعنی نفسانی خواہشات کی پرستش کرتا ہے۔ واضح ہو کہ کوئی شخص، مرشد کی صحبت کے بغیر اس دشمن پر غلبہ حاصل نہیں کر سکتا۔ حضرت علیؓ، حضرت ابوذر غفاریؓ اور حضرت سلمان فارسیؓ میں ایمان کا رنگ ذاتی کوشش سے پیدا نہیں ہوا تھا بلکہ یہ کسی مردِ مومن کی نگاہ کا فیض تھا۔ پس اگر مسلمان "ہوس" کے بُت کو توڑنا چاہتے ہیں تو کسی مومن کی صحبت میں بیٹھ کر اپنے بازو میں طاقت پیدا کریں۔ اگر اُستاد کی تعلیم اور اکھاڑے میں ورزش، کے بغیر، کوئی شخص اپنے مادی حریف کو چت نہیں کر سکتا، تو مرشد (استاد) کی نگاہ (تعلیم) اور خانقاہ (اکھاڑہ) میں مجاہدہ (ورزش) کے بغیر کوئی شخص اپنے روحانی دشمن کو کیسے شکست دے سکتا ہے؟ اے مسلمانو! یاد رکھو جو شخص تمھیں بزرگانِ دین کی صحبت سے روکتا ہے، وہ تمھارا بدترین دشمن ہے۔ ع

اے بسا ابلیس، آدم روئے ہست

(۵) اے مسلمانو! ذات پات، قوم قبیلہ اور برادریوں کے امتیازات اور بندہ و آقا کی تمیز کو مٹادو۔ یہ امتیازات انسانیت کے حق میں سم قاتل ہیں۔ یاد رکھو! قرآن کی رو سے کوئی شخص کسی دوسرے شخص کا آقا نہیں ہو سکتا۔ تم سب کا ایک ہی آقا ہے اور وہ اللہ ہے۔ کیا اس کا نام بتانے کی بھی ضرورت ہے!

وہ دانائے سُبل، ختم الرسل، مولائے کل جس نے غبارِ راہ کو بخشا فروغِ وادیِ سینا

دوسرے مصرع میں اقبال نے اُن سرمایہ داروں اور جاگیرداروں کو، جو مظلوم ہی نہیں اور بے زبان مزدوروں اور کاشتکاروں کو اپنا زر خرید غلام سمجھتے ہیں اور ان کی عورتوں کی بے عزتی کرنا اپنا پیدائشی حق سمجھتے ہیں، متنبہ کیا ہے کہ اگر تم اپنی حرکاتِ ملعونہ سے باز نہیں آؤ گے تو فطرت تمھیں مٹا کر رکھ دے گی۔ اقبال نے اس مصرع کا مضمون قرآن مجید کی اس آیت سے اخذ کیا ہے اِنَّ بَطْشَ رَبِّكَ لَشَدِيدٌ بے شک تیرے رب کی گرفت (بازپرس) بہت ہی سخت ہوتی ہے۔

(۶) اے مسلمانو! بندہ و آقا کا امتیاز، ظالم، خود غرض اور بدکار انسانوں کا پیدا کیا ہوا ہے۔ اللہ نے تو سب کو یکساں بنایا ہے، بلکہ کائنات میں ہر شے کی اصل و بنیاد ایک ہی ہے۔ بظاہر آفتاب اور ذرہ میں بڑا فرق نظر آتا ہے لیکن درحقیقت ان دونوں میں کوئی فرق نہیں ہے۔ یا یوں سمجھو کہ ان دونوں کی حقیقت ایک ہی ہے۔ آفتاب بھی مادی ہے، ذرہ بھی مادی ہے، وہ بھی مخلوق اور مجبور، یہ بھی مخلوق اور مجبور ہے۔

(۷) اے مسلمانو! اگر تم اپنے اندر یقینِ محکم، عملِ پیہم اور محبت، یہ صفاتِ سہ گانہ پیدا کر لو تو تم ساری دنیا کو فتح کر سکتے ہو۔ (اقبال کا مطلب یہ ہے کہ دنیا میں کامیابی کے لئے، مادی وسائل کے علاوہ بلکہ اُن سے بڑھ کر، اخلاقی طاقت کی ضرورت ہے۔ اور یہ وہ نکتہ ہے جسے مادہ پرست قومیں بھی تسلیم کرتی ہیں۔ چنانچہ آج کل ہر سلطنت اپنی توجہ اس بات پر مرکوز کرتی ہے کہ اس کی فوجوں کا مورال (Morale) پست نہ ہونے پائے

(۸) اے مسلمانو! جہاد میں ایک سپاہی (مرد) کو بندوق اور رائفل سے بدرجہا زیادہ طبع بلند، مشربِ ناب، دلِ گرم، نگاہ پاک بیں، اور جانِ بیتاب کی ضرورت ہے۔ اقبال کی فراست کی داد دینی پڑتی ہے کہ انھوں نے اس فہرست میں تمام وہی باتیں گنائی ہیں، جو ہماری قوم میں ناپید ہیں۔ مثلاً ہماری (۱) طبیعت کی بلندی کا یہ عالم ہے کہ چند روپیوں کے زیورات کے لئے ہم ایک معصوم لڑکی کو قتل کر سکتے ہیں۔

(ب) مشرب کی پاکیزگی کا یہ حال ہے کہ سرے سے ہمارا کوئی مشرب ہی نہیں ہے
ایمان بیچنے پہ ہیں اب سب تُلے ہوئے   لیکن خرید ہو جو علی گڑھ کے بھاؤ سے

(ج) دل کی گرمی کا اندازہ اس بات سے ہو سکتا ہے کہ اُس میں حضور انور کے تصور کی گنجائش ہی نہیں ہے۔ اور جب محبت ہی نہیں تو گرمی کا ذکر ہی خارج از بحث ہے۔

(د) نگاہ پاک بیں کی کیفیت یہ ہے کہ مسلمانوں نے اگست ۱۹۴۷ء سے پاک اور ناپاک کی تمیز ہی اُٹھا دی ہے۔ جو گناہ کیجئے ثواب ہے آج۔

(ہ) اب رہی "جان بیتاب" تو مجھے قوم کی زندگی ہی میں کلام ہے۔ بیتابی کا مسئلہ تو اس کے بعد زیر بحث آئے گا۔

دیکھ آئے قوم سنتے تھے جسے!   چند لڑکے ہیں مشن اسکول کے (اکبر مرحوم)

چھٹا بند:- (۱) مقام شکر ہے کہ اہل یونان جو ترکوں پر برطانوی امداد کی بدولت بڑے طمطراق (عقابی نشان کیساتھ) حملہ آور ہوئے تھے، نہایت ذلت کے ساتھ پسپا ہوتے۔

(۲) جن لوگوں (یونانیوں) کو آہن روز کشتیوں پر ناز تھا ترکوں نے بفضل خدا انھیں خود سمندر میں غرق کر دیا۔ اور جو مفلوک الحال اور بے سر و ساماں تھے کامیاب ہو گئے۔

(۳) جن یونانیوں کو اپنی فوج اور برطانوی خفیہ کمک (کیمیا) پر ناز تھا، وہ آج ذلیل و خوار ہیں۔ اور جن لوگوں نے آڑے وقت میں اللہ کو یاد کیا وہ فتح کی خوشیاں منا رہے تھے

نوٹ:- راقم الحروف کو اچھی طرح یاد ہے کہ جب ۱۹۲۲ء میں فتح سمرنا کی خبر اخبارات میں شائع ہوئی تھی تو بریلی کی کوئی مسجد نہ تھی جس میں مسلمانوں نے گھی کے چراغ نہ جلائے ہوں۔

(۴) بیشک ترکوں کے پاس نہ اسلحہ کا انتظام تھا نہ ٹیلیگراف کا نہ ٹیلیفون کا لیکن اسکے باوجود انھوں نے ان دشمنوں کے دانت کھٹے کر دیئے جو جدید ترین آلات حرب سے مسلح تھے۔

(۵) عربوں کے ماتھے پر اگر ملت سے غداری اور اسلام سے بے وفائی کا داغ لگا تو یہ سب شریف مکہ (حجاز کا گورنر) کی کم نگاہی یعنی عاقبت نااندیشی اور خود غرضی کا نتیجہ تھا لیکن ان کے مقابلہ میں ترک نہایت صاحب نظر، دانشمند، اور اسلام کے شیدائی نکلے جنھوں نے اپنا سر ہتھیلی پر رکھ کر کافروں کا مقابلہ کیا، حسین شریف مکہ نے تو لٹیا ہی ڈبو دی اسلام کو رسوا کر دیا۔ کہ کافروں کے ساتھ مل کر اُس قوم کا سینہ گولیوں سے چھلنی کر دیا جس نے حرمین شریفین کی حفاظت کے لئے صدیوں تک اپنا خون پانی کیطرح بہایا!

(۶) یہی وجہ ہے کہ دنیائے اسلام میں جس قدر سچے مسلمان موجود تھے، وہ سب اور جس قدر فرشتے زمین سے آسمان تک جاتے تھے، وہ سب یہی کہتے تھے کہ واقعی ترک تو بڑے ثابت قدم، بڑے جانباز، اور بڑے حوصلہ مند نکلے۔

(۷) حقیقت بھی یہی ہے کہ جن لوگوں کے دلوں میں ایمان کی چنگاری پوشیدہ ہوتی ہے وہ دنیا میں آفتاب کی طرح زندگی بسر کرتے ہیں، اِدھر ڈوبے اُدھر نکلے۔ یعنی اگر ۱۹۱۸ء میں شکست کھائی تو ۱۹۲۲ء میں شکست دیدی۔

(۸) اگر افراد کے دلوں میں یقین (ایمان) کا رنگ موجود ہو تو قوم اگر کسی معرکہ میں ناکام بھی ہو جائے تو دوبارہ کچھ عرصہ کے بعد کامیاب ہو سکتی ہے۔ یہ صفت یقین وہ قوت ہے۔ جس کی بدولت کسی قوم کی بگڑی ہوئی تقدیر بن جاتی ہے۔

ساتواں بند: ا۔ اے ہندی مسلمان! ترکوں کی زندگی سے سبق لے۔ اگر وہ آزاد ہو گئے تو، تو بھی آزاد ہو سکتا ہے بس اس کی صورت یہ ہے کہ تو (۱) پہلے اپنی حقیقت سے آگاہی حاصل کر کہ تو مقصد تخلیق کائنات ہے (ب) اس کے بعد اپنی خودی کی صحیح طریق پر (اور عشق رسول کے علاوہ اور کوئی طریقہ نہیں ہے) تربیت کر (ج) اور اس کے بعد دنیا میں حکومت الٰہیہ قائم کر دے

نوٹ: واضح ہو کہ یہ شعر بہت تفصیل طلب ہے۔ میں نے صرف مطلب بیان

کر رہا ہے۔ اس کی وضاحت کروں تو بذات خود ایک کتاب مرتب ہو سکتی ہے
ہاں اگر قوم نے کبھی اشتیاق ظاہر کیا تو یہ خدمت بسر و چشم انجام دونگا۔

(۲) اے مسلمان! اس وقت تمام دنیا اپنی نفسانی خواہشات کی پیروی کر رہی ہے ہر شخص نے اپنی خواہشات کو اپنا معبود بنا رکھا ہے اس لئے تو اس گمراہ انسانیت کو اخوت اور محبت کا پیغام دے۔ اور تمام امتیازات کو مٹا دے۔

(۳) آج خود مسلمانوں میں قومیت اور وطنیت کا نظریہ مقبول ہو رہا ہے مثلاً افغانستان کے مسلمان اپنے آپ کو افغانی سمجھتے ہیں اور توران کے مسلمان تورانی، اے مسلمان تو ان کو وحدت ملی کا درس دے۔ اور جغرافیائی حدود و قیود سے بالاتر ہو کر ان کے اندر آفاقیت (عالمگیریت) کی شان پیدا کر دے۔ واضح ہو کہ اسلام نے تمام جغرافیائی حدود کو باطل کر کے مسلمانوں کو ایک عالمگیری قوم بنا دیا ہے۔

(۴) اے مسلمان! چونکہ تیرے دماغ میں رنگ اور نسب کے غیر اسلامی تصورات پیدا ہو گئے ہیں۔ اس لئے مناسب ہے کہ دنیا میں ترقی کرنے سے پہلے ان تصورات کو اپنے دماغ سے نکال دے (پریشاں ہو جا)

(۵) اے مسلمان! اپنی خودی کی معرفت کر لے، کیونکہ تیری "خودی" حیات کا راز ہے۔ زندگی کی حقیقت اسی میں پوشیدہ ہے۔ اور تیری زندگی کا مقصد ہی یہ ہے کہ تو اپنی خودی سے آگاہ ہو جائے۔ یاد رکھ! جب تو اپنی خودی کی معرفت حاصل کر لے گا تو اسوقت تجھ میں اس قدر طاقت پیدا ہو جائے گی کہ تو زمان و مکان کی قید سے نکل سکے گا اور جو شخص زمان و مکان سے بالاتر ہو جاتا ہے وہ (جیسا کہ سب جانتے ہیں) حیات جاوداں حاصل کر لیتا ہے۔

(۶) اے مسلمان! زندگی کی جنگ یا جدوجہد میں کامیابی حاصل کرنے کے لئے تجھے اپنے آپ کو فولاد کی طرح مضبوط بنانا چاہیئے۔ یعنی مصائب برداشت کرنے کی

طاقت پیدا کرنی چاہیئے. لیکن جب تو اپنے بھائیوں (مسلمانوں) سے ملے تو ریشم کی طرح نرم ہو جا یعنی ان سے نرمی کا برتاؤ کر. یہ مضمون اس آیت سے ماخوذ ہے۔

مُحَمَّدٌ رَّسُولُ اللّٰهِ وَالَّذِينَ مَعَهٗ أَشِدَّاءُ عَلَى الْكُفَّارِ رُحَمَاءُ بَيْنَهُمْ ۔

——— بے شک (حضرت اقدس) محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) اللہ کے (سچے) رسول ہیں۔ اور جو لوگ آپ کے ساتھ ہیں یعنی (مسلمان) ان کی خصوصیت یہ ہے کہ وہ کافروں کے مقابلہ میں (فولاد کی طرح) سخت ہیں۔ (لیکن) آپس میں ایک دوسرے پر مہربان ہیں۔

(۷) اے مسلمان! اگر کوئی دشمن تیرے سامنے کوہ بن کر آئے تو اس کا مقابلہ کر لیکن اگر کوئی شخص تجھ سے دوستی کرے تو اس کو فائدہ پہونچا. اس کے ساتھ حسن سلوک کر.

(۸) اے مسلمان! تجھے اللہ نے دو قوتیں عطا فرمائی ہیں، فکر اور ذکر۔ قوتِ فکر کی بدولت تو علم حاصل کر سکتا ہے. اور قوتِ ذکر کی بدولت تجھ میں عشقِ رسول کا رنگ پیدا ہو سکتا ہے۔ اور اس حقیقت کو پیشِ نظر رکھ کہ نہ تیرے علم کی کوئی نہایت ہے نہ عشق کی کوئی نہایت ہے۔ اس کی وجہ یہ کہ تو کائنات میں اشرف المخلوقات ہے، تو اس کا تنہا ہر کام اور ہر ارادہ ہے اس لیے اللہ نے تجھ کو یہ دو قوتیں ایسی عطا فرمائی ہیں جو ذات کے اعتبار سے غیر محدود ہیں۔

آٹھواں بند: اے مسلمان! یہ بات کیا تیرے لیئے باعث خجالت نہیں ہے کہ تو نے ابھی تک دنیا سے ملوکیت کا خاتمہ نہیں کیا! جب تک دنیا میں ملوکیت باقی ہے انسان حقیقی معنوں میں آزاد نہیں ہو سکتا۔ کس قدر افسوس کی بات ہے کہ انسان خود اپنے ہی بھائیوں کو اپنا غلام بنا تا رہتا ہے۔

(۲) ملوکیت کے علاوہ تہذیبِ مغرب بھی بنی آدم کے حق میں لعنت ہے۔ اگرچہ بظاہر یہ تہذیب بہت دلکش ہے لیکن یہ وہ زیور ہے جس میں جھوٹے نگینے لگے ہوئے ہیں یعنی اس میں جس قدر خوبیاں نظر آتی ہیں وہ دراصل برائیاں ہیں۔

(۳) جس سائنس پر اہل یورپ فخر کرتے تھے، آج وہی سائنس اقوام مغرب کی ہوس پرستی اور استعمار پسندی کی وجہ سے بنی آدم کے حق میں لعنت بلکہ تباہی کا موجب بن گیا ہے اس شعر میں اُن خوفناک اور مہلک آلات جنگ کی طرف اشارہ ہے جو سائنس کی بدولت عالم وجود میں آتے ہیں (اب ان میں "ایٹم بم" کا اضافہ ہو گیا ہے)

(۴) حقیقت یہ ہے کہ اہل مغرب، کتنی ہی کوشش کیوں نہ کریں، ان کا تمدن (طریق زندگی) جس کی بنیاد سرمایہ داری اور ظلم و ستم پر ہے، کبھی پائیدار نہیں ہو سکتا۔ اقبال نے یہ خیال ۱۹۲۲ء میں ظاہر کیا تھا، اب ۱۹۵۱ء میں اس کی صداقت بالکل واضح ہو گئی ہے

(۵) انسان، اپنی فطرت کے اعتبار سے نہ نیک (نوری) ہے نہ بد (ناری) ہے۔ وہ اس دنیا میں جیسے اعمال کرتا ہے ویسا ہی ہو جاتا ہے۔ جو قوم اللہ کے احکام کی پابندی کرتی ہے وہ نکوکار (جنتی) ہے اور جو نافرمانی کرتی ہے۔ وہ بدکار (جہنمی) ہے۔

(۶) اے مسلمان تیرا وجود اس دنیا کے حق میں سراسر باعث رحمت و برکت ہے اس لئے تو انسانوں کو محبت کا پیغام دے۔ اور اطاعت الٰہی کا سبق پڑھا کیونکہ انسان کو صرف اللہ کی اطاعت سے اطمینان قلبی حاصل ہو سکتا ہے۔

(۷) ترکوں نے اپنے موجودہ طرز عمل سے ثابت کر دیا ہے کہ اگر وہ کمر بستہ ہو جائیں تو دنیا کو اسلام کا امن آفریں پیغام سنا سکتے ہیں۔

(۸) اے مسلمانو! اُٹھو! ستم رسیدہ انسانیت (جانِ ناتواں) تمہارے پیغام کو سننے کے لئے بیتاب ہے۔ بڑی مدت کے بعد تمہیں یہ موقع نصیب ہوا ہے کہ اسلام کی خوبیاں دنیا پر ظاہر کرو۔ آج یورپ جس مصیبت میں گرفتار ہے، اس کا ازالہ صرف اسلامی تعلیمات پر عمل کرنے سے ہو سکتا ہے۔

نوٹ: واضح ہو کہ یہ بند اقبال نے فارسی میں لکھا ہے۔ نہ تو اس کے ترجمہ سے اس کا جوش بیان یا اس کی سرمستی اور کیفیت واضح ہو سکتی ہے۔ اور نہ مفہوم ظاہر ہو سکتا ہے

اس لئے ترجمہ کے بجائے میں اس کا مطلب اپنے لفظوں میں بیان کرتا ہوں لیکن اس حقیقت کا اعتراف ضروری ہے کہ جو بات اقبال کے اشعار میں ہے وہ میں اپنے لفظوں میں ادا نہیں کر سکتا۔ اے اسلام کے علمبردار اٹھ اور دنیا کو اسلام کا پیغام سنا کیونکہ عصر حاضر، اسلام کی تعلیمات کو قبول کرنے کے لئے آمادہ ہے۔ دنیا میں تبلیغ و اشاعت اسلام کا اس وقت زریں موقعہ ہے۔ اہل دنیا مصائب کی وجہ سے پریشان ہیں، تو قرآنی تعلیمات کو شائع کر کے ان کے مصائب کا ازالہ کر سکتا ہے۔

اے مسلمان میں تیرے قربان جاؤں! اب عین موقع ہے کہ تو اپنے اسلاف کے نقش قدم پر چل کر دنیا کو اسلام سے روشناس کر دے۔ تمام قومیں زخموں سے چور ہیں تو اسلام کے مرہم سے ان کو صحت عطا کر، حجروں سے نکل! میدان عمل میں آ! ہمت سے کام لے اور نڈر ہو کر اسلام کی تبلیغ کر۔ بڑی مدت کے بعد یہ زریں موقع نصیب ہوا ہے دنیا والوں کو جو مادہ پرستی کا خمیازہ بھگت رہے ہیں، سرکار دو عالم صلعم کے جمال کا نظارہ دکھا! حضور کی سیرت مبارکہ کو لوگوں کے سامنے صحیح رنگ میں پیش کر۔ میں چونکہ حضور کی روحانی طاقت سے آگاہ ہوں، اس لئے تجھے یقین دلاتا ہوں کہ اگر تو حضور کی سیرت (اسوہ حسنہ) اس وقت دنیا کے سامنے پیش کرے گا تو یقیناً کامیابی ہوگی۔

اگر ہم اس وقت اسلام کی تبلیغ کے سلسلہ میں کام لیں تو ہماری کوشش (خون) سے ملت اسلامیہ (شاخ خلیل) کو چار چاند لگ جائیں گے۔ وجہ یہ ہے کہ ہمارے پاس قرآن مجید (زر کامل عیار) ہے۔ اور یہ وہ کتاب ہے جو ہر مرض کی دوا ہے۔ میں ہر اس مسلمان کے لئے، جو اس وقت میدان عمل میں آجائے، قرآن حکیم کی تبلیغ کے لئے اپنی جان ہتھیلی پر رکھ لے، صدق دل سے دعائیں کروں گا کیونکہ وہ اپنے عمل (خون) سے نہال ملت کو ترو تازہ کر دے گا۔ پس اے مسلمانو آؤ سب مل کر اسلام کی تبلیغ کریں اور غیر مسلموں کو قرآن کا پیغام سنائیں۔ کفر کا خاتمہ کر دیں۔ اور نئی دنیا پیدا کر دیں، جس طرح تیرہ سو سال

پہلے فاروق اعظمؓ نے پیدا کر دی تھی۔

نوٹ: میں نے فاروق اعظمؓ کا اسم گرامی اس لئے پیش کیا ہے کہ

(۱) دنیا میں اللہ کی حکومت اس وقت قائم ہو سکتی ہے جب بنی آدم کو حریت کاملہ (یعنی حریت نفس، حریت ضمیر اور حریت فکر) نصیب ہو جاتے۔

(۲) اور تاریخ گواہ ہے کہ سرکار دو عالم صلی اللہ علیہ وسلم کے بعد، فاروق اعظمؓ سے بڑھ کر کسی شخص نے دنیا میں حریت کاملہ کو مستحکم نہیں کیا۔

میں اس شرح میں اسلام کے اصول حریت کی وضاحت کر سکتا ہوں، نہ فاروق اعظمؓ کی سیرت قلمبند کر سکتا ہوں، صرف ایک واقعہ لکھتا ہوں:۔

جب ایک قبطی (مصری) نے فاروق اعظمؓ کی خدمت میں حاضر ہو کر یہ شکایت کی کہ مصر کے گورنر کے بیٹے نے مجھے بلا وجہ زدوکوب کیا ہے تو انھوں نے گورنر کو لکھا کہ "اللہ نے تو ہر انسان کو حریت کی نعمت سے نوازا ہے، تم کو یہ حق کہاں سے حاصل ہو گیا کہ لوگوں کو اس عطیۂ الٰہی سے محروم کر دو؟ اپنے بیٹے کو فوراً میرے پاس روانہ کر دو تاکہ مظلوم کی دادرسی ہو سکے۔"

حجۃ اللہ علی الارض حضرت شاہ ولی اللہ دہلویؒ نے بالکل صحیح لکھا ہے، کہ انبیاء کو چھوڑ کر دنیا ابھی تک فاروق اعظمؓ کا جواب پیدا نہیں کر سکی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ مسٹر گاندھی جی نے ۱۹۳۷ء میں کانگریسی لیڈروں کو ہدایت کی تھی کہ فاروق اعظمؓ سے حکومت کا طریقہ سیکھو۔

غزلیات حصہ سوم

پہلی غزل

(۱) اے بادِ صبا! تو مدینہ جائے تو سرکارِ دو عالم صلعم سے عرض کیجیو کہ آپ کی اُمت نے چونکہ آپ کی اطاعت سے مونھ موڑ لیا، اس لئے دین کے علاوہ حکومت بھی ان کے ہاتھ سے نکل گئی بات یہ ہے کہ مسلمان کا مقصدِ حیات حکومت نہیں ہے، بلکہ تبلیغ اسلام ہے، مسلمانوں نے یہ غلطی کی کہ فرضِ منصبی سے غافل ہو کر دنیا طلبی میں منہمک ہو گئے نتیجہ یہ نکلا کہ نہ دین ملا نہ دنیا ملی۔ اگر وہ دین اختیار کر لیں تو دنیا خود بخود مل جائے گی۔

ع ملک و دولت ہے فقط حفظ حرم کا اک ثمر

(۲) اقبالؔ مسلمانوں کو پیغام دیتے ہیں کہ خدا کی راہ میں تو بڑی بڑی دشواریاں لاحق حال ہوتی ہیں اے مسلمانو! تم صرف حکومت نکل جانے ہی سے پریشان ہو گئے۔

(۳) اے مسلمان! اسلام کی عزت، یعنی تیری عزت تو شعائر اسلامیہ کی پابندی پر منحصر ہے جب تو نے اسلامی اصول کی پابندی ترک کر دی تو نہ حکومت رہی، نہ عزت رہی، اور نہ آبرو رہی۔

(۴) اے مسلمان! اگر تو کمال (آبرو) حاصل کرنا چاہتا ہے تو دنیاوی عزت کے لئے دوڑ دھوپ ترک کر دے اور کسی صاحب کمال کی صحبت اختیار کر۔ اس کا نتیجہ یہ ہوگا کہ تیری فطرت کی خامیاں بھی دور ہو جائیں گی، اور تو لوگوں کے دروازوں کا طواف کرنے کی ذلت سے بھی محفوظ ہو جائے گا۔

(۵) بے شک یہ نظمیں اور غزلیں تو میں نے ہی لکھی ہیں، لیکن میرے تمام خیالات، قرآن

حدیث سے ماخوذ ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ میرے کلام کا مطالعہ روحانی تسکین بھی بخشتا ہے اور دلوں کو بھی گرماتا ہے۔

دوسری غزل

(۱) انسان جب اپنے چاروں طرف نظر کرتا ہے تو اسے مختلف قسم کے ہنگامے نظر آتے ہیں اور وہ اس غلط فہمی میں مبتلا ہو جاتا ہے کہ یہ ہنگامہ دنیا کی ذات میں داخل ہے۔ اقبال کہتے ہیں کہ یہ سب فریب نظر ہے، دراصل کائنات فانی ہے۔ یہ چمن بظاہر ہنگاموں سے آباد ہے لیکن اس کا باطن خاموش ہے یعنی اس کی حقیقت فنا ہے۔ یہ بلبل اور قمری کے نغمے، یہ عیش و عشرت کی محفلیں سب آنی اور فانی چیزیں ہیں۔

(۲) تہذیب مغرب اختیار کرنے کا نتیجہ یہ برآمد ہوا ہے کہ ہم مشرقی لوگ تو تباہ ہو گئے اور اقوام مغرب ہماری حماقت پر ہنس رہی ہیں۔

(۳) اقبال نے اس شعر میں ایک دلکش شاعرانہ نکتہ پیدا کیا ہے۔ کہتے ہیں کہ اے خدا! یہ دنیا جو بلا مبالغہ ایک غم خانہ ہے، اس میں تو کہیں نظر نہیں آتا۔ کیا دنیا کو پیدا کرنا بھی کوئی جرم تھا جو تو اس طرح روپوش ہو گیا؟ یہ شعر شاعرانہ شوخی کی عمدہ مثال ہے۔

(۴) انسان کا دل دل نہیں ہے بلکہ "نگار خانہ ہے آرزو کا" یہی وجہ ہے کہ اس میں ہر وقت ایک نیا ہنگامہ برپا رہتا ہے۔ یہ دوسری بات ہے کہ ان ہنگاموں میں شور و غل نہیں ہوتا۔ یہ شعر اسلوب بیان کی عمدہ مثال ہے۔

(۵) اے انسان! زندگی بسر کرنی کوئی آسانی بات نہیں ہے، بچوں کا کھیل نہیں ہے بس یہ سمجھ لے کہ شراب کی بوتلیں تیرے کاندھوں پر رکھی ہوئی ہیں۔ ذرا سی لغزش سے سب ٹوٹ جائیں گی۔ یعنی معمولی سی غلطی سے پوری زندگی تباہ ہو جاتی ہے۔ اقبال نے اس شعر میں زندگی کی بہت بڑی حقیقت واضح کر دی ہے

(۶) اس شعر میں اقبال نے مرزا ارشد گورگانی دہلوی کی وفات کی طرف اشارہ کیا ہے جو دلی کے شاہی خاندان سے تعلق رکھتے تھے۔ نہایت شریف اور سخن سنج تھے کچھ عرصہ لاہور میں رہے۔ اس کے بعد فیروزپور ہائی اسکول میں فارسی کے مدرس ہو کر چلے گئے تھے۔ انجمن حمایت اسلام لاہور کے سالانہ جلسوں میں شریک ہو کر اپنی نظموں سے سامعین کو محظوظ کرتے تھے۔ چونکہ ان کی وجہ سے لاہور کے بعض اشخاص میں شعر وسخن کا ذوق پیدا ہو گیا تھا اسلئے اقبال نے یہ مصرع لکھا تھا "جس کے دم سے دلی دلا ہو۔ ہم پہلو ہوئے"۔

تیسری غزل

(۱) مطلب یہ ہے کہ مسلمان کو اُس وقت میدان عمل (جہاد) میں آنا چاہیئے، جب سیرت میں پختگی پیدا ہو جائے۔ تاکہ وہ دنیا کے مصائب کا مقابلہ کر سکے۔

(۲) یہ مشہور شعر ہے جس میں اقبال نے عشق اور عقل کے بنیادی فرق کو واضح کیا ہے عقل میں جب تک مصلحت اندیشی کا رنگ پیدا نہ ہو کامل نہیں ہوتی، لیکن عشق کی نوعیت اس کے برعکس ہے اگر اس میں مصلحت اندیشی کا رنگ باقی ہے تو وہ کامل نہیں ہے یعنی عقل کا تقاضا یہ ہے کہ وہ انسان کو اپنی جان خطرات میں ڈالنے سے روکتی ہے، اس کے خلاف عشق انسان کو میدان جنگ میں سرفروشی کی تعلیم دیتا ہے۔

(۳) چنانچہ دیکھ لو! حضرت ابراہیم بلا تامل اس آگ میں داخل ہو گئے جو نمرود نے انکو جلانے کے لئے تیار کرائی تھی۔ لیکن اربابِ عقل (فلاسفہ) ابھی تک تذبذب میں گرفتار ہیں کہ خدا ہے یا نہیں، اور ہم اس کی خاطر جہاد کریں یا نہ کریں۔

(۴) یہ شعر بھی دوسرے شعر کی وضاحت کرتا ہے کہتے ہیں کہ صدیق اکبرؓ نے سرکار دوعالم صلعم کی زبان مبارک سے جس وقت یہ الفاظ سُنے کہ میں اللہ کا رسول ہوں تو فوراً ایمان لاکر اتباع رسول شروع کر دی لیکن ابوجہل جو مکہ میں عقل و خرد کے لیئے

مشہور تھا، ساری عمر، رسالت کا مفہوم ہی نہ سمجھ سکا۔

نوٹ:- جب لوگوں نے حضرت ابوبکرؓ سے پوچھا کہ تم نے نہ کوئی معجزہ دیکھا نہ گفتگو کی پھر کیسے آنحضرت کی رسالت پر ایمان لے آئے؟ تو اس عاشق صادقؓ نے یہ جواب دیا کہ مجھے حضور کا رخ انور ہی دیکھ کر یقین ہو گیا تھا۔ اور یہ قول داستان عشق میں قیامت تک بے نظیر رہے گا کہ "دلکش چہرہ کسی جھوٹے انسان کا نہیں ہو سکتا۔" مرشد رومیؒ نے اسی حقیقت کو مثنوی میں یوں بیان کیا ہے ؎

در دلِ ہر امتی کز حق مزہ است　　روئے و آواز پیمبر معجزہ است

(۵) اے مسلمان! اگر تو شیوۂ عشق اختیار کر لے تو تجھے زمان و مکان کی قیود سے بھی آزادی نصیب ہو جائے گی اور تو دنیا میں انقلاب بھی پیدا کر سکے گا لیکن افسوس ہے کہ تو ابھی تک زمان و مکان کی قید میں گرفتار ہے۔ اس لاجواب شعر میں اقبال نے زمانہ (ایام) کو بت خانہ قرار دے کر انسان کو پجاری (زناری) باندھا ہے۔ اس ترکیب سے شعر میں غضب کی دلکشی پیدا ہو گئی ہے۔

(۶) اس شعر کا اسلوب بیان نہایت دلکش ہے۔ کہتے ہیں کہ جب میں کثرت مئے نوشی سے انکار کرتا ہوں تو ساقی بگڑ کر کہتا ہے کہ اقبال! تو ابھی تک اس شغل (مے نوشی) کے انجام کے تصور سے خائف ہے۔ یہ بزدلی تجھے ہرگز زیب نہیں دیتی۔ مطلب یہ ہے کہ جب میں جہاد سے جان چرا کر کسی گوشۂ عافیت میں پوشیدہ ہو جاتا ہوں تو سرکار دو عالم (ساقی) کی روح مجھ سے کہتی ہے کہ افسوس! تو مسلمان ہو کر موت (انجام) سے ڈرتا ہے

(۷) کم و کیف منطق کی ان دونوں اصطلاحوں کو قبل ازیں واضح کر چکا ہوں، کم و کیف حیات، بہت بلیغ ترکیب ہے۔ اس کی وضاحت یہ ہے کہ ہم زندگی کی قیمت کا عموماً دو طرح اندازہ کرتے ہیں۔ پہلی صورت یہ ہے کہ ایک انسان نوے سال کی عمر میں فوت ہوتا ہے۔ مرتے وقت ایک صندوقچہ، تمغوں، اور سندات سے لبریز چھوڑتا ہے

جس میں جنرل نکلسن سے لے کر سر مائیکل اوڈوائر تک تمام "خداوندان لندن" کی خوشنودئ مزاج کا جلوہ نظر آتا ہے ان کے علاوہ بہت سے باغات اور مربعے بہت سی کوٹھیاں اور جاگیریں۔ اس مبارک اور مسکین بدبخت انسان کی زندگی "کم حیات" کی تصویر ہے۔

اس کے مقابلہ میں دوسرا انسان صرف ۴۸ سال زندہ رہتا ہے، لیکن جب تک زندہ رہتا ہے، دین وملت کے دشمنوں سے جنگ کرتا رہتا ہے۔ چاروں طرف سے محصور ہو جاتا ہے۔ لیکن ہمت نہیں ہارتا اور بالآخر ۱۷۹۹ء کو مردانہ وار جام شہادت نوش کر لیتا ہے۔ یہ مرد مومن "کیف حیات" کی تفسیر ہے۔

زانکہ از عرض حیات آمد ثبات — از خدا کم خواستم طول حیات (جاوید نامہ)

اب اس کا خلاصہ لکھتا ہوں (۱) کم حیات کا مطلب ہے کتنی مدت زندہ رہا اور کتنا عیش کیا؟ (ب) کیف حیات کا مطلب ہے، جتنی مدت بھی زندہ رہا (خواہ بیس برس ہی جیا) کیسے اور کس انداز سے زندہ رہا؟ غلامی کی حالت میں یا سرور کی کے عالم میں؟ اگر کسی کی زندگی میں کم اور کیف دونوں شامل ہوجائیں تو وہ سلطان محمود بیگڑہ یا سلطان اورنگزیب عالمگیر بن جاتا ہے

اوّل الذکر نے پچپن سال اور آخر الذکر نے پچاس سال حکمرانی کی، اور کسی معرکہ میں ناکامی کا منہ نہیں دیکھا۔

اقبال کہتے ہیں کہ زندگی کی کامیابی کا اندازہ طول حیات (شمار سحر و شام سے) مت کرو، یہ دیکھو کہ جتنے دن جیا، کیونکر جیا، اور کیسے جیا؟ بھیک مانگتا رہا، یا دولت لٹاتا رہا؟ غلامی کرتا رہا، یا آزاد رہا؟

(۸) اے خدا! میری قوم کے افراد (لالہ ہا) تیری نگاہ کرم کے محتاج ہیں۔ ان میں ابھی تک کفر کا مقابلہ کرنے کی طاقت پیدا نہیں ہوئی ہے، اس لئے تو ان کے دلوں میں

ہمت اور حوصلہ کے دریا بہا دے۔ انسوں سے پیاس نہیں بجھ سکتی۔

(۹) میری قوم کے نوجوان، کالجوں میں غیر اسلامی علوم پڑھتے ہیں۔ اور میرے کلام میں اوّل سے آخر تک قرآن اور حدیث کا رنگ پایا جاتا ہے۔ اس لئے قدرتی طور پر وہ ابھی میرے پیغام (ساغر) سے گریز کرتے ہیں۔

(۱۰) جس طرح یہ غزل لاجواب ہے۔ یہ مقطع بھی بے نظیر ہے۔ اگر رنگ تغزل سے قطع نظر کر کے، اس میں تاویل کی جائے تو یہ مطلب ہوگا کہ جب کوئی مسلمان جس کی سابقہ زندگی ہر کارپرستی میں گذری ہو کسی مرشد کی خدمت میں اصلاح نفس کے لیے حاضر ہوتا ہے تو شروع میں بہت گھبراتا ہے۔

چوتھی غزل

(۱) اے مسلمان! اگر تجھ میں اسلام جلوہ گر ہے۔ اگر تو واقعی مسلمان ہے تو پھر گوشۂ گمنامی میں کیوں پڑا ہے؟ حجرے میں کیوں چھپا ہوا ہے؟ میدان عمل میں آ، اور دنیا کو اسلام کی خوبیوں سے آگاہ کر!

(۲) اس میں خالص تغزل کا رنگ پایا جاتا ہے۔ یعنی شاعر اپنے محبوب سے کہتا ہے کہ تو سراپا حسن ہے۔ بلکہ مظہر کمال حسن ہے۔ اس لئے بے پردہ یعنی یہ؟ مجھے زحمت انتظار کیوں دیتا ہے؟ کھل کر سامنے آ اور دیوانہ بنا دے! عاشق یہ چاہتا ہے کہ معشوق اُسے دنیا اور مافیہا سے بے خبر کر دے

(۳) اے مسلمان! اگر تیرے دل میں عشقِ رسول (نفس گرم) کی آگ بھڑک رہی ہے تو بلاشبہ تو لوگوں کو زندہ کر سکتا ہے۔

(۴) مطلب یہ ہے کہ اگر انسان سچے دل سے خدا کی محبت اختیار کرلے تو طور پر جانے کی ضرورت نہیں ہوگی۔ عاشق خود مہبطِ انوارِ الٰہی بنجائے گا اور اس کی شخصیت خود دوسروں کیلئے

خندہ نما بن جائے گی۔ اقبال نے اس پامال مضمون کو بڑے دلکش طریقہ سے باندھا ہے۔

(۵) اے مسلمان! تہذیبِ مغرب (اندازِ کلیسائی) سے اجتناب کلی اختیار کر، کافرانہ طریق زندگی بالکل ترک کر دے۔ تاکہ تو اپنی زندگی کی تمام طاقتوں کو اسلام کی خدمت (تعمیر حرم) کیلئے وقف کر سکے

(۶) دنیا میں کامیاب زندگی بسر کرنے کیلئے انسان کو اعتدال کا رنگ اختیار کرنا لازم ہے اُسی قدر ناز کرے جسقدر حُسن و جمال (رعنائی) ہو یعنی جس مقام یا مرتبہ کی اہلیت ہو اسی کی آرزو رکھے۔

(۷) جو شخص دنیا میں عزت اور سرداری کا خواہشمند ہو، اُسے لازم ہے کہ پہلے اپنے اندر خودداری (عزتِ نفس) کی صفت پیدا کرے جو شخص دوسروں کے آگے ہاتھ پھیلاتا ہے، وہ کبھی دنیا میں معزز نہیں ہو سکتا۔

(۸) کامیابی (منزل لیلیٰ) کے لئے مسلسل جدوجہد شرط ہے۔

پانچویں غزل

(۱) مطلب یہ ہے کہ جب فطرت اپنا فیض عام کرے تو ہر شخص کو لازم ہے کہ اُس سے بقدر ظرف فائدہ حاصل کرے۔ اگر غفلت کرے گا تو موقع ہاتھ سے نکل جائے گا اور دوسرے لوگ آگے بڑھ جائیں گے۔

(۲) انسان کو فطرت نے ترقی کی صلاحیت عطا کی ہے اس لئے اس کا فرض ہے کہ اپنی مخفی صلاحیتوں کو بروئے کار لائے۔ اور ساری دنیا پر چھا جائے۔

(۳) اے مسلمان! یہ سچ ہے کہ تو اپنی ذات کے اعتبار سے بہت قیمتی ہے۔ لیکن اہل دنیا چونکہ جواہرات اسلام کی صحیح قدر نہیں کر سکتے۔ (قیمت کا صحیح اندازہ نہیں کر سکتے) اسلئے تو کفرستان میں اپنے فیض کو عام کر دے یعنی ہر شخص کو محبت (عشق رسول) کا پیغام پہونچا۔

(۴) تو اسلام کا علمبردار ہے (نغمۂ رنگین ہے) اور اسلام دنیا میں بہترین عناصر حیات ہے۔ تمام خوبیوں کا مجموعہ ہے۔ اس لئے تو ماسکو سے لے کر نیویارک تک،

ہر شخص کو اسلام کا پیغام سُنا!

لوٹ:- کاش مسلمان اقبال کے اس پیغام کو سمجھ سکیں ۱۲۔

(۵) اے مسلمان! تو اس طرح زندگی بسر کر کہ اگر دوستوں سے سابقہ ہو تو اُن کو فیض پہونچا، اور دشمنوں سے مقابلہ ہو تو اُن کو تباہ کر دے۔

(۶) اے مسلمان! اس حقیقت کو مدِ نظر رکھ کہ عیش و عشرت کے لوازم انسان کو کاہل اور بزدل بنا دیتے ہیں۔ اگر تو میدانِ جنگ میں کامیاب ہونا چاہتا ہے تو ان تمام لوازمِ عیش سے قطع نظر کر لے۔

لوٹ اٹھارھویں صدی میں سکھوں کو مسلمانوں پر جو غلبہ حاصل ہوا اس کی ایک بڑی وجہ یہ بھی تھی کہ گوبند سنگھ نے سامانِ عیش کی محبت ان کے دل سے نکال دی تھی ۱۲

چھٹی غزل

لوٹ:- یہ بانگِ درا کی سب سے زیادہ مشہور و معروف غزل ہے، لیکن اس کی شہرت کا باعث یہ نہیں ہے کہ قوم نے اس کے مفہوم سے آشنا ہو کر اس کو قبولِ عام کی سند عطا کر دی، بلکہ اس کا مطلع اور مقطع بدقسمتی سے قوالوں کو پسند آگیا اور انھوں نے اس غزل کو پشاور سے لے کر کلکتہ تک ہر محفل میں، اور ہر درگاہ میں گانا شروع کیا۔ راقم الحروف نے ۱۹۲۵ء میں اس غزل کو سب سے پہلے ایک قوال ہی کی زبان سے سُنا تھا جو، منتظر کو منتظر الاپ رہا تھا۔ اس کے باوجود سامعین اپنا سر دُھن رہے تھے۔ کیونکہ مسلمانوں کا مقصدِ حیات سر دُھنتا ہے، نہ کہ علم حاصل کرنا۔

اب میں یہ واضح کر دوں کہ قوالوں کو یہ غزل کیوں پسند آگئی؟ وجہ یہ ہے کہ اس غزل میں تصوف کی زبردست چاشنی موجود ہے، اور خصوصاً یہ

الفاظ تو بہت دلکش ہیں، حقیقت اور مجاز، آئینہ ساز، سوز و گداز، غزنوی اور ایاز، صنم آشنا اور نماز۔ یوپی کے ایک شاعر نے جس کا نام مجھے اب یاد نہیں رہا، اسی زمانہ میں، اس کے جواب میں ایک غزل لکھی تھی، اس غزل کا چراغ تو آفتاب کے سامنے کیا جلتا، ہاں قوالوں نے، دونوں غزلوں کی ترکیب دے کر ایک معجون مرکب عنبر و زنیار کر لی تھی اس غزل کا صرف ایک شعر یاد رہ گیا ہے۔

ترے یاد نے یہ غضب کیا، کہ ستایا آ کے نماز میں
مرا سجدہ سہو میں پڑ گیا، اب اسے قضا کہوں یا ادا

پہلا شعر:۔ حقیقتِ منتظر، وہ حقیقت جس کا یا جس کے ظہور کا انتظار کیا جائے، "حقیقت" فلسفہ اور تصوف دونوں کی اصطلاح ہے۔ اور بہت وسیع مفہوم کی حامل۔ یہاں اس سے محبوب یا ذاتِ خداوندی مراد ہے حقیقت کے لغوی معنی ہیں، وہ ذات جسے فنا نہ ہو، لباس مجاز سے مادی شکل مراد ہے جو حواس خمسہ سے محسوس ہو سکے۔

عاشق یہ کہتا ہے کہ اے خدا! میں تجھے سجدہ کرنا چاہتا ہوں، اس لئے تو کسی مادی شکل میں میری آنکھوں کے سامنے عیاں ہو جا۔ سجدہ تو اب بھی کر رہا ہوں لیکن میں انسان ہوں، اس لئے اس میں وہ لطف نہیں آیا جس کو میرا دل ڈھونڈتا ہے۔ خلاصہ یہ ہے کہ شاعر نے خدا کو مجازی محبوب فرض کر کے یہ درخواست کی ہے کہ میں تیرے دیدار کے لئے مدتوں سے ترس رہا ہوں سامنے آ جا تاکہ تیرے قدموں پہ سر رکھ دوں۔

دوسرا شعر:۔ اے مسلمان! اپنے عشق کی بدولت دنیا میں ہنگامہ برپا کر دے تیرے سینہ میں قرآن (نوا) مخفی ہے اُسے دنیا پر ظاہر کر دے۔ اس کے دوسرے معنی یہ بھی ہو سکتے ہیں کہ تو اپنی خودی کو دنیا پر آشکار کر دے۔ اللہ نے یہ جوہرِ خودی (سرود) اسلئے عطا نہیں کیا کہ ساز (شخصیت) کے پردوں میں چھپا رہے۔ بات بھی سچی ہے کہ جو نغمہ ساز میں پوشیدہ ہے دنیا اسکی کوئی قدر نہیں کر سکتی۔

تیسرا شعر:۔ اے مسلمان! تو اپنے دل کو عشق کی دستبرد سے محفوظ مت کر، یہ وہ آئینہ ہے کہ

جس قدر شکستہ ہوگا، اُسی قدر خدا کی نظروں میں محبوب او قیمتی ہوگا یعنی تیرا دل خدا کے عشق میں جس قدر پامال ہوگا، اُسی قدر سرفراز ہوگا۔ اگر ثبوت درکار ہو تو سرِ حلقۂ عشاق حضرت شیخ ہجویری المعروف بہ "داتا گنج بخش رحؒ" کی زندگی کا مطالعہ کر لو۔ ان کی وفات کو نو سو سال سے زائد ہو گئے۔ لیکن رجوعِ خلائق یعنی دلکشی کا وہی عالم ہے۔

چوتھا شعر:۔ اس شعر میں اقبال نے مسلمانوں کی عام دینی بے حسی کا نقشہ کھینچا ہے۔ جب مسلمان خانہ کعبہ کا طواف کرتے ہیں تو اُن کا دل خود اُن سے یہ کہتا ہے کہ نہ ہندیوں میں اس مقام مقدس کی حفاظت کا جذبہ پایا جاتا ہے، نہ حجازیوں میں طواف تو بدستور جاری ہے لیکن طواف کی روح فنا ہو چکی ہے۔

دوسرا مطلب یہ ہو سکتا ہے کہ "شمع" سے دینی پیشوا مراد لی جائے اور کرمک شمع سے عوام مراد لئے جائیں، یعنی نہ خواص میں اسلام کا رنگ پایا جاتا ہے، نہ عوام میں۔ خلاصۂ کلام یہ ہے کہ قوم کا شیرازہ بے جان ہو کر رہ گئی ہے۔

پانچواں شعر:۔ یہ شعر آسان ہے۔ مطلب یہ ہے کہ انسان، خطا کا پتلا ہے، دن رات گناہ کرتا رہتا ہے۔ اگر اللہ اپنی رحمت سے اس کے گناہوں کو معاف نہ کرے تو اُسے دارین میں کہیں پناہ (امان) نہیں مل سکتی، یعنی وہ نجات نہیں پا سکتا۔

چھٹا شعر:۔ یہ شعر بھی آسان ہے یعنی مسلمانوں پر زوال کی کیفیت طاری ہے، نہ عاشقوں (غزنوی) میں وہ تڑپ نظر آتی ہے، نہ معشوقوں (رہنماؤں) میں وہ خلوص کارفرما ہے۔

ساتواں شعر:۔ شعر کا مطلب بالکل واضح ہے۔ اور اس میں شک نہیں کہ یہ شعر حاصل غزل ہے۔ جب تک انسان اپنے دل کو غیر اللہ کی محبت سے پاک نہ کرے اس وقت تک نماز پڑھنے سے کوئی روحانی فائدہ مرتب نہیں ہو سکتا۔ جب کبھی میں یہ شعر پڑھتا ہوں، تو مجھے سری کرشن کا یہ قول یاد آجاتا ہے کہ "اے ارجن! میں تو صرف ان لوگوں کے دلوں میں براجمان ہوتا ہوں جو میرے سوا کسی غیر سے محبت نہیں کرتے اگر تو مجھے پانا چاہتا ہے تو میرے سوا کسی کا دھیان

مت کر۔ کسی سے دل مت لگا۔ اپنی پوری شخصیت مجھ پر نثار کر دے۔ میری اطاعت کر اور مجھ میں فنا ہو جا۔ میں تجھے وچن (قول) دیتا ہوں کہ اگر تو میرا ہو جائے تو میں تیرا ہو جاؤں گا۔"

(دیکھو بھگوت گیتا ادھیائے ۱۸، اشلوک ۶۵)

ساٹھویں غزل

(۱) مطلب یہ ہے کہ عاشق اگر کسی وجہ سے پابندِ غیر ہو جائے تو خواہ کتنی ہی نمازیں کیوں نہ پڑھے، نہ اُسے لطف آ سکتا ہے نہ نماز کا حق ادا ہو سکتا ہے اور نہ نتیجہ مرتب ہو سکتا ہے عبادت اور اطاعت (فنا) اُسی وقت مرتبہ کمال حاصل کر سکتی ہے جب عاشق (طائرِ آزاد ہو)

(۲) یہ شعر خالص تغزل کے رنگ میں ہے۔ یہی وجہ ہے کہ اس میں بلا کی دلکشی ہے۔ اقبال نے اس شعر میں عاشق کے دل کی اندرونی کیفیت کا صحیح نقشہ کھینچا ہے۔ اگر محبوب کسی وقت اپنا جلوہ دکھا بھی دے، تو اُس سے عاشق کے گریہ سحری اور آہِ نیم شبی میں کمی نہیں ہو سکتی وجہ یہ ہے کہ اس کمبخت عشق کی نوعیت ہی یہ ہے کہ عاشق معشوق کو اپنے اندر جذب کر لینا چاہتا ہے۔ جب تک عاشق کے ذہن میں دوئی کا احساس باقی رہتا ہے۔ یعنی جب تک یہ شعور قائم رہتا ہے کہ معشوق "وہ" ہے اور میں "یہ" ہوں۔ اس وقت تک اسے تسلی نصیب نہیں ہو سکتی عشق اس "من و تو" کے امتیاز کو مٹانا چاہتا ہے۔ اور جو لوگ سچے ہوتے ہیں وہ اسی زندگی میں اس امتیاز کو مٹا دیتے ہیں۔ اقبال کی شاعری اور فلسفہ دونوں کا خلاصہ اس کے سوا اور کچھ نہیں کہ لیلیٰ تو خود تیرے محمل میں پوشیدہ ہے تو اسے نجد کے صحرا میں کیوں ڈھونڈتا ہے

جنھیں میں ڈھونڈتا تھا آسمانوں میں زمینوں میں ۔۔۔ وہ نکلے میرے ظلمت خانۂ دل کے مکینوں میں

ناظرین اس نظم کو غور سے پڑھیں، اقبال کا مسلک واضح ہو جائے گا۔

(۳) بہت عمدہ شعر ہے "نہ خدا رہا" اس کا مطلب یہ ہے کہ مادہ پرستی کے موجودہ دور میں نہ کہیں خدا پرستوں کا وجود باقی رہا نہ بت پرستوں کا۔ نہ بت خانوں میں وہ رونق نظر آتی

ہے نہ مسجدوں میں، نہ کسی مسلمان میں حضرت علیؓ کی سی شان پائی جاتی ہے نہ کسی کافر میں ابولہب کا رنگ نظر آتا ہے، ساری دنیا عورت اور دولت کے چکر میں پھنسی ہوئی ہے۔

(۴) بہت خوب شعر ہے کہتے ہیں کہ اگرچہ میری زندگی غیر اسلامی ماحول میں بسر ہوئی لیکن خدا کا شکر ہے کہ میں اپنی زبان سے ساری عمر قرآن اور حدیث ہی کا پیغام دیتا رہا۔ اقبال کے یہاں عجم سے ہمیشہ غیر اسلامی خیالات اور تصورات مراد ہوتی ہے۔

آخری غزل

چونکہ آخری غزل ہے اس لیے اقبال نے اس میں ساری بانگ درا کا عطر کھینچ کر رکھ دیا ہے۔ اگر ان چار شعروں کی شرح لکھی جائے تو ایک مستقل کتاب مرتب ہو سکتی ہے اس لئے صرف اشارات پر اکتفا کرتا ہوں۔

(۱) اے مسلمان! یہ سچ ہے کہ تو دنیا میں ظاہری یا مادّی اسباب اور وسائل کا محتاج ہے اور تجھے کسی کام کو پایۂ تکمیل تک پہونچانے کے لئے تمام ممکن وسائل مہیا بھی کرنے لازمی ہیں لیکن یہ مت سمجھ بیٹھنا کہ کامیابی کا انحصار ان مادّی اسباب پر ہے تیرے دل میں یہ خیال کبھی ہرگز نہ آنے پائے، ورنہ تو بھی تیرے جسم کی طرح "زندانی اسباب" ہو جائے گا اور اسکا نتیجہ یہ نکلے گا کہ تو مادّہ پرست بن جائے گا۔ اگر تو اسلام پر قائم رہنا چاہتا ہے تو ہمیشہ یہ یقین رکھ کہ کامیابی کا دارومدار فضلِ ایزدی پر ہے۔ اگر وہ نہ چاہے تو سارے اسباب دھرے کے دھرے رہ جاتے ہیں۔

تدبیر سدا راست جو آتی نہیں اکبر معلوم ہوا یہ کہ خدا بھی ہے کوئی چیز

(۲) اے مسلمان! عقل ہر وقت اللہ کی ہستی پر اعتراضات وارد کرتی رہتی ہے، بلکہ عقل کی پیروی کی جائے تو کوئی شخص خدا پرستی نہیں کر سکتا، اتباع عقل کا منطقی نتیجہ تشکیک (لا مذہب) ہے۔ پس عقل پرست انسان تو قیامت تک سرفروشی نہیں کر سکتا۔ اس لئے

اے مسلمان! تو اگر کامیاب ہونا چاہتا ہے تو مسلکِ عشق اختیار کر۔ عشق تجھ کو سرکارِ دوعالم صلعم کے غلاموں کی صف میں جگہ عطا کر سکتا ہے۔

(۳) اے مسلمان! ہر وقت، حتی الامکان اپنی اصلاح میں مصروف رہ۔ اور اللہ اور اُس کے رسول کی اطاعت کر، تاکہ اللہ اپنا وعدہ پورا فرمائے۔ اور پھر تجھے سرزمی حاصل ہو جائے۔ یاد رکھ! کہ اللہ کبھی وعدہ خلافی نہیں کرتا۔ یہ بات اس کی شان کے خلاف ہے پس اگر تو چاہتا ہے کہ وہ اپنا وعدہ پورا کرے تو تجھے لازم ہے کہ تو اپنا وعدہ پورا کر۔

(۴) حضرت اکبر الہ آبادی قوم کو یہ پیغام دیتے ہیں کہ اے مسلمانو! اللہ نے جو وعدے قرآن مجید میں مومنوں سے کئے ہیں وہ سب حرف بحرف صحیح ہیں۔ اس لئے تم ایسی زندگی بسر کرو کہ اللہ اُن مواعید کا ایفا فرمائے۔

حضرت اکبر مرحوم ۱۸۴۶ء میں پیدا ہوئے تھے اور اقبال کے بہت مداح تھے۔ ان کے خطوط سے معلوم ہوتا ہے کہ وہ اقبال کے ساتھ بزرگانہ شفقت ملحوظ رکھتے تھے۔ اگرچہ ان کا انتقال ۱۹۲۱ء میں ہو گیا۔ اور اس لئے وہ اقبال کے علمی کمالات سے آگاہ نہ ہو سکے۔ لیکن انھوں نے پیش گوئی کر دی تھی کہ ایک دن اقبال آسمان علم و فضل پر آفتاب بنکر چمکیں گے۔ اگر اللہ نے توفیق دی تو اکبر مرحوم کے کلام پر مفصل تنقید لکھ کر قوم کی خدمت میں پیش کرونگا۔ اکبر بہت بڑا آدمی تھا! لیکن قوم نے اسے صرف ایک ظریف شاعر ہی سمجھا۔

ظریفانہ

پہلی نظم

مطلب:۔ اس نظم کا مطلب یہ ہے کہ مشرقی قومیں مذہب کی طرف مائل ہیں اور مادّی ترقی کی طرف سے بالکل غافل ہیں۔ گذشتہ چار سو سال میں کسی ایشیائی نے چین سے

لے کر عرب تک، نہ کوئی آلہ ایجاد کیا، نہ کوئی علمی تحقیق کی نہ کوئی نئی چیز دریافت کی۔ لیکن مغربی قومیں دن رات آلات ایجاد کرتی رہتی ہیں اور مشینوں کے ذریعہ سے مہینوں کا کام دنوں میں انجام دیتی ہیں۔ چنانچہ اس کا نتیجہ یہ ہے کہ ہم تو مفلس ہوتے جاتے ہیں، اور وہ ایک کے تین تین (روپئے) بنا لیتے ہیں۔

نوٹ:- ایک اور تین میں صنعتِ ایہام پائی جاتی ہے۔ اس لیے اس کے دوسرے معنی یہ بھی ہو سکتے ہیں کہ اگرچہ ہم دینداری کے مدعی ہیں، لیکن حالت یہ ہے کہ ہم توحید پر ایمان رکھتے ہیں اور یورپ والے جو مادیات میں منہمک ہیں اس کے باوجود تثلیث پر ایمان رکھتے ہیں۔ واضح ہو کہ نصاریٰ تثلیث فی التوحید کے قائل ہیں یعنی باپ، بیٹا اور روح قدس تینوں خدا ہیں، لیکن تین خدا نہیں ہیں، بلکہ یہ تینوں مل کر ایک خدا ہے ۱۲۔

دوسری نظم

مطلب:- مسلمانوں نے چونکہ تعلیم نسواں کو اپنی قومی فلاح کا ذریعہ سمجھ لیا ہے اس لیے مسلمان لڑکیاں بڑے شوق سے انگریزی پڑھ رہی ہیں۔ ان کے والدین قدیم مشرقی طرزِ تعلیم اور طریق معاشرت کو ناپسند کرتے ہیں۔ اس لیے اپنی لڑکیوں کو مغربی سانچوں میں ڈھال رہے ہیں۔ تیسرے مصرع میں صنعتِ ایہام پائی جاتی ہے۔

ڈراما (۱) وہ تماشہ جو اسٹیج پر دکھایا جاتا ہے (۲) یہ موجودہ طرزِ تعلیم۔

سین (۱) ہر ڈرامہ میں مناظر ہوتے ہیں، جن کو اصطلاح میں سین کہتے ہیں۔

(۲) نظارہ یا نقشہ، یا نتیجہ، یا انجام۔

پردہ (۱) اسٹیج کے اوپر خوبصورت ریشمی پردہ پڑا ہوتا ہے۔

(۲) شرعی حجاب، یا مسلمان عورت کا چہرے پر نقاب ڈال کر باہر نکلنا۔ مطلب یہ ہے کہ مسلمان اپنی لڑکیوں کو انگریزی پڑھا تو رہے ہیں لیکن اس کا نتیجہ انھیں اس

وقت معلوم ہوگا جب مسلمان عورتیں پردہ کی رسم ترک کر دیں گی۔

تیسری نظم

مطلب :- اس نظم میں اکبر الہ آبادی کے مشہور شعر کے ایک مصرع پر تضمین کی ہے۔ اقبال کے تمام مصرعے آسان ہیں۔ اکبر کے مصرع میں لفظ "زن" میں ابہام ہے۔ زن بمعنی عورت اور زن بمعنی زنانہ صفات رکھنے والا یعنی آج کل کی عورتیں یہ کہتی ہیں کہ جب آج کل کے مرد خود زنانے ہو گئے یعنی ان میں مردانہ صفات مثلاً شجاعت، جوانمردی، ذوق سپہ گری، شوق شہادت وغیرہ تو مفقود ہو گئیں اور ان کے بجائے نسوانی عادات پیدا ہو گئیں تو اب ہم پردہ کس سے کریں؟ نیز مصرع کے معنی یہ ہو سکتے ہیں کہ جب مردوں نے زن فیشن اختیار کر کے اپنی صورت عورتوں کی سی بنالی یعنی صورت کے اعتبار سے زن ہو گئے تو اب عورتوں کو اپنی جنس کے افراد سے پردہ کرنے کی کیا ضرورت ہے؟

چوتھی نظم

مطلب :- اے مسلمان! اگر تو تہذیب مغرب کی اسی طرح تقلید کرتا رہا تو وہ دن دور نہیں ہے جب تجھ میں غیرت اور عورت میں حیا بالکل باقی نہیں رہے گی نیز وہ زمانہ بھی عنقریب آنے والا ہے جب عورتیں اولاد کے بجائے ممبری کے لئے دربدر ووٹ مانگتی پھریں گی۔

نوٹ :- پہلے زمانہ میں عورتیں اولاد کی اس قدر تمنائی ہوتی تھیں کہ اگر کسی عورت کے اولاد نہیں ہوتی تھی تو وہ علاج معالجہ کے علاوہ درگاہوں پر جا کر اولاد کے لئے دعائیں کیا کرتی تھیں۔

پانچویں نظم

مطلب :- کہتے ہیں کہ مغربی تعلیم کی بدولت ہماری قوم کے نوجوانوں میں بہت جرأت

پیدا ہو جائے گی کیونکہ اس تعلیم کا پہلا سبق یہ ہے کہ ایک طالب علم دوسرے طالب علم سے ملے تو ہر بات میں شیخی بگھارے۔ اقبال نے لفظ "مارے" میں ابہام کا رنگ پیدا کیا ہے مارنا (۱) کسی کو لاٹھی سے یا گھونسہ سے مارنا (۲) جب ڈینگ کے ساتھ یہ لفظ مستعمل ہو تو اسکے معنی ہوتے ہیں تعلی آمیز گفتگو کرنا یا شیخی بگھارنا اس شعر کا لطف لفظ "مار" میں مضمر ہے۔

(۲) چونکہ ہندوستان میں صنعت و حرفت اور تجارت کا بالکل رواج نہیں اس لئے یورپ کے ملکوں سے تو سامانِ تجارت آتا ہی ہے، افغانستان جیسے پس ماندہ ملک سے بھی آغا لوگ ہینگ بیچنے آجاتے ہیں۔ کیونکہ وہ جانتے ہیں کہ ہندوستان کے باشندے ہر بات کے لئے غیر ممالک کے محتاج ہیں۔ اس شعر میں اسی احتیاج کی وضاحت مدنظر ہے۔

(۳) حاکم اور محکوم کی ذہنیت کا موازنہ اور حاکم کی فرعونیت کا اظہار کیا ہے۔ جب محکوم، کسی حاکم کے قدموں پر اپنا سر رکھتا ہے، تو حاکم کی نخوت کا پارہ اور بھی اوپر چڑھ جاتا ہے اور وہ اس کے سجدۂ عبودیت کو ایک خلافِ تہذیب فعل سمجھ کر اسے متنبہ کرتا ہے کہ "دیکھا! میرے فرش پر مت رینگ" فرش خراب ہو جائے گا۔

(۴) اس شعر کے دو معنی ہو سکتے ہیں اگر اونٹ سے مسلمان قوم مراد لی جائے، اور گائے سے ہندو قوم، تو معنی یہ ہونگے کہ ایک مہا سبھائی ذہنیت رکھنے والے ہندو نے طنزاً مسلمان سے یہ کہا کہ مسلمان بُرے ہیں، ہندو اچھے ہیں، اگر "بھدّے" اور "نوکدار" ان دو لفظوں کو مدنظر رکھا جائے تو یہ مطلب ہوگا کہ آج کل اہل دنیا کی روش یا ذہنیت الٹی ہوگئی ہے لوگ اچھے آدمی کو برا کہتے ہیں اور بُروں کو اچھا سمجھتے ہیں۔

چھٹی نظم

اس نظم میں اقبال نے اُن مسلمانوں پر طنز کی ہے (ان کے طرزِ عمل کی مذمت کی ہے) جو حکومت یا انگریزوں کو خوش کرنے کے لئے اپنے دینی اور ملّی شعائر یا عقائد کی تردید

ہیں بھی تامل نہیں کرتے۔ چنانچہ کہتے ہیں کہ اگر حضرت واعظ آج کل مالی مشکلات میں مبتلا ہیں تو پریشانی کی کوئی بات نہیں ہے۔ وہ اسلامی تہذیب کے بجائے مغربی (لازمی) تہذیب اختیار کرلیں، بہت جلد فارغ البالی حاصل ہوجائے گی۔ ایک شخص نے جہاد کی تردید میں بہت سی کتابیں تصنیف کردی ہیں جس کے صلہ میں حکومت نے اس کی بہت عزت افزائی کی ہے۔ اس لیئے وہ جہاد کے بجائے حج کی تردید میں کوئی کتاب تحریر کردیں امید ہے کہ حکومت ابھی بھی کافی سے زیادہ حوصلہ افزائی کرے گی۔ وہ چار مربعے تو بہر حال کہیں نہیں گئے۔

ساتویں نظم

اس نظم میں اقبال نے ہندوستانیوں کی ذہنیت میں اس تبدیلی پر طنز کی ہے جو مغربی تہذیب کی بدولت رونما ہوئی ہے۔ مثلاً اب جو شخص بیمار ہوتا ہے وہ کسی طبیب یا وید سے رجوع کرنا پسند نہیں کرتا کیونکہ گولیاں "فیشن" کے خلاف ہیں، بلکہ وہ سیدھا ڈاکٹر کے پاس جاتا ہے اور اگرچہ ڈاکٹر بھی "گولی" ہی دیتا ہے لیکن چونکہ اسکا نام "پِل" ہے اسلیئے ہندوستانی اُسے بہت شوق سے کھاتا ہے بلکہ جدید محاورہ کے مطابق "لیتا ہے"۔

اس تبدیلی کی دوسری مثال یہ ہے کہ پہلے زمانہ میں جب ہندوستانی لڑکے مکتبوں میں پڑھتے تھے، تو اپنے اساتذہ کا اس قدر احترام کرتے تھے کہ یا بید و شاید لیکن اب مغربی تعلیم نے ان کو اسقدر گستاخ بنا دیا ہے کہ وہ اپنے استاد کو اپنا ملازم یا ایک دکاندار سمجھتے ہیں چنانچہ اس سے کہتے ہیں کہ ماسٹر جی! اپنی تنخواہ کا بل پیش کیجیے تاکہ پیسے چکائے جائیں۔

آٹھویں نظم

اس نظم میں اقبال نے ہندوستانیوں کی غفلت پر ماتم کیا ہے کہ ہم لوگ

منفعت کی طرف مطلق توجہ نہیں کرتے۔ زندگی کی تمام ضروریات دوسرے ملکوں سے منگاتے ہیں۔ اگر ہماری احتیاج اور غفلت کا یہی عالم رہا تو وہ دن دور نہیں جب مُردوں کو غسل دینے والے نوکابل سے آیا کریں گے اور کفن کا کپڑا جاپان سے آیا کرے گا۔

نویں نظم

(۱) افسوس ہے کہ ہم مفلس ہندوستانیوں کا دل ہر وقت انگلستان میں پڑا رہتا ہے وجہ یہ ہے کہ وہاں کے لوگ بلوری کنٹروں میں شراب رکھتے ہیں یعنی خوب داد عیش دیتے ہیں ان کو لطف زندگی حاصل ہے اور غریب ہندوستانی اپنی شراب وہی پرانے مٹکوں میں رکھتے ہیں

(۲) تہذیب مغرب کی بدولت ہندوستانیوں کی ذہنیت میں اسقدر عظیم الشان انقلاب رونما ہوگیا ہے کہ آئندہ زمانہ میں صرف وہ افراد باقی رہ سکیں گے جو اپنی وضع پر قائم ہیں اور اپنی قومی روایات پر سختی کے ساتھ عامل ہیں۔ بقیہ افراد تباہ و برباد ہو جائیں گے۔

(۳) اے ہندوستانیو! غور کرو! جو لوگ آپس میں لڑتے رہتے ہیں وہ انجام کار تباہ ہو جاتے ہیں۔

(۴) اس شعر میں پہلے شعر کی وضاحت کی ہے کہتے ہیں کہ انگریزوں کی حکومت سے پہلے ہندو اور مسلمان آپس میں بہت پیار کے ساتھ رہتے تھے، لیکن اب کہیں اردو اور ہندی کا جھگڑا ہے کہیں گائے کی قربانی پر فساد ہے اور کہیں "جھٹکا" بنائے مخاصمت بنا ہوا ہے۔ "جھٹکا" حیوان کی گردن کاٹنے کا وہ طریقہ ہے جو سکھوں کے ہاں رائج ہے۔

دسویں نظم

اس نظم کا بنیادی تصور یہ ہے کہ اقبال مسلمانوں پر طنز کرتے ہیں جب تم نے ہندوؤں کی تہذیب اور رسوم اور ان کے خیالات اور طور طریقے سب اختیار کر لئے ہیں

توپھر اُن کو "غیر" کیوں سمجھتے ہو؟ اس غیریت کے تصور کی تردید کے لئے انھوں نے غالب کے ایک مشہور شعر کے پہلے مصرع کو ظریفانہ انداز میں بطور استدلال پیش کیا ہے کہ جس طرح شہود، شاہد اور مشہود کی اصل ایک ہے تو پھر "غیر" کا ذکر فضول ہے، اسی طرح جب مسلمانوں اور ہندوؤں کے عقائد اور خیالات میں وحدت ہے تو پھر مسلمان ہندوؤں کو غیر کیوں سمجھتے ہیں؟ یہی وجہ ہے کہ اہل دیر نے اہل کعبہ سے یہ سوال کیا کہ جب تم لوگ بتوں (مشرکانہ عقائد) سے محبت کرتے . . . ہو تو برہمن (ہندوؤں) سے کیوں نفرت کرتے ہو۔

نوٹ:۔ غالب کا وہ شعر جس کا پہلا مصرع اقبال نے نقل کیا ہے یہ ہے۔

اصلِ شہود و شاہد و مشہود ایک ہے ۔۔۔ حیراں ہوں، پھر مشاہدہ ہے کس حساب میں

شہود کے لفظی معنی ہیں، ظہور یا حاضر ہونا، موجود ہونا۔ اصطلاحی معنی یہ ہیں کہ جب سالک کو کائنات کی ہر شئی میں خدا ہی کا جلوہ نظر آتا ہے تو اس کیفیت کو شہود کہتے ہیں۔ شاہد بمعنی دیکھنے والا۔ اصطلاحی معنی ہیں معشوق مشہود بمعنی موجود یا جس کو دیکھا جائے۔ مشاہدہ بمعنی دیکھنا۔ غالب کے اس بے نظیر شعر کے دو معنی ہیں۔

(۱) لغوی اعتبار سے دیکھو تو شاہد، شہود اور مشہود کی اصل ایک ہی ہے یعنی ش ہ اور دال

(۲) تصوف کے اعتبار سے بھی مشاہد، شہود اور مشہود کی اصل ایک ہی ہے یعنی خدا۔ وہی ذاتِ واحد، شاہد ہے اور وہی مشہود ہے اسی کو وحدت الوجود کہتے ہیں غالب نے تصوف کے مفہوم کو مدِ نظر رکھ کر یہ نکتہ پیدا کیا ہے کہ جب ان تینوں کی اصل ایک ہی ہے یعنی دوئی کی گنجائش ہی نہیں تو پھر لفظ مشاہدہ تو بے معنی ہے کیونکہ مشاہدہ تو دوئی کو چاہتا ہے، اس کا تقاضا یہ ہے کہ شاہد اور مشہود میں مغائرت ہو

گیارھویں نظم

۱۹۱۱ء میں قائدِ اعظم مرحوم نے جو اس وقت محض مسٹر جناح بلکہ جینا تھے

وقف علی الاولاد کا مسودہ وائسرائے کی کونسل میں پیش کیا تھا، جسے حکومت نے ۱۹۱۲ء میں بشکل قانون نافذ کر دیا۔ قائد اعظم مرحوم کی یہ پہلی شاندار قومی خدمت تھی جس نے تمام مسلمانوں کو ان کا ممنون بنا دیا۔

اقبال کی طبع ظریفانہ نے اس قانون کے نفاذ سے یہ نکتہ پیدا کیا کہ مسلمانوں کی حالت یہ ہے کہ حکومت، تو مدت ہوئی قبضہ سے نکل گئی، رہی جائیدادیں تو چونکہ مسلمان آخرت کی گرفت کے خیال سے آزاد ہو چکے ہیں اس لئے رات دن عیاشی میں مشغول رہتے ہیں اور اپنی جائیدادیں کوڑیوں کے مول، ہندو ساہوکاروں کے ہاتھ فروخت کرتے رہتے ہیں۔ اندریں حالات جب کچھ عرصہ کے بعد مسلمانوں کے پاس جائیداد ہی باقی نہیں رہے گی تو وہ وقف کس چیز کو کریں گے؟ معاد کے لغوی معنی ہیں واپسی کی جگہ، مراد ہے عالم آخرت۔

نوٹ :۔ وقف، فقہ کی اصطلاح ہے۔ اسکی رو سے ایک مسلمان اپنی جائیداد کو یہ شکل دے سکتا ہے کہ اس کے مرنے کے بعد اسکی اولاد یا ورثا اس سے فائدہ تو حاصل کر سکتے ہیں لیکن نہ فروخت کر سکتے ہیں نہ رہن رکھ سکتے ہیں نہ ہبہ کر سکتے ہیں

بارھویں نظم

اس نظم کے پہلے مصرع کی بندش، اکبر الہ آبادی کے مشہور مصرع سے ملتی جلتی ہے وہ مس بولی ہیں کرتی اپنا کا ذکر اپنے فادر سے۔

مگر آپ اللہ اللہ کرتا ہے، پائنل کا مانک ہے۔

اس نظم میں اقبال نے مسلمان نوجوانوں کی اخلاقی تمدنی اور اقتصادی پستی اور زبوں حالی پر زہر دست طنز کی ہے قصہ یہ ہے کہ ایک مسلم عاشق مزاج کسی "مس" یعنی انگریز لڑکی پر عاشق ہو گیا۔ لیکن "مس" نے اس کو "ممبٹر" میں ڈنر پر مدعو کرنے

کی استطاعت تھی نہ خود کسی معزز عہدہ پر ممتاز تھا جو اس کی شخصیت یا عہدہ ہیں اس بت فرنگ کے لئے کچھ جاذبیت پیدا ہوتی اور نہ کسی فن لطیف مصوری یا موسیقی میں مہارت تھی کہ وہ حسینہ اس پر نگاہ التفات کرتی۔ اس لئے مجبور ہو کر اس مسلمان نوجوان نے خودکشی کا فیصلہ کیا

یہ فیصلہ کر کے وہ اپنی محبوبہ سے ملا اور اس پر اپنا ارادہ ظاہر کیا اس نے کہا " ڈیل مسٹر مسلم! یہ فعل سراسر تہذیب کے خلاف ہے۔ تمہاری جان جائے گی اور میری بدنامی ہوگی، آخر اس سے فائدہ! علاوہ بریں نہ تم میں ہمت ہے نہ حوصلہ (صاحب ہمت آدمی کبھی خودکشی نہیں کرتا) اور میری قوم نے تمہاری قوم کو ایک عرصہ سے غیر مسلح کر دیا ہے، تیرے پاس پستول کہاں ہے جو خودکشی کرے گا! تو اس عاشق صادق نے جواب دیا کہ اسی لئے تو میں آپ کے پاس آیا ہوں۔ آپ براہ کرم مجھے کچھ رقم عطا فرمائیں تاکہ میں "سرحد" سے کسی افغان کو کرایہ پر بلا کر اس سے درخواست کروں کہ وہ میرا کام تمام کر دے۔ اس کے بعد اس نے فی البدیہہ یہ شعر پڑھا۔

قتل میں میرے فوائد ہیں بہت مخفی، ڈیر! تجھ کو راحت! مجھ کو چھٹی اور بھائی کی مدد

تیرھویں نظم

اس نظم میں اقبال نے ترکوں کی غفلت شعاری پر ماتم کیا ہے۔ جیسا کہ میں قبل ازیں "ہلال عید" کی تشریح میں لکھ چکا ہوں، سلطان عبدالحمید ثانی کے (۱۸۷۷ء تا ۱۹۰۹ء) عہد حکومت میں سلطنت کا نظام بالکل تباہ ہو چکا تھا اس کی ادنیٰ مثال یہ ہے کہ جب ۱۹۱۲ء میں ترک، ایڈریانوپل میں مصروف پیکار تھے تو سامان رسد دس بارہ میل کے فاصلہ پر سڑ رہا تھا اور جنگ جو سپاہی فاقوں سے مر رہے تھے۔ یعنی سپلائی کا کوئی انتظام نہ تھا۔ اور اگر زخمیوں کی مرہم پٹی کا کوئی انتظام ہوتا تو ڈاکٹر مختار احمد انصاری مرحوم ۱۹۱۲ء میں ہندوستان سے ڈاکٹر اور دوائیاں لے کر قسطنطنیہ کیوں جاتے؟

اقبال نے اس نظم میں اسی حقیقت کو عیاں کیا ہے کہ اگر ترک حجاز میں اونٹوں سے کام لیتے اور "کیمل کور" (Camel corps) قائم کرتے۔ تو انھیں کس قدر سہولت نصیب ہو جاتی۔ فلیٹ (Fleet) کے معنی ہیں جنگی جہازوں کا بیڑا۔

چودھویں نظم

اس دلکش نظم میں اقبال نے لفظ "سوال" سے سارا لطف پیدا کیا ہے سوال کے دو معنی ہیں (۱) فقیر کا دروازہ پر بھیک مانگنا (۲) سیاسی اصطلاح میں کسی رکن مجلس کا حکومت سے جواب طلب کرنا یا کوئی بات دریافت کرنا۔ اکبر الہ آبادی نے اس لفظ کو اسطرح باندھا ہے

قومی طاقت نے جب جواب دیا — کونسلوں میں "سوال کرنے لگے۔

"ہم" سے مسلمان قوم اور "امرا" سے ہندو قوم مراد ہے لیکن "ہم" سے عوام اور "امرا" سے ہندو مسلمان مراد ہو سکتے ہیں۔ دونوں صورتوں میں مطلب ایک ہی ہے کہ پہلے زمانہ میں تو صرف غریب آدمی سوال کیا کرتے تھے۔ زمانہ کا انقلاب دیکھو کہ اب امرا بھی سوال کرتے ہیں۔

پندرھویں نظم

امپریل کونسل سے وائسرائے کی کونسل مراد ہے جس کی توسیع "منٹو مارلے اصلاحات" کی رو سے عمل میں آئی تھی اور اس کی بدولت ہندوستانیوں کو مزید نشستیں حاصل ہو گئیں تھیں میری رائے میں یہی برکات عالیہ، انگریزوں کی عیاری کی بدولت استخوان مخاصمت بن گئیں غالب کے مصرع کا لطف اس وقت دوبالا ہو جاتا ہے جب ہم اس بات کو مدنظر رکھتے ہیں کہ امپریل کونسل کے ممبروں کو زیادہ تر دلی میں قیام کرنا پڑتا تھا۔ اقبال نے غالب کے اس مصرع کو ذہن میں رکھ کر یہ ظریفانہ نکتہ پیدا کیا کہ مسلمان تو مفلس قوم ہے اگر اس کے ارکان کونسل کے ممبر ہو بھی گئے تو بے شک انہیں دلی میں وائسرائے بہادر

کی ہم نشینی کا شرف حاصل ہو جائے گا لیکن "کھائیں گے کیا"؟

سولھویں نظم

اس قطعہ میں اقبال نے ہندیوں کی غلامی پر ماتم کیا ہے۔ کہتے ہیں کہ

(۱) حضور! ہم سے بلا وجہ ناراض ہیں اور ہم کو مشتبہ نظروں سے دیکھتے ہیں حالانکہ ہم تو حضور کے سچے وفادار ہیں اگر وفادار نہ ہوتے تو یہ ظلم و ستم کیوں سہتے! ظلم و ستم کی تشریح کر دوں تو یہ شرح "ہندوستان میں انگریزوں کے ظلم و ستم کی ضخیم کتاب بن جائے گی۔ صرف ایک مثال کافی ہے

(ا) ہندی اگر چوری کرے تو چکی پیسے۔

انگریز اگر چوری کرے تو ہندی یعنی وہی قیدی اس چور کے کمرے کے باہر بیٹھ کر موسم گرما میں، دن بھر پنکھا کھینچے تا کہ اس چور کو گرمی کی تکلیف نہ ہو۔ اسکی وجہ یہ ہے کہ وہ انگریز ہے اور ہر انگریز ماں کے پیٹ سے معصوم عن الخطا ہو کر دنیا میں آتا ہے۔

(ب) ہندی اگر کسی کو قتل کر دے تو پھانسی پائے۔

انگریز کسی کو قتل کر دے تو "سول سرجن" یہ رپورٹ دے کہ مقتول کے جسم میں کہیں گولی کا نشان موجود نہیں تھا ہاں اس کی تلی پھٹی ہوئی تھی جو اس کی موت کا سبب ہو گئی

(۲) اس شعر میں اقبال نے ہندیوں کی مجبوری یا ضمیر فروشی پر طنز کی ہے کہ ہم لوگ کسی کمیٹی میں خواہ وہ میونسپل کمیٹی ہو یا وائسرائے کی کمیٹی ہو آزادانہ اپنی رائے کا اظہار نہیں کر سکتے

نوٹ! حضرتِ اقبال کا ارشاد قوم کے سر آنکھوں پر۔ لیکن اس کا کیا علاج ہے کہ رضائے کلکٹر سے اختلاف کے بعد کسی باپ کی "کرسی" برقرار رہ سکتی ہے نہ بیٹے کو نائب تحصیلداری مل سکتی ہے۔

اگر یہ بات نہ ہوتی تو حضرت مرحوم کے موجود ہوتے ہوئے، سر شادی لال چیف جسٹس پنجاب بمشورہ حکومت، یو پی اور سی پی سے مسلمانوں کو ججی کے لئے نہ بلاتا۔

(۳) یہ شعر تو حاصل غزل ہے جی چاہتا ہے اس کی شرح میں صفحے کے صفحے لکھ ڈالوں۔ لیکن قوم کی ناراضگی کا "ڈر" ہے اس لیئے کچھ نہیں لکھتا تاہم اتنا ضرور کہتا ہوں کہ یہ سند ہے بڑے معرکہ کی چیز۔ مثلاً جنرل نکلسن نے بوقت مرگ جو دو حرف اپنے اردلی کو بطور سند لکھ کر دے دیئے تھے، ان کی بدولت اس کے لڑکے "کرنل" ہو گئے۔

(۴) آسان شعر ہے۔ مطلب یہ ہے کہ ہندیوں کا اس وقت دنیا میں کہیں ٹھکانا نہیں ہے۔

(۵) اس شعر کا مضمون وہی ہے جو پہلے شعر میں بیان ہو چکا ہے۔ یعنی خوشامد پرست ہندی سرمایہ دار جب انگریزوں سے ملتے تھے تو کہا کرتے تھے کہ حضور تو ہمارے "مائی باپ" ہیں۔ اور ہم حضور کے تابع فرمان ہیں۔

ستر ھویں نظم

اس نظم میں اقبال نے ان مسلمانوں پر طنز کی ہے جو مسلمان ہو کر شراب کا کاروبار یا اس کی تجارت کرتے ہیں۔

سخت کوش۔ محنتی۔ مشرک وہ شخص جو کسی کو خدائے واحد کا شریک قرار دے گوش بمعنی کان۔ حق نیوش۔ سچی بات سننے یا پسند کرنے والا بادہ کش۔ شرابی۔ بارگوش۔ تکلیف دہ۔ کلمہ گو۔ مسلمان۔

ایک مولوی صاحب وعظ میں یہ کہہ رہے تھے کہ ہندو مشرک ہیں اور مشرک نجس ہوتے ہیں اس لیئے ان کے ساتھ لین دین کرنا سخت گناہ ہے۔ اس مجلس میں ایک مسلمان شرابی بھی شریک تھا اور اسے یہ تقریر بالکل ناپسند تھی چنانچہ اس نے اٹھ کر یہ اعتراض کیا کہ "مولوی صاحب! یہ تو بہت بڑا ظلم ہے کہ آپ کھانے پینے کی چیزوں کی تجارت پر ایسی پابندیاں لگا رہے ہیں" اس کی یہ بات سن کر میں نے کہا "پیارے بھائی آپ پریشان نہ ہوں۔ مسلمان شراب فروش بھی موجود ہیں؛

آپ ان سے خبر بد لیا کریں"۔

نوٹ:۔ یہ پرانے زمانہ کی باتیں ہیں۔ اب تو اور ہی عالم ہے، صرف ایک شعر لکھتا ہوں۔

پینے کا شوق ہو، تو کراچی کی سیر کر　　پھرتے ہیں بادہ نوش البغل میں لئے ہوئے

اٹھارویں نظم

یہ بڑی دلپذیر اور بلیغ نظم ہے۔ اقبال کہتے ہیں کہ مسلمانوں کی نادانی قابل افسوس ہے کہ یہ لوگ دین کے بدلے دنیا جیسی حقیر اور بیکار چیز خرید رہے ہیں اور اس کا باعث یہ ہے کہ یہ لوگ "جدید تعلیم" حاصل کر رہے ہیں اور اس ملحدانہ نظام تعلیم کا منطقی نتیجہ یہ ہے کہ قوم کے افراد احساسات ملی سے بیگانہ ہو جاتے ہیں۔ یعنی یہ تعلیم مسلمانوں کے حق میں سمِ قاتل ہے۔

انیسویں نظم

مطلب ۱:۔ ایک دن ایک سمجھ دار کانگریسی ہندو (گاندھی) نے مسلم لیگی مسلمان (اونٹ) سے کہا کہ میں تو مدت سے انگریزوں کی نگاہ میں باغی اور غدار ہوں، سنا ہے تم بھی اب انگریز کے خلاف ہو گئے ہو (۱۹۲۱ء میں مسلمان بھی خلافت عثمانیہ کے معاملہ میں انگریزوں سے ناراض ہو گئے تھے۔)

اُس کے بعد اس ہندو نے مسلمان پر یہ طنز کیا کہ اگرچہ عرب میں تمہیں کوئی سیاسی اہمیت حاصل نہیں ہے لیکن ہندوستان میں تو معاملہ بنوع دیگر ہے یہاں، تو انگریز بھی تمہیں اپنے ساتھ ملانا چاہتا ہے۔ اور کانگریس بھی تمہاری قیمت سے آگاہ ہے کہ تم بلا تامل جلیبیں بھر سکتے ہو۔

سنہ ۱۹۱۹ء تک تو تم لوگ ہم سے الگ تھلگ رہتے تھے۔ اب کیا بات ہے کہ ہم سے اتحاد پر آمادہ ہو؟ ہائے کچھ تو ہے جس کی پردہ داری ہے۔

مسلمان (اونٹ) نے جب یہ تقریر سُنی کہا کہ اصلی بات یہ ہے کہ اب ہم بھی کانگریس کی خوبیوں پہ مائل ہو گئے ہیں۔ دیکھو جب ایک ہی ملک میں رہنا ہے تو مناسب ہے کہ ہم تم متحد ہو کر رہیں۔ تمہارے ہنگاموں نے سارے ملک میں آگ سی لگا دی ہے اور آج وہ لوگ بھی کانگریس کے پلیٹ فارم سے انگریزوں کے خلاف تقریریں کر رہے ہیں جو کل تک بول بھی نہیں سکتے تھے۔

اگرچہ ہمارا تمہارا کوئی میل تو نہیں ہے کیونکہ تم دولت مند ہو اور ہم "جامہ بھی اُدھار کھاتے ہیں" (کیا حقیقت بیان کی ہے!) لیکن مناسب یہی ہے کہ ملک کی سب قومیں (ہندو مسلم سکھ عیسائی پارسی) ایک ہی پلیٹ فارم پر جمع ہو جائیں۔ پس تم ہمیں بھی "بندے ماترم" گانا سکھا دو تاکہ ہم بھی تمہارے ساتھ نغمہ سرائی کر سکیں۔

حافظ (مسلمان) کی گدڑی (ایمان) کی کوئی قیمت نہیں ہے۔ اُسے بلا تامل شراب (کفر) سے رنگین کر دے۔ اور اس کے بعد اُسے اچھی طرح سر بازار ذلیل و رسوا کر دے۔

نوٹ:- اگرچہ مطلب تو واضح کر دیا ہے لیکن طلبہ کی سہولت کے لیے مشکل الفاظ کے معانی بھی لکھے دیتا ہوں۔

گرم سخن گفتگو شروع کی۔ رسی تڑانا محاورہ ہے، مراد ہے سرکشی یا بغاوت کرنا حذر۔ اجتناب یا پرہیز۔ زنہار۔ انکار۔ رشک صد غمزۂ اشتر محاورہ ہے۔ اشتر غمزہ سے عیاری یا فریب مراد ہوتا ہے۔ مصرع کا مطلب یہ ہے کہ تیری ایک کلیل، اونٹ کے سو غمزوں سے بھی زیادہ دلکش ہے۔ گلہ مے کی کلیل سے حیوان کی اچھل کود مراد ہے۔ بیمار کنایہ ہے عاشق سے۔ بن کنایہ ہے ملک سے۔ پلنگ بمعنی چیتا۔ یک رنگی۔ وحدت۔ ہم زبان یعنی ہم خیال۔ دلق گدڑی۔ بچہ ارزد یعنی ہیچ ہے بے قیمت ہے

بیسویں نظم

میری رائے میں، ایک حصہ میں، اس سے زیادہ مؤثر نظم اور کوئی نہیں ہے کہتے ہیں کہ میں نے کل رات مچھر سے پوچھا کہ "کہو بھائی! کیا حال ہے؟ زندگی کیسے بسر ہو رہی ہے؟" تو اُس نے جواب دیا کہ حضرت! کیا بتاؤں کہ اس دنیا میں کسقدر ظلم وستم ہو رہا ہے؟ میں رات بھر محنت کرتا ہوں تو صبح ہوتے (جب انسان غافل ہو جاتا ہے) کہیں ایک دو بوندیں خون کی نصیب ہوتی ہیں، لیکن، اسی دنیا میں زمیندار بھی رہتا ہے جو بلا محنت کا[illegible] بیچارہ کا سارا خون چوس لیتا ہے (اور کوئی کچھ نہیں کہتا۔

نوٹ:۔ بسوہ دار اُس زمیندار کو کہتے ہیں جو کسی بڑے تعلقہ دار کے نیچے ہوتا ہے اور بسوہ ایک بیگھہ کے بیسویں حصے کو کہتے ہیں۔

اکیسویں نظم

اس نظم میں اقبال نے ظریفانہ رنگ میں بڑے پتہ کی بات کہی ہے۔ مثلاً گاندھی نے مسلمانوں کو کانگریس میں لانے کے لئے جو پروگرام وضع کیا تھا اس کی ایک شق یہ تھی کہ ان کے دماغ سے مذہبی امتیاز نکال دیا جائے۔ تاکہ وہ مسلم لیگ کو چھوڑ کر کانگریس سے آسانی سے وابستہ ہو جائیں اور مذہب پرستی کی بجائے قوم پرستی اختیار کرلیں۔ چنانچہ مسٹر موصوف نے ۱۹۲۲ء میں جیل سے ایک مضمون اپنے اخبار "نوجیون" میں اشاعت کے لئے بھیجا جس کا خلاصہ یہ ہے کہ میں نے قرآن اور گیتا دونوں کا مطالعہ کیا تو معلوم ہوا کہ دونوں کتابوں کی تعلیم یکساں

ہے اس لئے اسلام اور ہندو دھرم دونوں سچے ہیں۔ اس کے بعد بابو بھگوان داس لالہ بھگوان داس نے ایک کتاب لکھی جس کا نام تھا وحدتِ ادیانِ عالم، یعنی دنیا کے تمام مذاہب ایک ہی سی تعلیم دیتے ہیں۔ اس کے بعد جناب ابوالکلام آزاد نے ترجمان القرآن میں یہ خیال ظاہر کیا کہ تمام مذاہب سچے ہیں۔ اس کے بعد مسٹر گاندھی کے سیکرٹری مہادیو ڈیسائی نے آزاد صاحب کی لائف لکھی، اس میں انھوں نے یہ لکھا کہ مولانا کا عقیدہ یہ ہے کہ وہ عالمگیر صداقتیں جن پر نجاتِ اخروی کا انحصار ہے تمام مذاہب میں یکساں پائی جاتی ہیں۔ مسٹر گاندھی کو اپنے مشن میں حسبِ توقع کامیابی حاصل ہوئی، بہت سے کانگریسی مسلمان ان کے ہم خیال ہو گئے چنانچہ ۱۹۴۶ء میں کانپور کے ایک سربرآوردہ کانگریسی مسلمان نے مجھ سے کہا تھا کہ "تبلیغ اسلام کی کوئی ضرورت نہیں ہے کیونکہ سچائی ہر مذہب میں موجود ہے" یہ سن کر میں گاندھی جی کی مہاتمائیت کا معترف ہو گیا۔

اس پس منظر کو سامنے رکھ کر اب اس نظم کو پڑھئے۔ اقبال کہتے ہیں کہ مسلمانوں پر جبل سے یہ "نئی آیت" نازل ہوئی ہے کہ قرآن اور گیتا دونوں کتابیں سچی ہیں۔ اس کا نتیجہ یہ نکلا کہ مسلمان اور ہندو میں صلح ہو گئی کہ ہم بھی سچے اور ہم بھی سچے۔ اب صرف مندر اور مسجد کا اختلاف باقی رہ گیا ہے لیکن یہ منزل ذرا کٹھن ہے کیونکہ ہندو تو مندر سے پہلے ہی بیزار تھا، لیکن مسلمان مسجد سے نکلنے پر تیار نہیں ہے یعنی ہندو نے تو دستِ ہوائی ہندو دھرم چھوڑ کر قوم پرستی اختیار کر لی لیکن مسلمان ابھی تک اسلام سے وابستہ ہے۔

بائیسویں نظم

کہتے ہیں کہ ہر مذہب کی تعلیم کا خلاصہ (تت) یہی ہے کہ ہر حال میں سچ بولو

اس لئے میں یہ سچی بات برملا کہتا ہوں کہ ساہوکاری، البوہ داری (زمینداری) اور سلطنت، یہ تینوں ایک ہی تھیلی کے چٹے بٹے ہیں۔

ساہوکار، مقروض کا خون چوستا ہے۔ زمیندار کاشتکار کا خون چوستا ہے اور سلطان، رعایا کا خون چوستا ہے نام مختلف ہیں لیکن کام ایک ہی ہے۔

نوٹ:۔ تت سنسکرت کا لفظ ہے اس کے لغوی معنی ہیں، اصل یا جوہر ۱۲۔

تئیسویں نظم

حل لغات:۔ محنت و سرمایہ جدید علم سیاست کی دو مشہور اصطلاحیں ہیں محنت سے مراد ہے کسی مزدور کا کارخانوں میں اجرت پر کام کرنا۔ سرمایہ سے مراد ہے کسی دولتمند (سرمایہ دار) یا چند سرمایہ داروں کا مل کر کوئی کارخانہ قائم کرنا۔ محنت سے محنت کش طبقہ اور سرمایہ سے سرمایہ دار طبقہ مراد ہے۔ آج کل دنیا میں ان دونوں طبقوں میں جنگ ہو رہی ہے۔ روس محنت کش طبقہ کا حامی ہے۔ اور امریکہ مع انگلستان، سرمایہ دار طبقہ کا تمنائی ہے کا خون۔ اشارہ ہے سرمایہ داروں کی شکست کی طرف کہ اقبال کی رائے میں انجام کار ان ظالموں کو شکست ہوگی۔ حکمت و تدبیر سے ڈپلومیسی مراد ہے۔ فتنۂ آشوب خیز سے اشتراکیت اور اشتمالیت کی طرف اشارہ ہے سرمایہ دار اقوام ان کو اپنے حق میں بلا شبہ "فتنہ" یقین کرتی ہیں کیونکہ اشتراکیت کا مقصد ہی سرمایہ داری کو مٹانا ہے۔ ٹل نہیں سکتا فرو نہیں ہو سکتا۔ وَ قُلْ كُنْتُمْ بِهٖ تَسْتَعْجِلُوْنَ۔ اور تم (تو عذاب کے آنے میں شک کرتے) اس کے لئے جلدی مچایا کرتے تھے (سورۂ یونس ع ۵) اقبال نے بلا شبہ اس آیت کو بہت برمحل استعمال کیا ہے۔ مطلب یہ ہے کہ اشتراکیت دراصل وہ عذاب ہے جو اللہ تعالیٰ نے سرمایہ داروں پر ان کی بد اعمالیوں کی پاداش میں نازل فرمایا ہے

اب چونکہ سرمایہ دار مضطرب ہیں تو اقبال قرآنی الفاظ میں اُن سے کہتے ہیں کہ اے ظالمو! جب اللہ کے نیک بندے تم سے کہتے تھے کہ غریبوں کا خون چوسنا چھوڑ دو ورنہ تم پر عذاب نازل ہوگا تو تم کہا کرتے تھے اپنے خدا سے کہو کہ وہ جلدی عذاب نازل کرے پس اے سرمایہ دارو! اب کیوں مضطرب ہو؟ یہ وہی عذاب تو ہے جس کے نزول میں تنگ کر کے تم اس کے لئے جلدی مچایا کرتے تھے۔ یاد رکھو! یہ عذاب ٹل نہیں سکتا۔ یاجوج اور ماجوج۔ حَتّٰىٓ إِذَا فُتِحَتْ يَأْجُوجُ وَمَأْجُوجُ وَهُم مِّن كُلِّ حَدَبٍ يَنسِلُونَ (سورہ انبیاء ع ۷) یہانتک کہ یاجوج اور ماجوج کے لشکر کھولدئے جائیں اور وہ ہر بلندی سے ڈھلکتے ہوئے چلے آئیں میں نے یہ آیت اس لئے نقل کر دی ہے کہ اس میں یاجوج اور ماجوج اور ینسلون تینوں لفظ وارد ہیں۔ یاجوج اور ماجوج پرانے زمانے میں دو جنگجو قومیں تھیں جو سلطنت ایران میں داخل ہو کر تباہی مچایا کرتی تھیں اقبال نے ان کو روس اور امریکہ پر منطبق کیا ہے۔ وہ کہتے ہیں کہ قرآن مجید میں جو پیش گوئی کی گئی ہے کہ ایک زمانہ آنے والا ہے جب یاجوج اور ماجوج کے لشکر کھل جائیں گے اور تمام دنیا میں پھیل کر تباہی مچائیں گے۔ یہ پیش گوئی ہمارے زمانہ میں پوری ہو گئی۔ آیت مذکورہ بالا میں جو ینسلون کا لفظ آتا ہے، روس اور امریکہ اس کی تفسیر ہیں کہ یہ دونوں قومیں آج برسرپیکار ہیں خلاصہ کلام یہ ہے کہ اب ان میں زبردست جنگ ہوگی اور دنیا تباہ ہو جائے گی۔

مطلب! اشتراکیت نے آج تمام دنیا کے مزدوروں کو سرمایہ داروں کے خلاف متحد کر دیا ہے۔ اور ان دونوں طبقوں میں زبردست جنگ جاری ہے۔ دیکھئے اب کون کون سے سرمایہ دار ممالک تباہ ہوتے ہیں اگر یہ سرمایہ دار ممالک یہ سمجھتے ہیں کہ ہم عیاری اور چالاکی سے اشتراکی تحریک پر غالب آجائیں گے تو یہ ان کی سخت حماقت ہے۔ مزدور بیدار ہو چکے ہیں اور اب کسی سرمایہ دار سے دھوکہ نہیں کھا سکتے بلکہ

وہ وقت قریب ہے جب دُنیا سے سرمایہ داری کا خاتمہ ہو جائے گا۔ آج روس ایک طرف ہے اور سرمایہ دار ممالک دوسری طرف۔ گویا یاجوج اور ماجوج کے لشکر کھل گئے ہیں۔ اور مسلمان اس جنگ میں آیت ینسلون کی تفسیر پڑھ سکتے ہیں۔

چوبیسویں نظم

تمہید:۔ اس نظم کا مطلب سمجھنے کے لئے ملک شام کی موجودہ تاریخ سے واقفیت ضروری ہے۔ واضح ہو کہ پہلی جنگ عظیم میں اتحادی فوجوں نے ۱۹۱۷-۱۸ء میں ترکوں کو شکست دے کر اس ملک پر قبضہ کر لیا اور ۱۹۱۹ء میں انگریزوں نے غدار شریف مکہ جسے انگریزوں نے حجاز کا بادشاہ بنا دیا تھا جس طرح ۱۸۱۵ء میں انھوں نے نواب وزیر اودھ کو، بادشاہ دہلی کا اقتدار کم کرنے کے لئے بادشاہ ذی جاہ کا لقب دے دیا تھا کے بیٹے امیر فیصل کو شام کا بادشاہ بنا دیا۔ چونکہ عراق اور فلسطین کو انگریزوں نے اپنے زیر اثر رکھا تھا اس لئے اس ملک کو فرانس کے حوالے کر دیا۔ لیکن شامی عربوں نے فرانس کے خلاف جنگ شروع کر دی اور کہا کہ ہم جانتے ہیں کہ فیصل کے پردہ میں دراصل تم ہم پر حکومت کرو گے اور ہم اس کے لئے تیار نہیں ہیں ہم نے ترکوں کے خلاف اس شرط پر بغاوت کی تھی کہ ہمیں آزادی حاصل ہو جائے گی غرضیکہ عربوں نے فرانس کو مجبور کر دیا کہ وہ مجلسِ اقوام کے مجوزہ حکم برداری (Mandata) کے طریقہ کو تسلیم کرے اور جمہوریت قائم کرے۔ چنانچہ ۱۹۲۳ء میں فرانس نے لبنان کو اور ۱۹۲۵ء میں دمشق اور حلب کے صوبوں کو متحد کر کے ملک شام کو Republic تسلیم کر لیا۔

حلِ لغات:۔ رِند لم یزل۔ وہ رند جس کی رندی کو کبھی زوال نہ ہو۔ یعنی زبردست شراب خور۔ یہاں کنایہ ہے فرانس سے: اقبال نے "رند لم یزل" کی ترکیب بہت

برمحل استعمال کی ہے کیونکہ فرانس کے لوگ رندی اور میخواری کے اعتبار سے ساری دنیا میں مشہور ہیں۔ میخانہ کے قاعدوں سے یہاں سیاست کے اصول مراد ہیں۔ نیلی رداق۔ آسمان۔ مداوا۔ علاج۔ حکم برداری۔ جدید سیاسی اصطلاح ہے عربی میں اسے انتداب کہتے ہیں۔ مطلب اس کا یہ ہے کہ لیگ آف نیشنز (مجلس اقوام) جو کفن چوروں کی مجلس تھی جب کسی یورپین طاقت کو کسی ایشیائی ملک کا انتظام کرلینے یا حکومت کرنے یعنی اُسے غلام بنانے کا اختیار دیتی تھی تو اسے Mandate یا حکم برداری کہتے تھے۔ یہ سیاسی اصطلاح ۱۹۱۹ء میں وضع کی گئی تھی تاکہ مسلمانوں کو غلام بنایا جاسکے۔ دردِ لا یطاق۔ بڑی دلکش ترکیب ہے جو اقبال نے "تکلیف مالا یطاق" کو مدنظر رکھ کر وضع کی ہے۔ مطلب اس سے ہے وہ درد جو مریض سے برداشت نہ ہو سکے۔ وفد سیاسی اصطلاح ہے یعنی چند بااثر نمائندہ اشخاص کا کسی "خدائے مجازی" کی خدمت میں حاضر ہو کر اپنے مطالبات پیش کرنا۔ کامیابی ہو یا نہ ہو شہرت اور تفریح تو یقینی ہے۔ حضرتِ کرزن۔ انگلستان کا مشہور مدبر اور سیاست دان ۱۸۵۹ء میں پیدا ہوا۔ ۱۸۹۸ء میں زہرہ اور مشتری کے زیر اثر آگیا یعنی ہندوستان کا وائسرائے بن گیا۔ شاہانہ مزاج رکھتا تھا۔ اس لیے کلکتہ میں تاج محل آگرہ کا جواب بنایا جسے وکٹوریہ میموریل کہتے ہیں۔ اس کی تعمیر میں کمال یہ دکھایا کہ گرہ سے ایک پیسہ خرچ نہیں کیا تمام اخراجات اس کے خطاب یافتہ غلاموں مثلاً نظام، گائکواڑ، سندھیا اور دولتِ انگلشیہ کے دوسرے فرزندوں نے خود برداشت کیے۔ ۱۹۰۵ء میں لارڈ کچنر سپہ سالار افواج ہند سے اختلاف کی بنا پر مستعفی ہو کر واپس چلا گیا اکبر الہ آبادی نے اس واقعہ کو یوں نظم کیا تھا۔

کرزن ٹو کچنر کی حالت پر جو کل ✻ وہ صنم تشریح کا طالب ہوا
کہہ دیا میں نے کہ ہے یہ صاف صاف ✻ دیکھ لو تم زن پر نر غالب ہوا

۱۹۱۹ء میں لارڈ کرزن کو وزیر امور خارجہ کا منصب حاصل ہوا ۱۹۲۴ء میں مستعفی ہو گیا اور ۱۹۲۵ء میں وفات پائی۔ لارڈ کرزن نے اپنے تعلقات کی بنا پر سر آغا خاں کو اس بات پر آمادہ کیا تھا کہ وہ ہندوستان کے مسلمانوں کا وفد مرتب کر کے مجلس اقوام میں انگریزوں کے طرز عمل کی حمایت کریں۔ اور باقاعدہ درخواست کریں کہ جب فرانس کو شام عطا کر دیا گیا ہے تو عراق اور فلسطین پر انگریزوں کا تسلط تسلیم کر لینا چاہیے

سر آغا خاں شیعوں کے مشہور اور اہم فرقہ اسمٰعیلیہ کے شہرہ آفاق مذہبی پیشوا ہیں اسمٰعیلی شیعہ ان کو "حاضر امام" بلکہ اس سے بھی بلند تر مرتبہ دیتے ہیں ۱۸۷۷ء میں پیدا ہوئے۔ اُن کے دادا حسن علی شاہ المعروف بہ آغا خاں ایران کو خیر باد کہکر کراچی میں آباد ہو گئے تھے۔ ان کے فرزند آغا علی شاہ نے بمبئی کو وطن بنا لیا۔ ان کا نام محمد شاہ ہے۔ آغا خاں ثالث لقب ہے میری رائے میں موصوف دنیا کے خوش قسمت ترین انسان ہیں۔ اِس سے زیادہ اور کیا لکھوں۔

مطلب :- یہ نظم اقبال نے ۱۹۲۴ء میں لکھی تھی اس میں انھوں نے کمال اختصار کے ساتھ اس زمانہ کے سیاسی حالات پر جو شام میں رونما ہو رہے تھے تبصرہ کیا ہے، چونکہ مجھے اختصار ملحوظ ہے اس لئے میں نے تفصیل سے کام نہیں لیا اور جب تک کسی طالب علم کو شام کی تاریخ، لیگ آف نیشنز کی تاریخ، اس کے کارناموں، حکم برداری یا انتداب کی عیاریوں، انگریزوں کی دسیسہ کاریوں، کرزن کی کارگزاریوں، اور عراق پر للچائی ہوئی نظروں اور سر آغا خاں کے انگریزوں سے تعلقات سے پوری واقفیت نہ ہو اُس وقت تک اس نظم یا اس قسم کی نظموں کا مطلب سمجھ میں نہیں آسکتا۔

خلاصۂ کلام یہ ہے کہ جب ۱۹۲۳ء میں فرانس نے مجبور ہو کر اپنی فوجیں واپس

بلائیں اور شامیوں کو جمہوریت کے قیام کا موقع دیا تو اقبال نے یہ لکھا کہ خدا کا شکر ہے کہ اہلِ فرانس ملک شام کی سرحدوں سے رخصت ہو رہے ہیں۔ واقعی دُنیا عبرت کا مقام ہے کہ کل تک فرانس شام پر حکمراں تھا، لیکن آج آسمان اس کے خلاف ہو گیا۔ اور اس کے منصوبے خاک میں مل گئے۔

اس کے بعد اقبال نے کرزن پر طنز کی ہے کہ اب لارڈ موصوف کو عراق اور فلسطین کی خیر منانی چاہیئے۔ کیونکہ جو حشر فرانس کا ہوا ہے۔ وہی انگریزوں کا ہونے والا ہے۔ شاید اسی لئے آغا خاں نے ہندوستان سے ایک "وفد" طلب کیا ہے کہ مجلس اقوام میں انگریزوں کے موقف کی حمایت کا مقدس فریضہ انجام دیا جاسکے

پچیسویں نظم

مطلب:۔ ایک دن ایک زمیندار اور اسکے مزارع (کاشتکار) میں اس بات پر جھگڑا ہو رہا تھا کہ زمین کس کی ملکیت ہے؟ کاشتکار یہ کہتا تھا کہ عقل و نقل دونوں کا یہ تقاضا ہے کہ جو شخص کسی قطعۂ زمین میں کاشت کرے (ہل چلائے) وہ قطعہ اسی کی ملکیت ہے۔ زمیندار اس کے جواب میں کہتا تھا "معلوم ہوتا ہے کہ تیرا دماغ خراب ہو گیا ہے"۔ یہ سن کر میں نے زمین سے پوچھا کہ تو اس جھگڑے کا خود فیصلہ کردے تو زیادہ مناسب ہے زمین نے جواب دیا کہ یہ دونوں نادان ہیں، بلکہ میں نہ زمیندار کا مال ہوں نہ کاشتکار کا۔ بلکہ یہ دونوں خود میرا مال ہیں۔ کیونکہ مرنے کے بعد دونوں ہی میرے اندر چلے جائیں گے اور کچھ دنوں کے بعد میرا جزو بن جائیں گے۔ یہ لڑائی جھگڑے سب جہالت کے کرشمے ہیں۔

چھبیسویں نظم

مطلب:۔ نئی تہذیب نے ہماری قوم کے نوجوانوں کو بالکل ناکارہ کر دیا ہے نہ ان کی ذات سے دین کو کوئی فائدہ پہنچ سکتا ہے نہ وطن کو۔

الیکشن، ممبری، کونسل اور صدارت یہ سب وہ پھندے ہیں جن میں ہماری قوم گرفتار ہے اور ان کی وجہ سے بھائی بھائی سے برسرپیکار ہے۔

"میاں نجار" اس حصہ میں بلیغ ترین ترکیب ہے۔ اِس سے انگریز مراد ہیں جنھوں نے ہندوستانیوں کو ۱۸۸۵ء میں "آزادی" کا پہلا سبق پڑھایا تھا یورپ کے رندوں سے مغربی سیاست اور جمہوریت کے اُصول مراد ہیں۔

مطلب یہ ہے کہ انگریزوں نے، اِس خیال سے اہلِ ہند کو مغربی جمہوریت کا دلدادہ بنایا تھا کہ اس کے پردے میں آرام کے ساتھ حکومت کرتے رہیں گے لیکن ہندوستانیوں نے اب سیاسی شعور حاصل کرنے کے بعد واقعی آزادی حاصل کرنے کے لئے جدوجہد شروع کر دی ہے۔

ستائیسویں نظم

مطلب:۔ اقبالؔ نے اِن دو شعروں میں، محنت کش طبقہ کی حمایت کا حق

ادا کر دیا ہے۔ کہتے ہیں کہ کارخانہ کا مالک (سرمایہ دار) نہایت پست فطرت نااہل عیش پسند اور کاہل ہے، اب اس کے مقابل ذرا قرآن مجید کی اس آیت پر غور کرو کہ "انسان اسی شے کا حقدار ہے جس کے حصول کے لیئے وہ جد و جہد کرے اگر یہ فرمودۂ قرآنی صحیح ہے (اور یقیناً صحیح ہے) تو پھر سرمایہ دار کو کیا حق حاصل ہے کہ وہ مزدور کی محنت کا پھل تو خود کھائے اور مزدور خونِ جگر پی کر زندگی بسر کرے

نوٹ:۔ اقبال چونکہ مسلمان تھے
اس لیئے ساری عمر اس مظلوم طبقہ کی
بے کسی پر نوحہ خوانی کرتے رہے انقلاب
اس لیئے برپا نہ کر سکے کہ دنیا میں ہر شخص مصطفیٰ
کمال یا لینن تو نہیں ہو سکتا۔ ہاں نظموں کے
ذریعے سے اپنے دردِ دل کا اظہار انھوں نے
ہر تصنیف میں کیا ہے چنانچہ بالِ جبرائیل
میں تنگ آکر خدا سے پوچھتے ہیں۔

کب ڈوبے گا سرمایہ پرستی کا سفینہ — دنیا ہے تیری منتظرِ روزِ مکافات

اٹھائیسویں نظم

یہ نظم اس قدر دلکش ہے کہ شرح لکھ کر اسکی معنویت کا خون کرنے کو دل نہیں چاہتا۔ "کونسل ہال" کو سرمایہ داروں کے "تکیہ" سے تعبیر کرنا اقبال کی جودتِ طبع کی دلیل تو ہے ہی، لیکن اس سے اُن کی اُس نفرت کا اندازہ بھی ہو سکتا ہے جو ان کے مسلمان ہونے کی حیثیت سے، سرمایہ داروں سے تھی۔ بات یہ ہے کہ اسلام اور سرمایہ داری اسی طرح نقیضین ہیں جس طرح اسلام اور قوم پرستی یا اسلام اور کفر۔

واضح ہو کہ اقبال نے کونسل ہال کو سرمایہ داروں کے "تکیہ" سے اس لئے تعبیر کیا ہے کہ مغربی نظامِ جمہوریت میں اصلی طاقت بہرحال سرمایہ داروں کے ہاتھ میں ہوتی ہے کونسل میں جانے کے لئے ووٹ کی ضرورت ہے۔ اور ووٹ کے لئے "نوٹ" درکار ہے۔ اور یہی حربہ ہے جس کی مدد سے سرمایہ دار میری کیا چیز ہے دُنیا کی ہر نعمت خرید سکتا ہے۔ اگر کوئی شخص اس کی مخالفت کرے تو وہ اس کو اسی دولت کے زور سے "غائب" کرا سکتا ہے۔ کسی کو پتہ نہیں چل سکتا کہ وہ آدمی کہاں چلا گیا۔ اس موضوع پر بہت کچھ لکھا جا سکتا ہے۔ لیکن مصلحتاً قلم روکتا ہوں۔

مصلحت نیست کہ از پردہ بروں افتد راز

ورنہ در محفلِ رندان خبرے نیست کہ نیست

انیتسویں نظم

اِس قطعہ میں دو نام تشریح طلب ہیں (۱) امیر فیصل (۲) سنوسی امیر فیصل، غدار شریف مکہ کا بیٹا تھا۔ اس نے جنرل ایلنبی کے ساتھ مل کر ترکوں کے سینوں کو اپنی گولیوں سے چھلنی کیا اور اُن کی بربادی اور دمشق پر انگریزوں کے قبضہ کی خوشی میں اپنے گھر چراغاں کیا۔ مارچ ۱۹۲۰ء میں انگریزوں نے اس کو مذہب اور ملت دونوں سے غداری کے صلہ میں شام کا بادشاہ نامزد فرمایا۔ لیکن اپریل ۱۹۲۰ء میں لیگ آف نیشنز نے شام کو فرانس کے حوالے کر دیا اور فیصل کو جولائی میں وہاں سے نکلنا پڑا لیکن ۱۹۲۱ء میں خداوندانِ لندن نے اس کو عراق کا بادشاہ بنا دیا ۱۹۳۳ء میں وفات پائی۔

سنوسی سے سید محمد ادریس السنوسی مراد ہیں جو طریقۂ سنوسیہ کے شیخ تھے انھوں نے ۱۹۱۱ء میں طرابلس کی جنگ میں اطالیہ کا مقابلہ کرنے کے لئے غازی انور پاشا کے ساتھ مل کر اپنے مریدوں کی فوج مرتب کی تھی اور میدانِ جنگ میں داد

شجاعت لی۔ طریقہ سنوسیہ کی بنیاد حضرت سید محمد بن علی نے ڈالی تھی جو الجیریا کے رہنے والے تھے شمالی افریقہ کے اکثر مسلمان (مصر سے لے کر مراقش تک) اس تحریک میں شامل ہیں اور قومی خدمات میں عام طور سے حصہ لیتے رہتے ہیں۔

مطلب پہلا شعر:۔ اس شعر میں اگر "مسجد" سے اسلام مراد لیا جائے تو مطلب یہ ہوگا کہ سچے مسلمانوں نے تو بہت تھوڑی مدت میں اسلام کو دنیا میں پھیلا دیا۔ یعنی ہزاروں لاکھوں انسانوں کو مسلمان بنا دیا۔ لیکن میری حالت یہ ہے کہ میں اپنے آپ کو برسوں میں بھی مسلمان نہ بنا سکا۔

اگر مسجد سے واقعی مسجد مراد لی جائے تو مطلب یہ ہوگا کہ ہمارے اسلاف کے دلوں میں الفت اسلام کا یہ عالم تھا کہ انھوں نے راتوں رات مسجد بنا کر کھڑی کر دی لیکن وائے بر حالِ ما کہ ہم اس مسجد کو آباد بھی نہ کر سکے۔ اور آج وہ مسجدیں نمازیوں کی صورت کو ترس رہی ہیں۔ واضح ہو کہ ہندوستان میں کئی ایسی مسجدیں میرے علم میں ہیں جن کو "ایمان کی حرارت والوں نے" بلا مبالغہ صرف ایک رات میں تعمیر کر دیا تھا مثلاً نگینہ ضلع بجنور (یو۔پی) میں ایک مسجد تھی اس کا نام تھا "مسجد کفر توڑ" جب میں ۱۹۰۵ء میں نگینہ گیا تو لوگوں سے اس کی وجہ تسمیہ دریافت کی جس پر بعض بڑے بوڑھوں نے مجھے بتایا کہ آج سے تیس چالیس سال پہلے اس جگہ بعض مسلمانوں نے نماز کے لئے چبوترہ بنا لیا تھا۔ برادرانِ وطن نے بجنور جا کر حاکم ضلع یعنی کلکٹر سے شکایت کی اس نے کہا کہ میں خود آ کر موقع کا معائنہ کروں گا۔ جب مسلمانوں کو اس بات کا علم ہوا تو انھوں نے "شب بھر میں" مسجد بنا کر کھڑی کر دی جب چند روز کے بعد کلکٹر آیا تو اس نے اُسے برقرار رکھا۔

دوسرا شعر:۔ شیخ سنوسی نے امیر فیصل بن حسین غدار سے یہ کہا کہ نام و نسب کے لحاظ سے تو حجازی مسلمان ضرور ہے لیکن تیرے دل میں حجاز (اسلام) کی

محبّت مطلق نہیں ہے، ورنہ تو کافروں کا آلۂ کار نہ بنتا اور دین و ملت کو نقصانِ عظیم نہ پہنچاتا۔

واضح ہو کہ شریف مکہ حسین غدّار اور اس کے بیٹوں نے ملّت اسلامیہ کو جو ضعف پہنچایا ہے ابھی تک مسلمانوں نے اس کا اندازہ نہیں کیا تاریخ ملت اسلامیہ میں ان باپ بیٹوں کا نام میر جعفر اور میر صادق کے ساتھ ساتھ لکھا جائے گا میں چاہتا ہوں کہ اس بات کی قدرے وضاحت کر دوں میں قبل ازیں لکھ چکا ہوں کہ سلطنت ترکی کا وجود، ملتِ اسلامیہ کے سب سے بڑے دشمن یعنی برطانیہ کی نظروں میں خار بن کر کھٹکتا رہتا تھا۔ چنانچہ گلیڈسٹن نے ۱۸۸۳ء میں پارلیمان کے اجلاس میں یہ کہا تھا کہ جبتک دنیا میں ترکوں کا وجود باقی ہے نہ یورپ میں امن و امان قایم ہو سکتا ہے اور نہ تہذیب کو فروغ حاصل ہو سکتا ہے اس کی تہ میں یہ راز تھا کہ انگریز مشرقِ وسطیٰ میں اپنا اقتدار قائم کرنا چاہتے تھے اور یہ بات ممکن نہیں ہو سکتی تھی جب تک سلطنت ترکی برقرار تھی، اس لئے ان کی دلی آرزو یہ تھی کہ کسی طرح اس عظیم الشان سلطنت کو جو برباد ہو جانے کے بعد بھی تینوں براعظموں میں پھیلی ہوئی تھی، ٹکڑے ٹکڑے کر دیا جائے۔ تاکہ مصریوں عربوں عراقیوں شامیوں اور تمام مشرقِ وسطیٰ کو اپنا غلام بنایا جا سکے۔ اب ناظرین خود فیصلہ کرلیں کہ جو شخص ملت کے دشمنوں کی اس ناپاک آرزو کی تکمیل میں ان کا آلۂ کار بن جائے۔ وہ کتنا بڑا غدار اور دشمنِ اسلام ہوگا۔ یہ وجہ ہے کہ اقبالؔ نے یہ مصرع سپردِ قلم کیا۔

ع تو نام و نسب کا حجازی ہے پر دل کا حجازی بن نہ سکا۔

تیسرا شعر:۔ چونکہ اس شعر میں سوز و گداز کی کیفیت پائی جاتی ہے۔ اس لئے میں یا کوئی شخص لفظوں کے ذریعے اس کی تشریح نہیں کر سکتا۔

مطلب یہ ہے کہ رونے کا مزا جب ہے کہ آنسوؤں کے ساتھ جگر بھی خون

بھی شامل ہو جائے اور اس کی وجہ سے انکا رنگ ہلکا گلابی ہو جائے یعنی اگر اسلام کی محبت کا دعویٰ کرتے ہو تو پھر خلوص (خونِ جگر) کا ثبوت دو۔ محبت میں عاشق کو حقیقی لذت اُس وقت حاصل ہو سکتی ہے۔ جب وہ اپنی محبت میں خلوص کا رنگ پیدا کرلے لیکن اِس مطلب سے شعر کا لطف واضح نہیں ہو سکتا۔

چوتھا شعر:۔ کہتے ہیں کہ یوں تو میں بہت بڑا واعظ (ناصح) ہوں اور میری تقریر بہت دلکش ہوتی ہے لیکن افسوس کہ میں جو کچھ کہتا ہوں اُس پر عمل نہیں کرتا۔ اس شعر میں اقبال نے اپنے زمانے کے واعظوں کی زندگی کا نقشہ کھینچا ہے۔ لیکن ازراہِ انکسار انھوں نے اس عیب کو اپنی طرف منسوب کر لیا ہے ورنہ حقیقت یہ ہے کہ مرحوم کی ساری زندگی کردار اور عمل کی مظہر تھی اس کی تفصیل یہ ہے کہ عمل صرف جیل میں چکی پیسنے ہی کا نام نہیں ہے جو شخص راتوں کی تنہائی میں قوم کی اصلاح اور بہبود کے لئے خدا سے التجائیں کرے اور اپنے دل و دماغ کو قوم کے عروج کی تدبیریں سوچنے کے لئے وقف کر دے کوئی صاحب ہوش اس پر بےعملی کا الزام عائد نہیں کر سکتا ۱۲۔

ختم شُد

ASL-275 ✓	Javeed Name - جاوید نامہ Dr. Iqbal 1971 - 192 pages. Union Printing Press Delhi
ASL-276 ✓	Ghubar-e-Khatir غبار خاطر by Abul Kalam Azad Nomani Press Delhi (Azad Academi) 352 pages - 1946
ASL-277 ✓	Sharh-i-Bang-i-Dara Prof. Yusuf Saleem Chishti Sultanie Book Depot Delhi 536 pages

ASL-275 ✓	Javeed Name - جاوید نامہ Dr. Iqbal 1971 - 192 pages. Umar Publishing Press Delhi
ASL-276 ✓	Ghubar-e-Khatir غبار خاطر by Abul Kalam Azad Nomani Press Delhi (Azad Academi) 352 pages - 1946
ASL-277 ✓	Sharh-i-Bang-i-Dara Prof. Yusuf Saleem Chishti Sultanie Book Depot Delhi 536 pages